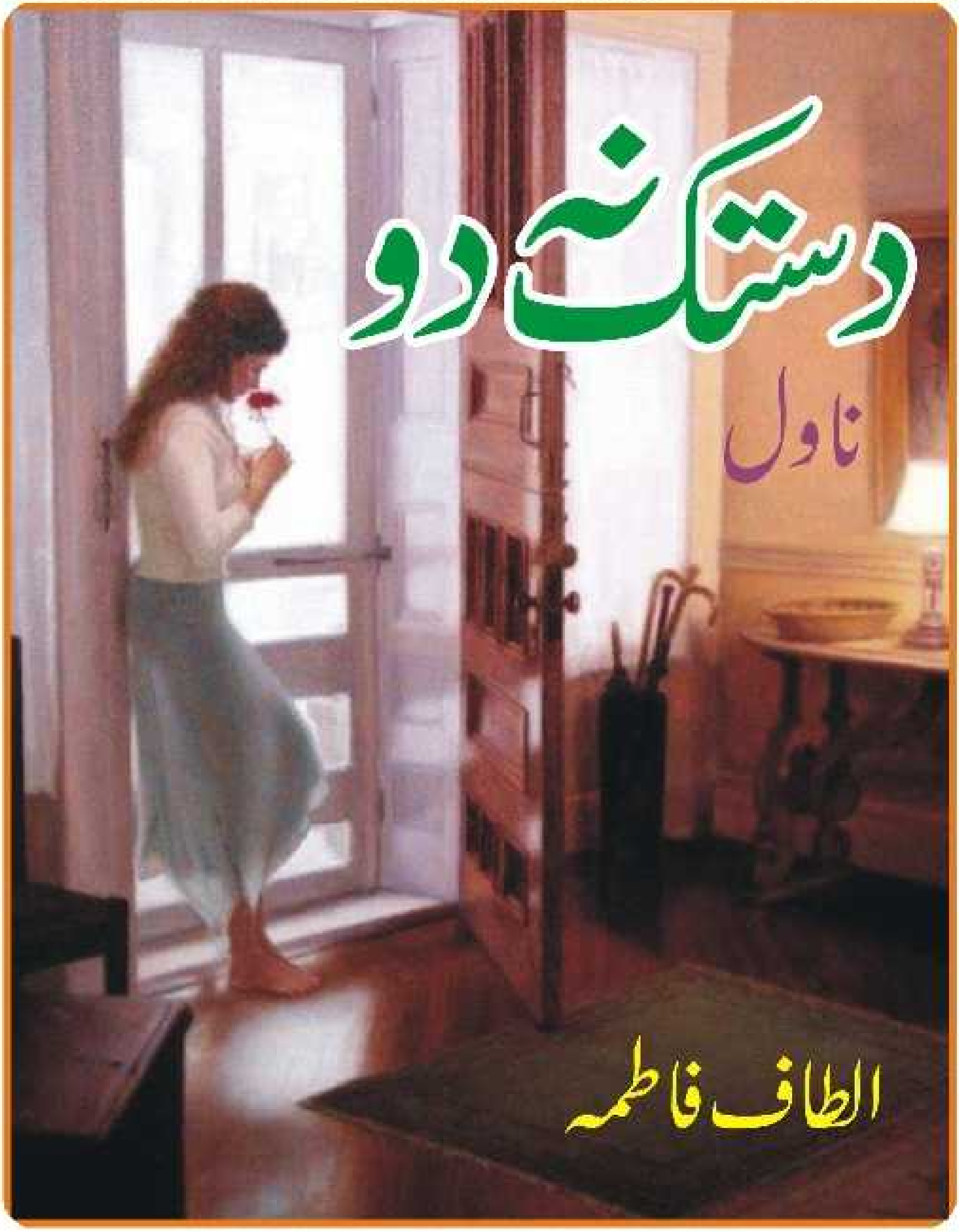
دستک نہ دو
ناول
الطاف فاطمہ

فصل اول

باب ۱

اس دوپہری پر شام کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ جنوری کا سب سے زیادہ کہر آلود دن تھا۔ مالی نے اسی شام کیاریوں کی گوڑائی کی تھی کہ شاید آج برکھا ہو جائے۔ سنہرے سنہرے سرکنڈوں کے سہارے لہلہاتے ہوئے سوئٹ پی کر پودوں میں سفید' آسمانی' اودے اور گلابی پھول اپنے جوبن پر تھے۔ سرد اور دھندلی فضا میں ہر طرف بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دل کی وضع کی کیاریوں میں نیلے اور بسنتی پھول منہ لٹکائے گہری سوچوں میں غرق نظر آ رہے تھے۔ اندر سے باہر تک خاموشی تھی اور صرف چمنیوں سے بل کھاتا ہوا دھواں نظر آ رہا تھا۔

ایسے میں پھاٹک کے قریب سائیکل چمکی اور کوئی اس پر سے اتر پڑا۔ سرخ رنگ کی مورم پر وہ سائیکل گھسیٹتا ہوا آگے بڑھا۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر چند قدم سائیکل آگے کو گھسیٹی۔ مورم بولی۔ "چرچرچر" اور وہ بولا۔ چائنا مین' چائنا مین"

پیچھے سے باریک سی آواز آئی۔ "چن چن چائنا مین"

اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک اور سائیکل تھی۔ اس پر وردی پوش بیرا بیٹھا تھا۔ آگے پیچھے نیلی ٹیونک اور سفید بلومر میں دو بچیاں تھیں۔ ایک کی آنکھیں بڑی بڑی اور کھلی کھلی تھیں اور ناک ستواں۔ دوسری کی آنکھیں چھوٹی اور تکونی تھیں اور ناک چپٹی۔ اس کے بال بھی بہت اونچے اونچے کٹے ہوئے تھے۔ دوسری لڑکی کی دو موٹی موٹی سنہری چوٹیاں تھیں۔

چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناک والی' چلتی سائیکل پر سے کودی۔ بھاری سے بستے کو اچھال کر کندھے پر سنبھالا اور اترا ہوا کوٹ کندھے پر جما کر پھر بولی۔ "چن چن چائنا مین!"

اس نے بات کاٹی اور بولا۔ "او بے بی! کوٹ پہنو' سردی بوت ہوتا' مر جائے گا۔"

بے بی نے جواب میں زبان نکال دیا اور چائنا مین نے گھونسا دکھایا۔

بیرے نے سائیکل روکی تو بڑی آنکھوں اور موٹی چوٹیوں والی لڑکی نیچے اتری۔ آہستہ سے بستہ کندھے پر ٹانگا اور معصومیت سے برساتی کی طرف چل دی۔

''اے چینا! پھر آئے' بیگم لوگ آرام کرتا۔ تم کدر نکل آیا اس وقت'' بیرے نے چائنامین کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور چپٹی کو ہانکتا ہوا اندر کی طرف لے چلا۔ جو اندر جانے کے بجائے کسی اور ہی سمت کو چلی تھی۔

چائنامین نے اپنا موٹا سا گٹھر سائیکل کے کیریئر پر مضبوطی سے جمایا' پتلون کا پائنچا ٹھیک سے موڑ کر اس میں کلپ لگایا' سیٹی بجائی اور سائیکل پر سوار ہو کر سٹرڈ سٹرڈ کرتا نکل گیا۔

پھر خود بخود ہی وہ خوشی کے نغمے کی دھن اداس سروں میں بدلتی چلی گئی۔ اس نے ٹھنڈی سی سانس لی اور ناتمام دھن کو فضا ہی میں بھٹکتا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

نہ جانے کیوں اس کو چلتے چلتے گھر کی یاد آ گئی۔ اس نے دھندلے اور کہر میں چھپے ہوئے افق کو تاکتے ہوئے سوچا۔ ''کیا پتہ آج پیکنگ میں بھی ایسے ہی غضب کی سردی ہو اور نہ جانے' نہ جانے میری ماں کیا کر رہی ہوگی۔ دبلے جسم' چپٹے اور خوبصورت دہانے والی عورت جس کے ہاتھ محنت کرنے کے باوجود نرم اور کنول کی طرح نازک ہیں اور میری دونوں چھوٹی بہنیں' معلوم نہیں اسکول جاتی ہیں یا نہیں۔''

سوچوں کا سلسلہ طویل ہوتا ہے۔ وہ گھر والوں کے متعلق سوچتے سوچتے جھینگوں کے شوربے' سرکے میں کتری ہوئی ہری مرچوں کی چٹنی اور گاجر کے لچھے کے ساتھ پکی ہوئی مچھلی کے متعلق سوچنے لگا۔ جو یہ چیزیں اس کو ڈھنگ سے ٹھکانے سے ملتی رہتیں تو وہ اسکول چھوڑ کر اتنی کم عمری میں گھر سے بے گھر' اس پرائے دیس میں سڑکیں کیوں ناپتا پھرتا۔

اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ابھی دسمبر ہی میں تو وہ پورے سترہ سال کا ہوا تھا اور عین اس دن اس کو اپنی ماں کا خط ملا تھا جو اس نے آج تک اپنے دل کے قریب والی جیب میں رکھ چھوڑا تھا۔ اتنی مشاقی سے برش عام طور پر مرد ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کی ماں کے لڑکپن میں عورتوں کی تعلیم کب اتنی عام تھی پر وہ تو دینی مدرسے کے اس معلم کی بیٹی تھی جس کے قلم کی جنبشیں مشہور تھیں۔

وہ اس خط کو بڑے پیار سے نکال کر دیکھتا۔ اوپر تلے لکھے ہوئے حروف کو پیار کرتا اور پھر تہہ کر کے احتیاط سے رکھ لیتا۔ چین میں عام طور پر لڑکوں کی مائیں کب اتنے بے عیب حرف بناتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی آ جاتی اور سر فخر سے تن جاتا۔

اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ سر کے سیاہ اور سیدھے بال پھسل کر پیشانی پر آ گئے' جن کو اس نے دوسرے جھٹکے سے پیچھے کر لیا۔ قریب سے سرخ کوٹ میں سائیکل پر ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی گذری۔ اس نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سانولی رنگت' تیکھی چتونیں' لمبی آنکھیں اور ستواں ناک۔

اس نے پھر ایک الجھی ہوئی سی سانس لی۔ ’’آہ‘ یہ ستواں ناک اور تیکھے نقوش ونگار۔ میں ان سے اکتا گیا ہوں۔ ان کو دیکھ دیکھ کر دل بیزار ہو گیا ہے۔‘‘ نفرت کی ایک پھریری سی اس نے لی اور پھر سوچنے لگا۔ ’’آج میں کتنی دلچسپ جگہ جا گھسا تھا۔ شہروں اور آبادیوں سے دور‘ جنگلوں میں بنے ہوئے ریسٹ ہاؤسوں کی وضع کا گھر یا پھر جیسے کوئی پہاڑی ڈاک بنگلہ ہو۔ اور اسکول سے آئی ہوئی وہ دونوں بچیاں۔‘‘

چھوٹی اور نسبتاً دبلی لڑکی کا خیال آ کر پھر اسے پھریری سی آئی۔ ستواں ناک اور کھلی کھلی معصوم آنکھیں۔ اور وہ دوسری موٹی کتنی بد تمیز تھی۔ ایلیفنٹ۔ ہی ہی‘ وہ زور سے ہنسا۔ اس کا جاتا ہوا بچپن کبھی کبھی لوٹ آتا تھا۔

باب ۲

اوپر سے اس نے آواز لگائی۔ ’’کچے پکے بیر کھائے۔ اپنا ساتھی مور کھایا۔ اور تجھ کو کھاؤں تو پیٹ بھرے اور تجھ کو کھاؤں تو پیٹ بھرے۔‘‘ ہی ہی ہاہا‘‘

نیچے سے سارے بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے اور وہ کچے پکے بیر جیبوں میں بھرے دھم سے نیچے کود پڑی۔ بیری کے نیچے سرخ اور زرد کھٹ مٹھے بیروں کا بچھونا سا بچھا ہوا تھا۔ بندو‘ شبراتی‘ مدھو اور جمعدار کا لڑکا چنا سب مل کر بیر چن چن کر جیبوں میں بھی بھر رہے تھے اور کھاتے بھی جا رہے تھے۔

بیری سے تھوڑے فاصلے پر پیپل کے کٹے ہوئے پیڑ کے گول کھتے پر ارجمند بیٹھی تھی۔ سنہری بالوں کی موٹی موٹی چوٹیاں اس کے دونوں شانوں کے آگے پڑی تھیں‘ جن میں بڑے بڑے سرخ ربن چمک رہے تھے۔ اس کی سرخ بندکیوں والی فراک بے حد صاف اور اجلی نظر آ رہی تھی۔ اس کی کٹوراسی آنکھیں اس وقت بھی پوری کھلی ہوئی تھیں اور وہ بڑی افسردگی سے گیتی کو شاگرد پیشے کے بچوں کے ساتھ بیر چنتے اور بھکر بھکر کھاتے دیکھ رہی تھی۔

’’کتنی ہڑونگی ہے۔‘‘

اس نے اس کی سبز فراک کے مسلے ہوئے دامن پر جا بجا دھبوں کو دیکھ کر سوچا۔

گیتی کے کٹے ہوئے بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔ مسلے ہوئے سبز ربن کی بوکھل گئی تھی اور اس کے سرے کان سے بھی نیچے لٹک رہے تھے۔ جوتے دور لان پر پڑے تھے۔

’’اگر اماں بیگم اس کو اس حال میں دیکھ لیں تو!‘ یہ سوچتے سوچتے ارجمند اور بھی افسردہ ہو گئی۔

''بی بی یہ' یہ تو بالکل بے ایمانی ہے۔اب ہمارے حصے کے بیر تم نہیں کھا سکتیں۔'' چنا نے صدائے احتجاج بلند کی۔

''کیوں! کیوں نہیں کھا سکتی؟ میں تو ضرور کھاؤں گی۔ یہ سارے بیر میں نے ہی تو جھاڑے ہیں۔'' اس نے اپنی تکونی آنکھیں شرارت سے نچائیں۔

''واہ یہ بیر ہمارے حصے کے ہیں' لاؤ جی! چھوڑو ہمارے بیر۔''

شبراتی نے اس کی فراک کا گھیر پکڑ کر زور سے کھینچا۔

ارجمند کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اس نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور موٹی گدبدی گیتی نے دو دو ہاتھ چنا اور شبراتی کے جڑ دیئے اور پھر مزے سے بیروں میں جٹ گئی۔

اور اسی آن اماں بیگم نے اپنی کھڑکی میں سے جھانک کر آواز دی۔

''ارجمند! گیتی!''

ارجمند نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اس نے دیکھا' اماں بیگم کی خوبصورت غصیلی آنکھیں کھڑکی میں سے انہی کی طرف تاک رہی تھیں۔ پہلی ہی آواز پر ارجمند نفاست سے اپنی فراک کا گھیر سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔ تیز لیکن ہموار قدموں سے اندر کی طرف چلتے چلتے گیتی کو پکارتی گئی۔ ''گیتی! چلو! اماں بیگم آواز دے رہی ہیں۔''

''اوں! تم چلو میں آ رہی ہوں۔'' اس نے پسے ہوئے نمک مرچ اور کھٹ مٹھے بیر کا چٹخارا لیا۔

''کیوں؟ وہ کدھر ہے؟'' اماں بیگم نے دوبارہ ارجمند کو گھورا۔

اور اس کو زبان کھولنا پڑی۔ ''وہ۔۔۔۔۔۔۔۔وہ وہاں ہے۔''

''کچھ پھوٹو بھی منہ سے' کدھر رہ گئی وہ؟''

''وہ وہ' بیر چن رہی ہے۔''

''چن رہی ہے' کہ بھکس رہی ہے۔'' اماں بیگم نے دانت پیسے۔

''جی اماں بیگم بھکس نہیں' کھا رہی ہے۔'' اور یہ کہتے کہتے سسکیوں کو دبانے کی ناکام کوشش میں اس کی چیخیں نکل گئیں۔

''بھکس نہیں' کھا رہی ہے!'' انہوں نے دہرایا۔ ان کی آواز غصیلی تھی مگر اس میں مسکراہٹ بھی تھی۔

''شریف' شریف'' انہوں نے دروازے کی طرف دیکھ کر پکارا۔ ''ذرا بلا کر تو لاؤ' اس چڑیل کو۔''

اور چڑیل نے ہونٹ لٹکا کر اپنی فراک کے ادھڑے ہوئے جھول کو دیکھا جو شبراتی کے کھینچنے سے ادھڑ گیا تھا۔ آہستہ سے باہر کے دروازے سے غسل خانے میں داخل ہوئی اور جلدی جلدی فراک بدل کر ڈریسنگ روم میں آ گئی۔ آئینے میں اپنے بالوں کی تباہی اور الجھے مسلے ربن کو دیکھ کر تو اسے بھی تاسف ہوا۔ بدقت تمام نوچ نوچ کر ربن نکالا اور کنگھو راسی مانگ نکال کر اس نے اپنے چینی وضع کے چپٹے چہرے کو ہر زاویے سے دیکھا اور قطعی مطمئن ہو کر باہر نکل آئی۔ گویا اب وہ اماں بیگم کی پیشی میں جانے کے قابل ہو گئی تھی۔

برآمدے میں شریف نے اس کا بازو پکڑا۔ ''چلو بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔''

''بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔'' اس نے منہ ٹیڑھا کر کے نقل اتاری۔ ''بڑے آئے کارگزار بن کر۔ تم تھوڑی مجھے بلا کر لائے ہو۔ میں آپ ہی آئی ہوں۔''

اور وہ قطعی بے باکی سے اماں بیگم کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی جن کے ہاتھ میں اس وقت شبراتی کا کان تھا۔

''کیوں! اب بناؤ گے بی بی کو پاگل؟''

''اس کا کان چھوڑ دیجئے۔ اماں! اس نے تھوڑی مجھے پاگل بنایا تھا۔''

وہ اس کی طرف مڑ گئیں۔

''آ گئیں شہزادی بیگم! چلو دفع ہو۔ خبردار جو آئندہ سے تم نے کبھی لڑکیوں کو دیوانہ بنایا۔''

گیتی نے شبراتی کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی طرف تاسف سے دیکھا اور براماں کر بولی۔

''اس کو مت ڈانٹئے' اس کو تو میں بلا کر لائی تھی۔''

''خاموش رہو' ہر بات میں دخل در معقولات کرتی ہو۔''

''فضول ہی میں مار رہی ہیں بیچارے کو۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''پھر تم بڑبڑائیں بندیوں کی طرح۔'' تڑ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور اس کا چہرہ سرخ ہونے کے بجائے کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور سوکھی سوکھی آنکھیں لیے کھڑی رہی۔

اور پھر اچانک ہی بولا۔

''ہاں میں تو یوں ہی بڑبڑاؤں گی۔''

''بڑبڑا کر دیکھو' میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔'' دو چانٹے اس کے منہ پر اور پڑے اور ارجمند نے دونوں کے بیچ میں آ کر رونا

شروع کر دیا۔

''بیگم صاحب! آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔'' شریف نے اطلاع دی اور اماں بیگم ڈریسنگ روم میں بال درست کرنے چلی گئیں۔

''ارجمند تم کیوں بیچ میں آ گئی تھیں؟ میں تو آج انہیں یوں ہی جواب دیے جاتی۔ دیکھتی کتنا مار سکتی ہیں یہ''

اس نے انتہائی حقارت سے کہا اور بغیر ایک آنسو بہائے کمرے سے نکل گئی۔

شبراتی نے جو پہلے ہی کمرے سے نکل چکا تھا' دروازے کی اوٹ سے جھانکا۔ اور ارجمند غیرت سے گڑ گئی۔ اس شبراتی نے یعنی خانساماں کے لڑکے نے گیتی کو مار کھاتے دیکھا جو اس کی اپنی بہن تھی اور بالکل چینیوں کی شکل۔

اور گیتی نے بڑے اطمینان سے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا اور چائنا مین کو پھاٹک کے قریب کھڑا دیکھ کر اپنی زبان نکال کر چڑا دی۔ وہ آپ ہی آپ ہنس پڑا۔ ''عجیب ہے یہ موٹی لڑکی بھی!''

باب ۳

اس شہر کا کیا نام تھا اور اس کی کیا اہمیت تھی۔ جس کی بعض کشادہ سڑکیں وہ ناپتا پھرتا تھا؟ اس کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا کوئی بھی نام ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا یہ اور اس نوعیت کا کوئی بھی شہر اس کا اپنا شہر نہیں ہو سکتا۔ اس کی ہر چیز اس کے لیے نامانوس اور اجنبی تھی۔ وہ اتنی بہت سی اجنبی چیزوں میں گھرا ہوا تھا کہ ان کا شمار بھی نہ کر سکتا تھا۔

لیکن اس کو خوب معلوم تھا کہ خدا کی اس طویل و عریض زمین میں بڑے بڑے شہر ہیں۔ یہاں تک کہ کلکتہ' بمبئی اور مدراس بھی موجود ہیں اور ہاں کراچی بھی تو ہے وہاں ہی تو وہ آ کر اترا تھا۔ چینیوں کے محلے میں جا کر اس کو سکون سا معلوم ہوتا تھا۔ چپٹے چہرے' تکونی آنکھیں اور بیٹھی بیٹھی ناکیں۔ پست قد فربہی کی طرف مائل گٹھی گٹھی عورتیں چینی لباس میں خاموش اور متانت سے کھٹ کھٹ چلتی ہوئی اور پھر تنگ تنگ سے فلیٹوں کے باورچی خانوں سے مچھلی' جھینگوں اور لہسن کی روٹی کی خوشبوئیں آتی ہوئی اور وہاں تو سب کچھ تھا۔ بہت بڑا چینی ریستوران جس کے کھانوں کی فہرست میں اتنے نام تھے کہ اس نے چین میں رہ کر بھی نہ سنے تھے۔

''ارے وہاں عام لوگوں کو کب اتنے اچھے کھانے میسر آتے ہیں۔'' وہ ہمیشہ قناعت سے سوچا کرتا تھا یہ تو بھئی اس طویل و عریض ملک کے لوگوں کا ہی حصہ ہیں۔ پھر بھی ان میں سے زیادہ تر کے چہروں پر بارہ ہی بجے رہتے ہیں۔'' وہ جل کر حقارت سے منہ بناتا۔

خیر جو کچھ بھی ہو' کراچی اچھا خاصا شہر تھا۔ مگر اس کم بخت سانگ نے اس کو وہاں رہنے ہی کب دیا۔ چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ

وہ اس کو وہاں سے لے اڑا۔ ہاں ٹھیک ہے کہ وہ اسے ملازم ہی رکھ کر لایا تھا۔ پر وہ اس کو کسی بہت بڑے شہر میں کیوں نہ لے گیا۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں۔ جہاں چینیوں کے محلے ہوتے ہیں اور آدمی کو اتنی زیادہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر خیر سانگ کو تو یہی مختصر سا شہر پسند آیا تھا۔ جہاں سرے سے کوئی دوسرا چینی موجود ہی نہ تھا۔

وہ رات کو اس کی جوتے بنانے والی مشین پر کام کرتا تھا۔ ہفتے میں چار روز جوتے کی دکان پر سیلز مین کا کام کرتا اور دو دن سائیکل پر چینی دستکاری کے بے مثال نمونے لے کر سول لائن کے علاوہ مقامی رئیسوں کی کوٹھیوں کے چکر کاٹا کرتا۔

''چائنا مین' چائنا مین'' وہ بڑی مسخری سی موٹی اور مہین آوازیں نکالتا ہوا بنگلوں اور کوٹھیوں کے احاطوں میں اپنی سائیکل لے کر گھس جاتا۔ گھٹنوں برآمدوں کی سیڑھیوں اور پورچ کے دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑا پتلون کے پائچے لپیٹ لپیٹ کر ان پر سفید سلو لائڈ کا کلپ جمایا کرتا اور اندر سے بیگموں کو جھانکتے دیکھ کر سنبھل کر مودب لہجے میں دہراتا۔ ''چائنا مین''

ذرا سے اشارے پر وہ اپنا بھاری بھر کم گٹھڑ دھم سے برآمدے کے چمکتے ہوئے فرش پر پٹخ دیتا اور خود اس کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا۔ اور جب نفاست کے ساتھ ناک بھوؤں چڑھاتی ہوئی بیگمیں برآمدے میں پڑے ہوئے مونڈھوں پر آکر بیٹھ جاتیں تو وہ اپنا گٹھڑ کھول کر چینی دستکاری کے بیش بہا نمونے ان کے قدموں میں بکھیر دیتا۔ پلنگ پوش' سلک کے نائٹ سوٹ اور ڈریسنگ گاؤن' میز پوش' ٹی کوزیاں' سامان کیا ہوتا' فائن آرٹ کی نمائش ہوتی۔

دل ہی دل میں اس صنعت اور دستکاری کی قائل ہوتے ہوئے بھی وہ اس سے کہتیں۔ ''ہٹاؤ کیا دکھا رہے ہو۔ بےکار ہے یہ پلنگ پوش تو۔۔۔۔۔۔۔ اونہہ! اس سٹ میں کیا رکھا ہے۔ جو اس کے دس روپے مانگ رہے ہو؟''

وہ اس سے دام کم کرنے کہتیں اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ترچھی آنکھیں جھپکا جھپکا کر پیسے پیسے کے لیے جھگڑتا' وہ جھگڑتا تو سہی لیکن اس کی آنکھیں اور لب مسکراتے رہتے۔ وہ بڑی خوش مزاجی سے ان کی ہر بات کے جواب دیئے جاتا۔

''لو بھلا اس ٹی کوزی کے تین روپے! میں ہرگز نہ دوں گی۔ ایسی کیا بات ہے اس میں؟''

''مت دو' ایک بھی مت دو۔'' وہ آنکھیں سکیڑ لیتا۔ ''مگر اس میں بوت بوت بکت۔ ہمارا عورت لوگ کو بوت آں آں اس سے بناتا ہے۔'' محنت کا لفظ اس کو یاد نہ آتا اور وہ مسخروں کی طرح ہاتھ ہلاتا۔

''کیا محنت لگتا ہے؟ کچھ نہیں' ذرا دیر کا کام ہے۔''

''ہاں بیگم صاحب! دو سلے کا کام ذرا دیر کا معلوم ہوتا۔'' وہ ان کو دھمکانے کے خیال سے چیزیں لپیٹ لپیٹ کر اور باندھ باندھ

کر رکھنا شروع کر دیتا۔ اور جب ان کو متوجہ نہ دیکھتا تو ایک دم ایک آدھ روپیہ کم کر کے پوچھتا۔ ''اتنے کو لیگا؟'' جھک جھک کرتو خوب ہوتی مگر کوٹھیوں میں مال بکتا ضرور۔

اور جب وہ اپنا گٹھڑ دوبارہ سائیکل پر لادتا تو یہ سوچ کر اس کا دل کڑھ کر رہ جاتا کہ یہ بیگم لوگ اس کی چیزوں کو معمولی اور نکما بتاتی ہیں۔ ان کو کیا معلوم یہ چیزیں اس کے نزدیک کتنی پیاری اور بے بہا ہیں۔ یہ اس کے ملک کی فاقہ کش عورت کی دستکاری ہیں۔ جن کو سخت محنت اور دیدہ ریزی کے بعد بھی شکم سیری نصیب نہیں ہوتی۔ کپڑے اور ریشم سے بنائے ہوئے ان شگوفوں' پلوں' دریاؤں' کشتیوں اور معبدوں سے اس کو کتنا جذباتی لگاؤ ہے وہ کیا جانیں۔ وہ جب ان سب چیزوں کو بکھیر کر ان کے درمیان بیٹھتا تو اس کو محسوس ہوتا کہ قدیم اور مہذب چین کا سارا ماحول' کلچر اور تاریخ اس کے اردگرد بکھری ہوئی ہے اور خود وہ ان سب کے درمیان مقدس بدھ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بھی ایک بہت سرد دن کا ہی واقعہ ہے۔ اس دن صبح ہی سے سانگ اس پر ناراض تھا۔ وہ دکان کے عقبی حصے میں بیٹھا ہوا چمڑا کاٹنے والی مشین پر کام کر رہا تھا۔ اور سانگ کے فضیحتے بھی خاموشی سے سن رہا تھا۔ ان دو ہفتوں میں اس نے جو عرف عام میں صفدر یاسین کے نام سے مشہور تھا پھیری کے سلسلے میں سانگ کو ایک پیسہ بھی لا کر نہ دیا تھا۔ پھر سانگ کو غصہ کیوں نہ آتا۔

''اس حرام خوری کے کیا معنی؟'' وہ ایک چھوٹی اور نیچی سی چوکی پر گوتم بدھ کے اسٹائل میں آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اس کا پست قد' فربہ جسم' ساٹن کے سیاہ چغے میں چھپا ہوا تھا' جس کے داہنی طرف ایک قدیم داستان عشق کڑھی ہوئی تھی۔ اور اس منظر میں بید مجنوں کے نیچے ننگ تائی اپنے ہم مکتب ''شان پو'' سے رخصت ہوتی دکھائی گئی تھی۔

سانگ کا موٹا اور سرخی مائل تھلتھلا جسم ہل رہا تھا۔ اس کا پیٹ لٹکتے ہوئے سینے کے گوشت کے درمیان ایک مدور ٹیلے کی طرح نمایاں اور ابھرا ہوا تھا۔ سیدھی اور سیاہ مونچھیں کیکڑے کے ڈنکوں کی طرح تھوڑی کے دونوں طرف بے بسی سے لٹک رہی تھیں۔

سانگ کی ساری بک جھک کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ نرا نکما اور کام چور ہے۔ بنگلوں پر جانے سے گھبراتا ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے جو اس کا سامان نہ خریدا جائے۔ ''فضول باتوں سے فرصت نہیں۔'' سانگ کا دراصل سارا رونا اسی بات کا تھا کہ ذرا آنکھ بچی اور خالی وقت میں صفدر کا برش چلنے لگا۔ سلک کے ٹکڑوں' سفید بانس کی پتلی پتلی چلمنوں پر اور کچھ نہیں تو چاول کے رنگ برنگ آٹے کو گوندھ گوندھ کر اس کی چیزیں بنانے بگاڑنے میں صفدر کا سارا وقت ضائع ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ مشغلے رات گئے سے پہلے کبھی بھی شروع نہ ہو سکتے تھے۔

''اس ماہ کے بعد تمہارا حساب کردوں گا۔ پھر تم جانو اور تمہارا کام۔'' وہ تقریباً ہر ماہ کے وسط میں یہی دھمکی دیتا۔ حالانکہ حساب کتاب کرنے کا خیال دور دور نہ ہوتا۔ صفدر جیسا لاوارث اور محنتی لڑکا اور اس پر بے عذری اور گھنا پن۔ کچھ کہہ لو مجال ہے جو منہ سے جواب نکل جائے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ذرا دیر میں سانگ کے بہی کھاتوں کا حساب ٹھیک کر دیا کرتا تھا۔ جس میں سانگ تقریباً کورا تھا۔ اور وہ یہ سارے کام ایک معمولی سے مشاہرے کے عوض خوشی خوشی یوں کر دیتا تھا کہ سانگ نے اس کے کھانے پینے کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ ہر دوپہر کو سانگ کی خاموش طبع بے اولاد بیوی نیچی سی چوکی نما میز پر پیالہ بھرے ہوئے چاول' جھینگوں کا شوربہ' مچھلی یا بانس کے کلوں کا شوربہ اس کے سامنے رکھ دیا کرتی تھی اور جب وہ چکنی اور سفید تیلیوں سے اڑا اڑا کر چاول کے لقمے منہ میں بھرتا تو وہ قریب بیٹھی بڑی توجہ سے اس کو کھاتے دیکھا کرتی اور سانگ کی نظر بچا کر پیالہ خالی ہونے سے پہلے ہی دوبارہ چاولوں سے بھر دیا کرتی۔

وہ اس کے قریب بیٹھی ہوتی تو اس کو ایسا لگتا جیسے وہ اس کی ماں ہو اور اس کو کھاتے دیکھ کر خوش ہونا چاہ رہی ہو۔ بس یہی ایک چیز تھی جس کے سہارے وہ سانگ کی بری بھلی باتیں بھول کر بچوں کی طرح بیٹھا خوشی خوشی کھانا کھاتا رہتا۔

سانگ کی بیوی دوسری چینی عورت کی نسبت قدرے دراز قد تھی۔ اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس کی زردی مائل جلد میں سے جابجا سرمئی رنگت جھانک رہی تھی۔ بادامی آنکھوں کے گرد حلقے گہرے سرمئی تھے اور دائیں رخسار کی ہڈی کے نیچے والے حصے میں سے دو بال نیچے کو لٹک آئے تھے۔ بالوں میں سفیدی کی بجلیاں سی کوندرہی تھیں۔ اس کا چہرہ خاموش اور افسردہ سا تھا لیکن اس کی چال تھی کہ غضب جیسے کوئی پانی پر بہتا چلا آرہا ہو' جیسے ہر قدم پر رقص کی چھما چھم سنائی دے رہی ہو جیسے پائل سے بج رہے ہوں۔

''یہ سانگ کی بیوی تھوڑی ہے۔ یہ تو اس کی داشتہ ہے۔'' ایک نامعلوم رشتے کے اعتبار سے سانگ کا بھتیجا لیا نگ چپکے چپکے اس کو بتایا کرتا۔ ''یہ تو انے وقت کی نامی رقاصہ تھی۔ بجلی تھی بجلی۔ اور سانگ کی اپنی بیوی اور متعدد داشتائیں تو اس کے وطن میں موجود ہیں۔ ایک بڑی سی چار چار صحنوں والی حویلی میں جس کے پائیں باغ میں شیر' وہاں فوارے پانی اگلا کرتے ہیں اور چوبی ستونوں میں بڑی نفاست اور باریکی سے لپٹے ہوئے اژدھے پھنکاریں مارتے محسوس ہوتے ہیں' وہ داشتائیں اور بے حد موٹی سارا دن اوٹ پٹانگ قسم کی مصروفیتوں میں لگی رہتی ہیں۔''

لیا نگ کے نزدیک اس سے زیادہ اہم کوئی اطلاع نہ تھی اور صفدر کے نزدیک یہ سب سے غیر اہم بات تھی۔

آج بھی جب سانگ' صفدر پر بک رہا تھا تو لیا نگ بظاہر تو جوتے سینے والی مشین پر کام کرتا رہا لیکن دراصل وہ منتظر تھا کہ سانگ

اٹھ کر پیچھے فلیٹ میں جائے تو وہ داشاؤں والی بات چھیڑے۔ مگر صفدر نے اس کا موقع نہ دیا۔ وہ مشین چھوڑ کر اٹھا۔ اسٹور میں سے اپنا گھٹڑ اٹھایا اور سائیکل پر جما دیا۔ گرم چاکلیٹ رنگ کی پتلون کا پائنچا موڑا اور اس کی کلپ لگا دیا۔ پھر سائیکل کو زور سے دھکیلا اور وہ تارکول کی نسبتاً خاموش سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ یہ سڑک آج خاموش تھی اس لیے کہ آج اتوار تھی اور دن سرد۔ صفدر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی' اس لیے کہ وہ آج غیر مطمئن تھا اور غمگین بھی۔

باب ۴

اور جب وہ اداس اور غمزدہ اس پہاڑی ڈاک بنگلے جیسے مکان کے پھاٹک کی طرف دیکھے بغیر ہی آگے بڑھ گیا تو باغ کی نیچی سی دیوار پر سے منہ نکال کر مالی نے اس کو آواز دی۔ ''اے چینا' ادھر آئے گا؟''

چینا رکا اور سائیکل پر چڑھے چڑھے ہی دیوار کے قریب آکر بولا۔ ''کیا آئے' اتی دفعہ تو آکر گیا ہے۔ بیرا الو کا بچہ بولتا ہے چینا شور مت کرو' بیگم لوگ سوتا ہے۔ ہم پوچھتا تمارا بیگم لوگ سارے ٹیم سوتا ہے۔''

مالی ہنسا اور اس کے سر پر گرہ دی ہوئی چوٹی بھی ہنسی۔

''اس ٹیم تو جاگ رہا ہے' چینا اندر چلے جاؤ۔ وہ ہم کو کئی بار بول چکی ہیں کہ ذرا چینا کا دھیان رکھنا۔''

پھر وہ رازداری میں گردن بڑھا کر بولا۔ ''بٹیا کی ساری ہونے کو ہے نا' اس کارن روج تمہاری راہ دیکھتی ہیں۔''

''ساری ہونے کو ہے تو ہمارا راستہ کیوں دیکھتا ہے۔ ہم کیا دولہا ہے۔'' صفدر نے معصومیت سے آنکھیں جھپکائیں۔

''چل دور ہو مسکھرا نہیں تو۔ جا تو اندر کھوب بکری ہوگی۔ بٹیا بڑے گھر جائے رہی ہے۔ کھوب جہیز لے کر جائے گی۔''

وہ سائیکل سے کود پڑا اور گھٹڑ کے بھاری بوجھ سے دبی ہوئی سائیکل کو گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اور غسل خانے کی کھڑکی کے قریب جا کر پورے زور سے آواز لگائی۔ ''چائنا مین' چائنا مین'' ہر طرف حسب معمول سناٹا تھا۔ تیسری آواز کے ساتھ ساتھ وہ مایوسی سے مڑا کہ غسل خانے کی کھڑکی کھلی ایک رانیوں کا سا وقار اور معمر چہرہ جھانکا اور انتہائی نرم لیکن بارعب انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

''اے! تم چل کر برآمدے میں بیٹھو' ہم ابھی آتے ہیں۔''

اجازت ملتے ہی اس نے تیزی سے برآمدے کا رخ کیا اور دھم سے گھٹڑ پٹخ کر اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے سے سرخ اور سیاہ گوٹ والا لہنگا اور پھنسی پھنسی آستینوں کی چولی پہنے اور نیلی چنری اوڑھے مالن چھم چھم کرتی گزر رہی تھی۔ صفدر کا دل مچل کر رہ گیا۔

کاش اس کے سامنے بانس کی سفید اور نازک تیلیوں والی چٹائی اور ہاتھ میں برش ہوتا تو وہ اس ادھیڑ عمر کی اس محنت کش عورت کے وجود کی ساری تڑپ اور طنطنے کو چرا لیتا اور بانس کی تیلیوں میں مقید کر لیتا۔ پر اس کے مقدر میں تو ان مغرور اور بد دماغ بیگموں سے سر مارنا لکھا تھا۔

گیلری کا دروازہ کھلا۔ تمتمایا ہوا چپٹا چہرہ جھانکا' بادامی وضع کی ترچھی آنکھیں جن میں بخار کی چمک صاف نمایاں تھیں۔ چمکیں اور آواز آئی۔

''چن چن چا ئنا مین''

''منی بے بی' اور آؤ۔''

چپٹی مگر دل کش لڑکی دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔

لیکن وہ جان بوجھ کر بے نیاز بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ دبے دبے قدموں سے اس کے قریب آ گئی۔ ''ہاؤ'' ایک دم منہ بڑھا کر صفدر نے اسے ڈرا دیا۔

''بدتمیز'' وہ ایک دم تمکنت سے بولی۔ ''لاؤ اپنا سامان دکھاؤ۔''

''بھاگ جاؤ موٹی ایلیفنٹ' تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ برامان کر مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اور وہ یوں بھی بہت دلچسپ نظر آ رہی تھی جیسے اپنے ہی گھر کی کوئی بچی ہو۔

''اپنا نام بتاؤ؟''

گیتی نے اپنا منہ پھیر لیا۔

''گسہ ہو گیا' چالو ہم معافی مانگتا۔ بولو تم کیا سامان مانگتا؟''

ایک ناخواندہ تبسم اس کی آنکھوں میں اور لبوں پر تھرکنے لگا۔ مگر وہ بڑی متانت سے ضبط کی پوری کوشش میں لگی رہی۔

''ہمارا بے بی تئیں' اب اپنا نام بولو۔ پھر ہم تم کو چاکلیٹ دے گا۔''

''میرے پاس خود چاکلیٹ ہے۔'' وہ اترائی۔

''پھر نام بولو۔''

''ہمارا نام گیتی آرا بیگم ہے۔''

اجنبی دیس کا نو عمر لڑکا بلا ارادہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

بدتمیز گدھا پاجی نہیں تو۔

گیلری میں ایک بار پھر سرسراہٹ ہوئی اور چکن کی ساری اور سفید وائل کے بلاؤ میں خوبصورت اور غصیلی آنکھوں والی بیگم نمودار ہوئیں۔اور گیتی سے مخاطب ہوئیں۔

''تم پھر نکل آئیں' چلو جا کر لیٹو۔'' ان کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار تھے۔

چائنا مین بلاوجہ ہی دبک گیا اور دبے ہوئے لہجے میں بولا۔''سلام بیگم صاحب!'' اور اپنا گٹھڑ کھولنے لگا۔

وہ پھر مڑیں۔''سنا نہیں تم نے چلو اندر اور چچی جان سے کہو کہ یہاں آکر سامان دیکھ لیں۔''

''میں بھی سامان دیکھوں گی۔'' اس نے گھنے اور سرکش لہجے میں جواب دیا۔

''ہرگز نہیں۔تم ایک منٹ میں یہاں نہیں ٹھیرو گی' کیا بخار میں بھی مار کھانے کا ارادہ ہے؟ بس میں نے کہہ دیا چلی جاؤ اندر۔''

''چلی جاؤ اندر'' موٹی اور گستاخ لڑکی نے نفرت اور سرکشی سے ماں کی بات دہرائی۔اور سر جھکائے اندر چلی گئی۔

سلک کے نیلے چار خانے کے شب خوابی کے لباس میں وہ اور بھی چینی نظر آ رہی تھی۔صفدر کو گھر کی یاد پھر ستانے لگی اور اس کا دل بلا وجہ ہی غمگین ہونے لگا۔

بیگم مونڈھے پر بیٹھی ادھر ادھر سے چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں' چہرے پر کسی قسم کا تحسین آمیز تاثر نہ تھا۔اگر ان کے سامنے سبزی ترکاری یا گیہوں کا ڈھیر بھی ہوتا تو وہ اس کو یوں ہی الٹ پلٹ کر دیکھتیں اور بھویں چڑھائے رہتیں۔

''اہل نظر تو سبزی ترکاری کے حسن پر بھی لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔'' یہ فقرہ صفدر نے خالص چینی زبان میں سوچا تھا۔

کھس کھس کی آواز نے اس کو پھر دروازے کی طرف متوجہ کر دیا۔ابھرے جسم' تیکھے نقش و نگار اور افسردہ شخصیت والی چچی جان نمودار ہوئیں اور اپنی جٹھانی سے دو قدم پیچھے اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ان کا رنگ سانولا اور آنکھیں خاموش تھیں۔لباس کی سفیدی میں بڑی مجبوری سی بے بسی تھی۔بیگم ہر چیز کے متعلق ان سے رائے طلب کر رہی تھیں اور ان کی کوئی انفرادی رائے نہ تھی۔صفدر کا چلتا ہوا دماغ منٹوں میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

پورچ میں ایک بڑے مہذب اور دبے ہوئے ہارن کی آواز آئی۔موٹر کا دروازہ کھلا اور احتیاط سے بند کر دیا گیا۔سرخ کنارے کی سفید ساری اور نرم کھادی کے بلاؤز میں ایک لڑکی اتری اور برآمدے کی طرف مڑی۔اس کے ہاتھ میں دواتیں' کاپیاں تھیں۔

بلاؤز کے گلے میں سے قلم کی سنہری پن جھانک رہی تھی۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح روشن اور پرسکون تھا۔ سنہرے اور روکھے بالوں کی موٹی اور گھنی سی چوٹی کمر سے کچھ اوپر آ کر رک گئی تھی۔

''اے لو! صولت خود بھی آ گئیں۔ ہاں بس تمہارا ہی انتظار تھا۔'' بیوہ چچی افسردہ سی شوخی سے مسکرائیں۔

صولت کی لمبی اور سیاہ پلکیں جھکیں تو وہ اور بھی دلچسپ نظر آنے لگی۔

''اچھا تو اس بی بی کا سادی بنائے گا۔ بیگم صاحب!''

''اے لو اس مردے کو یہ بھی خبر ہے۔'' چچی نے دلچسپی سے اس ذہین لڑکے کی طرف دیکھا جو عام چینیوں سے خاصا مختلف تھا۔ اس کی رنگت میں مینڈک کے پیٹ کا سا پیلا پن نمایاں نہ تھا۔ ناک کا بانسا بھی خاصا اونچا تھا اور بالوں میں بڑی خفیف اور نامعلوم سی لہریں تھیں۔

بیگم نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ''آج تم نے بڑی دیر کر دی۔''

''جی ذرا میں نے اس کو اتارا تھا۔''

''کس کو؟'' نگاہوں میں قہر تھا۔

''ثریا کو۔''

''مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔ ثریا ایسی کہاں کی موٹروں میں بیٹھنے والی ہو گئیں۔ کیوں؟ ان کی سائیکل کہاں گئی؟ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ گھنٹہ گھنٹہ بھر گاڑی تمہاری پیشی میں رہے۔ لو ذرا یہ نائٹ سوٹ تو پہن کر دیکھو' تمہارے ٹھیک آتا ہے؟''

لڑکی نے حیرت اور ناگواری سے ماں کو دیکھا۔

''میں کہتی ہوں' تمہاری عقل کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ میرا منہ کیا تک رہی ہو؟ ڈریسنگ روم میں جا کر پہن آؤ۔''

تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ نکلی۔ لٹھے کا سفید ڈھیلا پاجامہ' چکن کا کرتہ اور چنا ہوا پیازی دوپٹا۔ ہاتھ میں نائٹ سوٹ لیے وہ اپنی چچی کے قریب بیزار اور شرمائی سی آ کر کھڑی ہو گئی۔

''ٹھیک ہے'' اور نائٹ سوٹ اس نے بکھرے ہوئے کپڑوں پر ڈال دیا۔

''خاک ٹھیک ہے۔ اے ذرا دیکھنے تو دیا ہوتا۔ تم کو کوئی اندازہ ہے کسی بات کا۔''

''ارے اماں! ٹھیک ہے' میں یہاں کہاں پہن کر آتی۔''

انہوں نے انتہائی غصے سے بادامی سلک کا نائٹ سوٹ پھر سے اٹھایا اور بولیں۔ ''چلو میرے ساتھ پہن کر دکھاؤ۔''

گیلری میں جاتے جاتے انہوں نے اس کو کچوکا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ہر چیز سے بیزار ہوئی جاتی ہو' کوئی چیز بھاتی ہی نہیں۔''

صفدر کے کان تیز تھے اور وہ بہت چالاک تھا۔ وہ بیچی سے رازداری میں بولا۔ ''تمہارا لڑکی کا سادی کدھر ہوگا؟''

''افسر ہے بہت بڑا' فوج میں ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے۔''

''اونہہ! کتنا بڑا؟ ہاتھی کے برابر؟ افسر ہے تو اس کا رینک بتاؤ۔''

''اب تم کو کیا بتائیں' اجبک ہو تم تو۔''

''ہم کو سب پتہ ہوتا ہے' ہم آسمان کا رہنے والا تھوڑا ہے۔'' وہ خوب سمجھ گیا تھا ان دوسری بیگم کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''وہ لیفٹیننٹ کرنل ہے اور اس کی بہت سی زمینیں ہیں۔''

''تو یہ کہو کہ بڈھا آدمی کے ساتھ سادی بنائے گا؟''

کیوں' بڈھا کاہے کو ہوتا۔ یہ پلنگ پوش کتنے میں دوگے؟'' انہوں نے بات ٹالی۔

''تو اور کیا کوئی بچہ لیفٹیننٹ ہو جاتا ہے۔''

''اے دیکھو' تو کتنا دلیلیا ہے یہ' تم خاک بیچتے ہوگے ہم تم سے پلنگ پوش کی قیمت پوچھ رہے ہیں اور تم انٹ سنٹ باتیں کر رہے ہو۔''

''یہ بڈ کور اور ساتھ میں پلوکیس تو کتنی فول لو پی کا ہے لے گا؟'' اس نے بدلحاظی سے پلنگ پوس ان کی طرف اچھالا ہی تھا کہ بڑی بیگم ہاتھ میں سلک کا وہی نائٹ سوٹ اٹھائے واپس آ گئیں۔

''اس کی فٹنگ ہمیں پسند نہیں۔ تم ہم کو دوسرا اس ناپ کا نہیں دے سکتے؟'' انہوں نے کاغذ پر لکھا ہوا ایک سائز دیا اور مونڈھا سنبھال لیا۔

''صولت آہستہ آہستہ سے برآمدے میں آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور بھیگی بھیگی تھیں۔ روکھے روکھے بال' روشن پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھر رہے تھے۔

وہ آئی اور دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں نے بے تعلق اور بے زار چہرے کی طرف دیکھ کر تنبیہاً گھورا اور وہ سنبھل گئی۔
اس دن صفدر یاسین نے بہت سی چیزیں بیچیں اور بہت سی چیزوں کا آرڈر لیا۔ اپنا گٹھڑ باندھا اور سائیکل پر لاد کر سیٹی بجاتا ہوا نکل گیا۔ گیٹ کے قریب بڑی بڑی معصوم آنکھوں اور موٹی موٹی بھوری چوٹیوں والی لڑکی کھڑی ہوئی چپکے چپکے کھٹی نارنگیاں کھا رہی تھی۔ چائنامین کو آتے دیکھ کر اس نے نارنگیاں چھپالیں اور معصومیت سے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے نوٹس ہی نہ لیا اور آسمان کی طرف تاکتا آگے چلا گیا۔

باب ۵

باغ میں ہر طرف سناٹا تھا۔ مالی بھی اپنی کوٹھڑی میں جا چکا تھا۔ گیتی نے ادھر ادھر دیکھا اور اچھل کر دیوار کا گھوڑا بنا کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ کی ایک لمبی سی بار تھی اور وہ اس کو مزے لے لے کر چوس رہی تھی۔ اس کی موٹی ٹانگیں دیوار کے ادھر ادھر جھول رہی تھیں۔ بادام کی سی سیاہ آنکھوں میں ماحول سے بیگانگی اور چہرے پر بڑی آسودگی تھی۔
دور ہی سے چائنامین کو آتا دیکھ کر اس نے اس کی نقل اتاری۔ ''چائنامین' چائنامین''
وہ اس کے قریب آ گیا۔
''او بے بی کیا کرتا؟''
''تمہارا سر کرتا۔''
''تم بلا نوتی ہے۔''
''چائنامین! تم توتلے کیوں ہو؟''
''توتلے کیا ہوتی ہے؟''
وہ زور سے ہنسی اور انگریزی میں بولی۔ ''تمہارے منہ سے بات نہیں نکلتی۔ ایسے کہو بڑا نائی؟''
وہ بھی ہنس پڑا۔
''اندر نہیں جاؤ گے؟''
''جاؤں گا کیوں نہیں۔ آج تمہاری بہن کے واسطے ایک بہت خوبصورت کمونولا یا ہوں۔''

''تو پھر جاؤ نا۔''

''کہیں تمہارا ممی سوتا نہ ہو'وہ مجھے مارے گا۔''

''کیا تم کو بھی ممی سے ڈر لگتا ہے؟'' وہ انگریزی میں بات کرنے لگی۔

''ہاں' بہت'' وہ بھی انگریزی بولنے لگا۔

''تمہاری ممی بھی مارتی ہے تم کو؟''

''ارے نہیں کوکو! میری ممی بہت پیاری ہے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔''

''اچھا' کہاں ہے تمہاری ممی؟ مجھے دکھاؤ لا کر۔''

''میری ممی بہت دور رہتی ہے' چین میں۔ تم میرے ساتھ چلو تو اپنی ممی دکھاؤں۔''

''کون جائے۔ توبہ! تمہاری ممی اتنی دور رہتی ہیں۔ عجیب ہیں بھئی!'' وہ اس پر رشک کر رہی تھی۔

''کتنا خوش قسمت ہے یہ کہ اس کی ممی اتنی دور رہتی ہے اور سارے وقت اس کو ٹوکنے اور سزا دینے کو اس کے سر پر سوار نہیں رہتی۔'' اس نے سوچا۔'' پھر تو تم خوب کھٹی چیزیں کھاتے ہو گے اور دوپہر کو سوتے بھی نہیں ہو گے؟ وہ تم کو یاد تو نہیں آتی ہوں گی؟''

''بہت یاد آتی ہیں۔ میں ان سے دو سال سے نہیں ملا۔ تم خوش قسمت ہو کہ اپنی ممی کے پاس رہتی ہو۔''

''اچھا'' اس نے بے پروائی سے ٹال دیا۔

''مونگ پھلی کھاؤ گے؟''

''لاؤ' کوکو''

''مجھے کوکو کیوں کہہ رہے ہو؟ میرا نام گیتی ہے۔''

''تمہارا نام کوکو ہے۔'' اس نے اس کے چینیوں سے ملتے ہوئے چہرے کے قریب منہ لا کر کہا۔

اور جب وہ اپنی جیبیں ٹٹول کر مونگ پھلی نکال رہی تھی تو وہ بولا۔'' تمہاری بہن کی شادی کب ہو رہی ہے؟''

''پتہ نہیں' اونہہ! ہو جائے گی کبھی۔ تھوڑے دن میں۔''

''کوکو! تم کو اپنی بہن یاد آئے گی۔''

''بالکل نہیں' وہ مجھے بہت ڈانٹتی ہیں۔ ہر وقت یہ کرو یہ نہ کرو کرتی رہتی ہیں بالکل لاٹ صاحب ہیں۔ خدا کرے چلی جائیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''پتہ ہے' میں نے تمہارے بہنوئی کو دیکھا ہے۔ کیوں کوکو! تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

''ہٹ پاگل'' وہ اردو میں بگڑی۔

''سچ! وہ بالکل تمہاری طرح ہے۔ ایسا ہی موٹا اور بالکل تمہاری شکل کا۔''

''تمہاری شکل کا ہے' بلکہ تم سے بھی بدتر۔ چچی جان مجھ سے کہہ رہی تھیں' بالکل چینی لگتا ہے۔''

''تم بھی تو چینی لگتی ہو۔''

''اچھا بتاؤ' تم نے اس کو کب دیکھا؟''

''میں تمہاری بہن کے لیے کمونو لایا تھا اور جب وہ اس کو پہن رہی تھی تو وہ بھی آ گیا۔ یونیفارم میں بالکل چیانگ کائی شک لگ رہا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر اس کو پہننے میں مدد دینے لگا۔ کوکو تمہاری بہن اس کو بالکل پسند نہیں کرتی۔''

''تم کو کیسے معلوم ہو گیا؟''

''جب وہ اس کے کیمونو کی سیش (پٹکا) باندھ رہا تھا تو وہ برا سامنہ بنائے تیوریاں پر بل ڈالے کھڑی تھی۔ اور اس کے اندر چلے جانے کے بعد بھی وہ پیٹھ موڑے کھڑی رہی۔ میں اس کے سامنے گیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے پاس جا کر پوچھا' کیوں مس! کیمونو ٹھیک ہے؟'' تو وہ آہستہ سے بولی۔ ''نہیں'' پھر میں نے پوچھا۔ ''یہ ہی تمہارا منگیتر ہے؟'' اس نے جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کھڑی اپنی انگلی میں انگوٹھی گھماتی رہی۔ پتہ ہے میں نے اس سے کیا کہا؟''

''کیا کہا؟'' گیتی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے اس سے کہا۔ ''تم اس چیانگ کائی شک سے کاہے کو شادی کر رہی ہو؟ میری مانو تو تم اپنی اس چینیوں جیسی بہن کی شادی اس سے کروا دو۔''

''بدتمیز'' گیتی نے گھونسا دکھایا۔ ''مت آیا کرو ہمارے یہاں''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے پیڈل پر پیر چلایا۔

''بات تو سنو۔''

''ہاں کیا ہے؟'' وہ مڑا۔

''پھر صولت آپا نے کیا جواب دیا؟''

''جواب کیا دیتی۔ کموتو کو کرسی پر ڈال دیا اور جاتے ہوئے بولی۔'' یہ بہت بڑا ہے۔ اس سے چھوٹا چاہیے۔ میں تم کو سائز لکھ کر لا دیتی ہوں اور جب وہ اندر سے آئی تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ کوکو تمہاری بہن بہت خوبصورت ہے اور بہت مغرور۔ لیکن بھئی مجھے تو ایسی شکلیں دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔'' تم سے کس نے کہا ہے خوش ہونے کو؟'' وہ چڑ گئی۔'' کم بخت مارا ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے۔'' وہ اردو میں بڑبڑائی۔

''اچھا بھئی کوکو! اب تم شاید مجھے گالیاں دے رہی ہو۔ میں تو چلا۔ تمہاری بہن کا کموتو دے آؤں۔'' اس نے انگریزی میں کہا۔

''میرا نام کوکو نہیں ہے۔ گیتی کہو۔''

''یہ نام میرے منہ سے نہیں نکلے گا۔''

اور جب وہ کموتو دے کر اندر سے واپس آیا تو دیوار خالی تھی۔ وہ موٹی اور دلچسپ بچی دیوار پر سے کود کر نہ جانے کدھر چل دی تھی جس سے باتیں کر کے اس کو بڑا لطف آتا تھا۔

باب ۶

''مجھے اپنے نوشتہ تقدیر کو
بہر نوع برداشت کرنا چاہیے
بغض و عناد سے شکستہ دل بیمار کی ساری رنجوریاں
بالآخر سکون پذیر ہو ہی جاتی ہیں
موت' کلفتیں اور ان کا مداوا
بھی اپنے اپنے وقت ہی سے آتے ہیں''

خوبصورت اور نفیس مزاج صولت جہانگیر نے اس معمولی سے سفید کاغذ کو اٹھا کر ایک بار پھر غور سے دیکھا' جس پر سرخ پنسل سے خوبصورت چینی حروف میں یہ نظم لکھی ہوئی تھی اور پھر بیچ میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر شکستہ انگریزی تحریر میں اس کا ترجمہ تھا۔ یہ نظم کا آخری بند تھا۔ اس نے کاغذ کو میز پر ڈالا اور پھر اٹھا لیا۔ اور پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

میں شہنشاہوں کی اولاد کو ''لی'' (حسن عمل اور بلند کرداری) کے اصول کس طرح سکھاؤں۔

اور میں چن ذی (محبوں) کی صفات کس طرح ان کے ذہن نشین کر سکتا ہوں۔

یہ صرف چنگ (دوسروں کے جذبات کا لحاظ) کی کرامت ہے جو میں نے اپنی زبان بند رکھی ہے۔"

ہاں یہ صرف چنگ کی کرامت ہے جو میں نے اپنی زبان بند رکھی ہے۔ صولت جہانگیر نے اپنی رائٹنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی خاموش چہرے والی تصویر کو دیکھا جس کو فقط اس چہرے کی مسکینی اور راضی برضا انداز نے خوبصورت بنا رکھا تھا۔

"کیوں ہے نا یہی بات؟" اس نے بغور اس چہرے کو دیکھا جو بالکل خاموش اور بے تعلق نظر آ رہا تھا۔ اور وہ روٹھ کر وہاں سے ہٹ آئی۔

چاروں طرف اندھیرا تھا اور بے تعلقی۔ اس خوبصورت دریچوں اور کافوری دیواروں والے روشن کمرے میں بھی جس کے دروازوں پر سمندر کے پانیوں کی سی سبزی لیے ہوئے نیلگوں پردے سرسرا رہے تھے اور جس میں سادہ اور نفیس فرنیچر انتہائی خوش مذاقی سے سجا ہوا تھا۔

اس کمرے ہی پر کیا منحصر ہے۔ اس گھر کے در و دیوار، باغ کی سرسبز روشیں اور درخت تک بے تعلق نظر آ رہے تھے۔ سب اس کے حال دل سے واقف ہونے کے باوجود اس سے نظریں چرائے ہوئے تھے۔ کسی نے اس کو سمجھانے تک کی تو کوشش کی نہ تھی۔ بجز اس گستاخ لیکن بے حد مزاج شناس چینی لڑکے کے جس سے اس کا فقط اتنا واسطہ تھا کہ اس سے اس کے جہیز کے لیے کچھ سامان لیا گیا تھا۔

مگر وہ کس قدر دل چلا اور بے باک ہے۔ کس طرح بغیر تمہید کے بات شروع کر دیتا ہے۔ اس دن مجھ سے کہنے لگا۔ "تم اس چیانگ کائی شک سے کاہے کو شادی کر رہی ہو؟"

اور کل جب وہ دوبارہ کموتو دینے آیا تو کس طرح مجھے اکیلا بیٹھے دیکھ کر برآمدے میں آیا اور بے حد عاجزی اور ملائمت سے کموتو ٹرائی کرنے کو کہہ کر خود اطمینان سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اور جب میں نے کموتو اتار کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے" تو اس نے اس کو بڑی خوبصورتی سے تہہ کر کے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا مبارک کرے اور تم اس کو خوشی سے استعمال کرو۔" اور پھر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ واقعہ ہے کہ اس دلچسپ اور نو عمر چینی لڑکے نے کچھ اتنے خلوص اور سادگی سے یہ لفظ کہے تھے کہ صولت کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

''ہائیں ہائیں، ہمارے چین میں دلہن کا رونا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

وہ خاموشی سے بیٹھی کمونو کے انتہائی خوبصورت کام کو تکتی رہی۔

''مس تم کو یہ کمونو پسند آ گیا؟'' اس نے اس کو بہلانے کی غرض سے پوچھا۔

اور اس نے جواب دینے کے بجائے آہستہ سے سر ہلا دیا اور پھر وہ چینی لڑکا بغیر کسی تمہید کے بولا۔

''تم آج بھی افسردہ ہو اور اس دن اپنے منگیتر کے سامنے بھی بیزار تھیں۔ تم اپنی اس شادی سے ناخوش ہو نا۔''

اگر کوئی اور وقت اور کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ ایک ٹھوکر مار کر سامنے رکھی ہوئی میز کو گراتی ہوئی برآمدے کے دوسرے سرے پر جا کر پوری طاقت سے کہتی۔ ''نکل جاؤ، ابھی میرے سامنے۔''

مگر یہ وقت کچھ اور تھا اور یہ الفاظ کہنے والا شخص بھی کچھ اور قسم کا تھا۔ اس کی نیت میں کھوٹ نہ تھی۔ وہ اس کا مذاق اڑانے اور اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ بات نہ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں خلوص تھا اور لہجے میں سادگی۔

اس لیے صولت جہانگیر نے جس کا دل پکار پکار کر اعلان کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس شادی سے ناخوش ہے، بڑی خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور وہ اس کی اجازت کے بغیر ہی اس کے قریب اپنے گھٹنے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''تو مس! کیا اس معاملے میں تم اپنی رائے نہیں دے سکتیں؟'' وہ اچھی خاصی انگریزی بول لیتا تھا۔

''یہی سمجھ لو۔''

''تب تو تمہیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔''

''کیوں؟''

''تمہیں معلوم ہے جس چیز میں ہماری رائے اور مرضی کو دخل نہ ہو وہ نوشتہ دیوار کہلاتی ہے۔''

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''کچھ نہیں، ایک چینی نظم سناؤں تمہیں۔''

وہ افسردگی سے ہنس پڑی۔ کتنی بے تکی باتیں کرتا تھا یہ لڑکا۔

''سناؤ۔''

بڑے پر اثر اور دلکش سے لہجے میں چینی الفاظ کا ایک مترنم دریا سا بہہ نکلا۔

''کیا چن چو چو کر رہے ہو میری سمجھ میں آتا نہیں کچھ بھی اگر انگریزی میں ترجمہ کر سکتے ہو تو بتاؤ۔''

''میں زبانی تو نہیں کر سکتا' البتہ لکھ کر بتا سکتا ہوں۔ اجازت ہو تو لکھ دوں؟''

''لکھ دو' لو یہ کاغذ''

اس نے جیب سے سرخ پنسل نکالی اور چینی حروف بنانے لگا۔

''انگریزی میں لکھنا''

''تم بہت بے صبر ہو' حالانکہ حسن کو بے نیاز اور پر تمکنت ہونا چاہیے۔''

اس نے اس کو بزرگانہ انداز میں نصیحت کی۔ اور تھوڑی دیر میں انگریزی ترجمہ لکھنا شروع کیا اور آخری بند کے بول لکھتے لکھتے اونچی آواز میں پڑھے۔

''مجھے اپنے نوشتہ تقدیر کو

بہر نوع برداشت کرنا چاہیے''

اور پھر آخری بول لکھے۔

''موت' کلفتیں اور ان کا مداوا

بھی اپنے اپنے وقت ہی سے آتے ہیں''

اور کچھ ٹھہر ٹھہر کر اس نے ایک سطر اور لکھی اور سر اٹھا کر پوچھا کیا اس سطر کا ترجمہ بھی لکھ دوں؟''

''تم نے جو کچھ لکھا ہے سب کا ترجمہ لکھو۔''

سرخ پنسل پھر آہستہ آہستہ اور رک رک کر چلی۔

''خوبصورت اور آرام طلب لڑکیاں اپنے ماضی کو فراموش کر کے حال سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ اور تم بھی یہی کچھ کرو گی۔'' (صفدر یاسین)

''صفدر یاسین۔۔۔۔۔۔۔۔یہ کون ہے؟''

''یہ میں ہوں۔'' اس نے بڑے بھولپن سے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔

''اور اتم تو چینی ہو۔''

''چینی بھی مسلمان ہوتے ہیں' مس!''

''اچھا تم بودھ نہیں ہو؟''

''کسی کے بودھ ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''ٹھیک ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' صولت جہانگیر گھبرا کر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کو وہم سا ہونے لگا کہ پراسرار چینن کیہ اس نو عمر اور چالاک لڑکے نے باتوں ہی باتوں میں محض ایک اشارے میں اس کو اس کی سطح سے نیچے لا کھڑا کیا ہے۔

یہ اس جیسی لڑکی کے منصب اور شان کے خلاف تھا کہ وہ ایک بے حقیقت پھیری والے چھوکرے کے ساتھ بیٹھ کر زندگی کے فسلفے پر گفتگو کرے۔

''اچھا' پھر تم کسی وقت آ کر ممی سے کمونو کی قیمت لے جانا۔''

''کوئی بات نہیں مس!'' وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا گٹھڑا اٹھاتے وقت بے معنی طریق سے مسکرایا جیسے کہتا ہو۔ ''ٹھیک ہے' تم نے مجھے احساس دلا دیا کہ میں محض ایک پھیری والا ہوں۔''

اور صولت جہانگیر نے اندر آ کر اس چینی نظم کے ترجمے کو بار بار پڑھا اور اپنی نوٹ بک میں رکھ دیا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ اس جیسی لیے دیے رہنے والی اور بدگمان لڑکی کو ایک بے حقیقت پھیری والے کی باتوں نے سکون بخشا تھا۔

اسی دن سے اس نے اپنی میز پر رکھی ہوئی اس تصویر کے مسکین' راضی برضا اور ذہین چہرے کے مالک' زبیر کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا جو محض ایک جرنلسٹ تھا اور جو عمدہ اور قیمتی سوٹ پہننے کی وسعت نہ رکھنے کے باعث کھادی کا کرتہ اور سفید پاجامہ پہن کر سفید پوشی کو قائم رکھتا تھا۔ جو اتنا پڑھا لکھا اور باطنی طور پر اس درجے بھرپور تھا کہ ظاہری زندگی کے مہیب خلا اس کو ذرا بھی بے چین نہ کرتے تھے۔

لیکن زندگی کے لیے محض پڑھا لکھا ہونا اور اونچے خیالات تو ضروری نہیں ہوتے اور پھر کیا ضروری ہے کہ پڑھے لکھے اور اونچے آئیڈیل رکھنے والے لوگ ان لوگوں سے وابستہ ہوں جو ناز و نعم میں پلے ہوں' اور جن کا معیار زندگی عام لوگوں کے اندازے سے کہیں اونچا ہو۔

صولت جہانگیر کو کچھ اس قسم کی باتیں سمجھائی گئی تھیں۔ تمہیں تکلیف کی عادت نہیں ہے۔ چار دن کے بعد زندگی کی ہر خواہش اور آئیڈیل ختم ہو کر صرف ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے ضرورت۔ روپے کی ضرورت۔ دیکھو دولت دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔ اس سے تم ہر عزت' راحت اور آسائش خرید سکتی ہو۔

وہ چپ چاپ بیٹھی ہر بات کو ناگواری لیکن دھیان سے سنتی رہتی۔ بحث نہ کرنے پر بھی اس کو بڑی منطق اور حقیقت پسندانہ دلائل سننا پڑتے۔ دیکھو' دولت ہی سے انسان دوسروں کی نظر میں معزز ہوتا ہے۔ پیسہ نہ ہو تو چار دن میں قدر گر جاتی ہے۔

اور وہ خاموش بیٹھی خلا میں تکتی ہوتی۔ اس کی نظر سے گردو پیش کی ہر چیز حتیٰ کہ سامنے بیٹھی اماں بیگم تک اوجھل ہو جاتیں۔ صرف ان کی آواز اور نپے تلے لفظ کانوں میں آتے رہے۔ یہ سب بکواس ہے کہ ان کی عمر زیادہ ہے۔ دیکھو یہ کم عمر لڑکے بے حد غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تو بس معمولی گھروں کی پلی ہوئی اور سختیاں جھیلے ہوئے لڑکیاں ہی مناسب ہوتی ہیں۔ تم جیسی لڑکیوں کے لیے بھاری بھرکم اور سنجیدہ شوہر ہی اچھے ہوتے ہیں۔ دیکھو ہم نے تم کو بڑے ناز و نعم میں پالا ہے۔ تمہیں تکلیف کی عادت نہیں ہے۔ آسائش ہی زندگی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

تکلیف کی عادت نہیں ہے! تکلیف کی عادت نہیں ہے۔ ارے مجھے اب کم تکلیفیں ہیں۔ وہ باغیانہ انداز سے سوچتی۔ لیکن انتہائی بزدلی سے مسمسی شکل بنا کر اطلاع دیتی۔ ''اماں بیگم ظہر کا نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھ لیجیے۔''

اور جب زبیر کو نہ جانے کس طرح علم ہو گیا کہ اماں بیگم کا خیال ہے کہ یہ معمولی گھروں میں پلے ہوئے لڑکے بڑے گھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مڈل کلاس میں پیدا ہوتے ہیں اور ویسی مڈل کلاس قسمتیں بھی لے کر آتے ہیں تو وہ اور تو اور صولت تک سے روٹھ گیا تھا۔

لعنت تم سب بڑے گھروں میں پلنے والوں پر۔ رشتے دار ہے تو کیا ہوا کبھی تو تمہاری صورت دیکھوں گا نہیں۔ زبیر نے دل ہی دل میں سوچا اور بڑی بے نیازی سے اپنے روزمرہ میں مصروف رہا۔ سب بیکار بات ہے کوئی محبت وحبت نہیں ہوتی ہے۔ اس نے جھوٹ موٹ اپنے دل کو سمجھایا اور دوسرے دن کے لیے بیٹھ کر پہلے سے بھی زیادہ زوردار ایڈیٹوریل لکھنا شروع کر دیا۔

اور صولت جہانگیر سے اس نے یہ بھی نہ کہا کہ میں تم سے ناراض ہوں اور اب تم لوگوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے کہ میں کوٹھی بنگلوں کے بجائے ایک مختصر سے قدیم طرز کے گھر میں پلا بڑھا ہوں۔

جب وہ اس سے ایک دن راہ چلتے ملی اور بات کرنے لگی تو اس نے کہہ دیا کہ معاف کرنا میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ مجھے

اخبار کے مینجر سے ابھی جا کر ملنا ہے۔تم جانو نوکر آدمی ہوں میں تو اور باتیں۔۔۔۔۔۔۔باتوں کا کیا ہے۔ان کے لیے تو زندگی پڑی ہے۔

اس کی آواز میں بے تعلقی اور استقلال تھا لیکن جب وہ اپنی سائیکل پر دوبارہ چڑھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ بے حد خاموش اور ہمیشہ سے زیادہ راضی برضا نظر آ رہا تھا۔

پھر ہر شخص سمجھتا رہا کہ صولت خوش ہے اور مطمئن۔سوائے اس گوتم بدھ کی سی شکل والے چینی لڑکے کے۔صفدر یاسین تم بدھ مذہب کے ہو یا نہ ہو لیکن تم بدھ ضرور ہو۔تمہارا قلب و ذہن روشن ہے تم نے میرے دل کا حال کتنی جلدی سمجھ لیا تھا۔

اس نے زبیر کی تصویر اٹھائی اور اس چہرے کو دیکھا جس کی خاموشی اور مسکینی نے اس کو لازوال طور پر حسین بنا رکھا تھا۔

''اچھی بات ہے زبیر خان' اگر تم اکڑنا جانتے ہو تو صولت جہانگیر بھی مغل اعظم کی اولاد ہے۔''

اور اس شام اس نے اماں بیگم کو ابا میاں سے کہتے سنا۔اب تو صولت خوش ہے اور کل تو وہ آصف جاہ کے ساتھ سینما بھی خوشی خوشی گئی تھی۔کتنی پیاری لگ رہی تھی اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی۔

''ہوں' ہونہہ! ابا میاں کیوڑے میں بسے ہوئے حقے کی خوبصورت نے منہ میں دبا کر مسلسل گڑگڑ کئے جا رہے تھے۔گویا ان کو اس بات کے یقین کرنے میں تامل ہو۔

اور جب وہ واپس آئے تو آصف جاہ نے اس کو بڑا سا چاکلیٹ کا ڈبا اور گلاب کے ڈھیر جو پھول خرید کر دیئے تھے۔جی ہاں وہ بے حد خوش تھی کل تو۔اور آصف تو کہہ رہا تھا۔''اماں بیگم یہ تو ابھی بالکل بچی ہے۔''برآمدے کے ستون کی آڑ میں کھڑی ہوئی صولت ان کی باتیں سنتے سنتے خلا میں پہنچ گئی تھی۔اس کے کانوں میں اماں بیگم کے بجائے صفدر یاسین کی نوعمر' شستہ اور مترنم آواز آ رہی تھی۔

''میں شاہنشاہوں کی اولاد کو لی کے اصول کس طرح سکھاؤں اور میں چن ذی (نجیبوں) کی صفات کس طرح ان کے ذہن نشین کر سکتا ہوں۔یہ صرف چنگ (دوسروں کا لحاظ) کی کرامت ہے جو میں نے اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔

ہاں اماں بیگم یہ صرف چنگ کی کرامت ہے جو میں نے اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔

یا پھر میری کم ہمتی۔اس نے چپکے سے سوچا اور دبے قدموں وہاں سے چلی آئی۔

باب ۷

اس دوپہر کو بھی بیگم جہانگیر نے اپنی جڑواں بچیوں میں سے ایک کو یعنی گیتی کو بطور سزا بستر میں لٹا رکھا تھا ان کا خیال تھا کہ یہ بستر میں لٹا کر مقید کر دینے والی سزا دوسری سزاؤں کی نسبت زیادہ مہذب اور شائستہ قسم کی سزا تھی۔ اور زیادہ پر اثر۔ مگر گیتی بھاگوان کو تو یہ سزا تقریباً روز ہی ملتی تھی جبکہ ارجمند کو شاید ہی کبھی ملتی ہو۔ ان کی دونوں جڑواں لڑکیوں کی شکلوں اور مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ارجمند خالص مغلئی خدوخال والی تندرست اور نازک اندام تھی اور گیتی منگولی نقش ونگار کی موٹی تازی تھی۔ ارجمند بے حد معقول اور فرمانبردار اور وہ بے حد سرکش اور بے قابو۔

سب سے زیادہ جو سزا اس کو کھلتی تھی وہ بستر میں مریضوں کی طرح کئی کئی گھنٹوں لیٹے رہنا تھی۔ اس سزا کا عجیب ردعمل ہوتا تھا۔ سارے سارے دن مریضوں کی طرح بستر میں پڑے پڑے غصہ اور بغاوت ابل ابل کر اس کے دماغ میں عجیب عجیب ہیولے تیار کرتے۔ کبھی وہ خیال ہی خیال میں اپنا بستر بکس لے کر مالی کی کوٹھری میں پہنچ جاتی۔ اور کبھی دادی اماں کے گھر۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ اس کے تصور میں ابا میاں اس کے مچلنے اور ضد کرنے پر اماں بیگم کو پانی کے جہاز میں بٹھا کر نہ جانے کہاں بھیج دیا کرتے اور خود پان والی سے شادی کر لیتے جو اس کو مسالے اور پیپر منٹ ڈال کر پان کھلاتی اور جاڑوں میں اس کے کوٹ کی جیبیں مونگ پھلیوں سے بھر دیا کرتی کتنی موج آ جائے جو یوں ہو جائے۔ وہ بستر میں پڑے پڑے قہقہے لگاتی۔

اماں بیگم ڈانٹتیں۔ ''کیوں پاگلوں کی طرح ہنس رہی ہو؟''

ارجمند کے سیدھے پن اور مہذب عادتوں پر وہ اس کو اس قدر چڑاتی کہ رفتہ رفتہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتی جا رہی تھی۔ اماں بیگم نہ صرف یہ کہ گیتی کو ڈانٹتی ڈپٹتی اور سزائیں دیتی رہتی تھیں بلکہ وہ اس سے حقیقتاً بیزار تھیں۔ خدا جانے کیوں انہیں روز بروز اس لڑکی سے چڑ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے خلاف ان کے دل میں ایک عجیب سی نفرت کروٹیں لیا کرتی تھی اور جس دن وہ اس کو کوئی سخت سزا دے لیتیں اس دن ان کا دل اس کی طرف سے ہلکا ہلکا رہتا۔ اس کو مارتے وقت ان کو ایک نامعلوم سی لذت اور سرور کا سا احساس ہوتا اور وہ غیر اختیاری طور پر ذرا سی بات پر اس کو دھنک کر ڈال دیا کرتی تھیں۔ اپنی اس کیفیت کو وہ خود سمجھ نہ پاتی تھیں۔ اس لیے کہ اس کے دکھ درد اور بیماری پر وہ اسی طرح تلملا اٹھتی تھیں جیسے اپنے دوسرے بچوں کے لیے بے قرار ہوتی تھیں بلکہ بیماری کے عالم میں اس کو مجبوری اور پسپائی کے عالم میں لیٹا دیکھ کر ان کو عجیب تسکین سی ہوتی تھی وہ انتہائی توجہ اور خیال سے اس کی تیمارداری کرتی تھیں اور ان دنوں وہ خود بھی اتنی بدل جاتی تھیں کہ خود ان کو بھی حیرت ہوتی تھی۔

اور جس دن کا یہ واقعہ ہے اس سہ پہر کو سب پچھلے برآمدے میں بیٹھے سلائی میں مشغول تھے' صولت کے جہیز کی دلائی زیر بحث تھی۔ چچی جان کا کہنا تھا کہ تیز ہرے رنگ کی بناری میان تہہ پر سردی آب رواں کا دوپٹا کھلے گا۔ اور اماں بیگم کی رائے تھی کہ گوٹ کا پڑا خالہر دار زیادہ اچھا رہے گا۔

صولت ان سے کچھ فاصلے پر ان کی طرف سے پیٹھ کیے مونڈھے پر بیٹھی ایک ٹی کوزی بنا رہی تھی۔

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے اور کئی دن بعد اتنی ہوا چلی تھی کہ اماں بیگم نے چھت کا پنکھا بند کروا دیا تھا۔ دونوں بچیاں حسب معمول اپنے کمرے میں سلا دی گئی تھیں اور اب ان کے جاگنے کا وقت قریب تھا۔

مگر گیتی کے جاگنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے اور لطیف جھونکوں نے اس کی بھولی بھٹکی نیند کو بھی اڑا دیا تھا اور وہ کھڑکی کے قریب کھڑی باغ کے پچھلے حصے سے آتی ہوئی کوئل کی کوکو بڑے غور سے سن رہی تھی۔ ایک بار ہی ایک جھونکے کے ساتھ جامن کا درخت جھوما اور اس کی جامنوں سے لدی ہوئی شاخیں زمین تک جھک آئیں۔ گیتی کا دل کالی کالی جامنیں دیکھ کر بے اختیار ہو گیا۔

''ارجمند! ارجمند! چلو جامنیں توڑتے ہیں۔'' اس نے ارجمند کا شانہ ہلایا۔ جو بظاہر سوئی ہوئی تھی۔ ایسی سہانی رت میں نیند تو اسے بھی نہ آئی تھی۔ مگر وہ مکر کیے پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے مکاری کی نیند کے باعث سکڑے ہوئے تھے اور پٹ پٹ پھڑک رہے تھے۔ ہر آہٹ پر وہ سانس روک کر بمشکل آنکھوں کو ساکت کر لیتی تھی۔

''شی!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''تو پھر کیا زیادہ سے زیادہ پٹائی ہو جائے گی۔'' گیتی نے لاپروائی سے کہا اور باہر کو چل دی۔

نیم کے درخت کے نیچے چنا بیٹھا اپنے کنچوں کا حساب کر رہا تھا۔

''آؤ چنا' چلو جامنیں توڑتے ہیں۔''

''نہیں بھئی' تم آپ ہی توڑو' کون تمہارے ساتھ جا کر مار کھائے۔''

چنا نے جلدی سے اپنے کنچے چھپا لیے۔ اس لیے کہ ان میں کئی گولیاں گیتی کی بھی شامل تھیں۔

''مت جاؤ' کم بخت کہیں گے۔ کون مارتا ہے تم کو؟''

''کون مارتا ہے' ایں! اس دنا کیسا شبراتی کو پٹوایا تھا۔''

''اچھا اچھا' مت جاؤ کون بلاتا ہے تم کو۔'' اور وہ درخت پر جا چڑھی۔

انکار کے باوجود چنا بھی درخت کے نیچے پہنچ گیا۔

''میں بھی آؤں؟'' اس نے نیچے سے تاکا۔

''اب مت آنا' آؤ گے تو دھکا دے کر گرا دوں گی۔''

مجبوراً چنا نیچے گری ہوئی جامنیں بین بین کر کھاتا رہا۔ ''اللہ کرے گر جائے اوپر سے۔'' اس نے دل ہی دل میں کوسا۔

اور وہ مزے سے ایک گدے پر بیٹھی جامنیں کھا رہی تھی۔ اس نے اپنی فراک کی جیب میں سے نمک کی پڑیا نکالی اور چنا کو ترسایا۔

''ہمارے پاس تو نمک بھی ہے۔ ہم تو نمک سے کھا رہے ہیں۔''

''اللہ کرے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔'' چنا نے چپکے چپکے کوسا۔

ٹن ٹن سائیکل کی گھنٹی بجی۔

اور یہ سائیکل صفدر یاسین کی تھی جو اب بغیر صدا لگائے آ جاتا تھا۔

نیچے سے چنا نے گیتی کو ڈرایا۔ بیگم صاحب غسل خانے کے دروازے میں کھڑی ادھر ہی کو دیکھ رہی تھی۔ آج ہو گئی پٹائی۔ باپ رے! میں تو بھاگوں۔''

اور گیتی گڑبڑا گئی۔ بوکھلاہٹ میں اترتے میں اس کا پیر پھسل گیا اور نہ جانے کیا اتفاق ہوا کہ وہ گدے سمیت نیچے آ رہی اور گرتے وقت اس کے ذہن میں صرف یہی خیال تھا کہ ساری موٹی موٹی کالی کالی جامنیں بچ گئیں۔

گرتے کے ساتھ ہی اس نے ٹن ٹن کھڑک دھڑام کی آواز سنی جیسے کسی نے قصداً چلتی ہوئی سائیکل ہاتھ سے چھوڑ دی ہو۔ دوسرے لمحے اس نے اٹھنا چاہا تو ایک آہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ اس نے بے بسی سے سر گھما کر دیکھا۔ چائنامین اس کے سرہانے جھکا ہوا اس کو فکر مندی سے دیکھ رہا تھا۔

''کوکو چوٹ تو نہیں آئی؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اور صفدر یاسین دوبارہ اس کے اوپر جھک گیا اس کی آنکھوں میں درد کی لہر اور بے بسی یوں چمکی تھی جیسے کسی زخمی شیر کی آنکھوں میں مچلتی ہوئی کرب کی لہریں۔ اور اب وہ یوں آنکھیں بند کئے لیٹی تھی جیسے اپنی مسہری میں سوئی ہوئی ہو۔

اس کی گلابی اور نفیس فراک جا بجا سے جامنوں کے اودے اودے دھبوں میں لتھڑی ہوئی تھی۔ ہونٹ اودے ہو رہے تھے۔ پیروں سے جوتے غائب تھے اور سیدھے سیاہ بال پیشانی پر بکھر آتے تھے اور پیشانی کے بائیں طرف ایک کنکر نے چبھ کر زخم بنا دیا تھا جس میں سے جیتا جیتا خون رس رہا تھا۔ اور یوں لیٹی ہوئی وہ خالص چینی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے جھک کر دھیرے سے اس کو آواز دی۔ ''کوکو''

چنا موقع کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی وہاں سے بگٹٹ اڑا اور سیدھا اپنے کوارٹر میں جا کر دم لیا۔

صفدر نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے زخم پر رکھ کر آہستہ آہستہ خون کو اس میں جذب کرنے لگا۔

''کوکو! اس نے پھر اس کو آواز دی اور جواب نہ پا کر اس کو ہوشیار کرنے کے خیال سے پیشانی پر ہاتھ رکھا جو بالکل سرد تھی۔

''ارے! یہ تو بے ہوش ہے۔'' اس کو پہلی دفعہ احساس ہوا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا اسی قدر آرام سے اس نے اس کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور چر چر بولتی ہوئی مورم پر جلدی جلدی چلتا ہوا برآمدے میں جا پہنچا۔

اس کے دونوں ہاتھ گھرے ہوئے تھے اور گھنٹی کا بٹن دبانا ناممکن تھا۔ چنانچہ اس نے پوری طاقت سے آوازیں دیں۔ ''چانتامین' چانتامین''

''اونہہ! کیوں اتنا شور مچاتے ہو؟'' صولت نے جھنجھلا کر گیلری کا دروازہ کھولا اور اس کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''ہائیں' کیا ہوا اس کو؟''

''جب میں گیٹ کے اندر داخل ہو رہا تھا تو میں نے اس کو گرتے دیکھا۔ اور میں نے اپنی سائیکل وہیں پٹخ دی۔ مگر میرے پہنچنے سے پہلے یہ گر چکی تھی۔''

''اوہ!'' صولت کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

''جلدی کرو' بتاؤ نا اس کو کہاں لٹاؤں؟ یہ بہت بھاری ہے میرا ہاتھ تھک گیا۔''

''اوہ'' صولت اندر چلی گئی۔

''کس قدر پاگل ہے یہ'' صفدر نے سوچا۔ ''اب کیا میں اس کی اتنی بھاری سی بہن کو ساری عمر اپنے ہاتھوں پر اٹھائے کھڑا رہوں۔'' اس نے سر جھکا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور خود ہی مسکرا دیا۔ ''کون کہتا ہے یہ اس لڑکی کی بہن ہے تو بس خاص الخاص میرے اپنے ملک کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔''

گیلری میں سخت کھلابلی سی سنائی دی اور کئی قدم آگے بڑھے۔

''لاؤلاؤاندر لے آؤ'' چچی جان نے بے حد پریشان آواز میں صفدر کا اشارہ کیا۔ اور وہ اندر کمرے میں آ گیا۔ اور یہ کمرہ اس کی ماں کا تھا جو سر پکڑے تختوں کے چوکوں پر بیٹھی تھیں۔ بچی کو مسہری پر لٹا دینے کے بعد بھی وہ اس کے سرہانے کھڑا رہا۔

صولت آ کر اس نے سرہانے بیٹھ گئی اور اس کی نبض ٹٹولنے لگی۔

''اے بیٹا' اس کی نبض تو چل رہی ہے نا؟'' اماں بیگم کی آواز میں لرزش تھی۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ اب آپ اتنا نہ گھبرائیے۔''

اس نے اس کے مڑے ہوئے پیر کو سیدھا کرنا چاہا۔ تو وہ ساری جان سے لرز گئی۔

''معلوم ہوتا ہے فریکچر ہو گیا ہے۔''

''اے ہے تو بھاگوان نے اپنی ہڈی توڑ لی۔'' وہ رو دینے کے قریب ہو گئیں۔

''بچی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنا چاہیے۔'' مجبوراً صفدر نے صولت سے کہا۔

''اوہ ہاں'' صولت لپک کر اماں بیگم کے ڈریسنگ روم سے یوڈی کلون کی شیشی اٹھا لائی۔

ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں اور یوڈی کلون کی خوشبو کے اثر سے اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

سارے گھر کو اپنے گرد دیکھ کر فتح مندی اور تسکین کا احساس اس کے سارے وجود پر چھا گیا۔

''ارے کوئی گرم دودھ تو لانا۔'' چچی جان نے گھبراہٹ میں ہاتھ ہلائے اور صولت لپک کر گرم دودھ کی پیالی لے آئی۔

یہ کمرہ بے حد نفاست سے سجا ہوا اور اس میں کھڑے بیٹھے ہوئے سب لوگ ہی خوبصورت اور دل آویز تھے لیکن صفدر یاسین کو اس وقت قطعی یہ احساس نہ تھا۔

اور جب یہ معلوم ہوا کہ یوں لیٹے لیٹے وہ دودھ نہیں پی سکتی تو دواؤں کی الماری سے فیڈنگ کپ نکال کر دودھ اس میں انڈیل لیا گیا۔

مگر اس نے فیڈنگ کپ کو پکڑنے والے ہر ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے ہٹا دیا۔

تب صفدر یاسین اس کے قریب آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''کوکو! پی لو۔'' اس نے صولت کے ہاتھ سے بغیر کچھ کہے فیڈنگ کپ لے کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ اور کوکو نے درد سے لبریز مگر

مسکراتی آنکھوں سے اس کو دیکھتے ہوئے سارا دودھ غٹ غٹ پی لیا۔

پھر وہ سرگوشی میں بولی۔ ''چن چن چائنا مین! تم آج اندر آ گئے اب تم کو اس بڑی الماری میں بند کیا جائے گا۔ اب تم گھر نہیں جا سکتے۔''

''کوئی بات نہیں اب تمہارے درد تو نہیں۔''

''بہت درد ہے۔ میری تو ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔'' وہ بے بسی سے مسکرائی۔

''بہت بہادر ہو تم'' اس نے اس کے کالی گھٹاؤں سے بھی زیادہ کالے بال اس کی پیشانی پر سے ہٹا دیئے۔

اچانک اماں بیگم کے چہرے پر ناگواری سی چھا گئی۔ جیسے کوئی بہت غلط بات ہو گئی ہو۔

اب اس سے کہو کہ باہر جائے۔ وہ منہ پھیر کر صولت سے بولیں۔

صولت نے ایک نظر ان کو دیکھا اور پھر خجل سی ہو کر چائنا مین سے انگریزی میں کہا۔ ''تمہاری ہمدردی کا بہت بہت شکریہ اب تم جا سکتے ہو۔ اب ہم اس کو ہاسپٹل لے جا رہے ہیں۔''

''ہاں اپنے ابا کو تو اطلاع دے دو۔''

''میں نے ان کو فون کر دیا ہے۔ وہ ابھی گاڑی بھیج رہے ہیں۔''

''کیوں؟ تم نے بتایا نہیں کہ اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے؟''

''فضول پریشان ہوتے' شاید نہ ٹوٹی ہو۔ میرا خیال غلط ہے اب تو یہ باتیں کر رہی ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس نے صفدر کی طرف یوں دیکھا گویا کہتی ہو کہ بس اب تم اپنا راستہ لو۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور کسی کو سلام دعا کئے بغیر باہر نکل گیا۔

''ہائے ابا میاں بڑا درد ہے۔''

گیتی نے بلک کر اماں کے بجائے ابا میاں کو آواز دی جو موجود نہ تھے۔

مگر جواب انہوں نے ہی دیا۔ ''دیکھ لیا بے کہے پن کا مزا۔ اور کھاؤ جامنیں۔ صبح تم کو بستر میں لیٹنے کی سزا ملی تھی اور دوپہر کو تم خاک اڑانے نکل پڑیں۔''

ان کی بات کا جواب گیتی نے یوں دیا کہ درد کی دوسری شکایت کو اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر چھپا لیا۔ اس نے گردن موڑ کر

دیکھا' دروازے کے قریب سہمی ہوئی ارجمند کھڑی تھی۔

باب ۸

اور جب وہ لوگ اس کو اسٹریچر پر لٹا کر موٹر تک لائے تو انہوں نے دیکھا کہ سیڑھیوں پر اپنے گٹھڑ سے پیٹھ لگائے وہ چینی پھیری والا اب تک بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں میں اس کی سائیکل پڑی تھی۔ اور وہ آسمان پر منڈلاتی ہوئی چیلوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''اے' تم اس وقت جاؤ۔ ہم اس وقت پریشان ہیں۔ کچھ نہیں خریدیں گے۔ پھر کسی اطمینان کے وقت آنا'' بیگم صاحب نے بیزاری سے کہا۔

وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا اپنی سائیکل اٹھائی اور کیریئر پر گٹھڑ جمائے ہوئے سوچنے لگا۔

''بیگم صاحب! چاہے تم میرا شکریہ ادا کرو' چاہے یہ سمجھ کر کہ میں اپنی بکری کی خاطر یہاں اس وقت تک بیٹھا ہوں' میں تم کو یہ تو بتانے سے رہا کہ میں اس کی وجہ سے یہاں بیٹھا ہوں جس کو دیکھ کر اور جس سے بات کر کے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر ہوں۔

اور جب گیتی کو پہیے دار پلنگ پر لٹا کر اسکریننگ کے لیے ایکسرے روم میں لے جایا گیا تو صولت نے چپکے سے محسوس کیا کہ نتیجے کے منتظر گھر کے افراد کے درمیان ایک اجنبی چہرہ بھی موجود ہے۔ اور وہ چہرہ اس چینی لڑکے صفدر یاسین کا تھا۔

اسکریننگ کی رپورٹ سے تو یہی معلوم ہوا تھا کہ اس کی ران اور الٹے ہاتھ کی کلائی کی ہڈیاں ٹوٹی ہیں پر ابھی ایکسرے کی رپورٹ کا اور انتظار تھا۔ اس کو اس وقت کے لیے ایک سائیڈ روم میں اسٹریچر پر لٹا دیا گیا تھا۔ چچی جان کو گھر واپس بھیج دیا گیا۔ صولت ادھر ادھر ڈاکٹر کے ساتھ پھر رہی تھی اور اماں بیگم پلنگ کے قریب کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ صفدر یاسین نے کھڑکی کی جالیوں میں سے جھانکا۔ وہ پہلے کی نسبت پر سکون نظر آ رہی تھی اور سیدھے ہاتھ میں ایک پتلی سی کتاب کو بڑی دقت سے پکڑے ہوئے پڑھ رہی تھی۔

''یہ کو کتنی صابر ہے۔'' اس نے فخر سے سوچا اور بلا وجہ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو سے تیر آئے اور وہ جالی کے پاس سے ہٹ آیا۔

اب شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ ڈاکٹر نے آ کر عارضی قسم کی پٹی کر دی اور اس کو اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جو اس کے لیے خالی کروا لیا گیا تھا۔ وہ لوگ اندر ہی اندر اس کا اسٹریچر دھکیلتے ہوئے نہ جانے کس طرف لے گئے تھے۔ اور اس کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس کمرے کی طرف گئی ہے۔

انتظار کرتے کرتے اس کو کافی دیر ہوگئی اور کوئی اس طرف نہ نکلا تو وہ برآمدے سے اتر کر اپنی سائیکل کی طرف گیا۔ کیریئر پر اس کا گٹھڑ بدستور جما ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کر وہ لرز گیا۔ ''اف خدا' میں نے کتنی سخت حماقت کی تھی اور جو کوئی لے کر چل دیتا اس کو تو ۔۔۔۔۔۔'' اس خیال ہی سے اس کا سر چکرا گیا۔ ''اچھی ہمدردی کرنے اٹھا تھا میں بھی۔'' وہ اپنی حماقت پر بہت ہنسا۔ ''خدا نے بڑی خیر کی۔''

وہ پھاٹک کے قریب پہنچا تو اس نے ان کی موٹر کھڑی دیکھی۔ وہ گاڑی کے قریب رکا اور ڈرائیور سے پوچھا۔

''بے بی کے کمرے کا نمبر کیا ہے؟''

اسٹیرنگ وہیل پر دونوں ہاتھ رکھے اور اپنی پیشانی ٹیکے ہوئے ڈرائیور چونکا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم' ابھی وہ لوگ آتے ہوں گے۔ ان سے معلوم ہو جائے گا۔''

پچھلے اور نزدیکی زینے سے اتر کر صولت اس کی طرف کو مڑی۔ اس کے ساتھ ایک دراز قامت اور بے حد وجیہہ شخص تھا۔ ان دونوں سے چند قدم کے فاصلہ پر صولت کی ماں تھکے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھیں۔ وہ لوگ اب پہلے کی نسبت مطمئن نظر آ رہے تھے۔

باتیں کرتے ہوئے وہ موٹر کے اندر بیٹھ گئے۔ موٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈرائیور نے صاحب سے مخاطب ہو کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''صاحب! یہ چینا مین بے بی کے کمرے کا نمبر پوچھتا ہے۔''

''کیوں کیا بات ہے؟'' صاحب چونکے تو صولت نے دھیرے دھیرے ان سے کچھ کہا۔

ان کی بڑی بڑی خوبصورت غلافی آنکھیں اس کی طرف اٹھیں اور وہ موٹر سے نیچے اتر آئے۔ انہوں نے بڑے اخلاق سے کہا۔

''تمہاری ہمدردی کا میں بہت ممنون ہوں۔ بچی کے کمرے کا نمبر دس ہے سیکنڈ فلور۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو اس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ ان کے آگے تھوڑا سا جھکا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

وہ پھر گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ اور گاڑی ایک سڑاکے کے ساتھ پھاٹک کے باہر نکل گئی۔ مگر صفدر کی نظروں میں اب تک وہ سفید چوڑی دار پاجامے اور سفید شیروانی میں ملبوس آن بان والی شخصیت بسی ہوئی تھی جس کی بڑی بڑی اور گھومی ہوئی مونچھوں سے بھی نیکی اور شرافت عیاں تھی۔

اس کو قطعی علم نہ تھا کہ اس قسم کے نقش ونگار کو مغلیٰ خدوخال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لیکن وہ برابر سوچ رہا تھا کہ ضرور اس شخص کا اس ملک کے قدیم بادشاہوں سے تعلق ہے۔

باب ۹

''اب اماں بیگم اور صولت آپا خوش ہوں گی مجھے اس طرح لیٹا دیکھ کر۔'' گیتی نے اپنے آپ کو بے بس اور اپنی ٹانگ کو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر سوچا۔

اب تو ان کو مجھ سے شکایت نہیں ہو گی کہ ہر وقت اودھم مچاتی ہے لیکن ۔۔۔۔۔۔۔لیکن بھینس کے بھوسے کا ڈھیر شریف کی کوٹھڑی میں بھروا دے گا اور پھر میں کس طرح اس پر لوٹیں لگاؤں گی۔اور چڑ پٹے کے سارے پتے دھوبی اور مالی کے بچے نوچ نوچ کر ختم کر دیں گے۔پھر میں کس طرح ان کی روٹیاں بنا سکوں گی؟''

اس کی آنکھوں میں اتنی بہت سی محرومیوں کے خیال سے آنسو آ گئے۔

''اور پتہ نہیں میں اب کبھی اٹھ کر پہلے کی طرح دوڑ بھاگ بھی سکوں گی یا نہیں؟''

پریشان کن خیالوں سے بچنے کے لیے وہ چچی جان سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔اس نے ان کو آواز دی۔

''چچی جان! ہائے اللہ آپ کدھر ہیں؟'' وہ اس طرح کراہی جیسے سخت تکلیف میں ہو۔

وہ غسل خانے میں اس کی فیڈنگ کپ صاف کر رہی تھی۔گھبرا کر نکل آئیں۔

''کیا بات ہے؟ کیا پھر پیر بے کل کر لیا؟ بھئی' بڑی شریر اور بے چین ہو تم بھی۔جب ہی تو تمہاری ماں تم سے ناراض رہتی ہیں۔''

وہ مسکرائی۔''میرا دل گھبرا رہا ہے' میرے پاس بیٹھیے۔''

''توبہ ہے' تم نے تو ہمارے ہاتھ پیر پھلا دیئے۔''

''بھئی' دوسرے کے بچے کی دیکھ بھال کرنا بڑی مشکل بات ہے۔''

''مگر آپ تو سارے وقت دوسروں کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور عصمت آپا اور طلعت آپا کے پاس جاتی نہیں۔بچاری اکیلی رہتی ہیں۔''

''کیوں؟ اکیلی کیوں رہتیں؟ تمہاری دادی جو پاس ہیں ان کے۔''

''ہیں تو کیا ہوا بھئی آپ کو تو یاد کرتی ہوں گی دادی اماں ان کی اماں تو نہیں ہیں۔ اچھا' اب میں سمجھ گئی وہ بھی بڑی شریر ہوں گی جب ہی تو آپ ان سے خفا ہو کر چلی آئیں۔''

''نہیں بیٹا' وہ شریر نہیں ہیں۔'' وہ رنجیدہ سی ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

یہ باتیں بتانے کی تھوڑی تھیں۔ یہ تو ان کی اپنی مصلحت تھی۔ اپنے میاں کے مرجانے کے بعد ان کو پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ کسی نہ کسی کا میکے میں ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ سسرال والے رشتے دار ہو کر بھی غیر ہی ہو جاتے ہیں۔ میکے کے نہ ہونے اور کسی بیٹے کی ماں نہ ہونے نے اس کو عجب احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔

یہ بیٹیاں باہر بیاہ جائیں گی اور پھر میرا اس خاندان سے بھی برائے نام رشتہ رہ جائے گا۔ یہ گھرانہ جو کنبے بھر میں معزز تھا' اس سے لڑکیوں کا بھی کیا ناتا رہ جائے گا۔ ان کی شادیاں گھر کے گھر ہی میں کر کے میرے اور ان کے رشتے کا بندھن مضبوط ہو سکے گا۔ بڑے چچا نے تو کبھی ان کو پوچھا اور نہ لڑکیوں کو۔ اور پھوپھی کا بھی یہی تھا کہ کئی کئی سال پیچھے آتی تھیں اور کئی بار کہہ چکی تھیں کہ یہ اماں کا دم ہے جو مجھے کھینچ لاتا ہے۔ ان کو اور ان کی لڑکیوں کو جو کوئی پوچھتا تھا تو گیتی کے باپ ہی تھے اور انہوں نے بھی ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ کچھ دن سے ان کو شک کیا بلکہ یقین ہو چلا تھا کہ شہر یار عصمت کو کچھ اور نظر سے دیکھتا ہے۔ اور جب ہی سے وہ اپنی جٹھانی کی ہر خدمت کے لیے حاضر رہنے لگی تھیں۔ اور زیادہ وقت انہیں کے پاس گزرتا تھا۔

''بھئی آپ تو باتیں نہیں کرتیں۔ ہونہہ! ہونہہ!''

گیتی اب رونے کی تیاری میں مصروف تھی۔

''اے بھائی! اب ہم تم سے کیا باتیں کریں؟ کہو تو کوئی کہانی سنا دیں؟''

''کہانی!'' وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ''نہیں میں کہانی نہیں سنوں گی۔ کوئی ہنسی کی بات کیجیے۔''

''ہنسی کی بات! بھئی وہ تو تمہارا چیا ہی کرے گا آ کر۔ بالکل مسخرے بندروں کی سی باتیں کرتا ہے۔ ہم تو ایسی باتیں کر نہیں سکتے۔ سنو تو! تم تھوڑے انگور کھالو۔''

اس نے روٹھے پن سے سر ہلا دیا۔

''تو پھر نارنگی دیں؟''

گیتی نے آنکھیں بند کرلیں۔

باب ۱۰

ہر دوسری تیسری دوپہر کو وہ سانگ کے بکنے جھکنے کی پروا کیے بغیر چپکے سے کھسک آتا۔ بڑی خاموشی سے زینے طے کرتا ہوا ہسپتال کی دوسری منزل کے دس نمبر کمرے کے دروازے پر جا کر دستک دیتا اور وہ پرشوق نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دیتی۔ ''آجاؤ۔''

بے حد مسخری سی شکل بنائے وہ اس کے پلنگ کے قریب آکر جھکتا۔

''جامن کھانے والی لڑکی اب کیسی ہے؟''

اور کبھی کہتا۔ ''ہیلو فیٹی کیا حال ہے؟''

''اتنی تو میں دبلی ہوگئی اور تم مجھے اب بھی فیٹی کہتے ہو۔'' وہ ہنسی۔

اس کے آجانے سے چچی جان کو بے فکری سی ہو جاتی اور ان کو ادھر ادھر کے مریضوں کے کمروں میں جا بیٹھنے اور ان کے تیمار داروں سے گپیں ہانکنے کی آزادی مل جاتی۔ وہ اس کے لیے کھٹا چورن' لیمن ڈراپس اور ایسی ہی چھوٹی موٹی سستی چیزیں لایا کرتا تھا۔ اور وہ بڑے شوق سے کھایا کرتی تھیں۔

گیتی کو صفدر یاسین کی آمد کا یوں اور انتظار رہا کرتا تھا کہ وہ ایسے وقت آتا جب کسی دوسرے کے آنے کا قطعی امکان نہ ہوتا تھا اور وہ پڑی پڑی اکتا رہی ہوتی تھی۔ وہ اس کو طرح طرح کی نقلیں اور لطیفے سناتا اور وہ دل بھر کر ہنستی۔ بعض وقت یوں بھی ہوتا کہ وہ تکلیف اور بے چینی میں آنسو بہاتی ہوتی لیکن اس کو کمرے کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں مسکرانے لگتیں۔ اس کی باتوں' بے وقوفانہ سوالات اور دلچسپ حرکتوں سے وہ اتنا محظوظ ہوتی کہ یہ بھی بھول جاتی کہ وہ پندرہ دن سے جکڑی ہوئی پلنگ پر پڑی ہے اور اٹھ کر بیٹھنے کو بھی ترس گئی ہے۔

گیتی اس کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی اور بہل جاتی تھی۔ پھر بھی اس کی حیثیت اڑتے اڑتے کھڑکی میں آبیٹھنے والی چڑیا یا کسی بے تکی سی جگہ پر کھلے ہوئے چھوٹے سے بے حقیقت خودرو پھول سے زیادہ نہ تھی۔ جس کو دیکھ کر وقتی طور پر کوئی اس طرف متوجہ ہو جائے اور پھر فوراً ذہن سے نکال دے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اس طرح آجانے کا ذکر کسی دوسرے کے سامنے آیا ہی نہیں۔ اور گیتی نے تو شاید

یوں بھی ذکر نہ کیا ہوگا کہ وہ ان تمام باتوں کو راز بنا کر رکھتی تھی جن سے اس کو انتہائی دلچسپی ہوتی تھی۔

اور وہ تھا کہ گھنٹوں بیٹھا اس کی بیمار اور منہ پھٹ سی لڑکی کے ساتھ سر مارا کرتا۔ اور جب ہسپتال کے گیٹ سے اس کی سائیکل نکلتی ہوتی تو اس کو بڑی تسکین سی محسوس ہوتی جیسے یہ وقت وہ اپنے گھر میں گزار آیا ہو۔

اس کی اس خاموش آمد کا علم صولت کو اس شام کو ہوا جب اس نے گیتی کی میز پر زرد اور سرخ کانچ کی بنی ہوئی دو نازک ننھی ننھی سی بطخیں اور ایک کتاب رکھا دیکھا۔

''ارے' یہ تمہارے پاس کہاں سے آگئے؟'' اس نے گیتی کے بالوں میں انتہائی ملائمت سے برش پھیرتے ہوئے پوچھا۔

گیتی کوئی جواب دیئے بغیر اپنی نئی اسٹوری بک کی تصویریں دیکھتی رہی۔

''اے! وہ جو چائنا مین ہے نا' وہ اکثر ان کو دیکھنے آتا رہتا ہے۔ وہ دے گیا ہے۔'' چچی جان نے اپنے بٹوے سے کتری ہوئی چھالیہ اور الائچی نکال کر صولت کی طرف بڑھاتے ہوئے اطلاع دی۔

''اچھا! تو کیا وہ اس کو دیکھنے آتا رہتا ہے؟'' صولت نے حیرت اور اشتیاق سے پوچھا۔ ''عجب تھا یہ لڑکا بھی۔''

''اے لو اس کے آجانے سے تو یہ اپنا دکھ درد بھول جاتی ہیں۔''

گیتی نے کنکھیوں سے ہی بھانپ لیا کہ اماں بیگم نے اس بات کو ناپسندیدگی سے سنا ہے۔

''مگر تم نے یہ چیزیں تو واپس کردی ہوتیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟'' انہوں نے اپنی دیورانی کو ملامت کی۔

''اے لیجئے' ہم کو خبر بھی نہیں کہ وہ کس وقت میں یہ ان کی میز پر رکھ کر چلتا بنا۔'' اور چچی جان اپنی بات تو گول ہی کر گئیں۔ کتنی ہی بار انہوں نے اس سے پان' الائچیاں اور برف منگائی تھی۔

وہ بڑے انداز سے اس سے کہتیں۔ ''اے بھیا' اس وقت تو تم فرشتہ بن کر آئے ہو۔ ہم صبح سے پان سے حیران بیٹھے ہیں۔ ایک دو آنے کے پان تو لادو۔''

اور وہ لپک کر جاتا اور پان لے آتا۔

یا جب تھرماس کی برف ختم ہوجاتی تو وہ تھرماس اس کو دکھا کر کہتیں۔ ''برابر والے کمرے میں برف کی ضرورت تھی۔ مانگ لے گئیں اور ہمارا تھرماس خالی ہوگیا۔ اب یہ تمہاری بے بی پانی مانگے گی تو ہم کیا دیں گے؟''

اور وہ ان کے بغیر کہے اپنی خدمت پیش کرتا۔

''اچھا! ابی ہم لائے گا۔اپنی بے بی کو برف۔''

''اے تو بھیا' پیسے تو لے لو۔'' وہ واجبی سا اصرار کرتیں۔

''او بائی! پیسے کا کیا جلدی ہے' پھر لے لے گا۔'' وہ کمرے سے نکل جاتا۔

''پھر بھی تم نے خیال رکھا ہوتا۔اچھا یہ اب اس کو دے دینا۔''

اماں بیگم نے دس کا نوٹ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔''اور دیکھو اب اس سے کہہ دینا کہ بے بی کی طبیعت ٹھیک ہے۔دو چار دن میں پلاسٹر لگوا کر ہم اس کو گھر لے جا رہے ہیں۔اب آنے کی ضرورت نہیں۔''

''اماں بیگم! کیا ہرج ہے۔اس کا دل بہل جاتا ہے۔''

''نہیں اب ان کا دل نہیں' دیوانہ ہو گیا۔اتنی کتابیں اور چیزیں ہیں۔ ہر وقت تمہاری چچی جان موجود ہیں۔صبح شام ہم لوگ آتے رہتے ہیں۔''

اماں بیگم اس وقت سخت بیزار نظر آ رہی تھیں۔گیتی نے ان سے نظریں چار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''اب میرا بیٹا کیسا ہے؟'' اچانک ہی اس کے دراز قامت وجیہہ باپ نے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

''ابا میاں' وہ بلاوجہ ہی ان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر رونے لگی۔

''ہائیں ہائیں' تم تو ہمارے بہادر بیٹے ہو۔ بہادر بیٹا بھی کہیں روتا ہے؟ کیا

بات ہو گئی؟''

''ابا میاں!''

''ہاں بیٹے!''

''میں کب اٹھوں گی؟''

''تم ابھی کچھ دن لیٹو گی۔''

''آخر کتنے دن؟'' موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل پھسل کر رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

''افوہ بھئی! یہ تو بڑا مشکل سوال ہے اور بھئی دیکھو تم تو جانتی ہو کہ میرا حساب بہت کمزور ہے۔اچھا پھر کسی وقت بتاؤں گا۔''

ان کی خوبصورت غلافی آنکھوں میں دکھ اور رحم کی آمیزش صاف نظر آ رہی تھی۔

پاس پڑے ہوئے تولیے سے انہوں نے اس کے آنسو خشک کئے اور اپنی بیوی کے قریب جا بیٹھے۔

''یہ تو بہت گھبرا رہی ہے اور ابھی تو پلاسٹر کی مصیبت باقی ہے۔''

''ہاں' اپنی شرارت کا بھگتان بھگت رہی ہے۔ دیکھئے' اتنے دن میں زرد کیسی ہو گئی ہے!''

وہ رنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''کل آپ آئیں تو اس کے لیے کچھ کھلونے لیتے آیئے گا۔''

''اچھی بات ہے۔''

گیتی نے ذرا سا سر موڑ کر اپنے خوبصورت باپ اور خوبصورت ماں کی طرف دیکھا۔

''ابا میاں کی بڑی بڑی اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔'' اس نے بڑے پیار سے سوچا۔

چچی جان جو اپنے جیٹھ کے آ جانے سے سر ڈھک کر ایک طرف کو بیٹھ گئی تھیں۔ دھیرے سے صولت سے بولیں۔

''صابن بالکل ختم ہو گیا ہے۔''

''کل صبح غفور کے ہاتھ بھیج دوں گی۔''

''کل تم آنا تو پوڈر کا ڈبا ضرور لیتی آنا۔''

''جی اچھا'' صولت نے بھی دھیرے سے جواب دیا۔

جب سب چلنے لگے اور اماں بیگم خدا حافظ کہنے کو جھکیں تو اس نے پوچھا۔ ''ارجمند کیا کر رہی تھی؟''

''مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔''

''کل اس کو ضرور لایئے گا۔''

''اچھا' تم دودھ پی لیا کرو۔ خدمت کیا کرو۔ بالکل زرد ہو رہی ہو'' انہوں نے سمجھایا۔

''دودھ کا تو نام نہ لیجئے۔ دھاروں روتی ہیں۔'' چچی جان آہستہ سے بولیں۔

اماں بیگم نے اس کو گھور کر دیکھا۔ ''یہی تو حرکتیں ہیں' ان کی۔ ڈانٹا کرو ان کو۔''

گیتی نے آنکھیں بند کر لیں۔

اور موٹر میں بیٹھ کر جب انہوں نے اپنے آنسو پونچھے' تو جہانگیر مرزا گھبرا گئے۔

''ارے ارے! یہ آپ رو رہی ہیں؟''

''اے یہی خیال آیا ہے' جو ہڈی ٹھیک نہ بیٹھی تو تو لڑکی ذات ہے۔۔۔۔۔''

''پہلے سے ایسے وہم کیوں دل میں لاتی ہیں۔ کیوں نہیں ٹھیک بیٹھے گی۔''

باب ۱۱

''ہلو کوکو!'' وہ اس کے قریب اسٹول پر بیٹھ گیا۔

وہ جو نیم غنودگی کے عالم میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی طرف افسردگی سے دیکھ کر بولی۔

''چن چن چائنا مین''

''ہاں کوکو''

''تم کو گرمی نہیں لگتی۔ اتنی دھوپ میں آتے ہو؟''

''لگتی ہے۔''

''پھر کیوں نکلتے ہو اتنی دھوپ میں۔''

''میری مرضی''

''اوہو' بڑے لاٹ صاحب' میری مرضی'' اس کو اس چائنا مین پر رشک آ رہا تھا۔ کاش وہ بھی صولت آپا اور اماں بیگم کو دھوپ میں پھرنے پر ڈانٹنے پر اسی طرح جواب دے۔ ہاں پھر رہی ہوں دھوپ میں میری مرضی!

چچی جان غسل خانے سے بال پونچھتی ہوئی نکلیں۔ اور وہ ان سیاہ' لانبے اور لہردار بالوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ بال پونچھ چکنے کے بعد انہوں نے کنگھا لے کر آہستہ آہستہ بال سلجھانے شروع کر دیئے۔

وہ کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ ان کے زانوؤں پر بڑا روئیں دار تولیہ پھیلا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی لٹیں لے لے کر سلجھا رہی تھیں۔ ان کی نرم اور دبیز انگلیاں' گاؤدم کلائیاں آہستہ آہستہ بالوں کے درمیان جنبش کر رہی تھیں۔

ایک گھریلو اور سگھڑ عورت کی تمام تر شائستگی اور نفاست کے ساتھ ان دبیز اور لمبی لمبی انگلیوں کی ہر جنبش اور لچک کے پیچھے ایک پوری تہذیب' ایک قدیم رکھ رکھاؤ اور خاندانی آن بان موجود تھی۔

آج اس آن اور اس وقت اس پر یہ انکشاف ہوا کہ انسانی جسم کی ہر ہر جنبش' اس کے اعضاء کی ہر حرکت اور پیچ وخم میں نسلوں اور صدیوں کی تاریخیں مضمر ہوتی ہیں۔

وہ اس کے وجود سے بے پروا اور بے نیاز بیٹھی اپنے بال سلجھاتی رہی اور پھر ان کو آہستگی سے سمیٹ کر پیچھے کی طرف کر کے دوپٹے کے اندر کر لیا۔ پھر آہستہ آہستہ بڑے انہماک سے کنگھا صاف کیا۔ ٹوٹے ہوئے بالوں کو دھیرے دھیرے شہادت کی انگلی پر لپیٹ کر چھلا سا بنایا اور منہ کے قریب لا کر آہستہ آہستہ تھوتھو کرنے کے بعد غسل خانے میں چلی گئیں۔ وہاں سے واپس آ کر وہ اس کے قریب کھڑی ہو گئیں۔

''آ گئے تم؟'' انہوں نے بڑی نرمی سے کہا۔

وہ ان کے قریب کھڑا دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''آج تم ذرا جلدی نہیں چلے جاؤ گے؟''

''تم بولے گا تو جرور چلا جائے گا۔''

''ہاں بھئی' یہ آج بالکل نہیں سوئی ہے اور پھر اگر شام کو اپنی ماں کے آنے کے وقت سوئی تو وہ ناراض ہوں گی کہ دوپہر کو نہیں سلایا۔''

''اچا' کوئی بات نہیں۔'' اس نے خوش دلی سے اپنی ٹوپی اٹھائی اور گیتی سے بولا۔

''کوکو اب تم سو جاؤ۔ خدا حافظ'' اس نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

گیتی نے اپنی افسردہ آنکھوں سے اس کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اس کے کان چچی جان کی آواز پر تھے۔

''اے سنو تو''

''کیا حکم ہے؟'' وہ مڑا۔

''یہ جو تم کھلونے ۔۔۔۔۔۔ اے وہ ۔۔۔۔۔۔ وہ'' اس کے خلوص کے سامنے وہ اس قسم کی بات کرتے بوکھلا رہی تھیں۔

''کیا بات بولی؟''

''کچھ نہیں' ہم کہتے ہیں بچی کو یہ کھلونے کیوں دیئے؟''

وہ ان کی بات نہ سمجھ کر منہ کھولے کھڑا رہا۔

''ارے بھئی' بات یہ ہے کہ اس کی ماں نے یہ روپے دیئے ہیں۔ کھلونوں کی قیمت لے لو۔'' انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

''کھلونوں کی قیمت!'' وہ برا مان گیا۔

''ارے ہاں بھئی' اور سنو' وہ کہہ رہی تھیں کہ اب ہم دو تین دن میں پلاسٹر لگوا کر اس کو گھر لے جائیں گے۔ اب تمہارے تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ ان کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''تم ہماری بات سمجھے نہیں' دیکھو ہم۔۔۔۔۔۔''

''یس' یس' ہم سمجھتا ہے۔ اچھا بات ہے۔ ٹیک اے' ٹیک اے'' وہ بہت ہی دل گرفتہ آواز میں بولا اور دروازے سے نکل گیا۔

وہ ساری دوپہر سونے کے بجائے مکر کئے پڑی رہی۔ اور شام کو جب سب آئے تو اس کا چہرہ بہت اترا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس شام ابا میاں اس کے لیے ایک سوتی جاگتی گڑیا اور مٹکنے والی بلی لائے تھے۔ اس نے کھلونوں کو ایک نظر دیکھا اور میز پر رکھ دیا۔ تکیے کے نیچے سے چھوٹا سا ڈبہ نکال کر اس میں سے زرد کانچ کی بطخ نکالی اور اپنی آنکھوں کے سامنے کر لی' جن میں موٹے موٹے آنسو بھرے ہوئے تھے۔

سب نے مل کر اس کا جیتا جاگتا کھلونا چھین لیا تھا۔ بندر کی نقل کیسے مزے میں کرتا تھا اور کتنے مسخرے مسخرے منہ بناتا تھا۔ اسی لیے تو اس کا دل روٹھا روٹھا ہو رہا تھا۔

باب ۱۲

یہ ان کے گھر کی پہلی شادی تھی۔ پھر بھی بہت خاموشی سے ہوئی تھی۔ کیوں اور کس وجہ سے؟ اصل وجہ کون جان سکتا تھا۔ اپنے اپنے طور پر مختلف لوگوں نے قیاس آرائیاں کی تھیں۔

چچی جان کا خیال تھا کہ بھابی یہ نہیں چاہتی ہیں کہ کنبے اور رشتے کے لوگ ان کی طے کی ہوئی اس بے جوڑ شادی کو دیکھیں اور طرح طرح کی چہ میگوئیوں سے لڑکی کو پہلے ہی بد دل کر دیں۔

اس کے برعکس ان کی ساس کا خیال تھا کہ دلہن نے تو شروع سے ہر قاعدہ قانون توڑنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ ان کے بڑے بیٹے

نے اپنی لڑکی کی شاید انہیں کے خاندان سے کی تھی اور اب جہانگیر مرزا کی لڑکی کی شادی بھی اسی آبائی گھر سے ہونی چاہیے تھی۔ مگر وہ تو رفتہ رفتہ خاندان اور کنبے کی ہر پابندی سے آزاد ہو رہی ہیں۔

''بھئی صاف بات تو یہ ہے کہ ہم تو اس بے جوڑ شادی ہی سے خوش نہیں۔ لڑکا اپنے کنبے کا ہوتا تو چلو یہ بھی ہرج نہ تھا۔ مگر خیر ہم کون بولنے والے'' انہوں نے چپکے چپکے چچی جان سے کہا تھا۔ ''ہم تو بس مہمان آئے ہیں۔''

''ایک بات یہ ہے کہ ان کا اپنا کنبہ تو مختصر ہے۔ ایک بھائی ایک بہن۔'' چچی جان نے بھی سرگوشی کی تھی۔

''خیر کنبہ جتنا چاہے انسان مختصر کرلے' یہ تو اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ توبہ استغفراللہ! بس غیبت سے خدا محفوظ رکھے۔'' انہوں نے جھٹ ظہر کی نماز کی نیت باندھ لی۔

''پھر بھئی' ہمارے اپنے صاحبزادے کا یہ حال ہے کہ شکار سے فرصت نہیں۔ بیٹی کی شادی میں یوں گھوم رہے ہیں جیسے مہمان۔'' انہوں نے سلام پھیر کر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔

''ہاں' یہ تو ہے۔ بھائی صاحب تو بس مہمان ہی طریق رہتے ہیں کسی بات میں دخل نہیں دیتے۔ بڑی خوش نصیبی ہے بھابی جان کی۔'' چچی جان نے دوپٹہ پر کرن ٹانکتے ہوئے کہا۔

''ارے' تو وہ مرنے والا ہی کب کسی بات میں دخل دیتا تھا۔ وہ تو کہو عمر نے ہی وفا نہ کی۔ ہمارے تو لڑکوں میں عادت ہی نہیں۔ نہ خدا بخشے تمہارے ابا جان نے ہمارے سفید سیاہ میں دخل دیا۔''

وہ سر جھکائے فیروزی دوپٹہ کے کناروں پر سنہری کرن ٹانکتی رہیں۔ ان کو شاید وہ مختصر لیکن آسودہ ساتھ یاد آ گیا تھا۔

''اب تم یہی دیکھو کہ اس وقت ہاشمی کون سی دور بیٹھی ہے۔ ایک گھنٹے کا بھی تو راستہ نہیں۔ لیکن آج کئی دن سے سوچ رہی ہوں کہ جہانگیر سے کہوں کہ اس کو تو لے ہی آؤ۔''

''اے واہ' ایسا کیا سوچنا۔ آپ بھائی صاحب سے کہیں تو۔ آپ کے تو سگے چچا کی پوتی ہیں وہ۔''

''ہاں' دیکھو آج کہوں گی' شہریار بھی تو اس وقت کی گاڑی سے پہنچ رہا ہے۔ نہ ہو تو اسی کو لینے بھیج دیں۔''

سوئی کا ڈورا دانت سے کاٹ کر وہ بولیں۔

''شہریار کے کمرے میں تو بڑے بھائی ٹھہرے ہوئے ہیں اور اوپر والے کمرے میں بھابی کے بھائی بھاوج اور بہن ہیں۔ شہریار کدھر ٹھہریں گے؟''

''اے لو!اس کا گھر ہے۔لڑکوں کو کون سے کمرے درکار ہوتے ہیں۔ہاں اگر ہاشمی کے آنے کا ہوا تو پھر تم ان کو اپنے ساتھ ٹھیرا لینا۔''

''ہاں'میں عصمت اور طلعت سے کہہ دوں گی کہ تم دادی اماں کے پاس سو جایا کرو۔''

''دیکھو دلہن'میری رائے تو یہی ہے کہ تم شادی کے بعد میرے ساتھ چلو۔''

''ہاں سوچتی تو میں بھی یہی ہوں۔''انہوں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

اور جب شہریار آیا تو اماں بیگم سے ملتے ہی وہ سیدھا دادی اماں کے کمرے میں پہنچا تھا۔

''اب تو ماشاءاللہ تم اپنے باپ کے برابر آ لیے ہو۔''انہوں نے اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

''اور چچی جان تو اب میری کمر تک آنے لگی ہیں۔''وہ جھک کر ان سے گلے ملا۔

دبلی پتلی چچی جان نے اس کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔''ان کی جان سے دور'اب تو بالکل یہ لگتا ہے جیسے ان کے چچا سامنے آ کھڑے ہوں۔''

''سچ چچی جان!کیا میں واقعی چچا میاں سے اتنا ملتا جلتا ہوں؟''شہریار نے پوچھا۔

''بالکل'سات قرآن درمیان۔وہی ہاتھ پیر اور ناک نقشہ ہے۔''دادی اماں نے افسردگی اور شوق سے اس کی طرف دیکھا۔

''تو پھر میں ان کا بیٹا ہوا نا؟''وہ ان سے پھر لپٹ گیا۔''دیکھئے کہتا ہوں کہ مجھے اپنا بیٹا بنا لیجئے۔

''ارے'تو میرا ہی تو بیٹا ہے'بناؤں کس طرح؟''

انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کر کے بڑی مالکانہ نظروں سے دیکھا۔

''اچھا اب اٹھلا چکے بہت۔چلو اب ذرا مجھ سے بیٹھ کر بات کرو۔کتنے کام تمہارے انتظار میں پڑے ہیں۔''

بیک وقت دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ان کے پیچھے اماں بیگم تھیں۔ان کا چہرہ سرخ تھا اور ماتھے پر شکنیں نمایاں تھیں۔

''دیکھا بھابی آپ نے؟''کتنا شریر ہے۔''وہ کھسیانی سی ہو کر شرمندگی مٹانے لگیں۔

''شریر وریر کوئی نہیں۔بس اتراتے بہت زیادہ ہیں چلو۔''انہوں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

اور شہریار سر جھکا کر ان کے پیچھے چلا گیا۔

☆☆☆

''بس ہر وقت لپک جھپک!اتم اتنی بھی کامی نہیں ہو'عصمت!ذرا دیر کو ٹک کر بیٹھا بھی تو کرو۔''

شہریار نے عصمت کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر زبردستی اس کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''مگر بڑے بھیا' مجھے تو بہت سا کام کرنا ہے۔''

''بھئی! تم مجھے ہر وقت بڑے بھیا' بڑے بھیا' ذرا ذرا سی چھوکریوں کی طرح مت کہا کرو۔''

''پھر کیا کہا کروں؟''

''بتا دوں گا کسی وقت''

''مگر اس وقت تک کیا کہوں؟''

''میں بتاؤں۔''

کرسی کے پیچھے سے دبکی ہوئی گیتی اٹھی۔

''اری منگول چینی! تو یہاں دبکی کن سوئیاں لے رہی ہے؟'' شہریار نے اس کے موٹے موٹے کلے نوچے۔ ''بتا کیا کہا کرے عصمت مجھے؟''

''عصمت آپا آپ کو مسٹر شہریار صاحب کہا کریں۔''

''واہ ری گدھی''

عصمت بھی ہنس پڑی۔''

''بھئی عصمت' تم سے تو جو کام کہو ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ یا تو آدمی صاف جواب دے دے۔ تم سے کہا تھا کہ شکر تلوا دو۔''

''ابھی آئی بڑی اماں!'' وہ اٹھنے لگی۔

''میں تو تم سے کام کہہ کر چور ہو جاتی ہوں۔'' انہوں نے نہایت غصے سے کہا۔ ''اب رہنے دو' میں خود تلوا لوں گی۔'' اور وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

''شہریار کو تو کسی کام سے مطلب نہیں۔'' ان کی آواز دور سے آئی۔

''بڑی اماں بڑی جلدی ناراض ہو جاتی ہیں۔'' اس نے برا مان کر کہا۔ ''صبح سے تو میں اب بیٹھی ہوں۔''

''دیکھو عصمت' تم اماں بیگم کی مرضی کا کام کرنا سیکھ لو۔''

''کیوں؟''

''بس میں کہہ جو رہا ہوں' یوں''

''اچھے آپ کہہ رہے ہیں۔'' اس نے منہ پھلایا۔''عصمت چلو چپ رہو ہر وقت الٹی سیدھی باتیں نہ کیا کرو۔''

عصمت نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ جو اس پر ناراض ہو رہی تھیں۔ پھر انہوں نے بڑی محبت سے شہریار کی طرف دیکھا۔''تم اس کے منہ نہ لگا کرو۔ بڑی منہ پھٹ ہے یہ''

''جی ہاں' اس کا منہ سلوانا پڑے گا۔''

''شہریار میاں تو اپنے ددھیال والوں کے سوا کسی کو لفٹ دینے کے قائل ہی نہیں۔'' شہریار کی ممانی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''واہ ممانی جان! میں بس اب ننھیال والوں کو لفٹ دینے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا۔''

''ارے چل لڑکے! میں بھی تجھے خوب سمجھتی ہوں۔'' انہوں نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔

''کیا سمجھتی ہیں؟''

شہریار نے ان کی تیز نظروں کے آگے سر جھکا لیا تھا۔

''تو پھر کہوں آپا جان سے؟ سفارش کروں؟''

''جی نہیں' میں اپنی سفارش آپ ہوں۔''

وہ زور سے ہنسا اور عصمت سٹپٹا کر اٹھ گئی تو اس کی ماں نے اس کو ایک طرف لے جا کر ڈانٹا۔

''اے! اب کی اگر ہم نے تم کو شہریار سے زبان چلاتے سنا تو منہ توڑ دیں گے۔''

اسی وقت عصمت نے بڑی اماں کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تھا جو کسی سوچ میں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے اپنی دادی کے کمرے میں جا بیٹھی۔

''عجیب ہے یہ ہاشمی آپا کا لڑکا بھی۔'' گیتی نے سوچا۔ اس لڑکے کی ماں سے جس کا نام مسعود تھا اس کا کیا رشتہ ہے۔ نہ اس نے کسی سے پوچھا اور نہ کسی نے بتایا۔ وہ اتنی نازک سی اور خوبصورت تھی کہ وہ ان کو ہاشمی آپا کہنے لگا۔

ہاں تو وہ لڑکا جس کے متعلق یہ معلوم کر کے کہ اس کے ابا نہیں ہیں۔ گیتی کو بہت حیرت ہوئی تھی اور اس نے سوچا کہ آخر یہ لڑکا کیسے

رہتا ہے ابا کے بغیر!

وہ دبلا پتلا' اپنی عمر سے زیادہ لمبا' سانولی رنگت' اور سوچتی سوچتی آنکھوں سمیت بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں کئی باتیں ان سب سے الگ تھیں۔ وہ اور اس کے ماموں' چچا کے بچے فراٹے سے انگریزی بولتے اور آیاؤں اور بیروں کی مدد سے کپڑے بدلتے۔ گھنٹوں تو ان کی تیاری میں لگ جاتے۔ لیکن مسعود یعنی ہاشمی آپا کا لڑکا ان سب سے مختلف تھا۔ نہ تو اس کے پاس اتنے ٹھاٹ باٹ کے کپڑے تھے اور نہ اس کے ساتھ کوئی آیا یا بیرا تھا۔ گنتی کے چند بہت معمولی جوڑے تھے بلکہ جوتا تو بہت پرانا سا تھا جس کو وہ صبح شام پالش کر کے چمکا لیا کرتا تھا۔ خود ہی کسی وقت کسی بھی غسل خانے میں گھس کر نہا لیتا اور تیار ہو جاتا تھا۔

کتنی ہی دفعہ گیتی کی خالہ اور ماموں کے بچوں نے اس کے کپڑوں اور جوتوں کا مذاق اڑایا لیکن وہ ذرا بھی جز بز نہیں ہوا۔

''ذرا اپنا جوتا تو دیکھو مسعود خاں!'' گیتی کے ماموں زاد بھائی سلمان نے اس کا مذاق اڑایا۔

''دیکھ لیا۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اب تم یہ جوتا بدل ڈالو۔'' ارجمند نے ازراہ ہمدردی اس کو مشورہ دیا۔ ''سلمان تمہارا مذاق اڑا رہا ہے۔''

''یہ جوتا میرا ہے' سلمان کا تو نہیں۔ اس کو کیا مطلب میرے جوتے سے؟''

''مطلب یہ کہ جناب اس جوتے اور دھاری دار قمیص میں بالکل خانساماں کے بیٹے معلوم ہو رہے ہیں۔'' سلمان نے اس کے منہ کے بالکل قریب منہ لا کر کہا۔

ایک لمحہ مسعود نے سلمان کو دیکھا اور تڑ سے ایک بھرپور طمانچہ اس کے گورے بھبوکا سے منہ پر پڑا۔ سلمان غرایا۔ ''سمجھ لوں گا مسعود خاں''

''کیا سمجھ لو گے؟ ابھی سمجھو تو دیکھیں۔'' گیتی آگے بڑھ آئی۔ ''فضول میں بے ہودہ باتیں کر رہے ہو۔''

ارجمند سلمان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئی۔

لیکن اس کا مطلب نہ تھا کہ گیتی سے اس کی لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ کسی بات پر اس نے گیتی کے چٹکی لی تھی کہ دھم سے ایک گھونسا اس کی پیٹھ پر پڑا۔ ''گدھے تو نہیں۔''

''چپٹی چینی' میڈم چیانگ کائی شک''

''ارے ابا میں کیا وہ بدتمیز تمہارے یہاں بھی جاتا ہے؟''

''کون بدتمیز؟'' مسعود نے حقارت سے ہونٹ نکال کر پوچھا۔

''جو مجھے کوکو کہتا ہے بہت برا ہے وہ۔''

اچانک اس کو یاد آ گیا کہ وہ قطعی برا نہیں ہے۔ وہ جب اکیلی ہسپتال میں لیٹی گھبرا رہی ہوتی تھی تو عین اس وقت وہ مسخرا سا منہ بنائے اندر داخل ہوتا اور طرح طرح سے اس کو بہلانے اور ہنسانے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اب تو بہت دن سے اس کو دیکھا بھی نہیں تھا اس نے۔ اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔

اور اس تمام دوپہر صفدر نے سانگ کی دکان کے ایک کونے میں بیٹھ کر سلک پر ایک بہت باریک برش سے سنہری پینٹ کی تھی جس کی پاداش میں وہ ساری شام سانگ کی جھڑکیاں کھاتا رہا تھا۔ اس کو بھول کر بھی خیال نہ آیا تھا کہ آج کل میں اس خوبصورت اور مغرور لڑکی کی شادی ہو رہی ہے جس کو اپنا منگیتر ناپسند ہے' نہ ہی اس کو اس چینیوں سے بڑی گہری مشابہت رکھنے والی بچی کا خیال آیا تھا جس کی دلداری اور بہلانے کے لیے وہ بلا ارادہ ہی جلتی ہوئی دوپہر کو ہسپتال جایا کرتا تھا۔ یہ بھی کوئی سوچنے والی بات تھی۔

جہانگیر مرزا نے شہریار کو بلا کر کہا۔

''بھئی! ذرا ارجمند اور گیتی کو جوتے تو پہنوالاؤ۔ تمہاری اماں میرے سر ہیں۔ اب میں کہاں پہنواتا پھروں گا۔''

سامنے سے مسعود چلا آ رہا تھا۔ اس کے جوتے کی ایڑی بالکل گھس گئی تھی اور چمکا کر پالش کرنے کے باوجود جگہ جگہ سے چمڑے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے جوتے کو غور سے دیکھا اور سوچا۔ سچ ہی تو کہہ رہی تھی گیتی۔

رات کو جب اماں بیگم نے ابا میاں سے فرمائش کی تھی کہ کل آپ ذرا ارجمند اور گیتی کو نئے جوتے پہنوا لایئے تو وہ چونک پڑے تھے۔

''کون؟ میں جوتے پہنوالاؤں' آپ کا مطلب ہے ان لڑکیوں کو؟''

''تو اور کیا محلے پڑوس کی لڑکیوں کو کہہ رہی ہوں؟''

''نہیں' میں مذاق کر رہی ہوں۔'' اماں بیگم کا دل جل رہا تھا۔

پھر وہ خود ہی بڑبڑائیں۔ ''حد ہے' ایسا بھی کیا ہے۔ ہمارے بھائی جان ہمیشہ بچوں کو خود جوتے پہنواتے ہیں اور ان سے زندگی بھر میں آج نام لیا ہے تو بولائے جا رہے ہیں۔''

''وہ' بیگم بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔ بس وہ کچھ آپ نے عادت ہی نہیں ڈالی ایسے کام کرنے کی۔ آپ تو خود اتنی مستعد اور

ہوشیار ہیں کہ مجھے تو واقعی مجہول بنا دیا۔''

''اے میں نے مجہول بنایا ہے؟ آپ سدا کے ایسے ہی تھے۔ بگڑے ہوئے رئیسوں کے سے انداز۔ میں نے تو مجبوری کو یہ سب کرنا شروع کیا۔ ایک ہماری بھاوج خوش نصیب ہیں کہ ان کا کپڑا تک بھائی صاحب کی مرضی اور پسند سے خریدا جاتا ہے۔ آپ کی طرح تھوڑی کہ لتے لگالیں ہم' تو ہوش نہیں۔''

''یہ تو نہ کہو بیگم۔ وہ میں ۔۔۔۔۔۔'' وہ گڑبڑا گئے اور دل میں سوچتے رہے۔ ''تمہارے باپ بھائی کا کیا ہے۔ سیٹھ لوگ ٹھیرے۔ سوجھ بوجھ والے ہوشیار۔ ہم ٹھیرے نااہل لوگ۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بڑی مظلومیت سے بولے۔ ''تو اچھا پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ دلہن جوتے پہنوالائیں بچیوں کو؟''

''دلہن کو کل ضرور فرصت ہوگی۔''

''تو غفور سے کہو وہ پہنوالائے گا۔''

''آپ اپنے مشورے رہنے دیجئے۔ میں کچھ انتظام کرلوں گی۔'' وہ جھنجلائیں۔

اور وہ جو جوتے پہنوانے کے تصور ہی سے سہمے جارہے تھے' شکر کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے۔

گیتی نے جو اس وقت اماں بیگم کے پلنگ پر آلیٹی تھی' سر اٹھا کر دیکھا اور سوچا۔ ''اگر اماں بیگم جوتے پہنوانے گئیں تو مسعود بیچارا جوتا نہیں پہن سکے گا اور ابا میاں سے دو دفعہ کے کہنے پر جو چاہو' کروالو۔ وہ دبے قدموں ان کے تعاقب میں چلی اور پردے کے پیچھے سے جھانکا۔

ابا میاں ململ کے خوبصورت گلے کے کرتے اور سفید پاجامے میں زمردی قالین پر کھڑے ہوئے کتنے پیارے لگ رہے تھے۔ وہ ان کی گھومی ہوئی مونچھیں اور دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے قدموں میں سیاہ سلیم شاہی۔ یہ سب کتنی جانی پہچانی اور شفیق چیزیں تھیں۔

انہوں نے اپنے برسوں پرانے قالین کو اپنے تلے قدموں سے روندا۔ ''لو بھلا کتنا مضحکہ خیز نظارہ ہوتا کہ ہم بچیوں کو لیے بیٹھے جوتے نکلوا نکلوا کر پہنوا رہے ہیں اور جوتے والے سے جوتے کا بھاؤ کر رہے ہیں۔ ان کی اقسام پر بحث فرما رہے ہیں۔'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''ابا میاں'' اس نے ان کے پاس آکر ان کو مخاطب کیا۔

"ہاں بیٹے!" انہوں نے قدرے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان کی پنڈلی تک آ رہی تھی۔

"ابا میاں! کل آپ خود ہم کو جوتے پہنوایئے۔"

"کیوں بیٹا؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ آپ پہنوائیں۔"

"بھئی خوب' آپ کا دل خوب ہے۔ بات یہ ہے بیٹے کہ تمہارے ابا میاں جوتوں کے معاملے میں بالکل اناڑی ہیں۔"

"تو ابا میاں پھر کیا ہوگا؟ وہ تشویش میں پڑ گئی۔

"کیوں بیٹا' کیا بات ہے؟" انہوں نے تمسخر سے اس کی طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے ابا میاں؟" وہ اچانک ہی اپنی صاف گوئی پر اتر آئی۔ "میں اس لیے کہتی ہوں کہ آپ ہی پہنوایئے۔ اماں بیگم سے کہوں گی تو وہ جھڑک دیں گے۔"

"کیا بات کہنا ہے' اماں بیگم سے؟"

"وہ ابا میاں! مسعود کا جوتا بالکل خراب ہے۔ ایک دم ردی۔ سب بچے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"کون مسعود؟"

"ہاشمی آپا کا لڑکا جو ہے ابا میاں؟"

"وہ تمہاری آپا نہیں' پھوپھی ہیں۔"

"خیر میں تو مسعود کی بات کر رہی ہوں۔ سلمان نے کل اس سے کہا تھا کہ تم خانساماں کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔ تو مسعود نے اس کو مارا' زور سے۔ پھر میں نے مسعود سے کہا کہ بھئی تم دوسرا جوتا پہن لو مگر اس نے کہا کہ میرے پاس ایک ہی جوتا ہے۔ اور وہ مجھ سے بھی خفا ہو گیا۔ اب آپ چلئے تو اس کو بھی جوتا پہنوا دیجئے گا۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم کرسی پر بیٹھ گئے۔

"گیتی! یہاں آؤ میرے قریب"

اور وہ بڑی سنجیدگی سے ان کے قریب آ گئی۔ انہوں نے اس کے دونوں چھوٹے چھوٹے' موٹے موٹے ہاتھ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا' اور سوچا۔ "میری یہ چپٹی' چینیوں کی سی شکل والی بیٹی کتنے فراخ اور حساس دل والی ہے۔"

انہوں نے اس کے معمولی بلکہ بدصورتی سے بے حد قریب خدوخال کو بغور دیکھا۔ ان میں کتنا حسن تھا' کتنا سکون اور طمانیت تھی۔ پھر انہوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور بولے۔ ''گیتی! تم کو ایک بات بتاؤں۔''

''بتایئے!'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''تم میرے سب بچوں میں' سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔''

''میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''سچ کہتا ہوں۔''

''اچھا ابا میاں! جوتوں والی بات؟''

''صبح بتائیں گے' جاؤ اب تم جا کر سو جاؤ ورنہ!'' انہوں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''ورنہ اماں بیگم ماریں گی۔'' اس نے آنکھیں چمکائیں اور کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

''گیتی سچ کہتی تھی۔'' انہوں نے پھر سوچا اور پھر شہریار سے کہا۔ ''جب تم جاؤ تو مسعود کو بھی ساتھ لیتے جانا۔''

''کس واسطے؟''

''اس کو بھی جوتا پہننا ہے۔ ہاشمی بیگم نے رات کو مجھے اس کے جوتے کے لیے دام دیے تھے۔ یہ لو ایک جوتے اور ایک چپل کے دام ہیں۔''

اور پھر وہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شہریار ان کی کرسی کے قریب ہی کھڑا رہا۔

''ابا جان!''

''ہاں بھئی!'' انہوں نے اخبار پر سے نظریں اٹھائیں۔

''کیا مجھ سے کچھ کہنا ہے۔''

''وہ ابا میاں! اور پھر جلدی سے بولا۔ ''ایک جوتے کا آرڈر میں بھی دینا چاہتا تھا۔''

''ہاں تو پھر دے دو نا اور اپنے اور بچیوں کے جوتوں کے داموں کے متعلق اپنی اماں بیگم سے بات کر لو۔'' وہ پھر اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''وہ بات یہ ہے ابا میاں کہ اماں بیگم کہ ناوقت جوتوں کا آرڈر کیوں دیا؟ انہوں نے ابھی پچھلے مہینے مجھے جوتے بنوا کر بھیجے ہیں۔''

''پھر واقعی کیا ضرورت ہے؟''

''ابا میاں! میں شکار کے لیے جوتے بنوانا چاہتا ہوں۔''

''اچھا' تم بنوالو۔ میرے حساب میں لکھوا دینا۔''

باپ بیٹے کی آنکھیں ملیں جن میں ایک دلچسپ سازش کی چمک تھی۔

اور جب شہریار کمرے سے نکل گیا تو وہ غیر اختیاری طور پر سوچنے لگے۔ ''آخر میں اور میرے بچے بیگم کے خلاف سازشیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟''

شہریار نے اشارے سے مسعود کو بلایا اور کہا۔ ''تم چپکے سے جا کر موٹر میں بیٹھ جاؤ۔ کسی اور بچے کو خبر نہ ہو۔''

''کیوں' کہاں چلنا ہے؟''

''بس تم بیٹھ جاؤ جا کر' میں ذرا منگول کو اور ارجمند کو بلا لوں۔''

''چل رہی ہو موٹے خان!'' اس نے گیتی کا گلا دبایا۔

''کہاں بڑے بھیا!''

''جوتے کھانے''

''اوں! اچھیۓ۔''

''آئس کریم کھانا ہے یا وہ بھی نہیں۔''

''ہاں! کیوں نہیں کھانا۔''

''تو چلو۔۔۔۔۔''

''مسعود کو بلا لاؤں؟'' گیتی نے صلاح دی۔

''مسعود کیا کرے گا جا کر؟'' شہریار نے منہ سکھا کر کہا۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھی تو اس نے مسعود کو پہلے ہی بیٹھے دیکھا اور خوشی کے مارے اس کے بال جھکول ڈالے۔

''چڑیل!'' اس نے تلچا کر اس کے بال بھی کھینچ لیے۔

''اوئی اللہ! میرا ہاتھ کچلا۔'' ارجمند نے ان کی لڑائی سے بوکھلا کر کہا۔

''یار مسعود! کیا گڑبڑ مچا رہے ہو؟ تم تو بڑے ہو معاف کر دیا کرو۔'' شہریار ہنسا۔

اور جب وہ چائنز کی دکان کے سامنے جا کر رکے تو ارجمند نے معصومیت سے کہا۔ ''بھیا! یہ تو جوتوں کی دکان ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟ آئس کریم کے بدلے جوتے ہی کھا لینا۔''

وہ تینوں کو لے کر دکان میں داخل ہو گیا۔ شوروم میں صرف سانگ موجود تھا۔ اندر مشین پر کام ہو رہا تھا۔

شہریار نے مسعود اور دونوں لڑکیوں کے لیے جوتوں کی فرمائش کی تو مسعود چونک اٹھا۔ ''کون؟ میرے لیے؟ میں نہیں پہنوں گا؟''

''مت پہنو۔ تمہاری اماں نے ابا میاں کو پیسے دیے تھے کہ مسعود کو جوتا پہنوا دیجئے۔ میں ان کو واپس کر دوں گا۔''

''کب دیئے تھے؟'' مسعود نے بے یقینی سے کہا۔

''رات کو''

مسعود جوتا پہننے کو تیار ہو گیا اور ایک جوتا پسند بھی کر لیا۔ ارجمند نے بھی ایک براؤن رنگ کا جوتا جلدی سے پسند کر لیا مگر گیتی کا دل کسی ایک چیز پر ٹھکتا ہی نہ تھا۔ ابھی براؤن پسند آیا ہے ابھی کالے پر دل آ گیا۔ ساتھ ہی ملٹی کلر پر بھی نظر ہے۔ ایک طرف سرخ پر دل مچلا جاتا ہے۔ سانگ ادھر سے ادھر پھرتے پھرتے تنگ آ گیا۔ اب صرف وہ ہی جوتے دکھانا باقی تھے جو ورک شاپ میں رکھے تھے۔

سانگ نے کسی کو پکارا۔ ''لیو چو!'' اور پھر چینی زبان میں کچھ کہا۔

تھوڑی دیر کی کھٹر پٹر کے بعد دس بارہ ڈبوں کا اونچا سا مینار بنائے لیو چو اندر داخل ہوا۔

''ارے ابا ئیں! یہ یہاں بھی ہوا کرتا ہے؟ اے! تم جوتے والے بھی ہو؟'' گیتی نے بے تکی باتیں شروع کر دیں۔

''ہاں! کوکو! میں جوتے والا بھی ہوں۔'' عام چینیوں سے ذرا نکلتے ہوئے قد اور نسبتاً اونچی ناک والے لیو چو نے اس کے قریب چٹائی پر دو زانو بیٹھ کر جوتا اس کے پیر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں سن رہا تھا۔ تم بہت گڑبڑ کر رہی تھیں۔''

''تم لیو چو ہو؟ چو ہے کھاتے ہو؟''

''ڈونٹ بی سلی'' شہریار نے مجبوراً اس کو گھر کا۔

''بولنے دیجئے' یہ ایسی ہی باتیں کرتی ہے۔''

''معلوم ہوتا ہے تم ایک دوسرے کو خوب جانتے ہو۔''

''میں آپ کے یہاں چینی دستکاری کا سامان لے کر آتا تھا۔''

اور شہریار نے سوچا اس لڑکے کی انگریزی عام چینی دکانداروں سے زیادہ صاف اور بہتر ہے۔

''اور بڑے بھیا جب میں ہسپتال میں تھی تو روزانہ آ کر مجھے خوب ہنساتا تھا۔ بالکل بندر ہے لنگوری بندر۔'' گیتی نے لیو چو کی طرف دیکھ کر زبان نکال دی۔

''بکومت'' شہریار نے پھر ٹوکا۔ ''جوتا پسند کرو۔''

اس نے پھر ناک بھوؤں چڑھائی۔

''بس کوکو! یہ جوتا ٹھیک ہے۔ اب مت اتارنا اس کو۔ تمہارے لیے سنڈریلا کا جوتا تو آنے سے رہا۔''

گیتی نے گردن جھکا کر لیو چو کی بات مان لی۔

سانگ کاؤنٹر پر جا بیٹھا تھا اور چینی دکانداروں کی عادت کے مطابق جوتوں کی اصل قیمت سے دگنی اور چوگنی قیمتیں بتا رہا تھا۔

شہریار نے اس کی عادت کو جانتے ہوئے اس سے جھک جھک شروع کر دی۔ وہ دکانداروں سے حجت کا قائل نہ تھا۔ لیکن چینیوں سے بھاؤ تاؤ کرنا اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔ ان کا جھنجھلا جھنجھلا کر تو تو کر کے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا اس کو بہت پسند تھا۔ آج بھی یہی ہوا۔ سانگ بکتا جھکتا اٹھ کر اندر ورک شاپ میں جا بیٹھا کہ اب اس سے آگے ایک پائی کم نہ ہوگی۔ جوتے رکھ دو۔''

شہریار مسکراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے گھس گیا اور پھر بحث شروع کر دی۔ سگریٹ کیس نکالا۔ خود لیا اور سانگ کو پیش کیا۔ سگریٹ لیتے ہی سانگ نے ایک دم چار روپے کم کر دیے۔ مگر بھاؤ ابھی جاری تھا۔

یکایک شہریار کی نظر کونے میں رکھے ہوئے ایزل اور اس پر لگی ہوئی ناتمام پینٹنگ کی طرف گئی۔ اور اس نے سانگ سے پوچھا۔ ''تمہارے یہاں سلک پر پینٹ بھی ہوتا ہے؟''

سانگ اپنی بات ادھوری رہ جانے پر جل بھن گیا۔ ''یہ اس احمق کی حماقت ہے۔'' اس نے لیو چو کی طرف اشارہ کیا۔

''ذرا میں دیکھ سکتا ہوں؟'' شہریار نے پر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

سانگ کو جز بز دیکھ کر اس نے جوتوں کے دام ادا کر دیے۔ مسعود اور ارجمند تو باہر ہی کھڑے تھے مگر گیتی شہریار کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

سانگ رسید کاٹنے واپس کاؤنٹر پر گیا تو لیو چو نے اپنی پینٹنگ شہریار کے سامنے رکھ دی۔ وہ خاموش اور تحسین آمیز نظروں سے اس کو دیکھتا رہا۔ ''تم اس کو بیچتے ہو؟''

''نہیں' میں تو صرف شغلاً یہ کام کرتا ہوں۔''

''اور بھی پینٹ کی ہوئی چیزیں ہیں؟''

''صرف چند ایک' مجھے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے وقت ہی کب ملتا ہے۔'' لیو چو کی آواز میں حسرت دل کی بازگشت تھی۔

''مسٹر لیو چو! اگر میں تم سے یہ نا تمام پینٹنگ خرید لوں۔ میرا مطلب ہے مکمل ہونے کے بعد تو تم اس کی کیا قیمت لو گے؟''

لیو چو سوچ میں پڑ گیا۔

دوسرے لمحے شہریار کو محسوس ہوا کہ لیو چو اس قسم کی پیشکش کے لیے متوقع نہ تھا۔ اس لیے ہکا بکا نظر آ رہا تھا۔ لیو چو نے بولنے کی کوشش کی۔ اس کی آواز میں لکنت تھی اور وہ یہ طے نہ کر پا رہا تھا کہ اس کی کیا قیمت بتائے۔

شہریار مسکرایا۔ ''میں طالب علم ہوں۔ ایسی قیمت بتاؤ جو میں ادا کر سکوں۔''

''ابھی تو یہ نا مکمل ہے۔'' لیو چو نے بات ٹالی۔

''پھر کیا ہوا؟ دو ایک دن میں مکمل کر کے دے دو۔ میں آ کر لے جاؤں' جب کہو۔''

صفدر نہیں چاہتا تھا کہ سانگ کے علم میں اس قسم کا کوئی معاملہ ہو۔ جلدی سے بولا۔ ''آپ مجھے پتہ دے دیجئے' میں خود پہنچا دوں گا۔''

''میرا پتہ؟ آ۔۔۔۔۔۔ اگر تم اس کو جانتے ہو'' اس نے گیتی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تو میں اس کا بھائی ہی تو ہوں۔''

وہ دونوں ہی گیتی کی طرف مڑے۔ وہ کونے میں ایک میز پر رکھی ہوئی کسی چیز کے دیکھنے میں محو تھی۔

ان کو دیکھ کر بولی۔ ''بڑے بھیا پلیز! مجھے یہ لے لیجئے۔''

''یہ کیا ہے؟'' شہریار نے بظاہر ربر کے اس کھلونے کی طرف دیکھا۔

''دیکھئے کتنی پیاری ہے۔'' وہ اس کو چھونے ہی کو تھی۔

''اے بے بی! اس کو مت چھونا یہ ابھی بالکل گیلا ہے۔''

چینی تڑپ گیا۔

''گیلا؟'' شہریار نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں! یہ چو خاندان کے عہد کی رقاصہ ہے اور چاول کے آٹے کو گوندھ کر بنائی گئی ہے۔''

''یہ کس نے بنائی ہے؟''

''میں نے!''

اب شہریار نے بڑے غور سے دیکھا۔ چینی رقاصاؤں کے انداز پر سنوارے ہوئے بال۔ ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں پنکھا۔ بالوں میں سجائے ہوئے پھول۔ ان سب جزئیات کی نفاست اور نزاکت تو ایک طرف تھی۔ رقاصہ کے چہرے پر اس کے طبقے اور دور کی زندہ اور محسوس کیفیت موجود تھی۔

شہریار کا ذہن تعریف و تحسین کے الفاظ سے خالی تھا اور وہ ایک لفظ کہے بغیر سوچتا رہا۔ ''تاریخ تمدن کے یہ قدیم ترین وارث اب بھی بہت خوب ہیں۔''

''کیا تم یہ بھی ہمارے ہاتھ نہیں بیچو گے؟''

''یہ سانگ کی امانت ہے۔ یہ میں نے اس کے حکم سے ایک بہت بڑے یورپین افسر کے لیے بنائی ہے۔''

مگر گیتی مستقل للچائی اور مچلی ہوئی نظروں سے گڑیا کی طرف دیکھتی رہی۔

کوکوا تم فکر نہ کرو میں تم کو دوسری بنادوں گا۔''

''کب؟''

''جلدی''

''کیا واقعی تم اپنا وعدہ پورا کرو گے؟''

شہریار نے پوچھا۔ ''چینیوں کے وعدے اتنے بودے نہیں ہوا کرتے۔ یقین رکھیے دونوں چیزیں پرسوں تک ہر صورت میں مل جائیں گی لیکن ایک بات ہے میرا انتظار آٹھ بجے رات کے بعد کرنا۔ میں اس دکان کا ملازم ہوں۔''

شہریار جس وقت سانگ کی دکان سے آکر موٹر میں بیٹھا تو سوچ رہا تھا۔ ''یہ چپٹے چہروں اور ترچھی آنکھوں والے بونے ذہنی طور پر دیو پیکر ہوتے ہیں۔'' اور پھر اس نے سوچا۔ ''مگر یہ چین کے خیال کے ساتھ ساتھ ہمارے ذہن میں افیون کا تصور کیوں آنے لگتا ہے؟ افیون کی گولیاں نگلنا اور چرس کے دم لگانا ان کا محبوب مشغلہ نہ بن گیا ہوتا تو نہ جانے یہ کیا کر چکے ہوتے۔''

اور لیو چو یعنی صفدر یاسین اپنی نامکمل پینٹنگ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے تصور میں افسردہ نگاہوں' دبیز مخروطی انگلیوں اور گاؤدم کلائیوں والی خاتون دس روپے کا حقیر و بے جان نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''یہ لو' ان کھلونوں کی قیمت۔ اور ہاں سنو! اب ہم دو تین دن میں پلاسٹر کروا کر اس کو گھر لے جائیں گے اب تمہارے تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ حقارت سے مسکرایا۔

''ناحق میں نے کوکو کے اس بھائی سے وعدہ کر لیا۔ مجھے وہاں ان مغرور لوگوں میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اور پھر اس کے کانوں میں اپنی آواز گونجی۔ ''چینیوں کے وعدے اتنے بودے نہیں ہوا کرتے۔''

''ٹھیک ہے' چینیوں کے وعدے اتنے بودے نہیں ہوتے۔'' وہ مسکرایا اور چمڑا کاٹنے کی مشین کی طرف مڑ گیا۔

چاند کی تیرہویں شب تھی۔ دلچسپ اور خنک۔ آس پاس کے بنگلوں میں نیند ڈیرے ڈال چکی تھی۔ اس گھر میں بھی گھر کے بزرگ یا سو چکے تھے یا ضروری کاموں میں مشغول تھے۔ اگلی لان پر چاند کی روشنی میں چند شفاف بستر بچھے نظر آ رہے تھے اور ان سے کچھ پرے ایک نیچے اور بڑے سے تختوں کے چوکے پر کئی لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے۔ سفید چاندنی پر زرد غالیچہ تھا اور زرد ساٹن کے گاؤ تکیے سے لگی ہوئی ان کے درمیان صولت بیٹھی تھی۔ سر سے پیر تک زرد لباس میں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں لچھے اور کرن کا ایک کنگنا تھا۔ اس وقت وہ قطعی شرمائی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک مجبور اور ہاری ہوئی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں دلی افسردگی۔

لڑکیاں بیٹھیں ڈھولک پر غلط سلط ہاتھ چلا رہی تھیں۔ ایک دو بول بھی پورے نہ کرتیں کہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ صولت اور عصمت کے درمیان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شہریار تقریباً لیٹا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ صولت کی کمر میں تھا اور نگاہیں عصمت کے تیکھے اور بے حد سرکش چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ وہ لڑکیوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر اور ہنس ہنس کر مجبور کر رہا تھا کہ ایک گیت تو پورا گا دیں۔ مگر وہ گانے سے زیادہ ہنسنے اور ہی ہی کرنے کے موڈ میں تھیں۔ اس کے سب سے بڑے چچا کی لڑکی مہ جبین نے' جس کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی اپنے قریب ڈھولک سرکائی اور پیاری سی آواز میں بول اٹھائے۔

''ہریالے بنے میرے محلوں میں مت آنا

وہاں بیٹھا۔۔۔۔۔۔۔''

اور ایک گڑبڑ سی پھیل گئی' اے! بتاؤ نا کس کا نام لیتے ہیں؟ اے بولو کون بیٹھا تھا؟'' کسی کو یاد ہی نہ تھا۔ مہ جبین نے دوبارہ سر

اٹھائے وہاں بیٹھا پہرہ میری جان!

شہریار نے اپنی خالہ کی لڑکی مریم کی پیٹھ پر ایک دھموکا دیا۔

''کیا انگریزی سر نکال رہی ہو۔ میموں کی طرح کیکیں بھر رہی ہے بیٹھی۔''

''اونہہ بھئی اللہ!'' مریم بڑبڑائی۔

عصمت نے ایک نظر شہریار کو دیکھا۔ وہی منجھلے ابا کا سا ڈیل ڈول اور ویسی ہی بانکی سجیلی شکل۔ دودھ سا اجلا کرتا اور اس کا کڑھا ہوا گلا کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ گلے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی اسی کو تک رہا تھا۔

''اے بڑے بھیا! بٹن تو لگا لیجئے پورے۔'' عصمت نے سٹپٹا کر ٹوکا۔

''لگ جائیں گے وہ بھی۔ چلو تم اپنی ڈیوٹی پوری کرو۔'' شہریار نے اس کو گھرکا۔ ''میں کہتا ہوں آخر تم لوگوں کے گلے کیوں مارے گئے ہیں۔ برسات کی ہوا لگ گئی کیا؟''

''ہاں بھئی شروع کرو۔'' مہ جبین نے پھر مستعدی دکھائی۔

ہریالے بنے میرے باغوں مت آنا

''واہ بھئی واہ بس ایک ڈومنی ہے کام کی۔'' شہریار نے مہ جبیں کو شاباش دی۔

''اے واہ' کچھ ہوش ٹھکانے ہیں؟'' اس وقت تو خیر ہم خوب گائیں گے۔ تمہاری شادی میں البتہ منہ میں گھنگنیاں ڈال لیں گے۔ کیوں بھئی عصمت! تم گاؤ گی ان کی شادی میں؟''

عصمت کے بولنے سے پہلے ہی شہریار بول پڑا۔ ''تم ہی گاؤ گی! مجال ہی اس کی۔ گا کر دیکھے۔ گلا کاٹ کر پھینک دوں گا۔''

''کدھر پھینک دو گے؟''

''یہیں کہیں' اچھا بس بک بک نہ کرو' شروع کرو۔''

سب لڑکیوں نے بول اٹھائے۔

ہریالے بنے میرے باغوں مت آنا

ٹن ٹن' سائیکل کی گھنٹی کئی بار بجی۔ تارو والا ہوگا۔'' لڑکیوں نے مع شہریار کے سوچ لیا۔

اس کے بھاری قدموں کی چاپ بھی کسی نے نہ سنی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتا آیا اور ایک بار اس نے سوچا کہ واپس چلا

جائے۔مگر شہر یار پہلے ہی کہہ آیا تھا۔''چینیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔''ان چیزوں کو وہ بہر حال پہنچا کر رہے گا۔''اس نے شہر یار کو دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔اور وہ بے خیالی میں آگے بڑھتا چلا آیا۔

''چائنامین! چائنا مین''اس نے وہیں ٹھٹک کر دبی ہوئی آواز نکالی۔

''اوئی' ہائے اللہ! میں مرگئی''کہہ کر سوائے صولت کے تقریباً ہر لڑکی شہر یار پر اوندھ گئی۔

صولت بچپن سے ہی سنجیدہ اور لیے دیے رہتی تھی۔لڑکیاں بولائی ہوئی آوازوں میں پھسار ہی تھیں۔''اے ہے کون ہے؟ جنات ہیں؟اوئی اللہ' اب کیا ہوگا؟''

ایک دم شہر یار کو یاد آ گیا۔وہ ان سب کو پرے دھکیلتا ہوا اٹھا۔''کوئی آیا' کھٹ سے ہوا اور تم لوگوں کا دم نکلا۔وہ چینی لڑکا ہوگا۔''

وہ اس کے قریب گیا۔لکڑی کے نفیس اور خوبصورت سے گول ڈنڈے پر سلک پر بنائی ہوئی سینری لپٹی ہوئی لیو چو کے ہاتھ میں تھی اور ایک نازک سا ڈبا۔

''خوب' تم نے وعدہ پورا کیا۔مجھے امید نہ تھی۔''

شہر یار نے جلدی جلدی سلک کو کھول لیا۔چاند کی روشنی میں باریک موقلم سے بنائے ہوئے وہ دھیمے اور افسردہ نقوش خاطر خواہ طور پر واضح نہ ہو پا رہے تھے۔

''اس کی کیا قیمت طے کی ہے تم نے؟''شہر یار کا دل عش عش کر رہا تھا۔لیکن چہرہ بے نیاز تھا۔

''قیمت؟''اس پر تو واقعی اس نے اب تک غور نہ کیا تھا۔وہ تو فقط اپنا وعدہ نبھانے کی دھن میں تھا۔قیمت سوچنے سے پہلے اس کو یاد آ گیا کہ اس گھر میں اس خوبصورت لڑکی کی شادی بھی تو ہو رہی ہے جو اپنی شادی سے مطمئن نہ تھی اور جسے اس نے نصیحت کے طور پر چند اشعار لکھ کر دیئے تھے۔

وہ چونک کر بولا۔''اس کی کوئی قیمت نہیں۔''

''کیوں؟ تو پھر میں نہیں لیتا۔''

''یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔یہ دلہن کے لیے اس کی شادی کا تحفہ ہے۔اگر مجھے اجازت دو تو میں اور مبارکباد کے چند لفظ لکھ دوں۔''

''ضرور! کیا اپنی زبان میں لکھو گے؟''

''ترجمہ بھی لکھوں گا۔'' اس نے اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ پھر کاغذ نکال کر ڈبے پر رکھا اور ٹارچ جلا کر سامنے رکھ لی۔ اس کی پنسل بڑی تیزی اور مہارت سے چینی حروف بنا رہی تھی اور پھر اس نے انگریزی میں ترجمے کی مختصر عبارت لکھی۔

خوبصورت اور نوعمر دلہن! لاؤ تسے کی نظم کے یہ بول بھی تمہاری نذر ہیں۔

دوسروں کو جان لینا دانائی ہے۔

لیکن اپنی حقیقت سے باخبر ہونا روشن ضمیری کی دلیل ہے۔

انسانوں کو زیر کر لینے والے کو غالب کہا جاتا ہے۔

لیکن نفس امارہ کو مغلوب کر لینے والا

درحقیقت قوی و قادر کہلانے کا مستحق ہے۔

کاغذ اس نے اسی سلک کے ساتھ پن سے لگا دیا اور ڈبا شہریار کی طرف بڑھایا۔ ''اور یہ رہی بے بی کی رقاصہ''

''اوہ!'' شہریار کو یہ نوعمر پردیسی لڑکا بے حد دلچسپ نظر آ رہا تھا۔ وہ عام پھیری کرنے والے اور جوتوں کی دکان پر کام کرنے والے چینیوں سے بہت مختلف معلوم ہو رہا تھا۔

''چلو، پھر یہ تحفہ دلہن کو تم خود ہی دے دو۔ وہ بھی یہیں بیٹھی ہے۔ اس وقت لڑکیاں اس کی شادی کے گانے گا رہی ہیں۔''

اتنی بہت سی اجنبی اور گھریلو لڑکیوں کے سامنے جاتے اس کو جھجک سی آئی۔ پھر بھی وہ آگے بڑھا۔

''لو بھئی صولت! اپنی شادی کا سب سے پہلا اور شاید بہترین تحفہ'' شہریار نے صولت کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

صولت نے شاہانہ لیکن افسردہ نگاہوں سے اس لڑکے کی طرف دیکھا جو چند ماہ قبل اس کو گستاخی سے مشورہ دے گیا تھا۔ ''میری مانو تو اس چیانگ کائی شک کی شادی اپنی بہن گیتی سے کروا دو۔'' کتنا بدتمیز ہے یہ! صولت نے سوچا اور پھر اسی لمحے اس کے کانوں میں اس کی ٹھہری ہوئی آواز گونجی۔ ''مجھے اپنے نوشتہ تقدیر کو بہر نوع برداشت کرنا چاہیے۔''

مشرق بعید کی تہذیب کا وہ ادنیٰ سا نوعمر نمائندہ دوزانو ہو کر دلہن کے سامنے جھکا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر وہ تحفہ تھا۔ عصمت نے تصویر دیکھنے کے شوق میں لپک کر پورچ کی بتی جلا دی تھی۔

نومشق فنکار نے زرد لباس والی اس دلہن کو دیکھ کر سوچا۔

''جیسے کسی نے گگن کے تارے چرا کر چاول کے آٹے میں ملا دیئے ہوں اور اس کو دودھ سے خوب گوندھ کر یہ دلہن بنائی ہو۔''

شکریے کا لفظ سنے بغیر ہی گھبرا کر وہاں سے ہٹ آیا۔ بتی بجھادی گئی اور ڈھمک ڈھمک! ڈھولک ڈھولک پھر دھمکی۔

''میں ریشم کا لچھا' میں سونے کا تارا۔''

اس دفعہ بول سنجیدگی سے گائے جا رہے تھے۔ آوازیں سریلی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ شاید وہ افسردہ اور مغموم سی تصویر دیکھ کر ان کے اندر نغمہ کی روح بیدار ہوگئی تھی۔ شہریار اس کے ساتھ ساتھ سائیکل تک گیا تھا۔ وہ ٹھٹکا اور بے حد جھجکتے ہوئے بولا۔ ''اس بول کا مطلب پوچھ سکتا ہوں؟ یہ تو بڑے ہی میٹھے بول ہیں۔''

شہریار نے نرمی اور محبت سے انگریزی میں دہرایا۔

''میں ریشم کا لچھا' میں سونے کا تارا۔'' اور پھر خود ہی الجھ کر بولا۔ ''ان بولوں کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ واقعی بڑے میٹھے بول ہیں۔''

جھلمل کرتے کنگن کے تارے واقعی چاول کے آٹے اور دودھ میں گندھے ہوئے نظر آنے لگے گویا کہ وہ کم سواد چینی لڑکا ان مٹھاس بھرے بولوں کے رس اور روح کو لے اڑا تھا۔

شہریار نے پوچھا۔ ''تمہارا نام لیو چو ہے نا؟''

''میرا نام صفدر یاسین ہے۔ چینی مسلمانوں کے ناموں کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک چینی اور دوسرا اسلامی۔''

''اچھا' تم کسی وقت پھر آنا۔''

''کوشش کروں گا۔''

اس کے آنے یا نہ آنے سے شہریار کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ وہ پھر سے جا کر لڑکیوں کے جھرمٹ میں جا بیٹھا۔

''اب کون سا گیت گایا جائے؟ اب کیا گائیں؟'' لڑکیاں ایک دوسری سے صلاح کر رہی تھیں۔

''صولت سے پوچھو۔'' شہریار نے مشورہ دیا۔

''بتایئے بتایئے' صولت آپا'' عصمت نے اس کو عاجز کیا۔

صولت نے نظر بھر کر دیکھا۔ ان کے پلنگوں سے اچھے خاصے فاصلے پر بچھے ہوئے پلنگ پر اپنے کاموں سے فرصت پا کر ابھی ابھی اماں بیگم آکر لیٹی تھیں۔ اس نے جھک کر عصمت کے کان میں کہا۔ ''اچھا پھر وہی بڈھے والا گیت گا دو جو تم گاتی ہو۔''

''ارے ہاں!'' عصمت نے جھٹ ڈھولک سنبھالی اور اپنی بے سری سی آواز میں بول اٹھائے۔

میری قسمت میں بڈھا لکھاری

سب تو گئے بازار کو موا سنگ چلا ری

سب تو لائے ککڑی

موا لکڑی لایا ری

لڑکیاں اور شہریار ہنسی کے مارے لوٹ گئے۔
عصمت نے پھر آواز اٹھائی۔

سب تو گئے شکار کو موا سنگ چلا ری

سب تو لائے تیتر مار کے

سب تو لائے تیتر مار کے

موا کوا لایا ری

شہریار نے ایک زور کا قہقہہ مارا۔
''پاگل تو نہیں ہوگئی؟ اری یہ کہاں مل گیا تھا تجھے؟'' اور پھر اچانک ہی رعب دار آواز میں بولا۔ ''سن رہا ہوں تمہاری سب بکواس۔''

عصمت نے ڈھولک پر سے نظریں اٹھائیں اور اس کی مسکراتی ہوئی نگاہیں شہریار سے مل گئیں۔ صولت نے بڑی خاموشی سے اپنے ہنستے ہوئے تندرست اور نوجوان بھائی کے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اس کے بے حد قریب بیٹھا تھا اور اس کے بالکل قریب عصمت بیٹھی تھی۔ اس کی اور اس کے بھائی سے کہیں کم تر شکل اور حیثیت والی عصمت۔ مسکرا مسکرا کر بڑی مالکانہ اور مختار نظروں سے اس کے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

صولت کو خواہ مخواہ ہی شک ہوگیا کہ وہ اس کو جلانا چاہ رہی تھی اور اب اس کو عصمت سے انتہائی نفرت آرہی تھی۔

صولت کے ماموں کی دبلی پتلی اور سب سے کم عمر لڑکی بڑی نرم اور دھیمی آواز میں انگریزی میں عصمت سے بولی۔ ''ایک بار اور سناؤ' میں نے ایسے گانے کبھی نہیں سنے تھے۔''

عصمت نے بلا تکلف پھر شروع کر دیا۔

میری قسمت میں بڑھا لکھاری

اماں بیگم اپنے پلنگ پر لیٹی لیٹی نہ جانے کیوں بے آرام ہونے لگیں۔صولت کا سر جھک گیا تھا۔ٹپ! ٹپ! دو گرم گرم قطرے شہر یار کے ہاتھ پر گرے۔

''ہائیں! ارے! یہ کیا بات ہوئی صولت آرا؟'' اس نے اس کو گلے لگا کر چمکارا۔

صولت نے دبی دبی سی سسکیاں لیں۔

اور شہر یار نے دوسرا ہاتھ اٹھا کر عصمت کے منہ پر رکھ دیا۔

''اچھا' اچھا بس کرو۔''

اور اسی آن اماں بیگم نے قہر آلود نظروں سے شہر یار کو گھورا۔''خبر ہے کیا بجا ہے؟ گیارہ بج چکے ہیں اور تم اودھم مچوار ہے ہو۔اب تم اتنے ننھے سے تو ہو نہیں۔معلوم ہے کل کا دن بیچ ہے۔رات بھر جاگو کل دن بھر سونا۔باوا چچا شکار کھیلتے پھریں۔''

وہ اپنے بھائی اور بہنوئی کا نام صاف اڑا گئیں۔''بختیار کہاں ہے؟''

''بختیار کو بخار ہو گیا ہے۔دوسری طرف سو رہا ہے۔''عصمت بول اٹھی۔

''ہو گیا ہے تو میں کیا کروں؟'' وہ عصمت پر برس پڑیں۔''تم لوگ تو شور میں کمی نہ کرو۔تم کو اتنا بھی ہوش نہیں کہ دادی کی خبر لو۔یا کسی گھڑی آ کر کام میں ہاتھ بٹا لو۔''

حالانکہ عصمت نے آج دن بھر بیٹھ کر جوڑے استری کروائے اور ان میں ٹانکے لگوائے تھے۔

سب لڑکیاں چڑیوں کی طرح بھرا مار کر ادھر ادھر غائب ہو گئی تھیں' سوائے صولت' شہر یار اور عصمت کے۔''

''اماں بیگم نے صولت کو گھورا اور پھر نرمی سے بولیں' کیوں؟ تم کیسی ہو رہی ہو؟ اب تم اپنے آپ کو اس قدر تو نہ تھکا لو۔''

وہ اب خاموش ہو چکی تھی۔پورے سکون سے' آہستہ سے اٹھی۔نرم مخملی جوتی میں پیر ڈالتے ہوئے اس نے سوچا۔''میں نے ٹھیک ہی کیا جو یہ گیت ان کو سنوا دیا۔مگر ان کو اتنا برا کیوں لگا؟''

عصمت اٹھ کر جا چکی تھی۔

شہر یار اماں بیگم کے پیچھے سر جھکائے چلا گیا۔

صولت دل ہی دل میں ہنسی۔''چیانگ کائی شیک اماں بیگم کے قریب بیٹھا ہوا کیا لگا کرے گا۔''

اور جب اس نے تخت کے نیچے دوسرا پیر اتارا تو کسی نے اس کا پیر پکڑ لیا۔ اس کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو چلا اٹھتی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ پھر بھی اس نے سکون سے نیچے جھک کر دیکھا۔ تخت کے نیچے گیتی لیٹی تھی۔ اس نے اس کا پیر پکڑ رکھا تھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے جھک کر اس کو تخت کے نیچے سے کھینچا۔

''لاؤ میری گڑیا۔''

''کیسی گڑیا؟''

''چائنامین نے جو دی ہے۔''

''تم کہاں تھیں؟''

''یہیں تھی۔''

''کیوں؟''

''گانا سن رہی تھی؟''

اگر کبھی اور وہ یوں بستر سے آ کر پڑ گئی ہوتی تو وہ اس کے کان مسلتی اور اماں بیگم کی حضوری میں لے جاتی۔ لیکن اس نے نئی بات سوچی۔ ''ٹھیک ہے۔ لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بچپن میں قاعدے قانون نہ توڑیں تو پھر چیانگ کائی شک بیاہ کر لے جاتے ہیں ان کو۔''

اس نے اپنے کمرے میں جا کر مٹھی میں دبا ہوا کاغذ کھولا۔

''آج کیا نصیحت کی ہے کنفیوشس نے۔'' اس نے طنز سے سوچا۔ نہ جانے کیوں اس کی طبیعت میں تلخی اور حقارت کا عنصر غالب آتا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی پڑھا۔

دوسروں کو جان لینا دانائی ہے۔

لیکن اپنی حقیقت سے باخبر ہونا روشن ضمیری کی دلیل ہے۔

انسانوں کو زیر کرنے والے کو غالب کہا جاتا ہے۔

مگر نفس امارہ کو مغلوب کرنے والا

درحقیقت قوی و قادر کہلانے کا مستحق ہے۔

''اپنی حقیقت سے باخبر ہونا روشن ضمیری کی دلیل ہے۔ اس نے دل میں دہرایا۔

''پاگل ہو تم تو صفدر یاسین!'' وہ حقارت سے مسکرائی۔

اور اس رات صفدر کو اپنے بستر میں لیٹے لیٹے تنہائی سی محسوس ہوئی۔ بہت مدت کے بعد اس نے ایک گھر اور ایک خاندان کے لوگوں کو ہنستے بولتے دیکھا تھا۔ اس کا دل بھی اپنے گھر اور خاندان والوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

جب وہ رخصت ہو رہی تھی تو اس کو یوں محسوس ہوا کہ آج وہ اس گھر کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی چھوڑ چلی ہے۔

اب اس خاموش لبے دیئے رہنے والی' بے حد حساس اور سوچنے سمجھنے والی لڑکی سے کہ جس کو صولت جہانگیر کہا جاتا تھا' بیگم صولت آصف جاہ کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ اور اب

دل وحشی تیرے جینے کی ادا یہ ہوگی

اس نے بہت اطمینان سے بیلے اور چمبیلی کے پھولوں سے سجی ہوئی کار میں اپنے چیانگ کائی شیک کے پہلو میں بیٹھے ہوئے سوچا تھا۔ اس لیے کہ اب وہ مکمل طور پر پرسکون تھی۔ اس نے اس وقت اپنے بال خود سنوارے تھے اور اپنے ہاتھوں سے ہلکا ہلکا سنگھار کیا تھا۔ آبی سلک کی ساری میں وہ آسمانی حور نظر آ رہی تھی۔ اپنے کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنی الماریوں کو خود اپنے ہاتھوں سے تالے لگائے تھے اور میز پر رکھے ہوئے فریم میں سے افسردگی سے تالے لگائے تھے اور میز پر رکھے ہوئے فریم میں سے افسردگی سے مسکراتی ہوئی تصویر کو نکال کر الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیا تھا جس میں اس کے چند پرانے جوتے بھی رکھے تھے۔

اور جوں ہی کار پھاٹک کے باہر رینگی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنے گھر کے اس خوبصورت باغ کے عین وسط میں اس کو شعلے سے بھڑکتے نظر آئے جن کی لپیٹ میں اس کا لڑکپن اور معصومیت آ چکے تھے۔ تعلقات اور تصورات کے بے شمار ہیولے اور یادوں کے ان گنت ہجوموں کی خاموش چتائیں اسے ان شعلوں کی نذر ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ آگ کی ان بھڑکتی ہوئی زبانوں کے درمیان زبیر کا مستحکم وجود میں افسردگی سے مسکراتا نظر آ رہا تھا اور اس قافلے کے عقب میں سب سے آخری ہیولی اس چینی لڑکے صفدر یاسین کا تھا۔ جو بڑی سپردگی کے عالم میں بلندیوں پر سے دھیرے دھیرے سرکتا چلا آ رہا تھا۔ اپنے بشاش چہرے اور شانت آنکھوں سمیت اس کے دونوں ہاتھوں میں وہ کاغذ تھا جس پر اس نے لکھا تھا۔ ''اپنی حقیقت سے باخبر ہونا روشن ضمیری کی دلیل ہے۔''

اپنے کنوار پن کی خوبصورت اور احمق دنیا کو یوں بھسم ہوتے اس نے بڑے سکون سے دیکھا اور نگاہیں پھیر لیں۔ شام کا سہانا وقت تھا اور سڑکوں پر کئے ہوئے چھڑکاؤ سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چیانگ کائی شیک نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے تھری کاسل کا سگریٹ جلا لیا۔ وہ ہمیشہ ہی یہ سگریٹ پیتا تھا' لیکن صولت کو اس وقت اس کی مہک مدہوش کن اور خواب آور معلوم ہوئی

تھی۔اس نے خود اپنی مرضی سے اپنی خوبصورت پیشانی آصف جاہ کے چوڑے چکلے اور مضبوط شانے پر ٹکا دی تھی اور اس کی اس حرکت میں اماں بیگم کے اصرار یا ترغیب کو قطعی طور پر دخل نہ تھا۔

اور عین اسی وقت اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے زبیر نے چونک کر سر اٹھایا' بائیں ہاتھ کی کلائی اونچی کر کے وقت دیکھا اور پھر اپنے نا تمام ایڈیٹوریل پر جھک گیا۔ان دنوں وہ ڈبل شفٹ میں کام کر رہا تھا اور بے حد تھک جاتا تھا۔

◆◆◆

فصل دوم

باب ۱۳

صولت چلی گئی تو گھر بھی خالی ہونے لگا۔

سب سے پہلے تو اماں بیگم کی ماں، بہن اور بھائی بھاوج ہی سوار ہوئے اور پھر شہزادو صاحب کا کنبہ روانہ ہوا۔ ہاشمی بیگم تو رخصتی کے دوسرے ہی دن سے اپنا سامان باندھے بیٹھی تھیں اور ہر موٹر کی روانگی پر اصرار کرتیں کہ بھئی ہم کو تو فقط اسٹیشن تک پہنچا دو۔ ہم خود سوار ہو جائیں گے آنند پور دور ہی کتنا ہے۔ مگر جہانگیر مرزا ہر مرتبہ تسلی دیتے، گھبرائی کیوں جاتی ہو۔ بس آج اور رک جاؤ کل صبح تم کو موٹر سے پہنچوا دیں گے۔"

ان کی والدہ کو تو اپنے ٹھکانے پر چین آتا تھا۔ اور اسی لیے ان کو جانے کی جلدی تھی۔ دوسرے عصمت کے کالج کا بھی ہرج ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ عین وقت پر عصمت مچل گئی کہ اپنی ماں کو لے کر جاؤں گی۔

"ہاں، ہم بھی چل رہے ہیں۔" انہوں نے منہ پھلائے پھلائے اپنی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا تھا اور پھر وہ اپنی ساس کے قریب تخت پر بیٹھ کر بولیں۔" آپ کی صافی میں پان لپیٹ دوں؟" دیکھئے اماں جان! آپ گواہ ہیں۔ ہم نے کسی بات کا جواب نہیں دیا ہے الٹ کر۔ مگر ہم کو منجھلی بھابی سے یہ توقع نہ تھی۔"

"اب جہاں اتنا خاموش رہی ہو کچھ دیر اور زبان بند رکھو۔ بیوی ہماری رائے کبھی نہ تھی۔ مگر اسی خیال سے کچھ کہتے نہ بنتا تھا کہ تم سوچو گی کہ اماں جان کی مرضی نہیں ہے۔ ارے بیٹا! میرے لیے دونوں آنکھیں برابر ہیں۔"

اپنی ماں کے منہ سے جانے کا سن کر عصمت نے جھپا جھپ سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ بیچ والے کمرے میں صولت کی رخصتی کے دوسرے دن صبح کو جو ہلکا سا معرکہ ہوا تھا اس کی نہ شہریار کو خبر تھی اور نہ عصمت کو۔ البتہ عصمت کو یہ احساس ضرور تھا کہ اس مرتبہ بڑی اماں بلاوجہ ہی اس سے بیزار تھیں۔ اس کے ہر کام میں عیب نکالتی تھیں۔ اس کی ذرا سی بات پر تنتنا اٹھتی تھیں۔ اس نے

بڑے خلوص سے شادی کا کام کیا تھا لیکن تعریف کرنے کے بجائے ہر بار اس کے کان میں یہی صدا پڑتی تھی۔ ''اے ہے' عصمت سے ذرا سا یہ بھی نہ ہوا۔''

ساتھ ہی وہ بلاوجہ شہریار کو بھی گھرکتی رہی تھیں۔

''ہاں تم کو کیا فکر ہے۔ تم کو ٹھٹوں سے ہی فرصت نہیں۔''

یہاں تک کہ رنگ کھیلا گیا تو شہریار نے مریم اور اپنے ماموں کی لڑکی عذرا کی اور مہ جبیں آپا کی گت بنائی تو چپ رہیں اور جیسے ہی رنگ عصمت پر پھینکا تو وہ ناراض ہونے لگیں۔ ''چلو شہریار! بس کرو' مجھے نہیں پسند یہ ہڑونگا پن۔ جاؤ باہر جا کر لان پر کرسیاں لگواؤ۔''

بس اس کو تو اتنی ہی خبر تھی پر یہ معلوم نہ تھا کہ اپنی روانگی سے پہلے بڑی اماں کی والدہ نے اس کی امی کو باقاعدہ بٹھا کر یہ نصیحت کی تھی کہ بیوی تم کیا سوچ رہی ہو۔ تم بھی اب عصمت کی فکر کرو۔ ماشاء اللہ باپوں والی لڑکیاں تو بٹھائی نہیں جا رہی ہیں۔ اور تم ہو کہ اپنی لڑکی کو وکیل بیرسٹر بنا رہی ہو۔

اور انہوں نے یہ سوچ کر کہ شاید یہ شہریار کے رشتے کے پیغام کی تمہید ہے' ہنس کر کہا۔ ''فکر تو ہے' پر میرے کون سے لڑکے ہیں۔ بی اے تو کر ہی لے۔''

''بس بہن اب اس کا وقت نہیں ہے۔'' جٹھانی کی بہن کے تیور کچھ اور کہہ رہے تھے۔ ''کوئی مناسب اور حسب حیثیت لڑکا ملے تو فوراً کر دو۔''

''ہاں یہ بھی تو ہے۔'' انہوں نے کھوئے ہوئے انداز اور بجھتے ہوئے دل سے کہا۔ ''ملے نا تب''

''لڑکے تو بہت ہیں۔'' شہریار کی ممانی نے بڑے مصالحانہ اور بھولے انداز میں دھیرے سے اطلاع دی اور پھر اپنے میاں کی فرم کے ایک ملازم لڑکے کی شرافت اور لیاقت کی تعریف کھسر پھسر کر کے ان کے گوش گزار کرنے لگیں۔ اس لیے کہ وہ ان کے بہت نزدیک بیٹھی تھیں۔ ''فی الحال اس کی تنخواہ دو سو ہے' بی اے کرنے کا ارادہ ہے۔ کرلے گا تو گریڈ بھی بڑھ جائے گا۔ اے! میں تو کہتی ہوں کہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اکیلا ہے۔'' انہوں نے اکیلے پن پر زور دیا۔ ''جو ہم کہیں گے کرے گا' آپ کے بھائی تو اس پر بہت مہربان ہیں۔''

اور پھر اونچی آواز میں کہا۔ ''آپ سوچ لیجئے' شام تک جواب دے دیجئے تو میں جاتے ہی اس سے طے کروا دوں۔ اچھے لڑکوں کو آج کل چھوڑتا ہی کون ہے۔''

''اے بھئی! ہم نے تو ایس لیے جو ملا کر دی۔'' بڑی اماں نے بھنویں تان کر کہا۔ ''بات یہ ہے کہ ہماری لڑکی میں ایسے کون سے لال جڑے ہیں جو ہم یہ سب سوچتے (حالانکہ صولت عصمت سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی) اور پھر بھئی ہمارے آگے تو ایک دو نہیں سب ہی ہیں۔ اب اس سال شہریار کو ولایت بھی بھیجنا ہے اور اللہ خیریت سے پانچ سال کٹوا دے تو ان کی شادی بھی کرنا ہے۔''

''خدا ساتھ خیر کے کرنا نصیب کرے۔ مگر ایک بات کہے دیتی ہوں' جب تک لڑکا واپس نہ آ جائے تم کہیں اس کی نسبت ناتا نہ کرنا۔ برسر روزگار لڑکے کو رشتے ہی اور قسم کے ملتے ہیں۔''

شائیں شائیں' دھائیں دھائیں' عصمت کی امی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی جٹھانی کی ماں کا منہ نہیں آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ ہے جو ابلتے ہوئے لاوے اور سلگتے ہوئے پتھروں کی بارش کر رہا ہے اور ان کے ارمانوں کی ہری بھری کھیتیاں بھسم ہوئی جاتی ہیں۔ لیکن لاوا ابلتا ہے تو پھر پوری طرح ابل کر رہتا ہے۔ اچانک ہی انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ''بیٹی! میں تو سیدھی صاف بات کہتی ہوں' ہمیں یہ چچا پھوپھی' گود پیٹ کے رشتے نہیں بھاتے۔ تم بھی سمجھو اب یہ زمانے نہیں رہے۔''

ان کی اس بات کا جواب انہوں نے ہاتھ چھڑا کر یہ دیا تھا کہ آپ کے جتانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود سمجھتی ہوں اور کمرے سے نکل آئی تھیں۔

''کچھ اور سنا آپ نے؟ اے ہم پر حسین وقت پڑا ہوا تھا۔ نرغے میں لے لیا تھا سب نے۔'' انہوں نے پپڑائے ہوئے خشک ہونٹوں سے اپنی ساس کے پاس بیٹھ کر کہا اور چپکے چپکے سب سنا ڈالا۔

جٹھانی کی بھاوج نے ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر کہا۔ ''آپ کیوں رنج کرتی ہیں۔ اچھی لڑکیوں کو لڑکوں کی کمی نہیں۔ آپ خالہ جان سے بھی مشورہ کر لیجئے۔ میں جاتے ہی بات کروں گی۔''

''نہیں بیوی' کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو بیوقوف ہیں۔ جہاں تقدیر لڑی ہوگی وہیں ہو جائے گا۔ ان کو لڑکوں کی کیا کمی ہے۔ خاندان میں کچھ کم لڑکے ہیں۔'' ان کی ساس نے رکھائی سے کہا۔

''خاندان والے تو حیثیت چاہتے ہیں۔ فضول میں لڑکی کو نیچا سمجھتے ہیں۔'' شہریار کی ممانی نے جتایا۔

''نیچا سمجھنے والوں کو ہم خود نیچا سمجھتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ عصمت کو اور لڑکوں کی کمی یہ کس نے کہہ دیا تم سے۔'' وہ ہنس پڑی تھیں۔

اور جب یہ معرکہ ہو رہا تھا تو باہر والے برآمدے میں کھڑی ہوئی عصمت کے شانے جھنجھوڑ کر شہریار نے کہا تھا۔ ''دیکھ لیا عصمت آرا لڑکیوں کا انجام؟ اب تم بھی اپنے بوریے بستر کی خبر لو۔ پڑھائی وڑھائی ختم۔ بس اب گھر کا دھندا سیکھو۔ اب کالج جانا بند کرو۔''

''بڑے آئے' کیوں بند کروں؟ مجھے بی اے کرنا ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں' میں زیادہ پڑھی لکھی نستعلیق لڑکیاں نہیں پسند کرتا۔''

''آپ کی پسند کی پروا کسے ہے؟'' وہ ہنس پڑی۔

''ذرا میری طرف دیکھ کر پھر سے تو کہو۔''

اور وہ ہنستی ہوئی اندر بھاگ آئی۔

باب ۱۴

ٹن ٹن۔۔۔۔۔۔۔دور کہیں گھڑیال نے پانچ بجائے تھے۔وسط نومبر کی یہ شام خنک خنک اور خاموش تھی۔اس نے دھیرے سے غسل خانے کا دروازہ کھولا' ادھر ادھر دیکھا اور چپکے سے نکل کر غسل خانے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔اس کی نظر کے سامنے سبزیوں کی کیاریاں تھیں اور بانس کے ٹھاٹروں پر پھیلی ہوئی سیم کی بیلیں۔سیڑھیوں کے بائیں جانب گندے پانی کی حوضی تھی۔کائی زدہ اور گندے پانی سے لبریز جس کی سطح پر بالائی کی طرح استعمال شدہ صابن کی جھلی لرز رہی تھی۔سبزی مائل سفید سفید شکن آلود جھلی۔

اوہ!اس کا جی چاہا کہ وہ مٹی کی سکوری میں اس جھلی کو آہستہ آہستہ سمیٹ لے اور مزے سے بالائی بیچے۔۔۔۔۔۔۔مگر وہ کائیں! کائیں!ایک لخت ہی اس کی توجہ کووں کی قطار کی طرف مبذول ہو گئی۔جو بسیرے کے لیے جا رہے تھے۔اونچے اونچے درختوں کی سبز کاہی چوٹیوں کے مقابل نیلے آسمان پر منڈلاتے ہوئے سیاہ سیاہ کوے۔

''کاش!مجھے کوئی کوا بنا دیتا تو بھی مزے ہی میں رہتی۔چیل تو کوئی خاک بنائے گا۔''

اس کو چیل کی پرواز بہت پسند تھی۔وہ گھنٹوں گھنٹوں چت پڑی حسرت سے دھیرے دھیرے بلندیوں کی طرف جاتی ہوئی چیلوں کو دیکھا کرتی۔بالکل یہ معلوم ہوتا کہ اڑ نہیں رہی بلکہ تیر رہی ہیں۔بس پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہی چلی جا رہی ہیں۔

''اے ہے!ہمارے نصیب میں تو کوا بننا بھی نہیں۔'' اس نے کڑھ کر سوچا اور فوراً ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں ناچنے لگا۔

''یہ اماں بیگم نہ جانے کون سے اوٹ پٹانگ نمونے سویٹروں میں ڈالا کرتی ہیں۔اور جو میری بات مانیں تو بس مجھے ایسا ہی سویٹر بنا دیں۔بس ہرا بورڈ ہو اور باقی کا سب نیلا ہو اور آگے تمام میں چھوٹے چھوٹے' کالے کالے کوے ہوں۔مگر ان سے کون فرمائش کرے' جھڑکیاں دینے لگیں گی۔یا پھر سنی ان سنی کر دیں گی۔اونہہ!وہ تو کوئی بات سنتی ہی نہیں۔''

اچانک ہی اس کو پھر پانی کی حوضی پر تیرتی ہوئی صابن کی جھلی کا خیال آ گیا۔ ''کیسے مزے سے سکوریوں میں بھر کے بالائی بنا کر بیچی جاسکتی ہے' پر خریدے گا کون؟ جو ارجمند کے ہاتھ بیچنے کا نام بھی لیا تو اس کی تو گھگی بندھ جائے گی۔ جیسے سچ مچ ہی تو بالائی بنا کر کھانا ہے۔ اور مسعود بھی تو چلا گیا۔ اتنی کم بخت ہیں ہاشمی آپا کہ بس اس کو لے کر ہی ٹلیں۔ کتنا روک روک کر رکھا' ابا میاں اور اماں بیگم نے۔ دو مہینے بعد ہی بھاگ گئیں۔

واقعی دو مہینے کی مدت بھی کوئے مدت ہوتی ہے۔ کتنے ہی کام اور اسکیمیں ادھوری پڑی رہ گئیں۔

اسی پچھلی طرف ترکاریوں کے باغ کے ایک کونے میں انہوں نے مل کر چھوٹا سا کنواں کھودنا شروع کیا تھا اور باورچی خانے والا ڈرامہ بھی صرف ایک مرتبہ کی ریہرسل کے بعد اسٹیج نہ ہو سکا تھا۔ جس میں وہ خود بڑھیا بنی تھی' مسعود بوڑھا لکڑ ہارا اور چنا حاتم طائی۔ او ارجمند بیگم ڈرامے میں بھی بادشاہ سے کم عہدہ قبول کرنے پر تیار نہ ہوئی تھیں۔

''اے بھئی! مسعود کے چلے جانے سے تو زندگی ادھوری سی رہ گئی۔ مگر ایک بات ہے کہ مسعود لڑتا بہت تھا۔ چلو خیر کوئی بات نہیں۔ ہاں' تو بھئی کوے! تو کووں کا کسی نہ کسی چیز پر بننا بہت ضروری ہے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ میں لیو چو سے کہوں گی کہ بھئی تم مجھے ایک کموڈو بنا کر لا دو۔ ہاں بس سبز اور نیلا ہو اور اس کے گلے سے لے کر نیچے تک کالے کالے کوے بنے ہوئے ہوں۔ مشکل یہ تھی کہ کم بخت لیو چو بھی بالکل بے قابو تھا۔ بات بات میں تو مذاق اڑاتا تھا۔ کبھی جو مجھے گیتی کہا ہو۔ بس ایک رٹ تھی' کوکو! کوکو! ۔۔۔۔۔۔ اور بلی بھی کہہ دیا کرتا تھا۔ کہتا تھا تم چوہے کھاتی ہو۔ لو بھئی! میں نے کب چوہے کھائے تھے۔'' اس نے سوچا اور حسرت بھری نکھیوں سے حوضی کے پانی کو تاکا۔ اور جو کسی نے دیکھ لیا اس گندی حوضی کے پاس بیٹھے تو؟ بس پھر آفت آ جائے گی۔

''چلو' گندے پانی سے کھیل رہی ہو۔''

''کیوں نہ کھیلوں' میں تو یوں ہی کھیلوں گی۔'' اس نے فرضی آواز کا جواب با آواز بلند دیا اور پاس پڑی ہوئی لکڑی حوضی میں ڈال کر پانی میں ایسی تیزی سے چلانا شروع کی جیسے مکھن بلو رہی ہو۔

صابن گھلا ہوا غلیظ پانی اچھل اچھل کر اس پاس کی زمین پر گرا اور سوندھا سوندھا سا ایک بھپکا اس کی ناک میں پہنچا۔ مٹی کی سوندھی مہک اس کو بے خود کر دیا کرتی تھی۔ وہ بے اختیار گیلی زمین پر اوندھ گئی اور ناک لگا لگا کر سونگھنے لگی۔

''اس بی بی کو دھرتی سے کتنا پیار ہے۔'' مالی نے مٹر کی کیاری کو پانی لگاتے لگاتے سوچا اور یہ گیتی او ارجمند کی اسٹڈی کا وقت تھا۔ گھم سے ایک گھونسا اس کی پیٹھ پر پڑا۔

''کم بخت!''

اس نے بھنا کر سر گھمایا۔

اماں بیگم خونی آنکھوں سے اس کو گھور رہی تھیں۔اس شام پھر اس کو بستر میں لیٹنے کی سزا ملی۔

اچھا ہوا جو مسعود کم بخت چلا گیا۔وہ اس کو ایسی سزا ملنے پر بہت چڑاتا تھا۔

باب ۱۵

مسعود کی ماں ہاشمی بیگم کو اپنی سسرال' آنند پور' کسی جائیداد کے جدی مقدمے کے سلسلے میں بار بار آنا پڑتا تھا۔اور پھر پیشیوں کی وجہ سے کئی کئی ماہ وہ یہاں ٹھیرتی تھی۔

اور ایک دفعہ صولت کی شادی میں آنے کے بعد سے وہ ہر بار یہاں ضرور آتی تھیں اور کم سے کم ایک مہینہ ضرور رہ کر جاتیں۔اور ان کے ساتھ مسعود بھی آتا جاتا رہا۔وہ کتنی ہی مدت کے بعد کیوں نہ آتا' لیکن اس کو اور گیتی کو یہی محسوس ہوتا کہ وہ کہیں گیا ہی نہ تھا۔ آتے ہی فوراً ادھورے کھیل شروع ہو جاتے۔اور اب مسعود کی دلچسپیاں مختلف ہو چلی تھیں۔مثلاً غلیل اور ائیر گن۔سو گیتی نے وہ بھی اپنا لیں۔یہاں تک کہ پیچھے والے تالاب میں جا کر اس کے ساتھ تیر بھی آتی تھی۔

مسعود اس کے تتلیوں کے ذخیرے کے لیے تتلیاں پکڑ پکڑ کر اور جمع کر کر کے لاتا اور وہ اس کی ٹکٹوں کی البم کے لیے باہر سے آئے ہوئے خطوں پر سے ٹکٹ اتار اتار کر جمع کر کر کے رکھتی تھی۔اور اس کو دیتے وقت بیٹھ بیٹھ کر گھنٹوں احسان جتاتی اور رعب جماتی۔ ''جناب! یہ میں ہی ہوں جو تمہارے لیے اتنے ٹکٹ جمع کرتی ہوں (گویا ٹکٹ جمع کرنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے) جناب! یہ ٹکٹ بڑے بھیا کے خط پر سے اتارا ہے۔'' وہ فرانس سے آئے ہوئے ٹکٹوں کی ہسٹری سناتی۔''اور یہ ہانگ کانگ اور پیکنگ کے ٹکٹ مجھے لیو چو نے لا کر دیے ہیں۔جناب عالی! وہ عالی کو بے طرح کھینچتی۔

''اچھا' تو یہ تمہارا لیو چو ابھی تک آتا ہے؟''مسعود بے پروائی سے ٹکٹوں کا ذخیرہ سمیٹتے ہوئے پوچھتا۔

''تو اور کیا آنا چھوڑ دے؟ وہ تو بڑا کم بخت ہے۔اتنی مشکل سے لا کر دیتا ہے ٹکٹ کہ جناب کیا کہیے۔''

''اونہہ! کیا بک بک لگا رکھی ہے' جناب جناب کر کے۔''

''کیوں تم میرا احسان مانو نہ پھر''

''احسان؟ احسان تو میں بالکل نہیں مان سکتا۔''

''کیوں بھئی' یہ کوئی بات نہ ہوئی۔''

''اچھا لو' پکڑو اپنی تیتریاں'' وہ رنگ برنگی تیتریوں سے بھرا ہوا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا۔

''ہائے' سویٹ!'' وہ لفافے میں بھری ہوئی رنگ رنگ کی تتلیاں دیکھ کر تڑپ جاتی۔''ہائے مسعود! اتنی ڈھیر ساری تتلیاں تو بڑی مشکل سے پکڑ پاتے ہوگے۔'' وہ انگریزی میں کہتی۔

اور مسعود کو شدید احساس تھا کہ گیتی کے مقابلے میں اس کی انگریزی بالکل خراب ہے۔ اس لیے وہ اس کے سامنے کبھی انگریزی بولنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ اس کی بات کا جواب اردو ہی میں دیتا۔

''تم سے مطلب' جیسے بھی پکڑیں۔'' اور وہ کسی اور طرف لگ جاتا۔

باب ۱۶

بچوں کا یہی حساب رہتا ہے۔ گھر والے یہی رونا روتے رہتے ہیں کہ بڑھنے ہی میں نہیں آتے۔ بلا سے جلدی جلدی بڑھ جائیں تو ان کی شرارتوں اور بے ڈھنگی ضدوں سے تو نجات مل جائے۔ اور ہوتا یہ ہے کہ کل کچھ تھے اور آج کچھ ہیں۔ دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔

گیتی اور ارجمند کا یہی ہوا۔ ان پر سے وہ تین سال چھ برس بن کر گزر گئے۔ اب تو وہ پہچانی بھی نہ جاتی تھیں۔

ارجمند سینئر کیمبرج میں پہنچ گئی تھی۔ مگر گیتی ایک دم بدشوق سی ہو کر رہ گئی تھی اور وہ فیل بھی ہو گئی تھی۔ اپنے فیل ہونے کا اس کو قطعی ملال نہ تھا۔

جس نے بھی اس کے فیل ہونے کا طعنہ دیا اس نے پھٹ سے جواب دیا۔'' آدمی فیل یا پاس اپنے لیے ہوتا ہے' دوسروں کو کیا حق ہے جو اس کو فیل ہونے پر ملامت کریں۔ ہم تو اپنے لیے پڑھتے ہیں نہ کہ ٹوکنے والوں کے لیے۔''

اتنی بدتمیز اور ڈھیٹ لڑکی کی بات کا جواب بھی کیا ہو سکتا ہے۔

ارجمند بڑی دیانتداری سے پڑھ رہی تھی' گویا اس کو کسی کا قرضہ چکانا ہو۔ اس کی باتوں میں اور بھی دھیما پن آ گیا تھا اور اس کے

مزاج میں معصومیت اور حیرت کا عنصر پہلے سے کئی گنا زیادہ شامل ہو گیا تھا۔

گیتی اس کو چڑایا کرتی۔ ارجمند تمہارے تو پر نکلنے کی کسر ہے۔ پر کاٹ کر تم کو زمین پر بھیج گیا گیا ہے۔''

زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آجانے کے باوجود گھر کا سارا نظام اور ماحول حسب معمول تھا جیسے وقت گزرا ہی نہ ہو۔

مالی اسی طرح کھرپی لیے ادھر سے ادھر کیاریاں گوڑتا اور درختوں کی شاخیں چھانٹتا پھرتا۔ آبنوسی رنگت والی چھم چھم چلنے والی مالن اب بھی چھوٹا سا گھونگھٹ نکالے ایک نہ ایک چھوٹا بچہ کندھے سے لگائے گھوما کرتی۔

خانساماں ہمیشہ کی طرح اب بھی چولہے کے پاس کھڑا پھٹا پھٹ روٹیاں پکاتے پکاتے گیتی سے جھگڑا کرتا جو موقع پاتے ہی باورچی خانے میں گھس کر چپاتی پکانے کی ناکام کوشش میں آٹے اور پیڑوں کا ستیاناس کیا کرتی۔

اور تو اور چائنا مین اب بھی کبھی کبھار اپنی سائیکل پر بھاری گٹھڑ اٹھائے ''چائنا مین' چائنا مین'' کہتا آیا کرتا۔ مگر اب ایسا بہت کم ہوتا۔ سانگ کا ڈیل اور بھاری ہو گیا تھا۔ اس کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر پنڈلی کے گوشت کی جھالر سی لٹک آئی تھی اور پیٹ اور بھی چکنا اور مدور نکل آیا تھا۔ اس کی صحت کی خرابی کی بنا پر صفدر کو زیادہ تر دکان پر ہی رہنا پڑتا تھا لیکن سانگ اس خیال سے کہ دکان کا منتظم بن کر وہ یعنی صفدر یاسین لیو چو اپنی اوقات نہ بھول بیٹھے' اس کو اب بھی گاہے گاہے اتوار کے دن پھیری کے لیے بھیجا کرتا تھا۔

وہ جب کبھی پھیری کے لیے نکلتا' خواہ مخواہ ہی اس گھر کی طرف جا نکلتا اور اس کو اب بھی وہ چینیوں کے سے خدوخال والی دلچسپ لڑکی نظر آتی۔

زیادہ تر یوں ہوتا کہ وہ باغ کی اسی پچھلی دیوار پر پیر لٹکائے پڑھنے میں غرق ہوتی۔ جاڑے کی دوپہر یا گرمی کی شاموں میں ادھر سے گزرتے گزرتے اس کی سائیکل اس دیوار کے قریب آکر ضرور رک جاتی۔

عجیب بات تھی۔ وہ گھر گھر جاتا لیکن بے اختیار اور بلا ارادہ صرف اسی گھر میں پہنچا کرتا۔ ان سڑکوں پر آتے ہی اس کا دل وہاں جانے کو اس بری طرح چاہتا جیسے کسی کا دل اپنے گھر جانے کو مچل جائے۔ اس گھر سے اس کو اپنے گھر کو کیا نسبت ہو سکتی تھی۔ یہ ایک بڑا اور آسودہ حال گھرانہ تھا' جہاں عسرت وفلاکت کی پرچھائیں بھی نہ پڑی تھیں۔ یہاں کی بیگم پر تمکنت اور بلند اقبال تھی۔ اس گھر کے بچے مگن اور خوش باش تھے۔

اور خود اس کا گھر پیکنگ کی تنگ وتاریک گلیوں میں تھا۔ جس کا صحن مختصر اور کمرے محدود تھے۔ اس مختص سے گھر میں ویشیاؤں کا گزر نہ تھا۔ قدیم مذہبی طرز کے مدرسے کا دبلا پتلا معلم ان عیاشیوں کے خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گھر میں فراغت وخوشحالی کبھی

مہمان بھی نہ آئی تھی۔

اس عظیم طبقاتی فرق کے باوجود صفدر لیو چو کے گھر کا پھاٹک دیکھتے ہی محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اپنے گھر کے قریب آ گیا ہو اور اب وہاں گئے بنا واپسی ناممکن ہے۔

اور اس کی ایک ہی وجہ اس کی سمجھ میں آتی تھی۔ اس گھر میں اپنائیت کا فقط اتنا احساس تھا کہ یہاں پر ایک چپٹا اور بے حد مانوس و آشنا چہرہ نظر آتا تھا جس کے مزاج میں ریاست کے بجائے غربت کی خو بو تھی۔ جو بڑے لوگوں کی روایات کے برعکس بے تکلف گھل مل جانے والی اور ہر کس و ناکس کو قابل توجہ سمجھنے والی تھی۔

شاید اسی شدید اور قوی احساس کے ماتحت اس کی سائیکل سرکتے سرکتے باغ کی اس عقبی دیوار کے نزدیک جا ٹھیرتی۔ اور وہ سائیکل سے اتر کر کہتا۔

''ہلو کوکو!''

اور کوکو کتاب بند کر کے فوراً بے نیازی اور شفقت سے مسکراتی۔

''ہلو کیا لائے ہو؟'' وہ اسی طرح دیوار کا گھوڑا بنائے بیٹھی رہتی اور لیو چو دیوار کی جڑ سے ٹیک لگائے پیر پھیلائے اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا۔

''کوکو! کیا کر رہی ہو؟'' وہ پوچھتا۔

''واقعی تم تو چینی کے بولے ہی ہو' آنکھیں تھوڑی ہیں بٹن ہیں۔ دیکھتے نہیں کیا کر رہی ہوں۔''

''کوکو! تمہارے گھر آئینہ ہے؟''

''کیوں؟ پاگل تو نہیں ہو گئے۔''

''کبھی دیکھا بھی ہے تم نے آئینہ؟''

''آج کیا کھا کر آئے ہو؟ مینڈک کہ چوہا؟''

''تم کھاتی ہو چوہا۔''

''میں کیوں کھاؤں؟۔۔۔۔۔۔۔آخ تھو! لاحول والا قوۃ!''

''آخ تھو'' وہ اس کی نقل کرتا۔ ''لاحول ولا قوۃ!۔۔۔۔۔۔۔میں کیوں کھاؤں' کیا میں مسلمان نہیں ہوں؟''

''بڑے آئے۔۔۔۔۔'' وہ اس کو ہمیشہ جھٹلاتی۔

''خدا کی قسم' میں بڑے عالم کا بیٹا ہوں۔ میرے اندر عرب خون ہے۔''

چل جھوٹے! عرب خون ہے۔'' وہ منہ چڑاتی۔

''سچ کہتا ہوں' میری بہن چینیوں سے قطعی مختلف ہے۔ تمہاری طرح چپٹی چندھی نہیں ہے۔ اس کا قد تم سے بھی لمبا ہے۔ رنگ سنہرا ہے اور ناک اچھی خاصی اونچی ہے۔''

''اچھا ہوگا' کلمہ سناؤ۔''

وہ بڑے صحیح تلفظ سے کلمہ پڑھتا۔

''اچھا' سورہ رحمٰن سناؤ تو جانیں۔''

وہ بڑی خوش الحانی سے سورہ رحمٰن پڑھتا اور اپنی قرات پر خود ہی جھوم اٹھتا۔

''مکار کہیں کے۔ یہ سب کہاں سے سیکھ رکھا ہے؟''

''پیکنگ میں مسلمانوں کے مدرسے اور کالج ہیں اور طالب علموں کو قرات بھی سکھائی جاتی ہے۔''

''تم نے تھوڑی پڑھا ہے۔''

''کیوں' میں نے کیوں نہیں پڑھا ہے؟ میرا باپ نہ مرجاتا تو میں یہاں تمہارے ملک کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ اس کے زردی مائل سنہرے چہرے پر سرمئی سا بادل چھا جاتا۔

اور وہ اس کو اداس ہوتے دیکھ کر بات بدل دیتی۔

''لیو چو! مونگ پھلی کھاؤ گے؟'' وہ کوٹ کی جیبیں ٹٹولتی۔

''ہاں کوکو! تم چاکلیٹ کھاؤ گی؟''

''اتنے بڑے ڈھونگ چاکلیٹ لیے پھرتے ہو' شرم تو نہیں آتی۔''

''اتنی بڑی لڑکی دیوار پر بیٹھتی ہے' شرم تو نہیں آتی۔''

گزشتہ تین سال سے ان دونوں کے درمیان اسی قسم کی گفتگو ہوتی چلی آرہی تھی۔ اکثر مہینوں اس کی نوبت نہ آتی تو دونوں میں سے کسی کو خیال بھی نہ آتا۔

باب ۱۷

وہ دکان پر بیٹھا ہوا حساب کتاب درست کر رہا تھا۔ اس کے پیروں کے قریب ہی سنہری پشم والی چھوٹی اور نیچی سی کتیا چی بیٹھی تھی کہ اس کو مانوس سے بھاری قدموں کی آواز نے چونکا دیا۔ قلم ہاتھ سے رکھ کر اس نے سامنے کی طرف دیکھا۔ گیتی شوکیس کے قریب کھڑی جوتے دیکھ رہی تھی۔

ایک مستعد مین کی طرح اٹھ کر وہ اس کے قریب آ گیا۔

وہ مڑی اور بے پروائی سے بولی۔ ''ہلو!''

''اوہ! آج تو اکیلی آئی ہو۔ بہت بڑی ہو گئی ہو شاید''

''آج میں اپنی سائیکل پر آئی ہوں۔ مجھے آج جوتا ضرور ہی پہننا تھا۔ دیکھو نا' یہ پرانا جوتا تو اب گھس چلا ہے۔ پر میں گھر میں کسی پر تقاضا نہیں کر سکتی تھی۔''

اور پھر وہ رازداری میں بولی۔ ''تم کو شاید معلوم نہیں' میں فیل ہو گئی ہوں نا' سب مجھ سے ناراض ہیں۔''

''فیل تو ہونا تھا ہی' اور پڑھو قصے کہانیوں کی کتابیں امتحان کے دنوں میں۔ مگر تم اکیلی کیوں نکل پڑیں؟ پھر کسی دن لے جاتیں۔''

''نہیں بھئی' کل شام کی گاڑی سے میں اور ارجمند اپنے ابا کے وطن جا رہے ہیں۔''

''کہاں؟''

''تم کو کیا مطلب؟'' ''تم تو کہتے ہو مجھے تمہارے شہروں کے نام سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ سب شہر ہیں۔ بڑے شہر' چھوٹے شہر اور ان سے بھی چھوٹے شہر۔ اچھا بتاؤ۔ اس شہر کا کیا نام ہے؟'' وہ ہمیشہ کی طرح اس کا مذاق اڑانے لگی۔

''ارے ہٹاؤ' مجھے کیا معلوم۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ چاہے چین کے ہوں' اٹلی کے یا ہندوستان کے۔''

''سچ کہتا ہوں'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''بالکل ایک جیسی نک چڑھی اور مغرور بیگمیں' زن مرید مرد' مر گھلے کلرک' توندل اور عیار دکاندار' فاقہ کش' نیم برہنہ مزدور' بھٹکتے ہوئے فقیر' آوارہ کتے اور بچے اور ہسپتالوں میں تڑپتے ہوئے مریض اور ان کے خون کا

آخری قطرہ تک چوسنے والے خبیث ڈاکٹر۔"

ایسی باتیں کرتا ہوا وہ جوتے والے کے بجائے ایک سرپھرا فلاسفر معلوم ہو رہا تھا۔

"بس کرو اب چپ بھی ہو جاؤ نا۔ کنفیوشس کہیں کے۔ مجھے جوتے دکھاؤ۔" وہ باقاعدہ اور معزز گاہک بن کر کرسی پر بھدے بیٹھ گئی اور بڑی رکھائی سے مختلف نمونوں کے جوتے طلب کرتی رہی۔

وہ اس وقت ہلکے نیلے رنگ کی ٹینس کالر اور چھوٹی آستینوں والی قمیص اور سفید سلک کی شلوار پہنے تھی۔ سفید دوپٹہ بے توجہی سے کندھوں پر پڑا تھا۔

عجیب بات تھی۔ اس کو اس لڑکی کے جسم کے خطوط اور زاویے کبھی آج تک نظر نہ آئے۔ اس کو تو اس کے تمام وجود پر حاوی ایک چہرہ نظر آتا تھا۔

بالکل ایک دم پلین، چپٹا بادامی آنکھوں والا، نئے اور سنہری خون کے اثر سے دہکتے ہوئے چیری کے سے سرخ اور دبیز متبسم لب۔ بے تکلف اور پر تکلم آنکھیں کسی دوسری طرف نظر کو بھٹکنے ہی نہ دیتی تھیں۔

حسب عادت ہزار مین میکھ نکالنے کے بعد اور خوب بھاؤ تاؤ کر کے اس نے جوتا خریدا اور دکان سے نکل گئی۔

"بڑی خسیس ہے۔" اس نے دام گلے میں ڈال کر سوچا۔

دوسری شام گیتی اور ارجمند اپنی دادی کے پاس چھٹیاں گزارنے چلی گئیں۔ جہاں کا نام نہ صفدر نے پوچھا اور نہ اس نے بتایا۔ واقعی ناموں میں کیا رکھا ہے!

باب ۱۸

اس مرتبہ اپنی ددھیال کا وہ گھر گیتی کو بے حد دلچسپ نظر آیا۔ دالان در دالان، صحنچیاں اور شہ نشین، محرابی در اور ہشت پہل ستون۔ بڑی سی انگنائی اور اس کے مختلف گوشوں میں سلیقے سے لگے ہوئے بیلے اور کافی کے درخت، صحن کے جنوبی گوشے میں بڑے سے قطعے میں ہار سنگھار، مولسری اور رات کی رانی کے درخت، یہ سب چیزیں بڑی انوکھی اور قابل غور معلوم ہوئیں۔ جیسے قرون وسطیٰ کا دلچسپ خواب۔ وہ یہاں آ کر کچھ کھو سی گئی۔

وہ لوگ اپنی ددھیال کے گھر میں بہت کم آتے تھے اور چند دن سے زیادہ ٹھیرتے بھی نہ تھے۔ اور جب تو وہ بہت چھوٹی تھی۔ اپنی عمر کے اس حصے میں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ مدہوش تھی۔ کسی چیز پر غور کرنے اور اس کے متعلق رائے قائم کرنے کا ہوش ہی نہ تھا۔

لیکن اس مرتبہ اس گھر اور اس کے دستوروں کو اس نے بڑے غور اور شوق سے دیکھا' جیسے یہاں پہلی دفعہ آئی ہو۔ اس گھر کی زندگی میں اجتماعیت تھی۔ انفرادیت کا خودغرض دیوتا ابھی اس کی دہلیز تک بھی نہ آ پایا تھا۔

یوں تو اس گھر کی حاکم و مالک اس کی دادی اماں تھیں' جو فجر کی نماز سے فارغ ہو کر شہ نشین میں آ بیٹھتی تھیں اور اپنے وظیفوں اور مختلف نمازوں کے ساتھ ساتھ وہیں بیٹھے بیٹھے اندر سے باہر تک کا انتظام کرتی تھیں۔

ان کے دونوں لڑکے پردیس میں تھے اور لڑکی بھی ان سے بہت دور بیاہی ہوئی تھیں۔ بیوہ بہو بھی زیادہ تر ادھر ادھر رہتیں تھیں البتہ ان کی دونوں لڑکیاں مستقل طور پر دادی اماں کے ساتھ رہتی تھیں۔

باقی پورے گھر میں رشتے در رشتے کی خالائیں' نانیاں اور چچیاں رہ رہی تھیں۔ کسی صحنچی میں گاؤں والی نانی رہتی تھیں تو کسی دالان میں لال کنوئیں والی خالہ۔ رشتے اتنے ٹیڑھے' دور دراز کے اور پیچیدہ قسم کے تھے کہ گیتی تو گیتی اچھے اچھوں کی سمجھ میں آنا مشکل تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس گھر میں رشتے کا سرا ڈھونڈنا معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔

زیادہ کھوج اور پوچھ گچھ کا جواب دادی اماں بڑے رعب سے یوں دیا کرتی تھیں۔ "بس کہہ دیا بیوی کہ ہماری عزیز ہیں۔ عزیز داری میں کیا اور کیوں کرنے کا کیا مطلب؟ گاڑی بھر دوستی اور رتی برابر خون کا مقابلہ نہیں۔"

دراصل بات یہ تھی کہ اس گھر میں رشتے یا خون سے بھی زیادہ کچھ وضع داری اور پچھلی مروتوں کا دور دورہ تھا۔

صحن کے آخری سرے پر ایک لمبے دالان اور اس کی صحنچیوں کا جو سلسلہ تھا وہ کچھ اس قسم کی عورتوں اور بچوں سے بھرا پڑا تھا جن کے متعلق دادی اماں کا یہ کہنا تھا کہ صبح اٹھ کر جہاں ان تمام نانیوں وغیرہ کو سلام کرو' ان لوگوں کو بھی کرو۔ اس لیے کہ یہ ہمارے قدیمی ملازموں کے کنبے ہیں۔

ایک صحنچی میں تقریباً بدحواس سی بڑی بی رہتی تھیں جو ذرا ذرا سی بات پر شک کر کے کٹے کٹے کوسنے دیا کرتیں۔ مثلاً یہ کہ صاحبزادیوں نے میری بقچی ٹٹولی ہے اور سارے تعویذ نکال کر غارت کر دیئے۔ کسی پر شک تھا کہ اس نے صندوق میں ڈبیا کے اندر ان کے بیٹے کے عقیقے کے جو بال رکھے تھے وہ چرا لیے ہیں۔' اس شک پر وہ دن دن بھر روتی تھیں کہ بھئی بیٹا مر گیا تو خیر خدا کی امانت تھی'

اس نے واپس لے لی مگر بال تو بیٹے کی امانت ہیں وہ کوئی کیوں لے جائے۔

اب دادی اماں کی تاکید تھی کہ ان کو سلام کرنا ضروری ہے۔ یہ تمہارے دادا کی انا کی سب سے چھوٹی بہو ہیں۔ دوسرے نمبر اما می کی بیوی تھیں۔ ان کے شوہر دادا کے خاص خدمت گار تھے۔ یہ بدحواس تو نہ تھیں لیکن بس ایک فلیتہ تھیں۔ ہر وقت لڑکیوں اور ہر کسی کی ذرا سی بات کی تلاش میں رہتی تھیں ی اور ذرا ذرا سی بات دادی اماں سے لگاتی تھیں۔ پھر تین بچوں والی سروری جو گیتی کے بڑے ابا کی کھلائی کی منجھلی لڑکی تھی۔ اب بیوہ ہوگئی تو دادی اماں ہی کو سمیٹنا تھا۔

کچھ یوں لگتا تھا کہ اس گھر میں بڑی بوڑھیوں ہی کا دور دورہ ہے۔ نوعمر نفری تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ سارے گھر میں گیتی کی چچا زاد بہنوں' عصمت اور طلعت اور چھوٹی نانی کی یتیم نواسی کامنی کے علاوہ سروری کے تین بچے ہی نظر آتے۔

یہی وجہ تھی' گھر میں امن چین تھا۔ ورنہ ہر وقت نئی اور پرانی نسلوں میں تصادم ہوا کرتا۔ عصمت طلعت دادی اماں سے اس درجہ لگاؤ رکھتی تھیں کہ کبھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ کیا ہی نہیں۔

اس گھر کی تو فضا ہی دوسری تھی۔ کوئی اپنا کوہا لیے پڑی ہیں تو کسی کو ڈکاریں چھٹنے کا دکھڑا ہے۔ گھر کی پالیٹکس بھی اس قسم کی تھی۔ چچی بڑی بیگم کے دودھ میں بالائی کی تہہ ذرا پتلی ہو جاتی تو وہ ایک ایک کو سناتیں اور قصہ کرتیں۔ ''اے بہن! سنا تم نے مھنکو کی بہو دودھ میں پانی ملا رہی ہیں۔ آج دودھ پر نگوڑی جھلی سی بالائی پڑی۔''

گاؤں والی نانی کو یہی دکھڑا رہتا کہ نصیبن کی کاٹی چھالیہ' اللہ بچائے روڑے سے منہ میں لڑھکتے ہیں جبکہ نصیبن غریب اپنے حسابوں باجرہ سی چھالیہ کاٹتی تھی۔ اس بے تکے پن پر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا تھا۔

اور چھوٹی نانی کا سارا دن اسی بات پر جلتے گزرتا کہ دنیا میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کے کاموں میں بدتمیزی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔

یہ گھر اور اس کی ہر بات گیتی کے لیے نئی بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ شاید یہ اس زندگی کی بے تکلفی اور مساوات تھی جس کی بنا پر یہ گھر اس کو بہت اچھا لگا تھا۔ ارجمند یہاں آکر کچھ زیادہ خوش نہ تھی۔ عجیب قسم کا ہر طرف سے بند بند گھر اس کی سمجھ میں قطعی نہ آیا تھا۔ پھر بھی چچا طلعت اور عصمت آپا اور چچی جان کی وجہ سے اس کا دل لگا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر رہی بھی ان ہی کے کمروں میں تھی۔ لیکن گیتی تو پورے گھر میں اس قدر بے تکلفی سے پھرتی اور اٹھتی بیٹھتی جیسے وہ ہمیشہ سے یہاں رہتی چلی آئی ہو۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ اور روڑے سے ایک داستان وابستہ تھی۔ اس کے باپ چچا' پھوپھی اور دادا سے متعلق بے شمار قصے اس گھر کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے

تھے۔

وہ دادی اماں کے پاس آنے والی رشتے دار مہمان عورتوں اور ان کے ڈھیروں بچوں سے وہی دلچسپی لیتی جو خود دادی اماں لیتی تھیں۔ وہ بڑے شوق اور تپاک سے ان سے ملتی اور پھر ان کے پاس بیٹھ کر بڑی توجہ سے ان کے رشتے ذہن نشین کرتی اور ان کے بچوں تک سے بڑی گرمجوشی سے پیش آتی۔

اور یوں اس دلچسپ گھر میں دن ایک کے بعد ایک کر کے گزرتے چلے جا رہے تھے۔

صبح کا وقت تھا اور گیتی مولسری کے گھنے درخت کی چھاؤں میں بان کا چھوٹا سا پلنگ ڈالے لیٹی ہوئی اخبار دیکھ رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور کہا۔

''میں حاضر ہو سکتا ہوں؟''

وہ دل ہی دل میں ہنسی۔

''یہ طریقہ بھی خوب ہے کہ یہاں آنے والا آواز دیتا ہے اور ہمارے گھر آنے والے گھنٹے بجاتے ہیں۔''

آواز بڑی پیاری، سلجھی ہوئی اور مانوس سی تھی۔

''ہاں میاں آؤ۔'' ہارسنگھار کی جڑ میں بیٹھی ہوئی نصیبن نے لہک کر آواز دی۔

وہ یوں ہی دوسری طرف منہ کیے لیٹی رہی۔ اور پھر اس نے ایک سانولے رنگ اور لمبے قد کے لڑکے کو ہاتھ میں دو تین کا پیاں لیے دادی اماں کی طرف جاتے دیکھا۔ کتنا اسمارٹ لگ رہا ہے یہ۔'' اس نے اس کی پشت کو ہی دیکھ کر دل ہی دل میں تعریف کی۔

شگوفہ نے آ کر کہا۔'' آپ کو بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔'' وہ اخبار ڈال کر اٹھ بیٹھی اور اپنے کٹے ہوئے بالوں کو دوپٹے کی چنت کھینچ کھینچ کر چھپاتی ہوئی چل دی۔

باب ۱۹

''اچھا تو یہ تم تھے مسعود میاں!'' اس دوپہر اس نے خس کی ٹٹی کے بہت قریب لیٹ کر سوچا۔ تمہارا تو خیال میرے ذہن میں سے نکل گیا تھا۔

''مگر یاد ہے کئی سال تک تم آنند پور آتے رہے تھے' تو ہمارے یہاں بھی آیا کرتے تھے۔ ان دنوں ہم تم کتنے پکے دوست تھے۔ تم نے مجھے اور بھی زیادہ خراب کر دیا تھا۔ بقول اماں بیگم کے' بالکل دو کوڑے کا۔

اور تم مجھے ذرا ذرا سی بات پر مارا کرتے تھے اور اس وقت تو تم نے مجھے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا اور پھر مجھے بڑے غور سے دیکھ کر ہنس کر بولے تھے کہ ارے یہ منگول تو نہیں ہے؟

''ہاں بھئی' بات تو ٹھیک ہے۔ دراصل مسعود خاں اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تمہاری شربتی آنکھیں خوبصورت ہیں اور تمہارا سانولا چہرہ دلکش اور سنجیدہ اور میں! میں بقول تمہارے منگول چپٹی چینی ہوں۔ خدا غارت کرے صفدر لیو چو کو۔'' اس نے بلا وجہ ہی صفدر یاسین کو کوسا۔ گویا اس کے چپٹی اور چینی ہونے میں صفدر کا ہاتھ ہو۔ ''مجھے تو اس تک نے احساس کمتری میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر تم نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو کیا بڑی بات ہوئی۔''

اس کا ملول دل خواہ مخواہ ہی کمتری کا شکار ہو رہا تھا اور اسی کیفیت میں اس کو نیند آ گئی۔

اس شام وہ دیر سے جاگی تو اس نے دیکھا کہ طلعت' عصمت اور کامنی کھسر پھسر کر رہی ہیں جیسے کوئی بڑی سازش ہو رہی ہو۔

وہ ہمیشہ ایسی سازشیں کیا کرتی تھیں۔ مثلاً نمک مرچ شکر ملا کر املیوں کا کچلا کھانے کی تیاریاں یا پھر نمک مرچ سے کچی کچی کیریاں کھانے کا پروگرام۔

''کیا بات ہے۔ اللہ! ہمیں بھی تو بتاؤ؟'' گیتی نے پر شوق لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں' تم بھانڈا نہ پھوڑ دینا۔'' طلعت نے کہا۔

''واہ' اس کے ذریعے تو دادی اماں آسانی سے اجازت دے دیں گی۔'' عصمت نے رائے دی اور اس کے کان میں چپکے چپکے بتایا کہ مسعود کالج سے مشاعرے کے پاس لایا' اپنی امی' عصمت' طلعت' ان کی ماں اور کامنی وغیرہ کے لیے۔

گیتی کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ مشاعرہ کس چڑیا کا نام ہے۔ مگر وہ جھٹ بولی۔ ''ہم بھی چلیں گے۔''

''دادی اماں سے اجازت لینا پڑے گی۔'' طلعت نے مکاری سے آنکھیں گھمائیں۔

گیتی کی چچی جان نے طے کیا کہ سہ پہر کی چائے مسعود کے گھر جا کر پی جائے اور وہاں سے مشاعرے میں جایا جائے۔ گیتی اور ارجمند کے لیے اجازت لینا تھی۔ ارجمند نے تو خود ہی انکار کر دیا تھا۔

''بھئی' ہم نہیں جائیں گے۔ مشاعرہ ہوتی کیا چیز ہے؟''

لیکن گیتی سب سے آگے تیار تھی۔ان سب میں صرف کامنی ہی پردہ دار تھی۔
گلی اور کوچوں میں سے گزرتا ہوا تانگہ مسعود کے گھر کی طرف ڈیوڑھی کے برابر جا کھڑا ہوا۔
گیتی کو دیکھ کر مسعود پر کچھ اوس سی پڑ گئی اور اس نے سوچا۔''ارے یہ لوگ اس کو کیوں پکڑ لائے۔'' بھلا یہ ہمارے اس چھوٹے سے گھر کو دیکھ کر کیا کہے گی اور پھر میرا اسڑا سا قومی چندوں پر چلنے والا کالج دیکھ کر کیا سوچے گی۔اور اس کی اماں تو ہم جیسے رشتے داروں سے سخت بیزار ہوتی ہیں۔مجھے یاد ہے کہ ایک آدھ مرتبہ وہ مجبوری کو ہمارے یہاں آ جاتی تھیں تو ناک پر سے کپڑا نہیں ہٹاتی تھیں۔یوں لگتا تھا جیسے سنڈاس میں بیٹھی ہوں۔اور اپنی لڑکیوں کا تو کبھی انہوں نے ہمارے جیسے گھروں میں گزر بھی نہ ہونے دیا۔''بھئی! یہ کیا بوریت کی عصمت اور طلعت نے جو اس وحشی لڑکی کو پکڑ لائیں۔'' وہ سخت بور ہو رہا تھا۔
گیتی واقعی پہلی دفعہ اس مختصر سے ڈربے نما مکان میں آئی تھی۔چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی اونچی اونچی دیواروں سے گھری ہوئی انگنائی محرابی دروں اور ہشت پہل نازک نازک ستونوں والے دالان اور اس کے ساتھ صحنچی اور بالکل اندر کو گھسا ہوا ایک کشادہ سا کمرہ تھا۔
پرانی وضع کا گھر تو دادی اماں کا بھی تھا پر کس قدر کشادہ اور خوش وضع۔وہ کچھ دیر تک تو سوچتی رہی کہ یہ گھر کا نہ جانے کون سا حصہ ہے اور پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ کل گھر یہی ہے۔
اس گھر میں نہ صوفے اور کرسیاں تھیں اور نہ جا بجا بچھے ہوئے قالین۔اس کے دروازے خوش وضع اور خوش رنگ پردوں سے بھی محروم تھے۔پھر بھی اس میں کوئی بات تھی۔ایک عجیب پراسرار اور خوابیدہ سی۔شام کے وقت صحن میں چھڑکاؤ کر کے صفائی کی جا چکی تھی۔دیواروں کے ساتھ ساتھ کیاریاں تھیں۔شمالی گوشے میں تختوں کا چھوٹا اور نیچا سا چوکا تھا جس پر بچھی ہوی صاف ستھری جازم بچھی تھی۔تخت کے ساتھ ہی کاٹھ کی گھڑونچی پر کورے کورے سوندھے سوندھے گھڑے قلعی دار نقشیں بجھیروں سے ڈھکے رکھے تھے۔تخت کے ایک کونے پر جاء نماز رکھی تھی۔دوسرے کونے پر پاندان اور پانوں کی تسلی رکھی تھی۔سرخ صافی میں لپٹے ہوئے پانوں کے ساتھ موتیئے کی کلیاں رکھی تھیں۔
تختوں کے چوکے سے کچھ فاصلے پر دو کھری چارپائیاں تھیں اور ان پر پھرکیاں پڑے ہوئے بانس کے رنگ برنگے چوکور پنکھے رکھے تھے۔
سب نے گھر میں گھستے ہی ہنسنا اور باتیں کرنا شروع کر دیا تھا' سوائے گیتی اور مسعود کے۔

مسعود خاموش اور جز بز تھا کہ گیتی کو اس ننھے سے گھروندے سے وحشت ہوگی اور وہ دل میں کیا کہے گی۔ اور گیتی خاموش تھی مبہوت تھی۔ اس لیے کہ اس کو اس مختصر سے گھروندے میں لٹی ہوئی آن بان اور کھوئی ہوئی عظمتیں بھٹکتی نظر آرہی تھیں۔

مسعود کی والدہ ہاشمی بیگم باورچی خانے میں تھیں۔ ان کو ان لوگوں کے آنے کی خبر تھی اور وہ ان کے لیے چائے بنا رہی تھیں۔

انہوں نے باورچی خانے ہی سے گیتی کی چچی جان کو آواز دی۔ ''اے بھاوج آگئیں؟ بڑا ابھاری پائینچہ ہے۔ اب نکلی ہو؟''

''اے! ہم کیا کریں؟'' یہ لڑکیاں تیاری دیر میں ہوتی ہیں۔ ان کی بجتنیاں ختم ہی نہیں ہونے میں آتیں۔''

ان کو جواب دینے کے بجائے انہوں نے مسعود کو آواز دی۔

''اے بیٹا! تانگے کا کرایہ تو دے آؤ۔ پاندان میں رکھے ہیں پیسے۔''

''یہ کیا بات ہے بھئی' کرائے کا تکلف اب اٹھادو۔'' گیتی کی چچی جان باورچی خانے میں گھستے ہوئے بولیں۔

''کیوں اٹھادیں؟ تم فیشن والے لوگ۔ ہم تو بھیا پرانی چال کے لوگ ٹھہرے۔''

چچی جان کے ساتھ ہی لڑکیاں بھی ادھر چلیں۔ مگر مسعود نے گیتی کی وجہ سے ان کو ادھر ہی روک لیا۔ ''اونہہ! ان کو تو کچھ خیال ہی نہیں۔ اب اس کو باورچی خانے میں گھسیٹرے لیے جارہی ہیں۔'' وہ اپنی حیثیت سے شرمانے والے لڑکوں میں سے نہ تھا لیکن برابر گیتی کے یہاں جاتے رہنے سے اس کو خوب معلوم تھا کہ اس کے گھر والوں کے خیالات پرانے چلن کے کم حیثیت لوگوں کے متعلق کیسے ہیں اور اتنی مدت گزر جانے کے باوجود اس کا احساس اس کے دل میں موجود تھا۔

لڑکیاں وہیں پلنگوں پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئیں اور مسعود نے اپنی گھبراہٹ اور بوریت مٹانے کے خیال سے گیتی کو چھیڑا۔

''ہاں گیتی! یہ سب تو سب' تم مشاعرے میں کس سلسلے میں جارہی ہو؟''

''جس سلسلے میں یہ سب جارہی ہیں۔'' گیتی نے اپنے حسابوں اس کو لاجواب کر دیا۔

''بھئی یہ تو مشاعرہ سنیں گی۔''

''میں بھی سنوں گی۔''

''معلوم ہے مشاعرہ ہوتا کیا ہے؟ بڑے مشکل اور ادق شعر پڑھے جائیں گے۔ تمہارے پلے نہیں پڑنے کے۔ اچھا یہ بتاؤ' کچھ اردو پڑھ لکھ لیتی ہو؟''

زندگی میں پہلی مرتبہ گیتی کو اردو نہ جاننے پر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا اور فراٹے سے شستہ انگریزی بولنے والی یہ لڑکی اور بھی

زیادہ کمتری کے احساس میں مبتلا ہو کر کھسیانی سی ہو گئی اور خفگی سے بولی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھے اپنے مشاعرے میں لے جانا پسند نہیں کرو گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم لوگ جاتے وقت مجھے گھر چھوڑتے جانا۔''

مسعود کا مقصد اس سادہ دل لڑکی کو دل گرفتہ کرنا نہ تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

''ارے! تم مذاق میں کب سے روٹھنے لگیں؟''

ہاشمی بیگم چائے دان لیے ہوئے باورچی خانے سے نکلیں۔

لڑکیاں ان کو دیکھ کر کھڑی ہو گئیں اور آداب کیا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی صحنچی میں چلی گئیں اور نعمت خانے سے چائے کے برتن اور سامان نکال کر رکھنے لگیں۔

کامنی جلدی سے اٹھ کر صحنچی میں پہنچی۔ ''لائیے میں برتن لے چلتی ہوں۔'' اور وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے کے برتن کشتی میں سجانے لگی۔ گیتی نے دور سے دیکھا' سانولی رنگت' جھکی جھکی خوبصورت آنکھوں والی نازک بدن لڑکی بالکل میزبانوں کی طرح ان لوگوں کے لیے چائے کا سامان لگا رہی تھی۔ مسعود نے اس کے ہاتھ سے کشتی لے لی اور باہر تخت پر لا کر رکھ دی۔

ایک ہی دن میں دوسری مرتبہ اس نے مسعود کو دوبارہ دیکھا۔ سفید ململ کا کرتہ اور ملگجا سا پاجامہ اور بے ترتیب بال۔ وہ ان تینوں لڑکیوں سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ ان بہت سے وقتوں اور دنوں کی باتیں جو انہوں نے اکٹھے گزارے تھے اور جن میں گیتی کا دور دور پتہ نہ تھا۔

وہ اس وقت خود کو بے جگہ اور بالکل اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ طلعت اور عصمت سے بھی بہت دور۔ ان سبھوں کے رنگ تقریباً ایک جیسے تھے۔ وہ سب کھلے ملے نظر آ رہے تھے۔ بے تکلف اور غیر محتاط۔ اور وہ جوان سب کی بڑی قریبی رشتے دار تھی۔ ان سے ہر طرح مختلف اور بیگانہ تھی۔

''ارے کامنی! سارے کچالو تم ہی کھا جاؤ گی؟'' مسعود نے امرود کے کچالوؤں کی پلیٹ کامنی کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور کامنی نے اپنی خوبصورت آنکھیں اور جھکا لیں۔

گیتی کا دل گھبرانے لگا۔ ''میں یہاں کیوں آ گئی؟ اس نے مجھے بلایا بھی تو نہیں تھا اور یہ مجھ کو صبح ٹھیک سے پہچان بھی تو نہیں رہا تھا۔ آخر اس چھوٹے سے دھلے منجھے اور بے حد شائستہ گھر کا مالک وہی تو ہے۔ مجھے اس کی بلا اجازت آنے کا حق بھی کیا تھا۔ ٹھیک ہے

جو وہ مجھے لفٹ نہیں دے رہا ہے۔"

ہاشمی بیگم نے اس سے سب کی خیریت پوچھنے کے بعد چچی جان سے باتیں شروع کر دیں اور وہ بیٹھی بیٹھی گھلتی رہی۔

مسعود تانگے لایا اور جب سب بیٹھنے لگے تو اس نے گیتی کو اسی تانگے میں بٹھایا جس میں وہ خود بیٹھا تھا۔ کشادہ سڑکوں اور شام کی خنک ہوا نے اس تکلیف دہ احساس کو ختم کر دیا تھا۔ اب وہ گیتی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کو وہ کئی شرارتیں بھی یاد آ گئی تھیں جو انہوں نے مل کر کی تھیں۔

"اور ہاں گیتی! وہ کہاں گیا صفدر لیو چو؟ کتنے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور جانوروں کی بولیاں کیسی اچھی بولتا تھا۔"

"ہاں ہاں' وہ ابھی تک آتا ہے کبھی کبھی"

"ارے' وہ ابھی تک واپس نہیں گیا؟"

"ہاں وہ مجھے اب بھی کوکو کہتا ہے اور ویسے ہی ستاتا بھی ہے۔ اور اماں بیگم مجھے کئی دفعہ ڈانٹتی بھی ہیں کہ اس کو کیوں منہ لگاتی ہو۔"

اپنی دھن میں وہ انگریزی میں باتیں کرنے لگی۔ مسعود کا لہجہ اتنا صاف تھا کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزی اسکول کا پڑھا ہوا نہیں ہے اور اس احساس سے اس کو ایک ذرا سا اطمینان ہوا۔ باتوں ہی باتوں میں وہ مشاعرے کے پنڈال تک پہنچ گئے۔ کامنی اور مسعود کی اماں کے علاوہ سب بے پردہ تھیں۔

مسعود نے پھر کامنی کو چھیڑا۔ "یہ سرمہ دانی کہاں سے آ گئی؟ لاؤ کامنی اب بھی برقعہ اتار کر مجھے دے دو۔"

"اے! بس چپ رہو دیوانی باتیں مت کرو۔" ہاشمی بیگم نے برقعے کی نقاب برابر کر کے مسعود کو ڈانٹا اور ان کے بالکل قریب کھسک آئی۔

ایک بار پھر گیتی کو شدت سے احساس ہوا کہ کامنی ان لوگوں سے بہت قریب ہے۔ اس کے مزاج میں چھپا ہوا عقربی عنصر کروٹ لینے لگا۔ کسی کو ہتھیا لینے اور قبضہ کر لینے کی تمنا۔ جو اکتوبر کی پیدائش والے لوگوں کے مزاج کا خاصہ مانا جاتا ہے۔

باب ۲۰

وہ تنگ اور پیچیدہ گلیاں افسردہ اور مٹیالی نظر آتی تھیں۔ لیکن یہ بڑی پراسرار اور قدیم تھیں۔ یہاں غربت اور شرافت تھی۔ کچھ ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ یہ انسانیت کے جسم میں دوڑتی ہوئی رگیں ہیں جن میں بڑا پرانا سست اور نشہ آور خون دوڑ رہا ہے۔ کچھ ایسا خواب آور کہ ہر شخص اپنے حال میں مگن، ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا، مستقبل سے بے نیاز، کچھوے کی سی چال میں رینگتا، ایک نامعلوم لمبے راستے پر رواں دواں ہے۔ کون جانے، یہ راستہ کہاں سے چلا ہے اور کہاں پر ختم ہوگا۔ ان کا یہ بے نام سفر نسلاً بعد نسل جاری رہتا ہے۔

''زندگی اتنی مظلوم اور سہمی ہوئی بھی ہوتی ہے۔'' گیتی نے مسعود کے کمرے والی کھڑکی کی سلاخوں میں سے جھانک کر سوچا۔

''یہ سفید داڑھی اور تھکی آنکھوں والا مسجد کا موذن جس کے شانے جھکے ہوئے اور شرعی پاجامے کی مہریاں ٹخنوں سے اوپر ہیں اور یہ ٹیڑھی کمر اور اونچے شانوں کے درمیان بھاری مشک لادے ہوئے بہشتی شٹل کاک نما برقعوں میں سڑ پڑاتی عورتیں اور یہ سنہری مائل بوسیدہ دیواروں کے عقب میں رہنے والے لیکن، یہ آخر کن گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔'' اس کی چینیوں کی سی ننھی آنکھوں میں گرم گرم اور پر تسکین سا پانی ڈب ڈب کر رہا تھا۔

ایک دم ایک عجیب سرکش سی مسکراہٹ اس کے چپٹے، لیکن دلکش چہرے پر دوڑ گئی'' اور جو اماں بیگم کو خبر ہو جائے، میں یہاں ہوں تو وہ قیامت کر ڈالیں۔ ضرور دادی اماں کی شان میں بھی گستاخی کر بیٹھیں کہ بڑی بی تمہیں کیا حق حاصل تھا جو تم نے میری اس نازوں کی پالی بچی کو اس ماحول میں رہنے کی اجازت دے دی؟ اس زندگی کے مشاہدے کی اجازت جس کا تصور میں نے اس کے خواب میں بھی نہ آنے دیا تھا؟''

اماں بیگم کی خفگی کے خیال ہی سے اس کو اپنے جسم کا بند بند انجانی زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس ہونے لگا۔ طبقے اور حیثیت کی سنہری اور مضبوط زنجیروں سے بندھا ہوا۔ اس کے وجود کا رواں رواں درد سے کراہ اٹھا۔

مگر خیر! اب تو فی الحال وہ دو دن سے ہاشمی پھوپھو (پھپو) کے یہاں تھی اور اس مزے سے کہ گویا جنم جنم سے اسی گھر میں رہتی چلی آئی ہو۔ دوپہر کو لیٹ کر چھت سے ٹنگے ہوئے پنکھے کی ڈوری پیر کے انگوٹھے میں پھنسا کر اس مشاقی سے کھینچتی جیسے وہ کبھی بجلی کے پنکھوں میں سوئی ہی نہ ہو۔ سہ پہر کو ہاشمی پھوپھو کے جاگنے سے پہلے ہی اٹھ کر انگیٹھی سلگا کر چائے کا پانی بھی رکھ دیتی۔ اور پھر سر شام ہی سے صاف ستھرے تخت پر دسترخوان بچھا کر چٹپٹے اور لذیذ کھانے ہری مرچوں کے ساتھ کھاتی۔

دو دن تک اس گھر میں رہ کر اس نے یہ تکلیف دہ احساس بھلا دیا کہ وہ اپنے رشتے داروں، ہم وطنوں بلکہ یوں کہو کہ انسانیت کی اکثریت میں شامل نہیں۔ تنہائی اور اجنبیت کا دکھ دینے والا احساس، مٹھی بھر اقلیت یعنی بڑے لوگوں کی صف میں شامل ہونے کا شرمناک خیال تقریباً مٹ گیا تھا۔

اور یہ سب بالکل اچھوتے اور نئے احساسات ہی تو تھے جو اس مرتبہ اس کے باپ کے وطن کی سرزمین اور اس کی گلیوں اور تنگ مکانوں نے بخشے تھے۔

گیتی کو ان نئے تصورات اور خیالوں کا شدید احساس تھا جیسے وہ کسی بڑی مقدس امانت سے گراں بار ہو۔

اس کی نظر میں اپنی اہمیت ان دنوں کچھ اس طرح بڑھ گئی تھی جیسے ماں بننے والی عورت اپنی نظروں میں زیادہ اہم اور گراں قدر ہو جاتی ہے۔

یہ گھر اور یہ ماحول اس کو اس قدر پیارا کیوں لگ رہا تھا۔ یہ بات وہ قسم کھا کر کہنے کو تیار تھی کہ اس میں مسعود کے وجود کو قطعی دخل نہ تھا۔ مسعود کی شخصیت میں جاذبیت تھی۔ وہ تھوڑا سا مغرور اور تکلیف دہ حد تک خوددار بھی تھا۔ یہ باتیں بے شک اس کو پسند کرنے اور پیار کرنے کے لیے کافی تھیں۔

لیکن گیتی کی اس ماحول سے وابستگی اور انسیت میں مسعود کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اس زندگی اور ماحول سے شدید نفرت کر کے بھی مسعود سے محبت کر سکتی تھی۔ اور ابھی تک تو اس نے یہ طے بھی نہیں کیا تھا کہ واقعی وہ اس لڑکے سے کوئی تعلق خاطر قائم کر لے جو سارے دن کالج میں پڑھتا، شام کو ٹیوشن کرتا اور پھر رات گئے اپنے افسردہ اور غیر آرام دہ کمرے میں بیٹھ کر کتابوں سے سر مارتا۔

دراصل گیتی تو شروع دن سے ہی گھر کے خاموش ماحول اور ایک ڈھرے پر سلیقہ اور وضع داری سے چلنے والی زندگی پر فدا ہو گئی تھی۔ مشاعرے والے دن کے بعد وہ کئی دفعہ وہاں گئی اور پھر ہاشمی پھپھو نے میلاد شریف میں بلایا۔

گیتی کی دادی اماں اور چچی جان دوسری مہمان بیویوں کے جانے کے بعد تک وہیں ٹھہری رہیں اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں تو ہاشمی بیگم نے کہا۔

''یہ دونوں بچیاں بھی کیا کہتی ہوں گی کہ یہ پھوپھی کس ڈربے میں رہتی ہیں۔''

''واہ بھئی پھپو! مجھے تو آپ کا گھر بڑا اچھا لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے دو چار دن رہوں۔'' گیتی بیچ میں ٹپکی۔

''شوق سے، سر آنکھوں پر، ضرور رہ جاؤ۔'' میرا گھر ہی اس قابل نہیں ورنہ میں اور تم کو بلا کر نہ رکھتی۔ اگر تمہاری دادی اماں چھوڑ دیں تو تم دونوں آج رک جاؤ۔''

کوئی اور روکتا تو اس کی دادی ہرگز نہ چھوڑتیں۔ مگر ہاشمی کا دل میلا ہونے کے خیال سے چپ ہو رہیں۔ ارجمند اس چھوٹے سے گھٹے گھٹے گھر میں رہ جانے کے خیال سے ہی گھبرا گئی اور جیسے ہی دادی اماں چلیں ان کے ساتھ سوار ہو گئی۔

شام کو رمضانی آ کر گیتی کے رات کے پہننے کے کپڑے اور دو جوڑے اور دے گیا۔

''اے ہے یہ گیتی کس قدر بلا ہے! کیسا وہاں رک گئی۔ اب دلہن سنیں گی تو کس قدر برا مانیں گی۔'' دادی اماں نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ اپنی بہو کے خاموش لیکن گستاخ تیوروں سے بہت گھبراتی تھیں۔

مسعود کو گیتی کے مزاج میں ایک غیر معمولی اور چونکا دینے والی بات ہمیشہ سے نظر آتی تھی۔ لیکن اس کو یہ بھی توقع نہ تھی کہ وہ اس کے چھوٹے سے گھر میں یوں اہل گہل کر رہے گی جیسے ہمیشہ سے رہتی چلی آ رہی ہو۔

عجیب بے تکلف اور بے ساختہ قسم کی لڑکی ہے یہ بھی۔ اس نے جتنی بار گیتی کے متعلق سوچا وہ اس کو بے حد دلچسپ نظر آئی۔ مگر خیر کسی کا دلچسپ نظر آنا کوئی خاص اور غیر معمولی بات نہیں جو بھلا آدمی اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچتا رہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ گیتی کی موجودگی میں اپنے گھر اور حیثیت کے متعلق جو احساس اس کو ہوا تھا وہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اس کو یوں اپنے گھر میں بے تکلفی سے رہتا دیکھ کر وہ بھول گیا کہ اس کے اور اس لڑکی کے درمیان ایک زبردست طبقاتی بعد حائل ہے۔ اس کو بالکل یاد نہ رہا کہ اس کی اور گیتی کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑنے کے باوجود دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے قطعی الگ ہیں۔

وہ بے تکلفی سے اس سے فرمائش کرتا۔ ''گیتی! ذرا سا پانی تو پلا دو۔''

''ارے! بڑے کاہل ہو۔ خود پی لو اٹھ کر۔'' وہ اپنی عادت کے مطابق جواب دیتی اور ساتھ ہی پانی کا کٹورا اس کے ہاتھ میں تھما دیتی۔ اور جب وہ اس کی اماں کے پاس بیٹھی سالن میں ڈالنے کے لیے ادرک، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا کترتی ہوتی تو وہ اس کے قریب گھس کر بیٹھتے ہوئے کہتا۔

''توبہ! کیا بے ڈھنگی لڑکی ہے۔ دیکھو تو کیا موٹا موٹا مسالا کترا ہے۔''

''تو پھر کا ہوا۔ سالن ہی میں تو پڑے گا؟'' گیتی اپنے پھوہڑپن کا جواز پیش کرتی۔

''بیوقوف! سالن میں تو باریک اور نفاست سے کترا ہوا مسالہ پڑتا ہے۔ یہ موٹے موٹے کیڑے سے تیریں گے؟''

''بڑے نخریلے ہو۔'' وہ ہنستی۔

''یہ نخرا نہیں ہے۔ اس کو ذوق سلیم کہتے ہیں۔'' اور پھر بوڑھوں کے لہجے میں کہتا۔ ''اری بے ہنری! سیکھ لے یہ سب باتیں ورنہ سسرال میں نام دھرا جائے گا۔''

سسرال کے نام پر ٹپٹا کر چھری اس کے ہاتھ سے گر جاتی اور وہ کہتی۔ ''دیکھ رہی ہے پھپو آپ مسعود کو؟''

''یہ تو پگلا ہے' چلو تم یہاں دھوئیں میں کیوں آ بیٹھیں۔'' ان کو ایک دم یاد آ جاتا کہ اس گرمی میں اس کو یہاں بٹھانا واقعی زیادتی ہے۔

وہ تو شاید یہاں ہفتہ بھر رہ کر بھی نہ اکتاتی لیکن دادی اماں نے تیسرے ہی دن بلا بھیجا۔

اور جب وہ چلی گئی تو مسعود کو یوں لگا جیسے گھر خالی ہو گیا۔ کامنی اور دوسری لڑکیوں کے آ جانے سے رونق آ جاتی تھی اور ان کے چلے جانے کے بعد گھر سونا سونا سا لگتا تھا۔ پر گیتی کے جانے کے بعد تو اس کو یوں لگا کہ گھر کا کوئی مستقل فرد چلا گیا ہے۔ اس کے بغیر یہ گھر سونا سونا نہیں بلکہ برا لگ رہا تھا۔ اور وہ کتابیں اپنے کمرے میں ڈال کر بلا مقصد ہی بڑی دیر تک گلی میں کھڑا رہا۔

آسمان کی نیلاہٹ میں مٹیالا پن نمایاں تھا اور چیلیں بڑے افسردہ سے تسلسل کے ساتھ چکر کاٹ رہی تھیں۔ گلی بھی خاموش اور افسردہ نظر آ رہی تھی۔

اور گیتی کو وہاں سے واپس آ کر یہ شہ نشینوں والا بھرا پرا گھر بے رونق اور اجاڑ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہر احساس میں غضب کا خلوص اور صداقت ہوا کرتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کو یہاں کی بجلی کی روشنیوں میں بھی ہاشمی پھپو کے دالان کی محراب کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی زیادہ دلچسپ نظر آ رہی تھی۔ اس کی طبیعت میں بے وجہ ہی بے کلی سی پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی وہ بفاتن بوا کی بچیاں ٹٹولنے بیٹھ جاتی اور کبھی گاؤں والی نانی کی کھچی میں جا بیٹھتی اور نا معلوم کب کب کے قصے سننے شروع کر دیتی۔ کبھی چچی جان کی طرف جا کر سو جاتی۔

یا پھر اسی مولسری کے نیچے کھٹولا ڈال کر کوئی کتاب لے کر لیٹ جاتی۔ بھئی! اب تو چھٹی مناتے مناتے دل بھر گیا۔ اس نے بیس ہی دن کے بعد اکتا کر سوچا۔ اس کا دل عصمت اور طلعت کی صحبت سے بھی اچاٹ ہو چکا تھا۔ کامنی بچاری کو اول تو اس کی نانی اپنے پاس سے ملنے ہی نہ دیتی تھی اور دوسرے وہ تھی بھی گم سم' خاموش خاموش سی۔

''دادی اماں بھئی! اب ہمیں گھر بھجوا دیجئے۔'' ایک صبح اس نے حرف مدعا کہہ ہی ڈالا۔

''اے بیٹا! تم تو دو مہینے کو آئی تھیں' ابھی تو مہینہ ہی ہوا ہے۔ تمہارے باوا آنے والے ہیں' ان ہی کے ساتھ چلی جانا۔ میں تم کو زبردستی تھوڑی روکتی ہوں۔'' دادی اماں نے صندوقچے میں چابی گھماتے ہوئے کہا۔

باب ۲۱

''اس سال ہر جگہ ہی گرمی زیادہ پڑ رہی ہے۔'' اس نے اخبار ہاتھ سے ڈال دیا اور نیچی چھوٹی تپائی پر بیٹھے بیٹھے پیر پھیلا دیئے۔ وہ اس وقت صرف بنیان اور خاکی پتلون پہنے تھا۔ سورج کی تپش سے جھلسے ہوئے بھورے چہرے کے مقابلے میں کشادہ سینہ زیادہ صاف رنگ کا نظر آ رہا تھا۔ بنیان جو بہت اجلی نہ تھی پسینے کی شدت سے جگہ جگہ چپک رہی تھی اور گردن سے پسینہ بہہ بہہ کر بنیان کے گلے میں سرسر اتر رہا تھا۔

اس نے گردن جھکا کر اپنے گلے کی طرف دیکھا۔ بائیں طرف ہنسلی کی ہڈی پر ایک بڑا سا نمایاں سیاہ تل چمک رہا تھا۔ گھر اور وطن ہر چیز نے ہی اس کا ساتھ چھوڑ رکھا تھا لیکن اس پردیس میں یہ خاندانی تل ساتھ ساتھ آیا تھا۔ بالکل ٹھیک یہی تل اس کے باپ کے اسی جگہ پر تھا اور یہی باپ کے بڑے چچا کے تھا جو دن رات افیون کی پینک میں رہتا تھا اور اس کا سعادت مند بھتیجا یعنی اس کا باپ' چاہے کچھ ہی ہوتا ہر صبح شام اس کے لیے چرس کا ایک سگریٹ ضرور فراہم کرتا تھا۔ چچا کو چرس کے نشے نے سکھا کر کھانگڑ کر دیا تھا۔ اس کا سینہ اندر کو دھنستا چلا جا رہا تھا۔ کلے پچکتے پچکتے تالوسے جا ملے تھے۔ سرخ بوٹی سی دھنسی دھنسی آنکھوں سے پانی صرف اتنی ہی دیر کو رکتا تھا جتنی دیر وہ اس سگریٹ کے کش لگا تا رہتا اور اس کا باپ اپنے چچا کے لیے سگریٹ مہیا کرنے کی فکر میں سوکھتا جا رہا تھا۔

چچا کے علاوہ اس کے اور رشتہ دار بھی اس کے ذمے میں تھے۔ آہ! چینیوں کی وہ بے کنار رشتہ داری اور ان کے حقوق' کبھی خوشحالی اور فراوانی کے زمانے میں یہ خوش کن فرض ہوگا۔ مگر اف اس زمانے اور خوفناک بھوک اور بدحالی کے ان دنوں میں یہ زندگی کا ایک المیہ بن کر رہ گئے تھے۔

غرض اسی ہنسلی کی ہڈی پر ٹھیک اسی جگہ بڑا سا سیاہ تل رکھنے والے رشتے دار اس کے باپ کے لیے داغ جگر بن کر رہ گئے تھے۔ وہ اس کے نحیف و نزار جھکے ہوئے کاندھوں پر ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر سوار تھے۔ ان کو پیالہ بھر چاول اور کرم کلے اور اسی قسم کا سستا سا شوربہ بہر طور ملتا رہا اور اس کے شانے جھکتے گئے اور سر پر سے بال ان جانے میں سرکتے رہے۔

''اف! بڑی گرمی ہے۔'' صفدر یاسین نے بے ڈھنگے پن سے مڑا تڑا اخبار اٹھا کر جھلنا شروع کر دیا۔ دکان کے کاروباری اوقات کے علاوہ کسی ملازم کو بھی دکان کا پنکھا استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیانگ اور دکان میں کام کرنے والے دوسرے چھوکرے تو سانگ کی نظریں بچا کر جب بھی موقع ملتا پنکھا چلا لیتے۔

صفدر کبھی پنکھا استعمال نہ کرتا تھا' وہ سانگ کے منہ سے نکلی ہوئی مغلظات کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہ کرتا تھا جن سے وہ لیانگ اور دوسرے چھوکروں کو نوازتا رہتا تھا۔

ایک بار پھر اخبار اس نے ڈال دیا۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اس خاندانی تل نے باپ کی یاد کے ساتھ اور بھی بہت سی دکھی باتوں کی یاد دلا دی تھی۔ کس طرح اس کے باپ کی صحت گرتی جا رہی تھی اور کس طرح اس کا لائق اور خوددار باپ چڑچڑا اور بدخو بنتا جا رہا تھا۔ پھر اس کو اپنی ماں کی خاموش اور وفا شعار اطاعت گزاری اور دونوں بہنوں کی مشقت یاد آئی۔ خصوصاً ان منحوس دنوں کی یاد جن دنوں اس کے باپ پر یہ جنوں سوار ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی بات چیت' تقریر اور تحریر سے بتائے کہ عوام کی فلاکت اور فاقہ کشی کا باعث غیر ملکی تسلط اور مٹھی بھر چند انسانوں کے دلوں میں ان کی نقالی اور معیار زندگی کو اپنانے کا خبط ہے۔ بعض وقت وہ جوش میں آجاتا اور اپنے برسوں کے بھوکے اور ترسے ہوئے وجود میں سے کرب ناک آواز نکال کر پوری طاقت سے چلا اٹھتا۔ ''خدا کے واسطے اس بدیسی طوفان کو روکو۔ روکو ورنہ تم ختم ہو جاؤ گے اور یہ رہ جائے گا۔ ہاں' یہ دولت سے سرمست اور سرشار معیار حیات۔''

اور یہ ان دنوں کی بات تھی جب اس قسم کا کوئی بھی احساس اور جذبہ سخت قابل اعتراض تھا اور یہی ہوا کہ ایک دن ایک موٹا پست قد اور ترش رو انسپکٹر اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ ایک کہنہ اور بوسیدہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور جب کندھے جھکائے ہوئے وہ منحنی اور زرد رو شخص باہر نکلا تو انسپکٹر نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیں۔ صفدر کو خوب یاد تھا۔ برش جیسی ملگجی داڑھی ساکت تھی اور عام چینیوں سے قدرے مختلف انداز لیے ہوئے آنکھیں پرسکون تھیں۔

کتنے ہی مہینے گزرنے کے بعد اس کا باپ یاسین لیو قید سے نکلا۔ بالکل اس شکل میں جیسے کوئی عفریت ہو جیسے خدا کا قہر مجسم ہو کر روئے زمین پر اتر آیا ہو۔ ان گرسنہ آنکھوں میں نفرت اور حقارت کا مواج سمندر طوفان بدوش کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کے قوسین غم وغصہ اور ضبط کی شدت سے گہرے ہو کر اوپر کی جانب تن گئے تھے۔ سوچ کی شدت نے پیشانی کی رگوں کو جا بجا گچھوں کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔ مہینوں تک خاموش رہنے والی زبان پھر چلی اور بری طرح چلی۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔

اندرون شہر کے اس حصے کی گلیوں اور سڑکوں نے پھر کبھی یاسین لیو کو چلتا پھرتا نہ دیکھا۔ اس کو زمین کھا گئی یا آسمان۔ کون جانے! مگر اس کی بیوی کو خوب معلوم تھا کہ اس کا مجازی خدا' وہ ہڈیوں کا پنجر پرانی خانقاہ کے باغ والی باؤلی میں متعدد حساس' طالب علموں اور عالموں کے ساتھ آرام کی نیند سو رہا ہے۔

اس نے بڑی محنت کی تھی اور بہت دکھ اٹھائے تھے اور اب اس کا صلہ اس کو ابدی آرام کی صورت میں مل چکا تھا۔

اور پھر خود بخود ہر بات اپنی راہ پر آ گئی۔ صفدر نے کالج چھوڑ دیا۔ بوسیدہ سے نیلے کوٹ اور پاجامے میں وہ کام کی تلاش میں سرگرداں پھرا۔ آخر ایک دن شنگھائی سے جو جہاز چائے' سلک اور چاول لے کر انگلستان کو جا رہا تھا۔ اس پر قلیوں میں ملازم ہو کر وہ وہاں جا پہنچا۔ پھر وہاں سے ایک چینی تاجر اس کو لے کر کراچی پہنچا تھا۔ اور وہاں سے سانگ لے اڑا۔ دو سال تک نہ جانے کہاں کہاں خود بھی گھوما اور اس کو بھی گھمایا۔ آخر یہاں آ کر دم لیا۔ اور یوں اس مختصر سے سن و سال میں صفدر کا تجربہ خاصا وسیع ہو چکا تھا۔

اب وہ پھیری کرنے کے علاوہ سانگ کی دکان اور جوتوں کی فیکٹری کے مختلف کام کرنے کے بعد اتنا کما لیتا تھا کہ ہر دو تین ماہ بعد ایک خاصی معقول رقم اپنی ماں کو بھجوا دیا کرتا تھا۔ وہ رقم اس کی ماں اور بہنوں کی مشقت سے پیدا کی ہوئی رقم کے ساتھ مل کر ان کے اونگھتے ہوئے چینکی چچا اور دوسرے رشتے داروں کے دو وقت کے چاولوں کا انتظام ضرور کر دیتی تھی۔

گھر والوں اور گھر کے خیال کے ساتھ ہی وطن کی تاریک گلیوں اور فاقہ کش انسانوں کا خیال آتا۔ اور یہاں پردیس میں چاروں طرف بکھری ہوئی ویسی ہی پریشان اور افتاں و خیزاں زندگی کو دیکھ کر وہ سوچتا۔

''ارے! میں کب یہاں پر تنہا اور اجنبی ہوں۔ یہ تو وہی آشنا ماحول اور جانی پہچانی زندگی ہے۔ یہاں بھی غربت' فاقہ کشی اور بیماری ہے۔ یہاں بھی انسانوں کے تن ننگے اور دل حسرتوں کے مزار ہیں۔ یہاں بھی لوگوں کی عمروں کے کئی کئی سال من بھاتا کھانے اور جگ بھاتا پہننے کی آرزو میں کٹ جاتے ہیں۔ یہاں بھی تنگ اور افسردہ گلیوں سے دور ایک اور زندگی ہے۔ اونچے اور مقتدر طبقے کی۔ جہاں زندگی کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ ضروریات وہاں موہوم آرزو اور تمنا بن کر نہیں حقیقت کا روپ دھار کر آتی ہیں۔ جہاں بچے حال اور مستقبل کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں اور لڑکیاں چڑیوں کی طرح بے فکر اور خوش باش ہوتی ہیں' بالکل کوکو کی طرح۔''

اس وقت کوکو کا خیال بے محل ضرور تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ آزادی اور بے فکری کی اصل تفسیر ہی کوکو کی ذات تھی جس کا اصل نام گیتی آرا بیگم تھا۔

صفدر نے ایک انگڑائی کے ساتھ نیم وا آنکھوں کو بالکل بند کرتے ہوئے سوچا۔ ''وہ بھی تو ان دنوں اپنے باپ کے وطن اور قدیمی گھر میں چھٹیاں گزار رہی ہے۔ پتہ نہیں کیسا ہو گا وہ گھر!'' فاہیاں اور میگستھنیز کے دیس کے نوعمر اور گمنام نمائندے صفدر یاسین لیو چو کو بے وجہ تجسس ہوا۔ ''کیا وہاں بھی لکڑی کے منقش بھاری دروازے ہوں گے۔ کیا وہ گھر بھی مختلف ڈیوڑھیوں اور انگنائیوں میں بٹا ہو گا۔ کیا وہ لوگ بھی اپنے رشتے' کنبے کے لوگوں کی پرورش کرتے ہیں۔ پر ان کے یہاں کی ساری عورتیں کوکو جیسی نہیں ہوتیں جو چینیوں

سے خطرناک حد تک مشابہ ہیں۔ان کی تو پیشانیاں محرابی' آنکھیں روشن اور کھلی ہوتی ہیں۔"

اس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ ان گھروں میں چپکے سے جھانک کر دیکھے' وہ لوگ رہتے کیسے ہیں؟" اونہہ! رہتے ہوں گے کسی طرح بھی! کوکو اور اس کے گھر والے تو یقیناً اس طرح نہیں رہتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کسی بھی دولت منداور ماڈرن چینی گھرانے کو دیکھ کر باہر سے آنے والے چینی تہذیب وتمدن کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

وہ خود بخود ہنسا۔" وہ زمانے لد گئے جب فاہیان' میگستھنیز اور ابن بطوطہ لوگوں کے طرز معاشرت کا آسانی سے اندازہ لگا لیا کرتے تھے۔اس دنیا میں تمدن اب صرف دوٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔اس طبقہ کا تمدن جو گیتی آرا بیگم کوکو کا ہےاور گلیوں اور تنگ مکانوں کے باسیوں کا تمدن یعنی صفدر یاسین لیو چو کے طبقہ کا۔"

سوچتے سوچتے وہ بڑے واضح طور پر ہنسا اور چپکے سے سوچا۔" سنا کوکو! تمہارے اس تمدن میں یکسانیت اور یک رنگی ہے۔خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہواور میرے تمدن میں تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ ہر بھوکے اور فاقہ کش جی کے جینے کا اپنا الگ انداز ہے۔"

" کیوں بھئی! یہ تم سب کچھ کوکو ہی کو مخاطب کر کے کیوں کہنا چاہ رہے ہو۔ آخر تم اس جیسے بے شمار گھروں میں جاتے ہو۔" صفدر یاسین نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے جواب طلب کیا اور خود ہی جواب بھی دے دیا۔" شاید اس لیے کہ وہ کچھ اس قسم کی لڑکی ہے جو ہر شخص کو اپنے آپ سے بہت قریب نظر آتی ہے۔جس کو دیکھ کر خود بخود دل چاہتا ہے کہ اس کو خوب ستاؤ' رلاؤ اور جب یہ موڈ میں ہو تو اس سے دل کی بات کہہ دو۔ بے کھٹکے اس لیے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو کبھی کسی کا راز فاش نہیں کرتے۔اور جو بڑے سے بڑے ظالم کے آگے بھی مجبور ہو کر وہ بات نہیں ظاہر کرتے جس کا اظہار وہ نہ کرنا چاہیں۔

" ہاں' میں سچ کہتا ہوں گیتی آرا کوکو تم بڑی عجیب لڑکی ہو ہاں"

اس نے اطمینان سے پیٹھ لگائی' پیر پھیلائے اور گہری نیند سو گیا۔

باب ۲۲

وہ بے صبر تھی اور صاف گو۔وہ بہت دن تک ایک بات کو گھوٹ ہی نہ سکتی تھی۔بس کسی چیز کے متعلق سوچا اور وہ اس کے ذہن پر طاری ہوئی۔اس کا ہر جذبہ ہمیشہ شدید اور صادق ہوا کرتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اس شام اس نے مسعود کی طرف سے غور سے دیکھا اور ہنس

دی۔

اس کو دادی اماں کے پاس سے واپس آئے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا۔ اس کے ابا میاں ضروری کاموں کی وجہ سے ان کو لینے کے لیے نہ رک سکے تھے۔ انہوں نے دادی اماں کو لکھ دیا تھا کہ لڑکیوں کو کسی کے ساتھ روانہ کر دیجئے۔

مسعود کے کالج کی چھٹیاں تھیں۔ اور دادی اماں نے سوچتے سوچتے اسی کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ دوسرے ہی دن مسعود گیتی اور ارجمند کو لے کر روانہ ہو گیا۔

اور اب وہ اس وقت کنوئیں کی جگت کے پاس ایک بڑے سے پتھر پر چڑھا بیٹھا تھا اور گیتی اس کے سامنے ہی کھڑی کنوئیں کے اندر جھانک رہی تھی۔ کنوئیں کے اندر پانی کھینچنے والی مشین دھکا دھک چل رہی تھی۔ فضا میں رگڑ کھاتے ہوئے لوہے اور گریس کی مچاہندی بو پھیل رہی تھی۔ اس نے مسعود کی طرف غور سے دیکھا اور ہنس دی۔

''ارے مجھے دیکھ کر کیوں ہنس رہی ہو۔ میرے منہ پر کیا لکھا ہے؟'' مسعود نے سگریٹ سلگا لیا۔

گیتی نے بڑے اطمینان سے سگریٹ اس کے ہاتھ سے لیا۔ ''تم نے سگریٹ کب سے شروع کر دیا؟'' اور پھر کھلکھلا کر ہنس۔

''کیوں! پاگلوں کی طرح مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہو لاؤ میرا سگریٹ۔''

''لو بھئی اپنا سگریٹ'' اس نے اس کے دونوں شانوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور بولی۔ ''تم کو پتہ ہے' تم بہت سویٹ ہو۔ مجھے بہت پیارے لگتے ہو' سمجھ رہے ہو نا تم میری بات؟''

''پاگل!'' مسعود بھنا گیا۔ اس لیے نہیں کہ اس لڑکی نے کوئی بڑی معیوب بات کہہ دی تھی بلکہ اس لیے کہ آخر وہ اس قدر عجلت پسند کیوں تھی۔ جو بات کتنے ہی دن سے وہ خود اس سے کہنا چاہ رہا تھا اس کے کہنے میں پہل کرنے والی وہ کون تھی۔ اس کم بخت بے تکی لڑکی نے سراسر اس کی توہین کی۔ مسعود کا دل چاہا کہ کس کے ایک چانٹا اس بھتنی کے لگائے۔ پھر یہ اپنی چینیوں جیسی آنکھوں سے بیٹھی ٹسوے بہایا کرے۔

''سور' کتیا!'' وہ اتنا بڑا ہو کر بچوں کی طرح اس کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا رہا۔

''اب یہ تمہیں چپ کیوں لگ گئی؟'' وہ ہنسی کے مارے لوٹ گئی۔

''گیتی! اس نے بزرگانہ آواز نکالی۔ ''یہ باتیں لڑکیوں کے کرنے کی ہوتی ہیں؟''

''اور نہیں تو کیا بڑھیوں کے کرنے کی ہیں؟''

''بڑی واہیات ہو۔'' وہ اس سے انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔

''کیوں؟ اس میں واہیات پن کی کیا بات ہے؟ فرض کرو میں تم کو اچھی لگنے لگتی اور تم مجھے بہت چاہنے لگتے تو کیا تم مجھ سے نہ کہہ دیتے۔ بھئی واہ! یہ بھی کوئی بات ہے کہ اندر ہی اندر کسی پر مرتے رہیں اور جو اچھا لگ رہا ہے اس کو نہ بتائیں۔ یہ بھی اچھا پاگل پن ہے۔'' گیتی نے منہ پھلالیا اور بڑی روٹھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''پتہ ہے' میں تم پر مرتی ہوں۔''

''کوئی نہیں مر رہی ہو' اچھی خاصی تو بیٹھی ہو۔''

''اے مسعود تو کیا تمہارا ارادہ ہے کہ میں سچ مچ ہی مر جاؤں؟ اپنا مردہ اٹھوا دوں؟ بھئی! یہ تو محاورے کی ایک بات ہے۔ اسکول کی تمام لڑکیاں اسی طرح کہتی ہیں۔ وہ تو سسٹرز اور مدرس تک پر مرنے لگتی ہیں۔ اے لو' مسعود تم بہت خر دماغ ہو' بالکل پاگل؟''

''پاگل تو تم ہو' تمہاری عمر اس قسم کی باتوں میں پڑنے کی نہیں ہے اور میں تم سے بڑا ہوں۔ تم کو میرا لحاظ کرنا چاہیے۔''

''اور کیا! میرے ابا تو تم ہی ہو' گدھے نہیں تو'' اس نے گھم سے ایک دھموکا مسعود کی پیٹھ پر دیا۔

''ہٹو' بدتمیز نہیں تو کہیں کی۔ آج معلوم ہوا کہ ایسی ہو۔ جب ہی تو پٹا پٹ فیل ہوتی ہو۔''

''اچھا کرتی ہوں فیل ہوتی ہوں' تم کیا میرے اتالیق ہو؟ واہ بھئی! لورز کو فیل پاس سے کیا مطلب! لورز کب بیٹھ کر پڑھنے لکھنے کی باتیں کرتے ہیں۔''

''اوہو' کس قدر بڑی لورہیں آپ!'' مسعود نے مذاق اڑایا۔

''لو اور ہوئی۔ مسعود اللہ کی قسم تم مجھے بہت سویٹ لگتے ہو اور خاص کر اس وقت یوں اس پتھر پر بیٹھے ہوئے۔ اس طرح میلی سی قمیص پہنے ہوئے اور اجاڑ سی صورت بنائے۔''

اگر اس کی آنکھوں میں اتنی صداقت اور لہجے میں اتنا خلوص نہ ہوتا تو وہ سمجھتا شاید وہ اسے الو بنا رہی ہے۔

''گے تی!'' ارجمند کی نفیس اور دلربا آواز پورچ میں سے لہرائی۔ ''گے تی' یہاں آؤ۔''

''وہ دیکھو ارجمند آواز دے رہی ہے۔'' مسعود نے گیتی کو ٹالا اور خود ہی اس طرف چل پڑا۔ اس کے پیچھے پیچھے گیتی تھی۔ وہ نہ گھبرائی ہوئی تھی' نہ اس کا چہرہ سرخ تھا' نہ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور نہ سانس اوپر تلے ہو رہی تھی۔ وہ پرسکون تھی اور مطمئن تھی۔ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اس نے مسعود کے متعلق جو جذبہ اپنے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا محسوس کیا تھا وہ ایک سچے امانت دار کی طرح مسعود کے حوالے کر دیا تھا۔ اب وہ اس کے دل میں اپنا دل ڈالنے سے تو رہی کہ اس کو مجبور کرے اور کہلوا کر چھوڑے کہ ہاں

بھئی، میں بھی تم پر مرتا ہوں۔

''ہاں بھئی، مرضی ہے اس کی یہ تو۔'' اس نے بڑے اطمینان سے سوچا اور پھر خود بخود اس کا احساس کمتری اس پر غالب آ گیا۔

''اور بھئی ہم ہیں بھی تو سب سے بدتر، فیل بھی ہوتے ہیں اور شکل بھی بالکل ہونق ہے۔ اماں بیگم بھی ہر وقت ہم کو برا کہتی ہیں۔ بختیار بھیا بھی ہمیں سب سے حقیر سمجھتے ہیں اور وہ صولت آپا بھی ہم پر ہی دانت کٹکٹاتی ہیں۔ ایک ذرا شہریار بھیا چاہتے تھے تو وہ ولایت جا بیٹھے۔ ایک خط تک بھی نہیں لکھتے۔ پھر بھلا مسعود کی کیا شامت آئی ہے جو وہ ہمیں پسند کرنے لگے۔ بھئی! ہم سے اچھی اور گڈ لکنگ تو کامنی ہے۔'' حسد اور محرومی کی ایک شدید ٹیس درد بن کر اس کے وجود پر طاری ہو گئی۔

ارجمند گلابی لباس میں کھڑی تھی۔ اس کے رخساروں کا رنگ لباس سے مل رہا تھا اور معصومیت سے کھلی ہوئی کٹوراسی آنکھوں میں موتی سے کٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''چلو گی نہیں جینی کی برتھ ڈے پر؟'' اس نے رنگین کاغذ میں لپٹا اور لچھے سے بندھا ہوا تحفہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں، مگر ہائے اللہ! ہم تو تحفہ لینا ہی بھول گئے؟'' اس کی گردن لٹک گئی۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ پھر کسی دن دے دیں گے۔ یہ ضروری تھوڑی ہے کہ عین اسی وقت سب کے سامنے دیا جائے۔ گیتی نے پھر خود اپنے ہی استدلال سے مطمئن ہو کر سوچا۔

اور مسعود سوچ رہا تھا کہ اس وقت اگر گیتی کے بجائے ارجمند نے یوں اقبال محبت کیا ہوتا تو کیا اس کے ساتھ میرا یہی رویہ ہوتا۔

''اونہہ! کیا پتہ کیا رویہ ہوتا، جب کرتی تو دیکھا جاتا۔'' مسعود نے بے نیازی سے سوچا۔

دونوں بہنیں آگے پیچھے اندر چلی گئیں۔ ایک حسین، محتاط اور فرشتوں کی طرح معصوم اور دوسری موٹی، بھدی، الٹے سیدھے لباس میں چالاک اور شیطان کی طرح بے تکی۔

اور اس رات مسعود سامنے والی لان پر تنہا اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا تو کسی ارادے اور کوشش کے بغیر گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے پھسل پھسل کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ وہ نہ کچھ سوچ رہا تھا اور نہ کچھ سوچنا چاہ رہا تھا۔ پھر یہ آنسو کیوں بہے چلے جا رہے ہیں؟ آخر اس پر یہ عجیب کیفیت کیوں طاری ہے؟ وہ ایک بیکراں سناٹے اور ایک ناقابل عبور خلا میں ٹکریں کیوں مار رہا ہے؟ خدا سمجھے گیتی کی بچی کو۔ میرا صبر پڑے گا۔ اس نے دوسری طرف کروٹ لی، تکیے میں منہ چھپایا اور سو گیا۔

دبے دبے قدموں سے باتیں کرتی ہوئی اور ہنسی ہوئی دونوں بہنیں گزریں۔ وہ ابھی ابھی سالگرہ سے واپس آئی تھیں۔

گیتی اس کے قریب آکر رک گئی اور جھک کر اس کو دیکھا۔ مسعود کی آنکھ کھل گئی۔ مگر وہ دم سادے پڑا رہا۔

''کیوں ارجمند! اچھا لگ رہا ہے نا یہ؟ ہے نا پیارا سا؟'' وہ بالکل بچوں کی طرح بولی۔

''شی! جاگ جائے گا۔'' ارجمند نے دھیرے سے کہا۔ ''مگر گیتی تم نے اس سے ایسی باتیں کیں اور جو وہ کسی کو بتا دے تو؟''

''بتادے تو میں کیا کروں' میرا کیا بگاڑ لے گا؟ بھئی! بات یہ ہے ارجمند' اگر ایک بات میں' تم یا کوئی اور سوچے تو پھر وہ بات سب کو ضرور معلوم ہونا چاہیے' بھئی! دیکھو دل میں گھونٹ لینے کے لیے تو نہیں سوچی جاتیں۔''

ارجمند گیتی کی دل چلی باتوں پر فق کھڑی تھی۔ اور مسعود سوچ رہا تھا۔ بھئی عجیب ہے یہ گیتی تو۔ بالکل بلا ہی ہے۔'' نہ جانے کیوں پہلے تو اس کا دل بڑی زور زور سے دھڑکتا رہا' پھر ایک دم جیسے سکون سا آ گیا اور وہ دوبارہ سو گیا۔

باب ۲۳

وہ اس کو بڑی دیر سے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آج صبح سے اس کا منہ پھولا اور لٹکا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔

اس نے تو اب تک اس کی باتوں کا جواب دیا ہی نہ تھا۔ اس کی تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ پھر بھی وہ اس کو ڈھونڈھتا پھر رہا تھا اور وہ ملی تو کہاں۔ کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف۔ جدھر چارا اور مکا بوئی ہوئی تھی۔ وہ اسی حصے میں بھینس کے چھپر میں بیٹھی نظر آ گئی۔ وہ اور قریب گیا۔

راجو الگ کھڑا تھا اور وہ بڑی مشاقی سے بھینس کے تھن سے شرشر دودھ نکال رہی تھی۔ پورے انہماک اور محنت سے۔

''اے بی بی! تھن کو اس طرح نہ نچوڑو۔ اگر اس طرح تکلیف دو گی تو رفتہ رفتہ یہ بے کار ہو جائے گا۔''

''اچھا ہاں' راجو۔'' اس نے فوراً راجو کے کہنے کے مطابق ہاتھ نرم کر دیا۔

وہ اس کی نظروں سے دور اس کو کھڑا دیکھتا رہا۔ نیلی دھاری دار قمیص اور سفید شلوار میں وہ بڑے آرام سے اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹہ چھپر کے اسارے سے ٹنگا ہوا تھا۔ چھپر میں بھوسا پھیلا ہوا تھا اور ناند میں سانی رکھی تھی۔ کھلی' بھوسے اور بنولے کی ملی جلی چھار اور تازہ گوبر کی مہک میں وہ کتنی مگن بیٹھی تھی۔ مسعود کو اس پر رشک آیا اور وہ اس کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔

''ہٹو۔ اب میں نکالوں دودھ!''

وہ اچھل پڑی جیسے کسی نے اس کو عین ارتکاب جرم کے وقت آلیا ہو۔

''ہٹو!''مسعود نے اس کے ٹہوکا مارا۔''چھوڑو دیوانی! سب کپڑے لتک رہے ہیں۔''

''اونہہ! آ گئے یہاں بھی بور کرنے۔''وہ یوں چڑ چڑائی جیسے وہ اس سے واقعی سخت بور ہوتی ہو۔

''اور تم یہاں کیوں مری بیٹھی ہو؟ میں تم کو گھنٹہ بھر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''تم مر جاؤ اللہ کرے۔ میں کیوں مرنے لگی۔ تم کو مجھ سے کیا مطلب؟ تمہاری رشتے دار تو بس ارجمند ہے۔ لطیفے سناؤ گے تو اسی کی طرف منہ کر کے۔ ٹافیاں دو گے تو اسی کو اور کتاب بھی اسی کو لا کر دی ہے۔''

''وہ پڑھتی جو ہے اور تم ایک نکمی بدشوق ہو۔''

''مسعود تم میرے ابا نہیں لگتے جو تم مجھے ہر وقت پڑھنے پر ٹوکا کرتے ہو۔''لڑتے میں وہ بھینس' دودھ کی بالٹی اور راجو سب سے بے نیاز ہو کر چھپر سے نکل آئی۔ مسعود اس کے پیچھے تھا۔ چھپر سے ذرا دور امرودوں کے پیڑ تھے۔ اور وہ وہیں رک گئی۔

اس نے پھر باز پرس کی۔''بولو! میں تم سے کبھی پڑھنے لکھنے کو کہتی ہوں۔''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ایک گدرسا پستئی پستئی امرود توڑا اور جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔''کبھی میں نے بھی تم کو نکما کہا ہے؟''

ایک امرود اور ٹوٹ کر اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔ جسے پھر وہ بھکر بھکر کھا رہی تھی۔ اور پھر دو امرود اور توڑے اور پاس پڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔

''بولو بھئی' میں نے تم سے کبھی کہا کہ مجھے کتابیں پریزنٹ کرو اور لطیفے سناؤ۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموشی سے امرود پر امرود کھانے لگی۔

''کیوں اتنیت امرود کھا رہی ہو؟ مر جاؤ گی۔''مسعود نے اس کے ہاتھ سے امرود لے لیا۔

گیتی نے مسعود کا ہاتھ جھٹکا اور چیخ کر بولی۔''میں یہی کھاؤں گی۔ پتہ ہے کیوں؟ اس لیے کہ میں فرسٹریٹڈ ہوں۔''

''ارے' یہ کس نے بتا دیا تم کو؟''

''کیوں؟ میں کیا بالکل جاہل ہوں؟ میں اتنی کتابیں پڑھتی ہوں کہ تم کو معلوم بھی نہیں۔ فیل ہوتی ہوں تو کیا ہوا۔ بھئی میرا کورس پر دل نہیں لگتا۔''

وہ ہنس پڑا۔''اچھا تم فرسٹریٹڈ کیوں ہو؟''

''اس لیے کہ مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ سب برا بھلا کہتے ہیں۔ سوائے ابا میاں کے۔ پر ان کو اتنی فرصت نہیں اور پھر بھئی میں ہوں بھی بری۔ اس لیے مجھے خوب معلوم ہے کہ تم بھی میرے بجائے ارجمند کو چاہو گے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔'' وہ اس وقت دنیا کے ہر انسان سے مایوس و بدگمان نظر آ رہی تھی۔ ''مگر دیکھو مسعود! مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم مجھے پسند کرو یا نہ کرو۔ مگر ارجمند کو نہیں کرو گے۔''

وہ ہمیشہ بغیر مانگے اور ضد کئے میرے حصے کی ہر چیز ہتھیا لیتی ہے۔ تم کو نہیں معلوم کہ اس نے میرے ساتھ پیدا ہو کر میرے حصے کا سارا پیار اماں بیگم سے لے لیا اور میرے حصے میں کچھ بھی نہیں آیا۔''

اس نے اپنا چہرہ مسعود کی طرف اٹھایا۔ اس کے چپٹے چہرے پر اذیت اور کرب کی وہ کیفیت تھی اور آنکھوں میں اتنی مایوسی تھی کہ مسعود سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے اس بے قرار چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بادام کی وضع کی سیاہ آنکھیں' چینیوں کا سا زرد رنگ' عنابی لب اور چپٹی ناک یہ سب چیزیں کتنی دلچسپ لیکن پراسرار اور اجنبی تھیں۔ وہ آگے کو جھکا۔ اس نے ان سیدھے سیاہ اور نسبتاً سخت بالوں کو دیکھا ان میں ایک قدرتی مہک تھی۔ یہ سب چیزیں کتنی انجان اور اچھوتی تھیں۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے جو اس کے چہرے کو تھامے ہوئے تھے اور اس کے سیاہ بالوں کے ڈھیر میں اپنا منہ چھپا لیا اور صرف اتنا کہا۔

''تم اطمینان رکھو' میں ارجمند سے ہرگز محبت نہ کروں گا۔''

اسی وقت مکا کی میٹھی میٹھی خوشبو میں بسا ہوا' ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس نے بڑی امید سے سوال کیا۔

''اور مجھ سے؟''

''سوچ کر بتاؤں گا۔''

''اچھا! کوئی بات نہیں۔'' وہ بڑے اطمینان سے کھڑی ہو گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے تمہارے جواب کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس جو جذبہ تھا وہ میں تمہیں دے چکی ہوں۔ اس نے امرود کا باقی ٹکڑا شل شل کرتے پانی کے نالے میں پھینک دیا۔

کھیتوں میں گہری اور شاداب ہریالی تھی اور چھپر میں سنہری بھوسے کا بے ترتیبی سے ڈھیر لگا تھا۔ سرسوں اور بنولے کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اس نے گیتی کی طرف دیکھا۔ وہ اس سارے پس منظر میں بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بالکل دھرتی کی طرح۔ وسیع' فیاض اور مطمئن۔

''اونہہ! پتہ نہیں۔ اب تم کیا کر رہی ہوگی گیتی آرا'' مسعود نے نندا سی آنکھوں اور تھکے ہوئے دل سے کتابیں ایک طرف دھکیلیں اور اپنے پلنگ پر دراز ہوگیا۔'' دیکھا میں نے تم کو کیسا بہلایا۔'' سوچ کر بتاؤں گا۔''

''ہاں گیتی! میں اس قدر گدھا تو نہ تھا کہ ہر صبح ناشتے کی میز پر تمہاری سوالی نظروں کو نہ سمجھتا۔ مگر تم خود ہی بتاؤ کہ میں کیا جواب دیتا۔ بھلا اس میں ایسی کیا سوچنے اور سمجھنے کی بات تھی۔ یہ بھی کیمسٹری کا کوئی فارمولا تھا۔ ایک جانی بوجھی اور سوچی سمجھی بات کو آدمی سوچ ہی کب سکتا ہے۔ میں نے تم کو کب پسند نہیں کیا۔ تم کو پسند نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ تمہارے جیسی گستاخ اور بے دھڑک لڑکیاں روز روز تو پیدا نہیں ہوا کرتیں۔''

پھر تم تو میرے ذہن پر آسیب کی طرح مسلط ہوگئی ہو۔ کیا واقعی انسان اپنی زندگی میں بھی آسیب بن کر لوگوں کو ستا سکتے ہیں۔ لیکن گیتی! تمہاری بات کا جواب میں سوچ سمجھ کر دوں گا۔ یا شاید نہ بھی دوں۔ اس لیے کہ میرے اور تمہارے درمیان تنگ دستی اور فراغت کی ناقابل عبور دیواریں حائل ہیں۔ تم کو چشم بد دور فراغت حاصل ہے اور میں تنگ دست۔ میری اور تمہاری دنیا میں بڑا فرق ہے۔ اتنا کہ تمہارا ضرورت سے زیادہ سیدھا اور بھولا ذہن اس فرق کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اور یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ تم نے اپنے طبقے سے الگ ہوکر یہ بات سوچی ہی کیسے۔ تمہارے طبقے اور حیثیت کی لڑکیاں تو ہم جیسوں کو انسان ہی نہیں سمجھتیں۔ میرے جیسے کسی انسان کی پرشوق نظریا توجہ کے تصور ہی سے انہیں پھریریاں آتی ہیں۔

کاش میں نے تمہارے طبقے کی لڑکیوں اور لوگوں کی باتیں نہ سن رکھی ہوتیں جو وہ نفرت اور حقارت کے عالم میں میرے طبقہ کے متعلق کرتے ہیں تو میں بھی بڑے چاؤ سے عرض نیاز کرتا۔ اور تمہارے چرنوں میں بیٹھ کر اپنی محبت کے دیپ جلانے کی کوشش کرتا۔ مگر میں کیا بتاؤں کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ اور بقول تمہارے طبقے کے میرا کم نصیب طبقہ جھوٹی آن اور فریب خوردگی کو عزت نفس کا نام دے کر اس پر ناز کرتا ہے۔''

''اچھا گیتی! میں نے اس جذبے کو جو میرے اور تمہارے دونوں کے دلوں میں سر اٹھا رہا ہے قسمت کو سونپا۔''

مسعود نے کروٹ لی اور سو گیا۔

''لو! وہ تو چلا بھی گیا۔ اس نے تو کہا تھا کہ سوچ کر بتاؤں گا۔ پتہ نہیں وہ بالکل خاموش اور سہما سہما کیوں نظر آنے لگا تھا۔ کیا وہ کوشش کے باوجود مجھے پسند نہیں کر سکا۔ لیکن اس میں اتنے رنجیدہ ہونے کی بات تھی۔ کہہ دیتا بھئی میں مجبور ہوں۔ خیر بھئی مرضی ہے اس کی۔'' گیتی نے کاپی اپنے آگے کھسکائی اور سوال کرنے لگی۔ آخر کو اسے ہوم ورک بھی تو پورا کرنا تھا۔ سسٹر الینر ایہ تھوڑی سننے بیٹھے

گی کہ وہ اس وقت مسعود کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ جان بوجھ کر نہیں بلکہ آپ ہی آپ اس کا خیال آئے ہی چلا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ نماز پڑھتے اور حساب کرتے وقت ہی دنیا بھر کے خیال کیوں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کا دل اچاٹ ہوتا چلا گیا اور میز پر بیٹھی بیٹھی ادھورے کیے ہوئے کام کی کاپی پر سر رکھ کر وہ سو گئی۔

سانگ چین جا رہا ہے۔ کئی سال بعد وہ اور اس کی داشتہ دونوں وطن جا رہے ہیں۔ وہ وطن کی پیاری خوشبوؤں اور فضا میں سانس لیں گے۔ وہاں کی تمام خوشیوں اور دکھوں کا زندہ اور محسوس طور پر دیکھیں گے۔ کاش میں بھی وہاں جا سکتا۔ اگلے مہینے میری بہن کی شادی ہے۔ دور دراز گاؤں سے اس کی سسرال والے کپڑوں اور ساز و سامان کے ساتھ ایک ڈانڈی اس کو لینے بھیجیں گے اور وہ اس میں بیٹھ کر اس دیس چلی جائے گی جہاں اس کا ہونے والا شوہر دھان کے کھیتوں میں کام کر رہا ہوگا۔ اس کے سر پر دھان کے ریشے سے بنا ہوا ٹوپ ہوگا اور تن پر نیلا کوٹ اور پاجامہ۔ ٹھیک ہے۔ یوں ہی ہوتا ہے۔ عالموں کی یتیم لڑکیاں جاہل کسانوں کو سونپ دی جاتی ہیں اور ۔۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔۔ خیر کچھ نہیں۔ مجھے تو فکر یہ ہے کہ نسبت اور شادی کی رسوم میری غیر حاضری میں کیونکر طے ہوئی ہوں گی؟

صفدر یاسین نے سانگ کے کھاتے میں رقمیں لکھتے لکھتے ہاتھ روک لیا اور میز پر پڑا ہوا خط اٹھا لیا۔ خوبصورت حروف اور برش کی مشاق اور محتاط جنبشوں میں مختصراً اس کی ماں نے اپنے گھر کی پہلی شادی کی اطلاع اپنے اس کماؤ پوت کو دی تھی۔ جو اس سے منزلوں اور میلوں دور تھا۔ پردیس میں بیٹھے ہوئے لڑکے پر اس نے اپنی پریشانی اور فکروں کا کوئی اظہار نہ کیا تھا۔ لیکن وہ چند قانع الفاظ اور سنجیدہ سطریں اس کی دلی کیفیت کی ترجمان تھیں۔

”اچھا بیٹا! تم رنج نہ کرنا۔ تم جہاں کہیں بھی رہو ہم تم کو اپنے آپ سے بالکل قریب ہی سمجھتے ہیں۔ تم ہماری ہی خاطر تو اتنی دور جا بیٹھے ہو۔ تم اپنی بہن کی خوشحالی کی دعا کرنا۔ تم کوئی غم نہ کرنا۔“

”نہیں ماں' میں غم نہیں کروں گا۔ میں خوش ہوں کہ میرے باپ کی بیٹی کسی سود خوار مہاجن یا راشی افسر کی بیوی نہیں بننے والی ہے جس کے رگ و ریشے میں محنت کی حلال اور محتاط کمائی کا خون دوڑ رہا ہے۔ وہ ظلم اور زیادتی کی ناروا راحتوں سے محفوظ رہے گی۔ ماں! تم بھی شکر کرو کہ وہ کسان کے گھر جا رہی ہے۔ کسان تو جگ کا پالنہار ہوتا ہے۔“

پھر بھی وہ ملول اور افسردہ تھا۔ اس کی جفاکش اور یتیم بہن اپنے گھر جا رہی ہے۔ اس گھر کو چھوڑ کر جہاں کبھی اس نے سکھ نہیں دیکھا۔ جہاں اس کو کبھی ڈھنگ سے روٹی بھی نہ ملی۔ جس گھر میں ہوش سنبھالتے ہی وہ محنت مشقت میں لگ گئی۔ وہ کتنی ہنر مند اور

دستکار ہے۔ چین کی لاتعداد ذہین اور ضرورت مند عورتوں کی طرح۔ اس نے کبھی فراغت مندوں کی لڑکیوں کی طرح بے فکری اور چین کے دن گزارے۔ اب وہ اپنے گھر جا رہی ہے تو اس کا بھائی اس کو الوداع بھی نہ کہہ سکے گا۔

اس نے کئی چھوٹے موٹے حقیر تحفے سانگ کی داشتہ کو دیئے تھے کہ یہ تم میری ماں تک پہنچا دینا۔

اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ ان کئی سالوں میں کبھی بھی اس کا دل اتنی شدت سے گھر جانے کو نہ چاہا تھا۔ یانگ سی کے زرد پانیوں کے کناروں پر بسی ہوئی سرزمین' وہ اندرون شہر کے خستہ اور بوسیدہ حال علاقے' چرس کی بو اور اونگھتی ہوئی زندگی۔ اس کو بری طرح یاد آ رہی تھی اور یہ اس کو خوب معلوم تھا کہ وہ ابھی کئی سال تک اور گھر جانے کے قابل نہ بن سکے گا۔

اس کا دل بے طرح چاہ رہا تھا کہ کسی بہت ہمدرد اور غم خوار شخص کے سامنے بیٹھ کر اپنا دکھڑا سنائے اور خوب آنسو بہائے۔ مگر ایسا کون ہے' لیانگ؟ وہ ایک ہی کائیاں اور خشک مزاج ہے۔ جیسا سوکھا ہوا چھوہارہ۔ اور سانگ کی داشتہ؟ اوہ! تو پھر کیوں نہ وہ کنفیوشس کے مجسمے کے آگے بیٹھ کر درد دل کہہ ڈالے یا پھر بدھ کا مجسمہ کیا برا ہے۔ لانبے کانوں والا' آسن جمائے' گیان میں مصروف بدھ کا مجسمہ' اور پھر اس سے اس اجنبی شہر کی سڑکیں کیا بری ہیں۔ کیوں نہ وہ ان پر آوارہ گردی کرتا پھرے۔ لوگوں کو ہنستا بولتا' زندگی کی دمادم میں مصروف دیکھ کر اپنی سوچوں اور محرومیوں کو احساس بالکل مٹ جاتا ہے۔

◆◆◆

فصل سوم

باب ۲۴

بے مقصد سڑکوں اور شاہراہوں کا چکر کاٹتی ہوئی وہ بائیسکل بلاوجہ ریسٹ ہاؤس نما بنگلے کی عقبی دیوار کے پاس آ کر رک گئی۔ دیوار کے کنارے کنارے لگے ہوئے گل مہر کے سرخ انگارہ سے گچھے باہر سڑک کی طرف جھانک رہے تھے۔ دوپہر ابھی پوری طرح رخصت نہ ہوئی تھی۔ یہ شروع اگست کا مہینہ تھا اور مطلع ابر آلود۔

حسب معمول ہر طرف خاموشی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور چونک پڑا۔ ہائیں! میں یہاں تک کیوں آ گیا۔ میرے پاس یہاں آنے کے جواز میں کوئی سامان بھی تو نہیں۔

دیوار کے اس طرف سے وہ چپٹا اور آسودہ چہرہ ابھرا اور باہر کی طرف جھانکنے لگا۔ سامنے چائنامین صفدر یاسین کھڑا تھا۔ وہ کئی مہینے کے بعد نظر آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر وہ یہ قطعی بھول گئی کہ آج صبح سے وہ اداس اور پژمردہ ہو رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی بلا ارادہ ہنس دی۔

''ارے ہلو چینا!'' اس نے مسخرے پن سے اس کو مخاطب کیا۔ ''یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں'' وہ منہ لٹکا کر بولا۔

''تو آ جاؤ نا اندر۔ مجھے اپنے لیے ایک سیش لینا تھی۔ اور سنو صولت آپا نے بہت سی چیزوں کے لیے لکھا ہے۔ وہ آج کل کسی بڑی جنگلی سی جگہ پر ہیں۔ وہاں پر کوئی چائنامین وائنا مین نہیں ہوا کرتے۔ اور ہاں انہوں نے لکھا کہ صفدر سے کہنا کہ سلک پر غروب آفتاب کا منظر پینٹ کر دے میرے لیے۔''

وہ یہ سب ایک سانس میں کہہ گئی اور صفدر نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''اچھا! تو خوبصورت لڑکی تمہیں اتنی جلدی غروب سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔''

اور وہ اسی طرح منہ لٹکائے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے اس وقت' کہو تو اندر آ جاؤں۔''

''کیوں نہیں' ضرور آ جاؤ۔'' وہاں کیوں کھڑے ہو مرے ہوئے۔''

''تم بڑی بدزبان ہو۔'' وہ اندر آ گیا۔

وہ پھر ہنس پڑی۔ ''ہاں کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے میں خوب بدزبانی کروں' کسی سے خوب لڑوں اور زبان چلاؤں۔'' وہ گل مہر کے سائے میں کنکریٹ اور سیمنٹ کے اونچے سے ڈھیے پر بیٹھ گئی۔

''کیوں کوکو! ایسا دل کیوں چاہ رہا ہے؟'' اس نے دیکھا کہ بادام کی سی کھنچی کھنچی آنکھوں میں اداسیوں کے سائے گہرے تھے مگر چیری کے سے شاداب لبوں پر ہنسی تھی۔

اس نے بات ٹال دی اور بولی۔ ''آج تم بہت چپ چپ ہو لیو چو! کیا بات ہے؟ آج تم کوئی سامان بھی نہیں لائے؟ آج تم مجھ سے لڑے بھی نہیں؟''

وہ اسی طرح خاموش سا اس کے قریب گھاس پر بیٹھا ہوا ایک تنکا دانتوں کے تلے کچلتا رہا۔

''کچھ بیمار ہو؟''

''نہیں کوکو! میں بیمار نہیں۔ مگر میں فکرمند ضرور ہوں۔''

''کیا ہوا؟'' وہ ہمدردی سے اس کی طرف جھکی۔ اس کے انداز میں اتنا خلوص اور بے تکلفی تھی کہ صفدر سے اس سے زیادہ برداشت نہ ہو سکا۔ اس کا دل چاہا کہ اس لڑکی کو ساری باتیں بتا دے۔

''کچھ نہیں' میں اور میرا پورا خاندان بدقسمت ہے۔ جب کبھی اس کا خیال آتا ہے تو میں رنجیدہ ہو جاتا ہوں۔''

''تو مت سوچا کرو۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے متعلق کبھی نہ سوچے اور ہر وقت دوسروں ہی کے بارے میں سوچتا رہے۔ اور پھر بعض وقت تو مجبوراً سوچنا ہی پڑتا ہے۔''

''کیوں' آج کیا بات مجبور کر رہی ہے؟''

''بہت سی باتیں ہیں۔ مثلاً یہی کہ میری بہن کی شادی ایک ماہ بعد ہے اور میں وہاں نہیں جا سکتا۔''

''تو کیا ہوا' پھر چلے جانا۔''

''بڑی غیر ہمدرد ہو' تم کو معلوم ہے میں یہاں کتنے سال سے ہوں اور پھر میرے گھر پر کوئی ایسا بھی تو نہیں جو میری ماں کا دکھ درد بٹائے۔''

''تو تم یہاں آ ہی کیوں گئے تھے؟'' وہ جھنجھلائی۔

''واقعی کوکو! تم یہ سب سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ یہاں نہ آتا تو گھر والوں کو پیسے کہاں سے بھیجتا؟''

''کیوں کیا تمہارے چین میں پیسے نہیں ہوتے جو تم یہاں سے پیسے بھیجنے آئے ہو؟''

''اونہہ! یہ لڑکی اتنی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہیں اور پھر بھی میں اس کی باتوں کا جواب دیئے بغیر چلا جا رہا ہوں۔ وہ دل ہی دل میں کڑھا اور پھر اس کے جواب میں بولا۔

''واقعی کوکو! میرے چین میں مجھ جیسوں کے لیے نہ پیسے ہیں نہ کھانے کو۔ میں تم کو کیا بتاؤں۔'' اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

گیتی کا دل پسیج گیا اور اچانک ہی وہ بہت سمجھدار سی نظر آنے لگی۔ ''چہ! ہا! پتہ نہیں انسانوں کی مصیبتیں کب ختم ہوں گی۔''

''کبھی نہیں کوکو!۔۔۔۔۔۔۔جب تک۔۔۔۔۔۔۔جب تک''

''جب تک کیا؟''

''کچھ نہیں' تم ابھی چھوٹی ہو۔ ایسی باتیں نہیں سمجھ سکتیں اور پھر تم ہم جیسوں کے حالات کیا سمجھ سکتی ہو۔''

''میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ میں مصیبت اور پریشانی کی دنیا سے دور ہوں۔ اس لیے پاگل ہوں اور کچھ نہیں سمجھتی۔ خیر مرضی ہے تمہاری۔ جو چاہو سمجھو۔ پھر تم اب چلے جاؤ۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''اب کیسے جاؤں؟ میری قسمت سیدھی ہوتی تو میں یہاں کبھی کاہے کو نظر آتا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ مجھے ڈاکٹر بنائیں۔ مگر ان کو یہ خبر نہ تھی کہ میری قسمت میں کوکو کے دیس کی گلیوں اور سڑکوں کی خاک چھاننا لکھا ہے۔''

اس کی کالی آنکھوں سے واقعی آنسو ابل پڑے۔ سیدھے' سیاہ اور لدھڑ بال پیشانی پر بکھر آئے۔ وہ روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

وہ بالکل بھول گئی کہ وہ رتبے اور حیثیت میں اس پھیری والے غریب الوطن لڑکے سے بہت بلند ہے اور اس سے یوں گھل مل کر باتیں کرنا اور اسے تسلی دینا سخت معیوب حرکت ہے۔ بے خیالی میں اس کا ہاتھ بڑھا اور اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور

بہلانے کے انداز میں بولی۔

''ارے چن چن چائنامین! تم سچ مچ رو رہے ہو۔ ارے واہ! تم تو بہادر لڑکے ہو۔ تم تو اپنی ماں کی خاطر ہمارے ملک میں پیسہ کمانے آئے ہو۔ ایسے دل نہ چھوٹا کرو۔ لو تم املی کھالو۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاغذ کی تھیلی کھولی اور نمک مرچ کی پڑیا اور املی کے سرخ اور پکے پکے کتارے اس کی طرف بڑھا دیے۔

''اونہہ! وہ آنسو بہاتے بہاتے ہنس پڑا۔'' پگلی ہے۔''

وہ خود بھی اس سے بات کرتے ہوئے بھول جاتا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے گھر کی نوعمر لڑکی ہے جو سیان پن کی راہوں پر گامزن ہو چکی ہے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور صرف اس کو خوش کرنے کی خاطر املی کا کتارہ کھانے کی کوشش کرنے لگا۔

دبے قدموں ارجمند نے گیتی کے پیچھے آ کر اچانک پوچھا۔ ''گیتی تم نے میری چابی تو نہیں دیکھی ہے؟''

گیتی نے نمک مرچ میں لپٹی ہوئی املی منہ میں رکھ کر چٹخارا بھرا اور بولی۔ ''میری میز پر ہوگی۔''

''چل کر دے دو۔ مجھے نہیں ملتی۔'' ارجمند کے انداز سے لگ رہا تھا کہ چابیوں سے زیادہ اس کو گیتی کی ضرورت ہے۔

''اچھا بھئی لیو چو! میں چلی۔ اب تو نہیں رو گے؟ ہاں بھئی ایسا مت کرنا۔''

وہ چپ چاپ اٹھا۔ دیوار سے لگی سائیکل اٹھائی اور گیٹ کے باہر نکل گیا۔ ارجمند کو یوں اچانک دیکھ کر وہ سہم سا گیا تھا۔

راستے میں ارجمند نے کہنا شروع کیا۔ ''گیتی! تم کو کیا ہو گیا ہے؟ ایسے لوگوں سے اس طرح چھپ کر بیرے خانساموں کی لڑکیاں فلرٹ کرتی ہیں۔'' ارجمند اپنے حسابوں بڑی سنجیدگی اور شائستگی کا ثبوت دے رہی تھی۔

''ارے ارجمند! اللہ کی قسم میں فلرٹ تھوڑی کر رہی تھی؟'' وہ ارجمند کی بات پر حیران رہ گئی۔

''تو اور کیا کر رہی تھی؟''

''سر تمہارا' وہ غریب گھر کو یاد کر کے رو رہا تھا تو ذرا میں نے تسلی دے دی۔''

''تو اتنا راستہ چل کر وہ گھر کو یاد کرنے آیا تھا؟ اور اچھا آیا بھی تھا تو تم کو کیا پڑ گئی تھی اس کو تسلیاں دینے کی؟'' ارجمند ان دنوں بڑوں میں ضرورت سے زیادہ اٹھنے بیٹھنے لگی تھی۔

''کیوں' کیسے نہیں پڑ گئی تھی؟ میرا فرض تھا کہ میں اس کو تسلی دوں۔''

''واہ وا' کاہے کو فرض تھا؟'' ارجمند پھر الجھی۔

''ہاں ارجمند میرا فرض تھا۔ بات یہ ہے کہ ٹانگ میری ٹوٹی تھی' تمہاری نہیں۔''

''ٹانگ ٹوٹنے کا کیا ذکر ہے؟''

''اسی کا تو سارا ذکر ہے۔ میری ٹانگ ٹوٹی تھی تو میں ہسپتال میں جکڑی پڑی تھی۔ تو تم کو کیا معلوم کہ میں کیسا کیسا گھبراتی تھی۔ پھر اپنا کام آج کر کے میرا دل بہلانے ہر روز وہی تو آتا تھا۔''

لیکن ارجمند کا معترض دماغ ان باتوں سے قائل ہونے پر تیار ہی کب تھا جو وہ اس کی دلیل کو مانتی۔

''اور جو اماں بیگم دیکھ لیتیں۔''

''دیکھ لیتیں تو کیا غضب ہو جاتا۔ وہ تو جو کچھ بھی دیکھ لیتی ہیں وہی بات ان کی نظر میں بری ہوتی ہے۔''

رات گئے جب پورچ میں گاڑی کی بتیاں چمک کر بجھیں تو رات کی خاموشی میں موٹر کا دروازہ دھپ سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز دور تک گونج گئی۔

اور اندھیرے میں تین سائے آگے بڑھے۔

''ابا میاں آپ آگے چلیے۔'' اس نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں ہاں! چل رہا ہوں۔ اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟''

وہ خاموشی سے مڑی اور بولی۔ ''آؤ مسعود!''

گیلری کے دروازے پر شریف کھڑا تھا۔ ''صاحب! کھانا لگاؤں؟''

''نہیں بھئی' کھانا تو ہم کھا آئے ہیں۔ بیگم صاحب جاگ رہی ہیں یا سو گئیں؟''

''شاید سو گئی ہیں۔ پریشان بہت ہو رہی تھیں دیر ہونے پر۔''

''ہاں بھئی! دیر تو ہو گئی۔'' وہ دبے قدموں سے آگے بڑھے۔

''دیکھو بھئی شریف' مسعود میاں کے لیے اس کونے والے کمرے میں بستر لگا دینا۔''

سانس روکے اور اپنے ہی قدموں کی چاپ سے دوڑتی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اندھیرے میں کرسی سے ٹکرا گئی۔

''کون ہے؟'' ارجمند ڈر کر چونکی۔

''شی! سو جاؤ' میں ہوں۔''

''تو آخر کو تم آ ہی گئیں؟''

''اور تو کیا وہیں رہ جاتی؟''

ارجمند اٹھ کر بیٹھ گئی اور ننداسی آواز میں بولی۔

''میں کہتی ہوں گیتی تمہیں ہوا کیا ہے؟ جو بات اماں بیگم کو ناپسند ہوتی ہے وہ ضرور کرتی ہو۔''

''کیوں بھئی! آج میں نے کون سی ناپسندیدہ حرکت کی؟'' گیتی نے لیمپ جلاتے ہوئے سوال کیا۔

''ابا میاں آنند پور شکار کھیلنے جا رہے تھے تو تم کیوں ان کے پیچھے لگ لیں؟''

''یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ ان کے ساتھ ہم لوگ برابر جاتے رہتے ہیں۔''

''مگر یہ آج ہاشمی پھپھو سے ملنے کے لیے خاص طور پر لد کر جانا ضروری تھا؟''

''تو اس میں کیا خرابی تھی؟ میں نے کہا وہ آئی ہوئی ہیں تو مل بھی آؤں گی۔ پتہ ہے ان لوگوں نے اتنی خاطر کی۔ کھانا کھائے بغیر آنے ہی نہیں دیا۔ اسی لیے تو اتنی دیر ہوگئی۔''

''دیر ہوگئی۔'' ارجمند نے غصے سے کہا۔ ''معلوم ہے اماں بیگم اچھا نہیں سمجھتیں، ہر جگہ گھستے پھرنے کو۔''

''ہر جگہ کیوں؟ وہ ہماری رشتے دار نہیں ہیں؟''

''ایسی کون سی قریب کی رشتے دار ہیں۔ پتہ ہے تم تو چلی گئیں۔ انہوں نے سارا دن مجھے بات بات پر ڈانٹا ہے۔ تمہارے غصے میں۔''

''کیا کہہ رہی تھیں؟'' گیتی نے تشویش سے پوچھا۔

''ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ یہ کنبے ناتے کے لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ ہر وقت ان کو گھسایا جائے۔''

''مگر میں تو مسعود کو اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔''

''یہ تم نے اور اچھا کیا۔ اب ان کا موڈ اور خراب ہوگا۔ معلوم ہے کہ وہ ایسی باتوں سے گھبراتی ہیں۔ مگر کرنا ضرور ایسی حرکتیں۔ پھر کہتی ہو اماں بیگم مجھے برا سمجھتی ہیں۔ یہ کہتی ہیں وہ کہتی ہیں۔''

''اچھا تو پھر ایسا کون سا گناہ کر لیا؟'' ''مسعود کوئی چور ڈاکو تو نہیں ہے جس کا آنا اتنا برا لگے۔''

گیتی جب زیادہ ڈرتی تھی تو پھر ایسی ہی باتیں کرنے لگتی تھی۔ ''خیر بھئی، تم جانو میں تو کہتی ہوں کہ میں مفت خدا میں تمہاری وجہ سے باتیں سنتی ہوں۔''

''تو مت سنا کرو۔ کہہ دیا کرو کہ اسی کو ڈانٹیے گا۔''

''میں تمہاری طرح بدتمیز تو نہیں ہوں۔''

اس نے خاموشی سے لیمپ بجھایا اور لحاف میں دبک کر سوچنے لگی۔

''میں واقعی بدتمیز ہوں۔ ارجمند بھی مجھے بدتمیز سمجھتی ہے۔ پھر وہ اپنے دل میں پچھتائی کہ میں ناحق ہی مسعود کو لے کر آئی۔ میں واقعی غلط حرکتیں کرتی ہوں اور ارجمند صحیح کہتی ہے۔ مجھے نہ صفدر لیو چو سے گھل مل کر باتیں کرنا چاہیے۔ اور۔۔۔۔۔۔۔ اور نہ ۔۔۔۔۔۔ اچانک اس کی انکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کروٹ لے لی۔

اس کو یہ تو علم نہ تھا کہ اس کا یہاں آنا کس کو کتنا بھرا لگا تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ کچھ بے کل سا تھا۔

اس شام گیتی نے اس کو اکتایا ہوا سا دیکھ کر کہا تھا۔ ''مسعود میرے ساتھ چلتے ہو؟''

''کہاں؟''

''ذرا چینی کی دکان تک جانا ہے۔ میں نے اپنا جوتا مرمت کے لیے دے رکھا ہے۔''

''چلو'' وہ کھڑا ہو گیا۔

اور وہ دونوں سائیکلوں پر روانہ ہو گئے۔

''گیتی!'' چلتے چلتے مسعود نے کہا۔

''ہاں!''

''آج رات کو کھانے کے وقت ماموں جان سے اجازت دلوا دو تو میں صبح چلا جاؤں۔''

''ایسی کیا جلدی ہے' ابھی تو تمہاری چھٹیاں ہیں۔''

''چھٹیاں تو ہیں لیکن مجھے آنند پور رہنا چاہیے۔''

''توبہ ہے' تم آخر اتنا کیوں گھبرا رہے ہو؟''

''بھئی صاف بات یہ ہے کہ مجھے کچھ یہ احساس رہتا ہے کہ جیسے ممانی جان میرے آنے سے ناخوش ہیں۔ جس دن سے میں آیا ہوں انہوں نے ایک بات بھی نہیں کی ہے' سوائے سلام کا جواب دینے کے۔''

''ناخوش کیوں ہوتیں۔ ویسے ہی کوئی موقع نہ ہوا ہوگا۔'' اس نے بات بنانی چاہی۔

''خیر تو مجھے وہم ہوگا۔ مگر دل تو میرا بہر حال اچاٹ ہے۔''

''اچھا بابا' چلے جانا۔ بھلا تم میرے کہے سے کیوں رکنے لگے۔''

اس نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور مسعود کو محسوس ہوا جیسے وہ شکوہ کر رہی ہو کہ تم نے میری بات کا جواب بھی تو نہیں دیا۔

اور یہ خیال آکر اسے نہ جانے کیوں دکھ ہوا تھا۔ پھر وہ راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔

اور جب وہ دکان میں داخل ہوئے تو صفدر نے جو ایک دبلی پتلی سی سنہری بالوں والی میم کے پیر میں جوتا پہنا رہا تھا' کنکھیوں سے ان دونوں کو دیکھا اور سر جھکا کر پہلے سے بھی زیادہ انہماک سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

جوتے کی رسید اس نے کاؤنٹر پر دی اور خود مسعود سے باتیں کرنے لگی۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چینی زبان میں کچھ کہا اور صفدر سنہری بالوں والی میم کے جوتے کی رسید بناتے بناتے رک گیا۔ خاموشی سے ان دونوں کو دیکھا اور اندر سے جوتا لا کر اس کو دے دیا۔

''سنو صفدر' صولت آپا آنے والی ہیں۔ اب تم اپنا سامان لے کر آنا۔'' اس نے کہا۔

''میں اب دکان پر رہتا ہوں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔

اور پھر دونوں دکان سے باہر نکل آئے۔

نہ جانے کیوں صفدر کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ اس نے بلاوجہ ہی دکان پر کام کرنے والی چینی لڑکے کو بار بار جھڑکیاں دیں اور پھر خود ہی رنجیدگی سے سوچا۔

''یہ مجھے ہوا کیا ہے؟''

باب ۲۵

یوں تو گیتی نے اس سے پھر دوبارہ وہ بوکھلا دینے والا سوال نہ کیا تھا۔ مگر کئی بار مسعود کو محسوس ہوا کہ اس کی بھروسے اور اعتماد سے بھرپور نگاہیں سوال کرتی ہوں۔ ''آخر تمہیں کبھی میرے سوال کا جواب سوجھے گا بھی؟''

سوال کا جواب تو بہت معمولی ہے مگر نہ جانے کیوں ہر بار میرا ذہن سہم جاتا ہے۔

اس دن بھی مسعود اس کے سامنے سے ہٹ کر باہر لان پر جا بیٹھا اور کیاریوں میں دی ہوئی کھاد اور مٹی کی ملی جلی بو اور لان پر پھرتی ہوئی مشین کی گھرر گھرر میں اپنے خیالات کو مدغم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

اور پھر پورچ میں وہ اسٹاف کار آ کر رکی تھی جس کا دروازہ ایک مودب اور سجیلے کیپٹن آفیسر نے کھولا تھا اور جس میں سے اترنے والی عورت کی آن بان کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سا گیا تھا اور پھر اس کو یاد آیا۔

''ارے یہ تو صولت آپا ہیں۔''

پھر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سے تندرست اور کسے ہوئے جسم والی آیا بچی کی گود میں لیے ہوئے اتری تھی۔ اور اب برآمدے میں صولت کی دونوں بہنیں پہنچ چکی تھیں۔ ملنے ملانے اور باتوں کے درمیان کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اس سجیلے کمشینڈ آفیسر کی طرف نہ دیکھا تھا جو ادنیٰ خادموں کی طرح سامان اتروا کر قرینے سے رکھوا رہا تھا۔

اور جب اس آفیسر نے واپس جانے کے لیے صولت آپا کو سلام کیا تو اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا اور اندر چلی گئی۔

''تو اس گھر کی بیٹی کو اس شان سے آنا چاہیے۔'' مسعود نے کڑھ کر سوچا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یوں ہی بداخلاقی سے یہاں لان پر بیٹھا رہے یا پھر اس حقیر اور ناگوار بھنگے کی طرح ان کے درمیان جا پہنچے۔ جس کے وجود کا احساس کسی کو بھی خوش نہیں کرتا۔

وہ تذبذب کے عالم میں یوں ہی بیٹھا رہ گیا تھا اور پھر جب کچھ دیر کے بعد گیتی نے اس کا تعارف کرانے کی کوشش کی تھی تو انہوں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔

اور نہ جانے کیوں اس کو اپنا وجود سخت بے جگہ اور ناگوار محسوس ہوا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھا اور آہستہ آہستہ باغ کے اسی پچھلے حصے کی طرف جا نکلا جہاں امرودوں کے پیڑوں تلے بیٹھ کر اس نے گیتی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ارجمند کو کبھی پیار نہ کرے گا۔ امرودوں کے درختوں کے قریب سے نالے میں پانی شل شل کرتا بہہ رہا تھا۔ دور کہیں سے چکی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بڑی دیر اسی پتھر پر چڑھا بیٹھا رہا۔ جس پر بیٹھی وہ بے تکی لڑکی اس سے الجھتی رہی تھی۔ اس جگہ کا ذرہ ذرہ اس کو طعنے دیتا معلوم ہو رہا تھا۔

''تم سے اچھی تو وہ لڑکی ہے جس نے کم سے کم اپنے جذبے اور احساس کے ساتھ انصاف تو کیا۔''

گیتی کو گرمی کا اثر ہو گیا تھا اور کئی دن سے وہ بے سدھ پڑی تھی اور اس وقت بھی شدید گرمی تھی لو کے ایک جھکڑ نے مسعود کو موسم کی

تندی کا احساس دلایا اور وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

وہ سو کر اٹھا تو ابھی سب سو رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔

''اب نہ معلوم اس کا کیا حال ہے؟''

وہ دبے قدموں گیتی اور ارجمند کے کمرے کی طرف گیا اور آہستہ سے دروازے پر دستک دی تو ارجمند کی آواز آئی۔

''کون ہے؟ آ جاؤ۔''

دروازہ کھول کر وہ اندر چلا گیا۔

وہ گیتی کے پلنگ کے قریب بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ سیدھے سادے لباس میں اس کا چہرہ اور بھی معصوم ٗ دلکش اور باوقار نظر آ رہا تھا اور اس کے مقابل اسی کی جڑواں بہن کا چہرہ تھا۔ بے حد معمولی ٗ چینیوں کی سی ساخت والا ٗ لیکن مخلص ٗ وہ خاموش کھڑا چند لمحے دونوں کو دیکھتا تھا۔

اس نے دل میں کہا۔ ''تم اس کے مقابلے میں بے حد معمولی لیکن بے حد دلچسپ ہو۔'' اور پھر اس نے اس کی بات کا جواب دینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

''ارجمند!'' اس نے دھیرے سے آواز دی۔

''کیا ہے؟'' ارجمند نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔

''بات سنو''

اس خیال سے کہ گیتی کی نیند خراب نہ ہو وہ دبے قدموں باہر نکل آئی اور اس کے پیچھے چلتی رہی۔ وہ باہر کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا تو مجبوراً ارجمند کو بھی بیٹھنا پڑا۔

''ایک بات پوچھوں ٗ سچ سچ جواب دو گی؟''

''کیا؟'' وہ حیران تھی۔

''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔''

''کیا کہو؟'' وہ ٹپٹا سی گئی۔

''یہی کہ میں تم سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔'' اب اس نے انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ

مجھے تم سے محبت ہے تو کیا تم یہ بات پسند کروں گی اور اس بات پر راضی ہو جاؤ گی کہ مجھ سے شادی کر لو؟"

وہ خوبصورت اور معصوم آنکھیں انتہائی حیرت سے پوری کھلی ہوئی اس کی صورت کو تک رہی تھیں۔ ان میں لحظہ بھر کو ایک چمک سی آئی اور پھر دھیرے دھیرے حقارت اور رحم کا ایک بے پناہ طوفان اٹھا اور اس کے وجود پر چھا گیا۔

پھر اس نے تقریباً پر سکون آواز میں کہا۔ "لیکن مسعود! تم ایسا کہنے ہی کیوں لگے؟ اور اگر کہو گے تو یہ بڑی حماقت ہوگی۔ کیا تم کو یقین ہے کہ کوئی لڑکی تمہارے مقابلے میں دوسرے خوبصورت اور۔۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ زیادہ اچھی حیثیت والے لڑکوں کو ٹھکرا دے؟ اور میرے خیال میں تمہارے حق میں بھی یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ انسان ایسی لڑکی سے شادی کرے جس کی زندگی اس کی اپنی زندگی سے بہت مختلف نہ ہو۔"

ارجمند کو پل بھر خود بھی اس بات کا یقین نہ آیا کہ وہ اس سادگی سے اس لڑکے کی بات کا یہ جواب دے گی جس کے قرب سے اس کا دل بھی چوری چوری دھڑکنے لگتا تھا۔

آئی ایم سوری مسعود۔۔۔۔۔۔۔!" پھر اس نے اپنے قدرے سخت لہجے کی معذرت چاہی۔

"کوئی بات نہیں۔ تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

وہ نہ اس وقت افسردہ تھا اور نہ مطمئن۔ بعض حقیقتوں کا انکشاف بڑا مبہوت کن ہوتا ہے۔

اور اسی شام وہ آنند پور روانہ ہو گیا۔

گیتی کی جب آنکھ کھلی اور بخار کی غفلت دور ہوئی تو اس کو مطلق خبر نہ تھی کہ مسعود کو گئے آج دوسرا دن ہے۔ وہ کمرے میں تنہا لیٹی تھی اور سورج کی الوداعی کرنیں کھڑکی کے شیشوں کو چوم رہی تھیں۔ شاید گھر کے سب لوگ شام کی چائے پینے کے لیے کھانے کے کمرے میں تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اس وقت اس کو خفیف سا بخار تھا اور طبیعت ہلکی تھی۔ لیکن دل بیٹھا جا رہا تھا کہ قدموں کی آہٹ ہوئی اور پھر ارجمند اندر داخل ہوئی۔

"گیتی اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اس نے اس کو تکیے پر منہ اوندھائے دیکھ کر پوچھا۔

گیتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ارجمند نے میز پر رکھا ہوا تھرما میٹر جھٹکا اور اس کے قریب آکر بولی۔ "لو یہ تھرما میٹر تو لگا لو۔"

بغیر جواب دیے وہ سیدھی ہو کر لیٹ گئی اور تھرمامیٹر منہ میں لگا لیا۔

ارجمند اس کی حرارت پڑھ کر چونک اٹھی۔ ستانوے سے بھی کچھ نیچے ہی پارہ رہ گیا تھا۔ اس نے تھرمامیٹر واپس کیس میں رکھا اور باہر نکل گئی۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ گرم دودھ لیے ہوئے اندر آئی۔ دودھ میں کوکو ملائی اور آہستہ سے پیالی میز پر رکھ کر کہنے لگی۔

''تمہیں کمزوری ہو رہی ہے۔ یہ پی لو۔''

وہ خاموشی سے اٹھی اور دودھ کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگا لی۔ دھیرے دھیرے ارجمند نے میز صاف کی۔ بستر کی شکنیں ٹھیک کیں اور گلدان کے پھول درست کرنے لگی۔

دودھ پی لینے سے گیتی کو تقویت سی محسوس اور اس نے سر اٹھا کر ارجمند کو دیکھا۔ اس کے پھول سے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی؟

''خیر تو ہے؟'' گیتی نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' مسعود چلا گیا۔

''کب؟'' گیتی کے دل پر گھونسا سا لگا۔

''کل''

''کچھ کہتا تھا؟'' گیتی کی آواز کپکپانے لگی۔

''ہاں! اس نے مجھ ایک بات کہی تھی۔''

''کیا؟'' وہ اٹھ بیٹھ گئی۔

''اونہہ! نرا احمق ہے۔'' ارجمند شرمائی۔

کہنے لگا۔ ''مجھ سے کہتا تھا۔۔۔۔۔۔۔''

گیتی الجھ گئی جھلا کر بولی۔ ''اگر وہ کچھ کہہ رہا تھا تو تمہیں شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ کہتا تھا۔'' ارجمند نے اس کی ڈانٹ پر دبک کر کہا۔'' ارجمند! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''جھوٹی! مکارہ کہیں کی۔ تم مجھ سے جل رہی ہو۔''

''گیتی! میں تم سے مکاری کب کرتی ہوں۔'' ارجمند نے معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔

''مگر میں تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتی۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔''

''کیوں گیتی! تمہارے خیال میں میں اتنی بری ہوں۔''

''یہ میں کب کہتی ہوں۔ مگر مسعود تم سے ایسی بات کہہ ہی نہیں سکتا اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے مگر تم سے کبھی پیار نہ کرے گا۔''

ارجمند پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''گیتی! تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔'' ارجمند نے آزردگی سے کہا۔

''اس میں نفرت کی کیا بات ہے۔ تم یہ بتاؤ، تم یہ گوارا کر سکتی ہو کہ جس سے تم محبت کرو، وہ مجھے پیار کرنے لگے؟''

ارجمند خاموشی سے اپنی اس نیم پاگل بہن کو دیکھ رہی تھی جو ہمیشہ اسی قسم کی گفتگو کیا کرتی تھی۔

لیکن گیتی اس طرح ماننے والی نہ تھی۔ اس نے جرح کی۔

''اچھا تم مجھے بالکل وہی اور ٹھیک ٹھیک لفظ بتاؤ جو مسعود نے تم سے کہے تھے۔''

ارجمند ہمیشہ سے گیتی کی دبتی تھی اور اس کو معلوم تھا کہ اس کو وہی کرنا پڑتا ہے جو گیتی کا حکم ہوتا ہے۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ''ارجمند ایک بات تو بتاؤ۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر رک گیا اور کہنے لگا اگر میں کہوں کہ آئی لو یو۔۔۔۔۔۔۔ اگر میں تم سے کہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو تو تم برا تو نہ مانو گی؟''

''کیا یہ کہتے وقت وہ کچھ گھبرایا ہوا اور اداس بھی تھا؟''

''نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔ اور جب میں نے اس سے کہا کہ مسعود! اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری غلطی ہوگی۔ تم کو ایسی لڑکی سے یہ بات کہنا ہی نہیں چاہیے جس کا اسٹینڈرڈ تم سے بہت اونچا ہو، تو وہ بہت سکون سے بولا۔ ''تم بالکل صحیح کہتی ہو۔''

''بس، ٹھیک ہے ارجمند بیگم! تم اس ہوا میں نہ رہنا کہ اس نے یہ سب کچھ تمہاری خاطر کہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر میں گیتی سے اس قسم کی بات کروں تو تم لوگ برا تو نہ مانو گے۔ وہ اپنے اور تم لوگوں کے اسٹینڈرڈ اور فرق کو خوب سمجھتا ہے۔ مگر تم اس بھلاوے میں نہ رہنا کہ وہ تم سے مخاطب تھا۔''

عجیب تھی وہ لڑکی۔ یہ تمام باتیں وہ اتنے سکون اور آسانی سے کر رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس کا چہرہ اب بالکل پر سکون تھا۔

باب۲۶

چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور اسکول دوبارہ کھل گیا تھا۔ موٹر آج کل ابا میاں کے ساتھ دوروں پر رہتی تھی اور وہ دونوں اب سائیکلوں پر اسکول جاتی تھیں۔ گیتی بیماری سے اٹھنے کے بعد چونچال نہ ہو سکی۔ اب اس کی بیماری ایک قصہ پارینہ بن چکی تھی اور پھر بے ڈھنگی عادتوں کے چلتے اس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ اسکول سے سخت مایوس کن رپورٹ گھر بھیج دی گئی تھی اور اس کا دل سخت برا ہو رہا تھا۔

ارجمند زکام کی وجہ سے دو دن سے اسکول نہیں اور گیتی آج ضرورت سے زیادہ دل برداشتہ اور مضمحل تھی۔ کئی دن بعد اس نے دن بھر میں کئی مرتبہ مسعود کے متعلق سوچا تھا۔

چھٹی کے دن سب لڑکیاں گھروں کو روانہ ہوئی مگر نہ جانے کس طرح گیتی کی سائیکل مخالف سمت کو مڑتی ہی چلی گئی۔ صاف ستھرے مختصر اور نسبتاً خاموش پارک کے ہرے بھرے قطعے پر اس نے کھڑے قد سے سائیکل چھوڑ دی اور پھر خود بھی دھم سے بیٹھ گئی۔ مولسری کے گھنے درخت کی چھاؤں میں اس کے تنے سے ٹیک لگائے وہ نہ معلوم کب تک اونگھتی رہی اور جب صفدر یاسین اتفاقاً ادھر سے ٹہلتا ہوا گزرا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سولہ سترہ سال کی یہ سیانی لڑکی آوارہ لڑکوں کی طرح یہاں بیٹھی کیوں اونگھ رہی ہے۔ مگر اوتھ! اس کوکو کا کیا ہے' یہ تو واقعی دل چلی ہے۔ یہ جو نہ کر گزرے تھوڑا ہے۔ وہ جھکا اور اس نے اس کے چہرے کی طرف تمسخر سے دیکھا جو بہت سی مانوس اور آشنا کیفیتوں کا حامل تھا۔ ارے یہ تو بیمار' غمزدہ اور بے حد دل برداشتہ سی نظر آ رہی ہے۔

پتہ نہیں اسے کیوں اس لڑکی پر بے حد رحم آیا۔ جس کے باپ کے پاس لمبی چوڑی موٹر تھی اور جو صاحب جائیداد ہونے کے علاوہ اس علاقے کا اعلیٰ افسر بھی تھا۔

اگر وہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ کبھی یہ جرات نہ کرتا لیکن یہ تو اپنی کوکو تھی۔ بالکل ویسی ہی معصوم اور سادہ دل' جیسی اب سے چھ سات برس پہلے تھی۔ اس نے سیٹی بجا کر اس کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ چونک پڑی۔

''ارے ہلو!'' وہ افسردگی سے مسکرائی۔

مولسری کے چھوٹے چھوٹے کافوری پھول جھڑ کر اس کے سیاہ اور سیدھے بالوں میں جگہ جگہ پھنسے ہوئے تھے اور وہ بہت زرد اور اداس نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے' میری ننھی دوست!''

''کچھ نہیں' تم یہاں کہاں گھوم رہے ہو؟''

''میں تو یہاں اکثر آتا ہوں کوکو! مگر تم یہاں آج کیسے نظر آ رہی ہو؟ تم کو یہاں نہ ہونا چاہیے۔''

''کیوں صفدر! کیا یہاں آدمی نہیں آتے یا میں آدمی نہیں ہوں؟''

''یہ لڑکی اتنی ذہانت کی باتیں کس سادگی سے کرتی ہے۔'' وہ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔'' آدمی تو آتے ہیں مگر بڑے آدمی نہیں آتے۔ خصوصاً بڑے آدمیوں کی لڑکیاں۔''

''صفدر لیو چو!''

''ہاں''

''ایک بات بتاؤ' کیا تمہارے چین میں بھی بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی کی سرحدوں کے درمیان اتنی ہی اونچی دیواریں ہیں؟''

''ہاں کوکو! بلکہ چین کی مشہور و معروف دیوار سے بھی زیادہ اونچی دیواریں۔''

''اور سب اطمینان میں ہیں؟''

''سب اطمینان سے ہوں یا نہ ہوں یہ تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔''

''اور کیا ہمیشہ ہوتا چلا جائے گا؟'' صفدر نے دیکھا اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں خوف و ہراس تھا۔

''یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں' میں تو ایک غریب جاہل چینی ہوں جو سات سال سے اپنے وطن نہیں گیا ہے۔ میں نے سات سال سے اپنی ماں کو نہیں دیکھا ہے۔ جس کے پاس سوئے بغیر مجھے آتے دم تک نیند نہ آئی تھی۔ مجھے اپنی ماں کے جسم' اپنے وطن کی زرد مٹی اور دھان کے کھیتوں کی مخصوص بو کی یاد ہر روز ستاتی ہے۔''

''پھر چلے جاؤ نا' جب سنو یہی رونا روتے ہو۔''

''کیسے چلا جاؤں۔ میرا ملک بہت غریب اور بدنصیب ہے۔ غریب ملک اپنے فرزندوں کو پناہ دینے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ ان کی زمین ان پر تنگ ہو جاتی ہے۔''

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''اب میں تمہیں کیا بتاؤں؟''

وہ ہری اور نرم نرم گھاس پر اس کے بالکل بے تکلفی سے بیٹھا تھا۔اس کی پتلون کے پائنچے میں اب تک کلپ لگا ہوا تھا۔ زرد سلک کی قمیص کا گلا کھلا ہوا تھا اور گلے میں نازک زنجیر میں چاندی کا ایک چھوٹا سا تعویذ پڑا تھا۔

''ارے چو،یہ تمہارے گلے میں لاکٹ کیسا ہے؟''

''تم مجھے کبھی چو کہتی ہو اور کبھی صفدر''

پھر تم بھی تو مجھے کوکو کہتے ہو۔اچھا بات کیوں ٹال رہے ہو۔یہ بتاؤ یہ لاکٹ کیسی ہے؟''

''پگلی' یہ لاکٹ ہے!یہ تو قرآن شریف ہے۔''

''جھوٹا'نہیں تو!تمہارے پاس کہاں سے آ گیا ہے۔اتنا سا قرآن شریف؟''

''لو دیکھو لو۔''اس نے تعویذ کا کھٹکا دبا دیا۔اور اپنی انگلی کے پوروے کے برابر قرآن شریف نکال کر اس کو چوما اور کوکو کے ہاتھ میں دے دیا۔

''یہ میری ماں نے چلتے وقت اپنے ہاتھ سے میرے گلے میں ڈالا تھا۔میری حفاظت کے لیے۔''

صفدر لیو چو کی بادامی آنکھیں آ بگوں پڑ گئیں۔

''دیکھوں!''اس نے صفدر کی تقلید میں ننھی سی مقدس کتاب کو چوم لیا۔''لو بھئی' گلے میں ڈالو۔''اس نے تعظیماً کہا اور پھر سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو کوکو؟''

''میں یہ سوچتی ہوں کہ اس لحاظ سے تو مذہب اچھی چیز ہے۔''وہ جیسے بڑی دور سے بولی۔

''کس لحاظ سے؟''

''یہی کہ بہت سے آدمی بغیر بڑے اور چھوٹے آدمی کا خیال کیے ہوئے ایک سی باتوں کو مانتے ہیں اور ایک سے کام کرتے ہیں۔بالکل ایسا ہی چاندی میں منڈھا ہوا قرآن شریف میرے ابا میاں کے گلے میں رہتا ہے۔وہ کہتے ہیں جب وہ پہلی بار ہوسٹل میں رہنے گئے تھے تو میری دادی اماں نے ان کی حفاظت کے لیے پہنایا تھا۔اور اب تک جب وہ ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ ان کا گریبان کھول کر اپنا اطمینان کر لیتی ہیں کہ پہنے ہیں اور ایسا ہی قرآن شریف میں نے خانساماں کے لڑکے کو پہنے دیکھا ہے۔''

''لڑکی!تم ضرورت سے زیادہ سوچتی ہو۔اس لیے بار بار فیل ہوتی ہو۔''

وہ بہت معصومیت سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ گیتی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

لیکن وہ پھر اداس ہوگئی اور چپ چاپ افق کو تکنے لگی۔

''ہاں کوکو! پھر تم نے یہ نہ بتایا کہ تم آج اتنی چپ چاپ اور اداس کیوں بیٹھی ہو؟''

اس نے ایک لمحے سوچا اور اس کے کبھی جھوٹ نہ بولنے والے غیر مصلحت کوش لبوں پر اس کے ذہن کی ساری تلخیاں آ گئیں۔

''اس لیے کہ میں اپنے گھر والوں سے بعض وقت بہت بیزار ہو جاتی ہوں۔ مجھے ان کی کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔ اس گھر میں میرے ابا نہ رہا کرتے تو پتہ نہیں میں کیا کرتی۔''

''کیوں کیا وجہ ہے؟''

''اونہہ! اب میں تم کو کیا بتاؤں۔'' وہ رونے لگی۔

دور کہیں سے مغرب کی اذان کی آواز آئی اور وہ چونکا۔

''ارے اتنی دیر ہوگئی۔ دیکھو کتنی بری بات کی ہے تم نے۔ کہیں کوئی لڑکی گھر سے اتنی دیر غائب رہتی ہے۔ چلو اٹھو اور آئندہ اب میں تم کو اس پارک میں دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ جب بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کو اپنے سے دور دور رکھتے ہیں تو وہ انتقاماً خود کو اس قدر بگاڑ لیتے ہیں کہ واقعی سنجیدگی اور شرافت کو ان کے نزدیک آتے ڈرنا چاہیے۔ آؤ چلو اب مجھے بھی واپس جانا چاہیے۔ ہم یہاں سے ساتھ ہی ساتھ چلیں گے۔''

وہ اس کا منتظر کھڑا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس بیوقوف اور ضدی مزاج لڑکی کو یوں بیٹھا چھوڑ جائے۔

''تم چلو میں بھی آتی ہوں۔''

''نہیں، تم بھی اٹھو۔'' وہ بہت برا مان کر بولا۔

وہ اپنی سائیکل اٹھا کر کھڑی ہوگئی اور پارک سے باہر نکل آئی۔ دونوں ساتھ ساتھ سائیکلوں پر سوار ہوئے اور برابر چلتے رہے۔

سڑکوں پر شام کے دھندلکے پھیل چکے تھے۔ لوگ خوش اور مصروف ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ بعض دکانوں میں روشنیاں ہونا شروع ہوگئی تھیں اور گیتی کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ صفدر سچ کہہ رہا تھا اور وہ غلط طور سے گھر سے غائب رہی ہے۔

اس وقت سردی بڑھ گئی تھی۔ صفدر نے ایک بار پھر گھور کر اس کو دیکھا۔ ''کوٹ کے بٹن اچھی طرح لگاؤ' اتنی بیمار رہ چکی ہو اور اب یہ بداحتیاطی کر رہی ہو۔''

''اونہہ! مر ہی تو جاؤں گی' زیادہ سے زیادہ۔''

''واہیات باتیں نہ کرو اور اب جلدی سے گھر چلی جاؤ۔''

مال روڈ کے موڑ پر اس نے اپنی سائیکل کا رخ صفدر کی طرف کر لیا اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔

گھر میں جو پریشانی اور کوفت پھیلی ہوئی تھی اس کا اثر پھاٹک تک پر تھا۔ حسب معمول ہر طرف خاموشی تھی۔ وحشت ناک حد تک۔ کمروں کی بتیاں روشن تھیں مگر پورچ اور برآمدے میں اندھیرا تھا۔ برآمدے میں کوئی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ پھاٹک پر ہی سائیکل سے اتر گئی اور آہستہ آہستہ سائیکل گھسیٹتی ہوئی دوسری طرف جا کر عقبی دروازے سے چوروں کی طرح داخل ہوئی۔

ارجمند اندر والے برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں۔ وہ ارجمند کے قریب آئی تو وہ جھپٹ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے بار بار اس کو پیار کیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''تم کو کیا ہوا ہے ارجمند؟'' اس نے اس طرح کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں؟ معلوم ہے اماں کو تم پر کتنا غصہ ہے۔ مالی نے بتایا کہ تم چائنا مین کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔''

''جھوٹا ہے مالی' وہ وہاں کہاں سے آیا' میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔''

''خیر' تم تھیں تو اسی کے ساتھ۔ مالی کو تم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔''

''دشمنی کیوں ہونے لگی۔ مگر مالی وہاں پارک میں کہاں پہنچا؟''

''تو کیا تم پارک میں تھیں؟ تم کو سب ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ مالی نے تم کو اور اس کو سائیکلوں پر ساتھ دیکھا تھا۔ دیکھو کتنا ذلیل ہے کم بخت چائنا مین۔''

''ذلیل تم ہو' وہ کیوں ہوتا۔''

''گیتی' تم اسی سلوک کے قابل ہو جو اماں بیگم تمہارے ساتھ کریں گی۔ اس کمینے بدمعاش کی خاطر تم اپنی سگی جڑواں بہن کو ذلیل کہہ رہی ہو۔''

''تو اور۔۔۔۔۔۔۔ اور کیا کہوں؟ اس کا تو تم شکریہ ادا کرو۔ اس نے مجھے اتنی جھڑکیاں نہ دی ہوتیں تو تم ابھی میرا انتظار کر رہی

ہوتیں۔''

''تو تم وہاں گئی کیوں تھیں؟''

''بس میرا دل چاہا تھا' میری مرضی۔''

''مرضی کی بچی حرام خور' آ ئیں تجھے تیری مرضی بتاؤں۔''

پیچھے سے اماں بیگم نے اس کے کٹے ہوئے بال کھینچ کر اس کے منہ پر تھپڑ دیا۔

''آپ مجھے یوں سب کے سامنے نہیں مار سکتیں۔'' وہ بری طرح غرائی۔

''میں تجھے کھود کر گاڑ دوں گی۔'' انہوں نے اسے کو دھکا دیا اور وہ چکنے فرش پر گر پڑی اور انہوں نے واقعی پیر سے چپل اتار کر اس کو بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔

وہ نہ چیخی اور نہ ہلی۔ اسی طرح زمین پر پڑی رہی۔ ارجمند کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اماں بیگم کو خوشامدوں سے کھینچ کر کمرے میں لے گئی۔ جہاں وہ دیر تک بیٹھی ہانپتی رہی۔

اور وہ گیتی جس کی اتنی توہین ہوئی تھی اور جس کے متعلق سب لوگ اتنی ذلیل قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ برآمدے کے سلیٹی اور ٹھنڈے فرش پر خاموش پڑی رہی۔

کوئی چھوٹا سا مکان ہو یا بڑی کوٹھی' وہاں ہونے والے غیر معمولی واقعے کی اطلاع اندر باہر ہو ہی جاتی ہے۔ اور یہی حشر اس واقعے کا بھی ہوا۔

''اب کو کو کہیں نظر نہیں آتی۔'' صفدر یاسین نے ایک دن اپنے نئے کینوس پر برش چلاتے چلاتے سوچا۔ وہ عنقریب گھر جانے والا تھا اور بہت خوش تھا۔ اگر کو کو کہیں نظر نہیں آتی تو اس کو کیا مطلب۔ مگر اس کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ اس دن اس کے ساتھ ساتھ سائیکل پر اس کو دیکھا جا چکا ہے اور اس بات کو بہت قابل اعتراض قسم کا پیرایہ دے کر اب اس کا اسکول جانا بند ہو چکا ہے اور وہ پرائیویٹ طور پر میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔

خالی وقتوں میں اس کے آگے مرمت طلب کپڑوں کا ڈھیر ہوتا ہے اور وہ ان کی مرمت کرتی اور چادروں پر نام ڈالا کرتی ہے اور صبح کے وقت مولوی صاحب کے سامنے رحل پر قرآن شریف رکھے' سر ڈھانکے' ہل ہل کر قرآن شریف پڑھتی ہے۔

اور اگر وہ اس ساری صورت حال سے واقف ہو جاتا تو کس قدر ہنستا اور کہتا۔ ''ٹھیک ہے کو کو تم اسی قابل ہو۔''

باب ۲۷

تجربے کار اور سمجھ دار مائیں باپ اور بچوں کے درمیان ایک عجب پر اسرار قسم کی خلیج قائم کر دیتی ہیں۔ خود ہی ان کے درمیان دیوار بن کر حائل ہوتی ہیں اور پھر خود ہی دونوں کے مابین رابطے کا کام دیتی ہیں۔ ایک طرف اپنی حکمت عملی سے باپ کی حیثیت تاج برطانیہ کے وارث کی سی کر دیتی ہیں اور دوسری طرف بچوں کے دلوں میں اس کی ہیبت پیدا کر دیتی ہیں۔ ''تمہارے ابا نے سن لیا تو ۔۔۔۔۔۔ ابا کا مزاج تو تمہیں خوب معلوم ہے۔''

حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اولاد پر باپ کا مزاج کھل ہی نہیں پاتا۔ ''تمہارے ابا'' کا لفظ ایک خوف و ہیبت کا مظہر ہوتا ہے۔ جو باپ کو اولاد سے' اولاد کو باپ سے بے تعلق اور دور کرتا چلا جاتا ہے۔

کچھ اسی قسم کی دوری اور فاصلہ بیگم جہانگیر نے اپنے بچوں اور شوہر کے درمیان قائم کر رکھا تھا۔ دونوں لڑکوں اور دو لڑکیوں نے اس فاصلے کو بلا چوں و چراں تسلیم کر لیا تھا۔ ان کے اس بیان پر یقین کرنے میں تامل اور پس و پیش تھا تو اسی سب سے مختلف لڑکی کو۔

وہ جب اپنی گہری اور گھمبیر آواز میں کسی بات پر فضیحتا کرنے کے بعد یہ ٹکڑا لگاتیں کہ ''اگر تمہارے باوا نے سن لیا تو پھر تم جانو' ان کا مزاج تو تمہیں معلوم ہی ہے۔'' تو گیتی دل ہی دل میں کہتی۔ ''اماں بیگم! یہ آپ کا غلط خیال ہے۔ مجھے اپنے باپ کا مزاج خوب معلوم ہے۔ کاش! ان کو ہماری تربیت اور پرورش میں بولنے کا جائز حق حاصل ہوتا تو میرے اور ان کے درمیان یہ فاصلے حائل نہ ہوتے۔''

ساری اولاد میں ایک فقط وہ تھی جس کا دل ان سے ملا ہوا تھا۔ اور اس تمام بعد کے باوجود جو ان کی مصروفیتوں اور اولاد کے متعلق اماں بیگم کے بنائے ہوئے دستور نے قائم کر رکھا تھا وہ کبھی کبھار چپکے سے اپنے باپ کے بہت قریب کھسک آیا کرتی تھی۔ وہ اپنے بچپن کی اس رات کو کبھی نہ بھولی تھی جب اس کے باپ نے اس کو اپنے بہت قریب بلا کر چپکے سے اس سے کہا تھا۔

''تمہیں کچھ خبر ہے' میری ساری اولاد میں تم سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔''

اور اب اس کو یہ احساس بھی خوب ہو چکا تھا کہ اس خوبصورتی سے ان کی مراد اس کے دل کا وہ حسن تھا جس میں صداقت اور خلوص کی فراوانی تھی۔ اپنی اس خصوصیت کا اسے نہ صرف احساس تھا بلکہ وہ اس پر نازاں بھی تھی۔ آج سے نہیں بہت چھوٹے پن سے۔

اور جب اس شام گھر میں اس کا اتنا فضیحتا مچا اور وہ نوکروں چاکروں تک کے سامنے مطعون کی گئی تو اس نے کوئی خاص پروا نہ کی۔ اس لیے کہ اس نے اسی وقت بڑے اطمینان سے سوچا تھا۔ ''اس سے کیا ہوتا ہے' کوئی میں سچ مچ تو ایسی نہیں ہوں جیسا انہوں نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ اور پتہ نہیں اماں بیگم نے کس طرح اتنی بری بات کو مجھ سے وابستہ کر لیا۔''

اچھا ہوا جو شہریار بھیا اتنی دور ولایت میں بیٹھے ہیں۔ ورنہ وہ بھی یقین کر لیتے اور صولت آپا تو سب سے پہلے یقین کریں گی۔ ارجمند تو پہلے ہی یقین کئے بیٹھی تھی۔ اچھا بھئی' اگر سب یقین کرتے ہیں تو کر لیں۔ اب میں کیا کر سکتی ہوں' اس نے تھکے دل سے سوچا اور پھر فوراً اس کے دل میں اپنے باپ کا خیال آیا۔

''ابا میاں کے دورے پر سے آتے ہی ساری نہ سہی تو کچھ نہ کچھ بات تو ان کے کان تک پہنچائی گئی ہو گی۔

اور اس خیال کے آتے ہی وہ بے چین ہو گئی۔ ''کیا ابا میاں اب بھی یہ نہ کہیں گے کہ یہ میرے تمام بچوں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔''

اور جیسا کہ وہ اکثر اماں بیگم کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو کہا کرتے تھے۔ ''بیگم! میری لڑکی دل کی بری نہیں' تم اس کو سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ اب وہ اس قسم کی کوئی بات اس کے حق میں نہ کہیں گے۔''

اور اس خیال کے آتے ہی اس کا دل آزردہ ہو گیا۔ اس دوپہر وہ روز سے بھی زیادہ خاموش اور افسردہ رہی اور بالآخر باہر کے برآمدے میں پہنچ ہی لی۔ جہاں وہ صبح شام بیٹھ کر حقہ پیتے اور اخبار دیکھا کرتے تھے۔ سجے ہوئے نیچے والے حقے کی چاندی کی منہال منہ سے لگائے وہ آرام کرسی پر دراز تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور کسی گہری سوچ میں تھے۔ ان کے چاروں طرف حقے کی سوندھی مہک تھی اور سامنے میز پر تازہ اخبار کے ساتھ ساتھ مثنوی مولانا روم بھی کھلی رکھی تھی۔ ہوا سے اس کے ورق الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ وہ دبے قدموں آگے کو بڑھی۔ ہوا نے ایک ورق پلٹا اور ایک شعر پر گیتی کی نگاہ پڑی۔

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید ایں آواز دوست

یہ اس کے ابا میاں کا محبوب ترین شعر تھا۔ وہ اس کو اپنی بھاری اور خوبصورت اور ٹھہری ہوئی آواز میں پڑھا کرتے تھے اور کتنی بار گیتی نے ان سے اس کا مطلب بھی پوچھا تھا۔

وہ ایک لمحہ ٹھٹکی ہوئی کھڑی اس انسان کو دیکھتی رہی جس کو دیکھ کر اس کو ہمیشہ بیلے اور چنبیلی کے پھولوں' چاند کی ٹھنڈی کرنوں'

خوبصورت شہ نشینوں اور مضبوط ستونوں کا خیال آتا تھا۔

اچانک وہ یہ جاننے کو بے تاب ہو گئی کہ کیا واقعی اس کے باپ کے شفاف آئینہ دل میں بھی اس کی طرف سے میل آ چکا ہے۔ بے اختیار وہ جھکی اور اس نے اپنے باپ کے سینے پر اپنا سر جھکا دیا۔ اور اب وہ اس دل کی دھڑکنیں سن سکتی تھی جس کے متعلق اس کو خوب معلوم تھا کہ وہ محبت کرنے والا ہے۔

موٹے موٹے آنسوؤں کی نمی نے ان کو چونکا دیا۔ اور انہوں نے دھیرے سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس ہاتھ کی گرمی پا کر اس کا دل اور بھی پگھل گیا۔

''بری بات ہے بیٹے!'' انہوں نے نرمی سے اس کو سمجھایا۔ ''یوں نہیں روتے' میری طرف دیکھو۔''

اس نے اپنی آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں روٹھی ہوئی تو نہ تھیں لیکن بے حد افسردہ تھیں۔

''تو کیا میں نے واقعی اپنے باپ کو دکھ پہنچایا ہے۔'' اس نے سہم کر سوچا۔

''ابا میاں!''

''ہاں بیٹے!'' انہوں نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا آپ نے بھی ارجمند اور اماں بیگم کی بات کا یقین کر لیا؟''

''گیتی! دوسروں پر شک نہیں کیا کرتے۔''

''پھر ابا میاں؟''

انہوں نے اس کی سوالیہ نظروں کا سوال سمجھ کر کہا۔

''اماں بیگم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن کوئی بات ہوتی ہے تو اس کو دوسرے بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔''

''ابا میاں!''

''ہاں!''

''آپ مجھے جھوٹا تو نہیں سمجھتے؟''

''ہاں! مجھے یقین ہے کہ میری لڑکی کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔''

''تو پھر میری بات کا یقین کر لیجئے۔''

''کہو!''

اوراس نے بڑی سادگی سے ساری بات دہرادی۔اس کے لہجے میں مکروفریب نہ تھا۔صداقت کی معصومیت اورخلوص تھا۔اور پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔''ابامیاں!کیا آپ یقین کرسکتے ہیں کہ آپ کی بیٹی اتنی بری ہے۔''

''نہیں بیٹے!بیٹیاں تو اپنے باپ کے لیے ایک مقدس وعدہ ہوتی ہیں۔''

اس کے باپ کی آواز میں بھی اسی قدر خلوص اور صداقت تھی جتنی اس کے دل میں موجود تھی۔

وہ کچھ دیر بیٹھے سوچتے رہے۔پھر دھیرے دھیرے سے بولے۔''گیتی!میری ایک بات سنوگی؟''

اس نے جواب میں اپنی روتی ہوئی آنکھیں ان کے چہرے پر مرکوز کردیں اور انہوں نے اپنے مخصوص نپے تلے اور دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''دیکھو بیٹا!یہ تو ہوسکتا ہے کہ اولاد اور ماں کے سوچنے کے طریقے مختلف ہوں' لیکن یہ کبھی ممکن نہیں کہ ماں اپنی اولاد کے ساتھ جان بوجھ کر زیادتی کرے۔مجھے معلوم ہے کہ تمہاری ماں کے سوچنے کا انداز تم سے بہت مختلف ہے۔لیکن وہ اپنی دانست میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی سوچتی ہیں۔

گیتی نے شرمساری سے سر جھکالیا اور انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔''بیٹا!ماں کا احترام اولاد اور اس کے باپ دونوں ہی پر فرض ہوتا ہے۔خصوصاً باپ پر تو اس کا بڑا احسان ہوتا ہے۔وہ اس کی اولاد کو بڑے دکھ جھیل کر پالتی ہے اور وہ گھرانا بہت بلند بخت ہوتا ہے جس میں ماں ہی اپنی بیٹیوں کو سمجھتی ہیں۔اور بیٹیاں اپنی ماں کے جذبات کا احترام کرتی ہیں۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔اور افسردگی سے باہر کی طرف دیکھنے لگے۔انہوں نے منہ سے نہیں کہا لیکن ان کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ ان کی اولاد اور اس ہستی کے درمیان مفاہمت اور قرب موجود نہ تھا جس سے انہیں محبت تھی اور جس کو انہوں نے اپنا سب کچھ سونپ رکھا تھا۔

انہوں نے بڑے دھیمے لفظوں میں سے اس پر صرف اپنا ایک خیال ظاہر کیا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو گرنے لگے۔

اس نے اپنا سر ان کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور دھیرے سے بولی۔

''ابامیاں!میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو کبھی دکھ نہیں پہنچاؤں گی۔''

''ہاں اور اماں بیگم کو بھی نہیں۔''انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

گیتی نے ان کی بات کا جواب دیئے بغیر سر اٹھا کر آنسو پونچھے اور کھڑی ہوگئی۔

آپ' آپ مجھ سے ناراض تو نہیں' ابا میاں!''

''نہیں بیٹے!''

وہ جانے کے لیے مڑی۔

''گیتی! ایک بات سنو۔'' انہوں نے اس کو آواز دی۔

''جی!''

''ایک بات یاد رکھنا۔ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ انسان جب بڑا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو بچپن کی بہت سی باتوں اور بے تکلف عادتوں کو مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے چوما اور چھوڑ دیا۔ ''ہاں' اب تم جا سکتی ہو۔''

افسردہ لیکن پر اعتماد قدموں سے وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک بار پھر انہوں نے منہال منہ سے لگالی مگر حقہ سرد ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس کو پرے کھسکا دیا۔ مثنوی مولانا روم کے اوراق ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اس مرتبہ ان کی نظر جس شعر سے الجھی وہ ان کا اپنا پسندیدہ مصرعہ تھا۔

از کجا می آید ایں آواز دوست

آہ! یہ آواز دوست۔ ان کو اپنی دنیوی مصروفیتوں اور خالص دنیادار زندگی کے باوجود بارہا سنائی دی تھی۔ جنگلوں میں' ویرانوں میں اور کبھی کبھی بھری محفلوں کے ہنگاموں میں بھی دوست کی آواز ان تک پہنچ ہی جاتی تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ کبھی کبھی اچانک ہی ان کو اپنی اس عجیب و غریب مزاج والی اور بیگم کے بقول بے قابو لڑکی کی بے ڈھنگی باتوں میں بھی اسی جانی پہچانی آواز کی ایک موہوم بازگشت سی محسوس ہوتی تھی۔

باب ۲۸

اول تو شہریار کے واپس آنے یا نہ آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس نے عصمت کے ساتھ ایک مخصوص سلوک روا رکھ کر اپنی چچی جان کے دل میں ارمانوں کی جو دنیا بسا دی تھی وہ تو صولت کی شادی کے فوراً بعد اس کی ماں اور ننھیال والوں نے اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ اب وہاں کیا رکھا تھا۔ ٹھنڈے لاوے کے نیچے دبے ہوئے پومپی آئی کے پر شوکت کھنڈر تھے جو کبھی نہ مٹنے کے لیے محفوظ ہو کر رہ گئے

تھے۔لیکن انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ شہریار کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔اور اب تو وہ دو ایک سال سے اس نے پیسے بھی منگانا چھوڑ دیئے تھے۔

انہوں نے دھیرے دھیرے بالواسطہ طور پر صورت حال عصمت پر بھی واضح کر دی تھی۔اور اس لڑکی نے جس کو وہ دولہا کہا کرتی تھیں کہ مرنے والے کا سالا ابالی مزاج لے کر پیدا ہوئی ہے' اپنے مخصوص لاابالی انداز میں اس تمام حقیقت کو سنا' سمجھا اور اس خاموشی سے پی گئی کہ کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ اس سب کا اس کے دل پر کیا اثر ہوا۔بعض وقت ان کو شک سا ہوتا تھا کہ یہ مختصر سا رومانس اور محبت کی یہ ناکامی ان کی بیٹی کے بجائے خود ان کے زندگی کا حادثہ تھا۔شہریار جیسے لڑکے کے ہاتھ سے نکل جانے کے قلق کے باوجود وہ خوش تھیں کہ ان کی بیٹی اس حادثے میں اتنی متاثر نہ تھی جتنا انہوں نے سمجھ رکھا تھا۔

ویسے ان کو عصمت کی شادی کی جلدی نہ تھی۔ان کا خیال تھا کہ لڑکی کو کسی قابل کئے بغیر چلتا کر دینا خود غرضی ہے۔یہ صحیح ہے کہ ماں باپ کے سر سے اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے لیکن وہ تمام عمر ایک غیر یقینی مستقبل سے دو چار رہتی ہے۔

"ارے ہاں! اگر ہم کسی قابل ہوتے تو یوں ساس کے گھر بیٹھ کر روٹیاں توڑتے۔ارے یہ بے غیرتی کی زندگی ہے۔اکثر ان کے اندر کی خوددار اور غیرت مند عورت اپنی نااہلی پر تلملا اٹھا کرتی تھی اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے کوئی اعتراض کرے اور چاہے کوسی قابل ہی کر کے اپنے سے جدا کریں گی۔

اور یہ بھی بہت غنیمت تھا کہ ان کی ساس ان کی ہم خیال تھیں۔باوجود اپنی ضعیفی اور قدامت پسندی کے ان کا خیال تھا کہ بیٹی کا حقیقی اور بڑا جہیز اس کی لیاقت ہوتی ہے اور سب چیزیں تو دکھاوے اور دوسروں کے برتنے کی ہوتی ہیں' اس کا ساتھ اس کی لیاقت ہی دیتی ہے۔وہ دل ہی دل میں اپنی منجھلی بہو سے ناخوش تھیں کہ صولت کو کسی قابل کئے بغیر ہی ایک عمر رسیدہ شخص کے پلے باندھ دیا۔

"بیوی! ہمیں ادھ کچری تعلیم نہیں پسند۔عورت جاہل ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ' انسان کو ایک سرے ہونا چاہیے۔ورنہ بے سکون رہتا ہے۔"

پھر بھی عصمت کے لیے اکثر رشتے آتے رہتے تھے۔شہریار جیسے خوبصورت اور نیک سیرت اور شان وشوکت والے لڑکے کے بعد ان کا دل کسی پر جمتا ہی نہ تھا۔اگرچہ شعوری طور پر انہوں نے ان لڑکوں کا شہریار سے موازنہ کیا ہی نہ تھا لیکن غیر شعوری طور پر وہ اسی لمحے ان کے ذہن میں آ بیٹھتا تھا۔سب سے پہلا خیال جو ان کو ستاتا تھا وہ ان کا یہ یقین تھا کہ وہ خواہ کہیں رہے اور کتنا ہی خوش کیوں نہ ہو' عصمت کی شادی کی خبر اس کو بے حد افسردہ کرے گی۔

ان کے تصور میں اس دور افتادہ لڑکے کا ملول چہرہ آجاتا تھا جس سے ان کو اب سے نہیں اس کے بچپن سے محبت تھی۔ اور وہ خود بھی شروع ہی سے ان سے مانوس تھا۔ دراصل شہریار کو اپنے چچا جان سے بہت پیار تھا اور وہ بھی اس کو بیٹا کہا کرتے تھے۔ اور یوں چچا جان کے مرنے کے بعد یہ حیثیت چچی جان نے لے لی تھی اور وہ بھی اس کو اس خیال سے بے حد عزیز رکھتی تھیں کہ یہ مرنے والے کو بہت پیارا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اب تک زیر غور رکھنے کے باوجود ان کو یہ تمام رشتے ناپسند تھے۔

اور اس دن عصمت کے بی اے فائنل کا آخری پرچہ تھا۔ جس دن وہ غیر متوقع پیغام ان کے گھر آیا اور اس نے خود کو اپنی نظر میں بلند کر دیا۔ خوشی اور فخر کے مارے وہ خلاف عادت پیامیوں کے سامنے ہی مسکرا دی تھیں۔

یہ پیغام کسی سن رسیدہ لیفٹیننٹ کرنل اور صاحب جاگیر شخص کا نہ تھا بلکہ یہ تو اس افسردہ چہرے والے کم حیثیت جرنلسٹ کی طرف سے آیا تھا جو عرف عام میں زبیر کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن جس کے متعلق ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کو صولت نے دیوتا کی حیثیت دی ہوئی تھی۔ شادی کے وقت تک وہ اس کی پرستش کرتی رہی تھیں۔ اور محض یہ ہی ایک سبب تھا جو انہوں نے اس سے کہیں زیادہ برتر حیثیت والے خوش شکل رشتوں کو نظر انداز کر کے جھٹ اس رشتے کو منظور کر لیا۔ سب سے پہلا خیال جو ان کے دل میں آیا تھا وہ یہ تھا کہ صولت بیگم منہ دیکھ کر رہ جائیں گی۔ بہت حقیر سمجھتی ہیں سب کو اور دوسرا خیال جو ان کے ذہن میں ابھرا وہ یہ تھا کہ ہماری جٹھانی کوملوں پر لوٹ کر رہ جائیں گی۔ سمجھتی تھیں کہ بس ان کی بیٹی نہیں ملی تو زبیر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا۔

اور عصمت بھی عجیب لڑکی تھی۔ وہ لڑکی جو کتنی ہی مرتبہ صولت آپا کے دیئے ہوئے سندیسے زبیر بھیا کے پاس لے کر گئی تھی۔ زبیر بھیا کے گھر سے آئی ہوئی انگوٹھی پہن کر دیر تک تنہائی میں مسکراتی رہی اور سوچتی رہی کہ عجیب مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ بھئی میں تو صولت آپا سے صاف کہہ دوں گی کہ جب آپ ہی سے اپنا دل پسند شخص سنبھال کر نہیں رکھا گیا تو میں کیا کروں۔

پھر اس نے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی شہریار کی تصویر کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ''اب بھئی! میرا اس میں کیا قصور دیکھو نا بڑے بھیا! میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ تم تو خود ساری صورت حال سے واقف ہو۔''

اور یوں اپنے دل کو اطمینان دلانے اور ہر ذمے داری سے سبکدوش ہو جانے کے باوجود اس کی پلکیں بھیگ سی گئی تھیں۔

''نہ جانے اس وقت بڑے بھیا کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔'' اس نے پھر سوچا اور کمرے سے نکل گئی۔

اسی شام اس نے اپنی ماں کو شہریار کی تصویر کے پاس افسردگی سے کھڑے دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ اپنی لڑکی کو دیکھ کر وہ غسل خانے کی طرف مڑ گئیں۔

عصمت کو اس وقت اپنی ماں پر بہت ترس آرہا تھا۔

یہ سب تو چچی جان کے ذہن کے شاخسانے تھے۔ ان کی جٹھانی کے ذہن میں زندگی کی صرف ایک قدر تھی۔ وہ تھی دولت بلکہ بے شمار دولت۔ ان کے یہاں ایسی حماقتوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور نہ کونلوں پر لوٹنے کا کوئی حساب کتاب تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی صولت کا جو رشتہ سوچ سمجھ کر کیا تھا اور وہ اس پر قطعی طور پر مطمئن تھیں۔

اور رہ گیا بیگم صولت آصف جاہ کے منہ دیکھ کر رہ جانے کا سوال تو وہ ان سب باتوں سے ماورا ہو چکی تھی۔ اس کے دل پر جو گزرنا تھی، گزر چکی تھی۔ اس نے اب سے بہت پہلے، شادی کے موقع پر ایک سبق لیا تھا۔

"مجھے اپنے نوشتہ تقدیر کو

بہر نوع برداشت کرنا چاہیے"

بغض و عناد سے شکستہ دل رنجور کی ساری بیماریاں بالآخر سکون پذیر ہو ہی جاتی ہیں۔

اور اس نو عمر چینی لڑکے کا یہ سبق بھی اس کے ذہن سے بہت پرے پھسل چکا تھا۔ اس وقت یہ بات اس کو کتنی پیاری اور دل لگتی معلوم ہوئی تھی۔ اور اب۔۔۔۔۔۔۔ اب اگر یہ ساری بات اسے بھول کر بھی یاد آجائے تو شاید وہ بہت ہی ہلکے دل سے ایک قہقہہ لگا کر کہہ اٹھے۔ "کیا کیا حماقتیں ہوتی ہیں اس عمر کی بھی۔"

یعنی نوشتہ تقدیر کیا معنی؟۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب تو اس کی بلند بختی کی دلیل ہیں۔ اور اب وہ حقیقی معنوں میں شاہنشاہوں کی اولاد کہے جانے کی مستحق تھی۔ اور یہ لی (حسن عمل اور بلند کرداری) اور چن ذی (نجیبوں کی صفات) یہ سب تو کم نصیبوں اور کوتاہ بختوں کے بنائے ہوئے ڈھونگ ہیں۔ جو وہ حقیقتوں سے فرار کی خاطر تیار کرتے ہیں۔

اس کے چیانگ کائی شک نے اس کو ایک قصر نما کوٹھی رہنے کو اور ایک شاہانہ زندگی جینے کو عطا کی تھی۔ اس نے اس کو اپنے عہدے اور اقتدار کا سہارا دیا تھا۔ جس کے سہارے وہ جو چاہے کر سکتی تھی۔ اور جس کی ہیبت سے زمانے کی انگلیاں بھی اس کی طرف اٹھتے جھجکتی تھیں۔

زبیر کی عصمت کے ساتھ شادی کی خبر کو صولت نے ایک دلچسپ لطیفے کے طور پر لیا تھا اور یہ بھی ایک دلچسپ ٹیبل جوک رہے گا۔ اس نے مختصر سے سادہ سے بلاوے کو لاپرواہی سے اپنی رائٹنگ ٹیبل پر ڈال کر سوچا اور اپنے شوہر کے خاص مونوگرام والے پیڈ کے

کاغذ پر چچی جان کو ایک بہت ہی لچھے دار قسم کا مبارکبادی خط لکھنے بیٹھ گئی۔

"یہ تو طے ہے کہ میں ضرور شریک ہو رہی ہوں اس شادی میں۔"

اس نے سوچا۔ خدا جانے کیوں اس کو شادی کی خبر سے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ "کیا ضرورت تھی جو عصمت اپنی پسند کے مطابق بڑے بھیا سے شادی رچا کر بیٹھ جاتیں۔ فضول باتیں۔ یہ سب تو ڈھونگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ آخر کو ہماری شادی بھی تو ہماری مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔"

شادی میں شرکت کے خیال ہی سے وہ ان دنوں اپنے گھر آئی ہوئی تھی۔

اور جب اماں بیگم کو اس کا ارادہ معلوم ہوا تو انہوں نے خاصی مخالفت کی۔ اول تو وہ ایسی شرکتوں کو اس کے شایان شان نہیں سمجھتی تھیں۔ دوسرے یہ شادی ہو بھی تو زبیر سے رہی تھی۔ فضول میں اچھا بھلا سکون دل درہم برہم ہوگا اس کا' جواب اتنی خوش ہے آصف جاہ کے ساتھ۔"

انہوں نے سہم کا سوچا۔

اور صولت بھی ان کے واہموں کو خوب سمجھ گئی تھی۔ اس نے ان کی اس تشویش کو محسوس کر کے بے حد لطف لیا اور سوچنے لگی۔۔

"اماں بیگم بھی بس مجھ کو چھوئی موئی ہی سمجھتی ہیں' دل نہ ہوا شیشہ ہو گیا۔ ارے' اب میں کوئی وہ پہلی سی ناتجربہ کار اور سادہ دل صولت جہانگیر ہوں۔ اماں بیگم یہ بیگم صولت آصف جاہ ہے جو اب اپنے فیصلے خود کرتی ہے اور جس کے دلی جذبات سے خود آصف جاہ تک کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ میری ٹھوکر میں زبیر ایسے دس انسان رہتے ہیں۔ اور کیا مجال ہے آصف جاہ کی جو سانس بھی لے سکے۔ ماڈرن سوسائٹی کا بس ایک یہی تو فائدہ ہے۔

اتنا سب کچھ سوچنے کے بعد وہ بڑے دھیمے لیکن فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "نہیں اماں بیگم' میں ضرور جاؤں گی۔ یہی ایک شادی ایسی ہے جو دادی اماں کے گھر سے ہو رہی ہے۔ ہمارے پرانے خاندان کے سب لوگ جمع ہوں گے اور طرح طرح کی رسمیں ہوں گی۔ میں یہ رسمیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہماری تو شادی میں کسی نے دولہا کا جوتا بھی نہ چرایا۔"

"کون چراتا موٹے ڈھاپل کا جوتا!" گیتی نے پھٹ سے کہا' جو تخت پر بیٹھی تکیے کے غلافوں پر نام ڈال رہی تھی۔

صولت نے اس کی طرف بڑے بغض و عناد سے دیکھا۔ یہ بدزبان لڑکی ہمیشہ اس قسم کی باتیں کر کے اس کے غرور و تمکنت کو ٹھیس پہنچایا کرتی تھی۔ صولت کو اس آزاد فطرت اور کج روی سے دلی نفرت تھی۔

''خدا کی مار تمہاری زبان پر'' اماں بیگم نے اس کو ڈانٹا اور حکم دیا۔ ''جاؤ ذرا شریف سے کہو چائے بنا کر دے جائے۔''

''پتہ نہیں' اماں بیگم مجھے لے بھی جائیں گی یا نہیں۔'' اس نے مردہ دلی سے سوچا۔ اس نے ابھی تھوڑی دن ہوئی میٹرک کے امتحان سے فرصت پائی تھی اور اپنی دشمن جاں پڑھائی سے فرصت پا چکی تھی۔ ان دنوں اس پر اتنی زیادہ سختی تھی کہ اس کی بہت سے عادتیں ختم ہو چکی تھیں۔ مثلاً وہ کئی مہینے سے دیوار پر چڑھ کر نہ بیٹھی تھی۔ شہتوت کے درخت پر خود چڑھ کر شہتوت نہ توڑے تو اس نے مالی کے توڑے شہتوتوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اماں بیگم کے پسندیدہ ملنے والوں یعنی چیف انجینئر کا خوش شکل لڑکا اس سے کھلم کھلا فلرٹ کیا کرتا اور وہ باوجود دلی خواہش کے اس کے منہ پر تڑاخ سے تھپڑ بھی رسید نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ اماں بیگم کی عین مرضی یہی تھی۔ اور وہ لڑکا آئندہ سال مقابلے کے امتحان میں بیٹھ رہا تھا۔

اور جو ایک سال پہلے وہ اس کو یوں بور کرتا تو وہ اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر ایسا گراتی کہ چاروں شانے چت گرتا۔ مگر اس کی روح تو کچلی ہوئی تھی ان دنوں' پھر بھی وہ سوچا کرتی تھی۔

''ذرا میرا رزلٹ نکل آنے دو۔''

پتہ نہیں رزلٹ کیا کر لیتا۔ اور اب تو اس کو اس سے بھی کوئی سروکار نہ تھا کہ اماں بیگم اس کو شادی میں لے جائیں گی یا نہیں۔

غرض ان دنوں اس کے چاروں طرف مایوسی اور تنہائی کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور گاہے گاہے ان کالے بادلوں میں سے اس کا وہ دل پسند ذہین اور سانولا چہرہ ابھرتا۔ جیسے پوچھتا ہو۔ ''کیوں گیتی! کیا تم اس بڑے اچھے موقع پر بھی نہ آؤ گی۔ کون جانے پھر کبھی تم آ سکو۔ کیا تمہیں اب مجھ سے بالکل ہی دلچسپی نہیں رہی؟؟''

''ہاں مسعود! کیوں نہیں۔ مجھے تمہارے سوا کسی سے بھی دلچسپی نہیں۔ اور تم ہی اتنے برے ہو کہ ارجمند کو پروپوز کرنے بیٹھ گئے۔ کم بخت مارے! اگر تو مجھ سے یہی بات کہتا تو میں ارجمند سے بالکل مختلف جواب دیتی۔ مگر مجھے کیا پروا۔ تم کسی سے بھی پروپوز کرتے پھرو میری بلا سے۔ بات یہ ہے کہ میرا تمہارا یہ وعدہ تو ہوا ہی نہیں ہے کہ تم بھی مجھ سے دلچسپی لو گے۔''

اس کے ہاتھ غیر دلچسپ کاموں میں مصروف ہوتے اور دماغ ان خیالوں میں۔

باب ۲۹

شہ نشینوں اور محرابی دروں والے اس مکان میں شادی کے ہنگامے شروع ہوئے تو ساتھ ہی عصمت کے جواں مرگ باپ خاقان مرزا کی پرانی یاد انگڑائی لے کر کھڑی ہو گئی۔ ساس' بہو اور دونوں لڑکیاں اس نقطہ اتحاد پر آ کر ہو گئیں۔ ہر بات اور موقع پر ان کی آنکھوں میں آنسو مچل مچل اٹھتے اور ٹھنڈی سانسیں لبوں پر آ کر پلٹ پلٹ جاتیں۔ یہ شادی صولت کی شادی سے ہر بات میں مختلف تھی۔ بڑے چچا کے بیوی بچے مدراس سے نہ آ سکے اور وہ خود وقت کے وقت پہنچے۔

جہانگیر مرزا کے گھر والے البتہ کئی دن پہلے پہنچ گئی تھے اور وہ خود ہی بھی تین دن پہلے آ گئے تھے۔ ساری رسموں اور گیتوں میں ان ہی کو باپ کی جگہ ملی ہوئی تھی اور وہ بڑی افسردگی لیکن توجہ سے ہر رسم کو پورا کر رہے تھے۔ جو سچ پوچھو تو زندگی کے جھمیلوں نے بھائی کی یاد سے بیگانہ کر رکھا تھا۔ لیکن اس کی لڑکی کی شادی کے موقع پر تو وہ یاد ان سے بہت قریب بلکہ ان کے دل میں آ بسی تھی۔ ان کا وہ سر جھکائے آنکھوں اور کھوئی اداؤں والا بھائی ابھی کسی کونے سے نکل کر آتا ہی ہوگا۔

شہریار پردیس میں تھا اور بختیار کی ابھی چھٹی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کام کاج میں مدد کرنے والا کوئی معقول لڑکا ان کی سمجھ میں آ سکتا تھا تو وہ مسعود ہی تھا۔ ان کے اصرار پر مسعود کو شادی تک کے لیے مستقل وہیں رہنا پڑا۔

سارے دن کے انتظاموں کے بعد جب لڑکیاں ڈھول لے کر گانے بیٹھتی تھیں تو مسعود کا ان میں گھس کر بیٹھنا لازمی تھا۔ وہ طلعت' ارجمند اور کامنی کو اشارے سے منع کر دیتا کہ صرف گیتی ہی کو آواز نکالنے دو۔ اور وہ بے خبری میں اکیلی ہی گاتی چلی جاتی کہ اچانک اس کو احساس ہوتا کہ اس کا ساتھ دوسری آوازیں نہیں دے رہی ہیں۔ تو وہ بگڑ اٹھتی۔

''واہ بھئی! میں کیا ڈومنی ہوں جو اکیلی گاؤں۔''

''تو اور'' پیچھے سے مسعود کی آواز آتی۔

اور وہ جل بھن کر وہاں سے کھسک کر دور جا بیٹھتی۔

اور پھر اس شب ماہتاب میں جس کی صبح بارات آئی تھی۔ مولسری کے پیڑ کے نیچے وہ تختوں کے اجلے چوکے پر بیٹھی گا رہی تھیں۔ گیتی کا گلا بیٹھ رہا تھا۔ اس نے گلے میں رومال باندھ رکھا تھا۔

سب نے کامنی سے کہا تھا کہ آج تم شروع کرو۔ کامنی نے اپنی نازک اور لمبی لمبی انگلیاں ڈھولک پر چلائیں اور بڑی بڑی آنکھوں کو ریشمی پلکوں کی اوٹ میں چھپا لیا۔ اس کے سانولے چہرے پر بڑی دلکش سی گلابیاں کھیل رہی تھیں۔ اس نے گلا صاف کیا اور بول اٹھائے ہی تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کا منہ بند کر لیا اور پھر اس کے بہت قریب جھک کر بولا۔ ''خبردار! کیا تم ڈومنی ہو

جو یوں گا رہی ہو؟ سب آواز ملائیں تو گاؤ۔'' اس نے یوں ہی گیتی کی طرف دیکھا۔

اور گیتی کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ ایک لق ودق صحرا میں تنہا کھڑی ہے۔ جہاں زرد اور بے حیا دھوپ ہر طرف دیدے پھاڑے موجود ہے۔ اف غضب کا سناٹا اور تنہائی تھی۔ اس لیے کہ مسعود اس لڑکی سے بہت قریب نظر آ رہا تھا۔ دونوں کا رنگ یکساں تھا۔ دونوں کے چہروں کی ساخت نمایاں مشابہت تھی اور سب سے بڑھ کر وہ ازلی اور ابدی منحوس حقیقت کہ دونوں کی حیثیت یکساں تھی اور وہ خود ان سے منزلوں دور تھی۔

وہ دبے قدموں اٹھی اور وہاں سے ٹل گئی۔

سب دادی اماں کی طرف تھے۔ چچی جان والے چھوٹے صحن میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ وہ ایک چارپائی پر جا کر اوندھی لیٹ گئی۔ اس کے بے زبان آنسو آنکھوں کے کویوں سے رس رس کر تکیے کو بھگوتے رہے۔ اس کا حلق خشک تھا اور وہ اس میں درد سا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے کسی سے سر اٹھا کر افسردہ چاند کو دیکھا اور پھر نیچا کر لیا۔ سامنے ہار سنگھار کا پیڑ تھا۔ اس کی آڑ میں ایک سایہ دبے قدموں آگے بڑھا اور اس کے پلنگ کی پٹی کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔

''ارے پگلی! تجھے کیا ہوا؟''

پگلی جواب دیے بغیر اپنے آنسو خشک کرتی رہی۔

''کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی؟'' اس نے اس کے کٹے ہوئے بال پکڑ کر ہلائے۔

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''گیتی!'' مسعود کی آواز بھاری اور گلوگیر تھی۔

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی چینیوں کی سی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

''جواب دو میری بات کا۔''

''کس بات کا؟''

''یہی کہ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں پتھر ہوں؟''

''پتھر یا گوشت کے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے مسعود!''

''کم بخت! کیسی فلسفیوں کی سی باتیں کرنے لگی ہے۔'' اس نے سوچا۔

''تم تو بڑی بھاری فلسفی ہونا' اور میں تو بالکل احمق ہوں۔''

''تو اور؟''

''گدھی' نامعقول' شرم تو نہیں آتی مجھ پر شک کرتے ہوئے۔''

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کو جو اس سے یوں بدظن ہو کر رو رہی تھی' برے سے برے لفظ کہے چلا جائے۔

دھیرے دھیرے اس کا چہرہ اس کے سر کے بالکل نزدیک آ گیا تھا اور اس کے ان سیدھے اور سیاہ بالوں سے بھر وہی اور مدہوش کن خوشبو آ رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا اور اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

جاتے جاتے اس نے سوچا۔ ''یہ اس میں پسپائی اور شکست خوردگی کے انداز کیوں پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ تو اس سے بعید تھا کہ وہ یوں بیٹھ کر آنسو بہائے۔ وہ تو مار سکتی تھی۔ رونا اس کے بس کی چیز تو نہ تھی۔

شادی میں صولت کی شرکت اور دلچسپی تمام خاندان کے لیے ایک دلچسپ چیز تھی۔ وہ خاندان سے اس درجہ علیحدہ اور بلند سطح پر ہو کر پلی اور بڑھی تھی کہ اس وقت اس کا اپنی سطح سے نیچے اترنا بھی ایک عجیب بات تھا۔ خصوصاً خاندان کے متوسط اور غیر فیشن ایبل رشتے داروں کے لیے جن کو خبر ہی نہ تھی کہ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ عورتیں اس کی ہر ہر بات سے مرعوب تھیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی پرستش کر رہی تھیں۔ اپنے شرمیلے لجیلے بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر اس سے متعارف کرواتیں۔

''اے! ان کو آداب کرو۔ باجی ہیں تمہاری' خالہ ہیں۔'' اور وہ غریب دبے' سکڑے' نیلی پیلی ساٹنوں پر معکوس رنگوں کی ڈوریوں سے کام کئے ہوئے نیکر اور بلاؤز پہنے شرما شرما کر دوہرے ہو ہو جاتے۔

وہ اتنی حسین اور بارعب اور پیاری پیاری خوشبوؤں میں بسی ہوئی دیدی سے کس طرح اپنی ماؤں کی فرمائش کے مطابق لپٹ سکتے تھے۔

اس کے بجائے اگر وہ اس کی چینیوں جیسی شکل والی بالوں کٹی بہن سے لپٹنے کی فرمائش کرتیں تو وہ بے محابا اس کی گردن تک میں لپٹنے کو تیار تھے۔

اور صولت کا یہ تھا کہ وہ ان کے تپاک پر دل ہی دل میں ہنستی۔ انہیں کیا خبر کہ وہ تو صرف یہ دیکھنے کے لیے یہ پرانی تہذیب اور اپنے ہی خول میں گھٹا ہوا کلچر اپنے اندر کون کون سے رنگ رکھتا ہے' یہاں آئی تھی۔ اور اب جب کہ وہ یہاں آ ہی گئی تھی تو اپنی بڑائی اور تمکنت کا اظہار بالکل فضول تھا۔ جب دیوتا کسی سبب سے اپنے استھان سے نیچے اتر آئے تو پھر محض اپنی بلندی کے اظہار کے لیے وہ

اچک اچک کر تو نہیں چلتا۔ اور اسی لیے وہ ان میں بالکل ملی گھلی ہوئی تھی۔ اور شادی کے ہر کام اور معاملے میں اس کی رائے شامل تھی۔
جب وکیل اور گواہ دلہن کی اجازت کے لیے اندر آئے تو دلہن کو گھیر کر بیٹھنے والی ساری بیویوں نے آڑ کر لی۔ لیکن وہ سب کے درمیان سر کھولے دلہن کی جھکی ہوئی گردن کو سہارا دیئے کھڑی رہی اور پہلی ہی مرتبہ مہر وغیرہ کی تفصیلات سن کر اس نے بڑے گمبھیر اور فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''اب ہاں کہہ بھی دو میری بہن!'' اور دلہن نے بھی اس تقاضے پر جھٹ ہاں کہہ دی اور اس کے بعد اس نے دلہن سے شدت کے ساتھ اصرار شروع کیا کہ بھئی اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ کاہے کو رو رہی ہو۔
اور دلہن نے روتے روتے سوچا کہ مجھے کیا معلوم کہ کاہے کو رو رہی ہوں۔ واقعی اس میں رونے والی کوئی بات تو نہیں ہے۔ لیکن یہ رونے کی بات تو نسلاً بعد نسل چلی آ رہی ہے اور شاید ہر دلہن کی جبلت بن چکی ہے۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ اس میں رونے کی کوئی بات نہیں بغیر کوشش کے رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں صولت کی بات کا برا مان گئی۔ مگر جان سے بیزار چندے اور سفید سرے گواہ صولت سے حد درجے خوش اور اس کے احسان مند تھے کہ اس نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ ورنہ تین چار بار ان کو اپنی بلغمی آوازوں سے یہ رٹے رٹائے جملے ادا کر کے کان بڑھا بڑھا کر دلہن کی گھٹی گھٹائی ''ہوں'' سننا پڑتی تھی۔
ایک اونچا سننے والے بڑے میاں نے تو اس کی تعریف میں یہاں تک کہہ دیا کہ بڑی سعید اور پابند شریعت بچی ہے۔ نکاح قبول کروانے اور میت اٹھانے دونوں ہی کاموں میں عجلت کرنا ہی افضل ہے۔
صولت نے دلہن کو بنانے میں اپنا پورا آرٹ صرف کر دیا تھا۔ پورے تین گھنٹے دلہن کو تیار کرنے میں صرف کر دیئے تھے۔ اور زبیر کو جو نکاح اور سہرے دونوں سے فراغت پا کر اپنے دوستوں کے درمیان اندر بلائے جانے کا منتظر بیٹھا تھا یہ خبر مل چکی تھی کہ آرسی مصحف کے لیے اب تک بلائے نہ جانے کا سبب یہ ہے کہ اس کی دلہن کو بیگم صولت آصف جاہ تیار کر رہی ہے۔
اور اس دم زبیر صولت کے ٹھسے' غمزوں اور حد سے بڑھی ہوئی تمکنت کے متعلق سوچ کر ہی سہم گیا۔ ارے معاذ اللہ! ایک وقت میں میں بھی کیسا احمق ہوا کرتا تھا۔ ''ولے بخیر گزشت'' اور یہ فقرہ سوچتے ہی وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔
اور یہ حقیقت تھی کہ آصف جاہ کی بیگم نے اس کی دلہن کو بڑی فراغت اور اطمینان سے سجایا تھا۔ یہ کامنی سی لڑکی ایک بڑا ہی معطر اور دلربا خواب نظر آنے لگی تھی۔
صولت کے اس انہماک کو دیکھ کر عصمت کی ماں یعنی اس کی چچی جان نے بڑی افسردگی سے سوچا۔ ''کیوں صول! اگر تم اس کو اسی طرح سجا کر اپنے گھر لے جاتیں تو کوئی ہرج تھا؟''

آج انہوں نے شہر یار کو کوئی وجوہ کی بنا پر کئی مرتبہ یاد کیا تھا۔

باب ۳۰

اس بارات اور شادی کے ہنگامے میں گیتی سے سے زیادہ شاید ہی کوئی مطمئن اور خوش ہو۔ اس سے وہ مغرور لیکن پیارا انسان کتنی بڑی بات کہہ گیا تھا۔

''گدھی نامعقول کہیں کی! شرم تو نہیں آتی مجھ پر شک کرتے۔''

اور یہی تو وہ بات تھی جس کو سننے کے لیے وہ دو سال سے بے چین تھی۔

مسعود اس سے اتنی بات کہہ دینے کے بعد پہلے ہی کی طرح بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ تمام وقت کامنی کا چھیڑتا اور اس سے طرح طرح کے کام لیتا رہا۔ لیکن اب وہ خوش اور مطمئن تھی بلکہ اس کو کامنی سے بڑی ہمدردی تھی۔

''بچاری کتنی سویٹ ہے اور مسعود سے کتنی مانوس ہے۔ مسعود جو صرف میرے لیے بنا ہے۔''

وہ واقعی بڑی فراخدل اور فیاض طبیعت تھی۔ اس کو اب اس لڑکی سے ذرا بھی رشک وحسد نہ تھا بلکہ دوپہر کو وہ کامنی کو پریشان کر رہا تھا تو گیتی نے اس سے کہا۔

''مسعود! یہ سویٹ ہے نا' پیاری سی چیز ہے۔''

اور مسعود نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کہتا ہو۔ ''تجھ سے بھی زیادہ پیاری چیز کہیں ہو سکتی ہے پگلی! اعتماد اور محبت سے بھرپور شیطان کی طرح خودسر اور گستاخ لیکن دھرتی کی طرح فراخ دل۔''

لیکن وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اس کے دل میں ایک عجیب خوف اور وہم سا کروٹیں لے رہا تھا۔

اور جب گیتی کے گھر والوں نے جانے کی تیاریاں شروع کیں تو تنہائی میں اس نے چچی جان سے کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے' آپ کے پاس رک جاؤں۔''

''ارے ہاں' رک جاتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا۔'' شہر یار کے بعد ان کو اپنے جیٹھ کے بچوں میں اگر کوئی پیارا لگتا تھا تو وہ گیتی تھی۔

''تو آپ روک لیجیے مجھے''

''اے بھئی! ہمیں تو ڈر لگتا ہے۔ بھلا تمہاری اماں ہماری بات مانیں گی؟''

''مان جائیں گی۔ اگر آپ کے ساتھ دادی اماں بھی کہہ دیں۔ مگر ابا میاں کے سامنے کہئے تو چھوڑ دیں گی۔''

''ہاں تو میں آج ہی کہہ دوں گی۔ میرا خود عصمت کے چلے جانے سے جی برا ہو رہا ہے۔'' ان کا دل بھر آیا۔ تمہارے رہنے سے کچھ تو رونق ہو جائے گی۔''

اسی دوپہر کھانے پر انہوں نے ذکر چھیڑ دیا۔ ''اب آپ لوگ چلے جائیں گے تو یہ گھر کاٹنے کو دوڑے گا۔ بالکل سناٹا ہو جائے گا۔''

''لو اس گھر میں خدا نہ کرے سناٹا ہو۔ ماشاء اللہ یہاں کی رونق تو لوگوں کے یہاں کی تقریبوں کے برابر ہے۔'' اماں بیگم نے ہنس کر کہا۔

''پھر بھی' یہ تو اب روزمرہ میں داخل ہے۔ آئے ہوئے لوگ چلے جائیں تو بھرا گھر خالی لگتا ہے۔'' دادی اماں نے کہا۔

''ہاں' یہ تو ہے۔'' چچی جان نے چٹنی کی طشتری ان کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا تو دل چاہتا ہے کہ گیتی کو روک لوں کچھ دن کو۔ اس کا تو امتحان بھی ختم ہو چکا ہے۔''

''ضرور روک لو۔'' جہانگیر مرزا نے تائید کی۔ ''یہ وہاں سخت بور ہو رہی ہے ان دنوں۔'' اور پھر انہوں نے گیتی کی طرف دیکھا۔

''کیوں دوست' کیا خیال ہے؟ رہو گی کچھ دن دادی اماں کے پاس؟''

''میں تو رک رہی ہوں پر۔۔۔۔۔۔''

اماں بیگم نے خشم ناک نگاہوں سے اس کو گھورا اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

لیکن اسی وقت ابا میاں نے کہہ دیا۔ ''اچھا تو پھر طے ہے۔ میں گیتی کا ٹکٹ نہیں منگوا سکتا۔ اب جب تک چاہیے اس کو روک لیجئے۔ بس امتحان کا نتیجہ نکلنے سے کچھ دن پہلے بھیج دیجئے گا۔''

اپنی بیگم کو جز بز دیکھ کر انہوں نے وضاحت کی۔ ''بھئی! میرے بچوں کو بھی تو اماں جان کی خدمت کرنا چاہیے کبھی کبھی۔''

اس مرتبہ وہ رک گئی تو دادی اماں نے اس کو بڑے غور سے اور قریب سے دیکھا۔ یہ لڑکی جس کی ماں اس سے ہر دم بیزار رہتی تھی۔ کتنی سادہ مزاج اور صلح کل واقع ہوئی تھی۔ نہ کسی بات پر اعتراض' نہ کسی کام سے انکار اور ان کی تو وہ خصوصیت سے خدمت کرتی تھی۔

''مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ جہانگیر میرزا کی اولاد میں ہیرا ہے۔'' انہوں نے ایک دن اس کو گلے لگا کر کہا۔

اور گیتی سوچنے لگی۔ ''یہ لفظ تو ارجمند کے متعلق کہا جاتا ہے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دادی اماں صفدر کے دماغ کی ہیں۔ وہ ہی ایک ایسی ہستی ہے جس نے شروع ہی سے ارجمند کے بجائے مجھے قابل توجہ سمجھا ہے۔''

مسعود کو خبر بھی نہ تھی کہ وہ رک گئی ہے۔ وہ کئی دن بعد اس طرف آیا تو اس نے دیکھا کہ اسی مولسری کی گھنی چھاؤں تلے چھوٹے سے کھٹولے پر جولڑکی اوندھی لیٹی تھی وہ نہ طلعت تھی اور نہ کامنی۔ وہ اور قریب گیا۔ کھلی ہوئی کتاب پر گیتی منہ اوندھائے لیٹی تھی۔

''ارے! اس سر میں جو اس کتاب پر اوندھا ہوا ہے۔ میرا ہی تو سودا ہے۔'' مسعود کا دل خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ جھک کر ان سیاہ گھور بالوں کے ڈھیر کو پیار کر لے مگر وہ ذرا ہٹ کر بکھرے ہوئے مولسری کے پھول چننے لگا۔ اور وہیں سے آواز دی۔

''ہیلو چائینز! تم یہاں مری پڑی ہو۔ میں نے تو سنا تھا تم لوگ واپس گئے۔ کب واپس ہو رہی ہے؟''

اس نے سر اٹھایا اور بولی۔ ''سب گئے اور میں رک گئی۔''

''کیوں؟ یہ کیا وحشت تھی؟ بھئی اپنے انتظام سے جانا۔ میں نہیں تم کو ڈھوتا پھروں گا۔''

''بڑے آئے ڈھونے والے میں خود چلی جاؤں گی۔''

''ضرور اکیلی گئیں تو دادی اماں مار ڈالیں گی جان سے۔''

''کوئی نہیں ماریں گی۔ پتہ ہے وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔''

''ارے ہٹو تم کو کوئی کیا پیار کرے گا۔ وہ تو تمہارا دل رکھنے کو کہتی ہوں گی۔ بھلا کوئی پاگلوں سے بھی پیار کرتا ہے۔''

''تم بھی نہیں کر سکتے؟'' وہ پھر بے تکے پن پر اتر آئی۔

''لو بھئی! مجھے کیا باولے کتے نے کاٹا ہے؟'' وہ اس کو دھکیل کر اسی کھٹولے پر بیٹھ گیا۔

''ہٹو کم بخت! اتی سی جگہ میں گھس آئے۔'' وہ ادوان پر بیٹھ گئی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ واپس تشریف کیوں نہیں گئی جناب کی؟''

''اے مسعو! میرے رہ جانے سے تمہارا کیا نقصان ہے؟ تمہارے گھر تو نہیں پڑی ہوں؟ کیا حرج ہے جو میں رک گئی۔ بلا سے یہاں میرے فضیحتے تو نہیں ہوتے ہر وقت۔''

''کیوں تمہارے فضیحتے کیوں ہوتے ہیں؟''

اس نے ڈر کر سوچا۔ کہیں اس پر میری وجہ سے سختی تو نہیں ہو رہی ہے اور پھر ہمدردی سے بولا۔ ''گیتی! کیا بات ہے؟ تم پریشان نظر آتی ہو اس مرتبہ۔''

اس سدا کی احمق کا تو یہ ہمیشہ سے ہی حال تھا کہ کسی نے دل لے کر بات کی اور اس نے سب اگل دیا۔ اس وقت بھی اس کی

آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے تمام قصہ سنا دیا۔ یہاں تک کہ اپنی پٹائی کا ذکر بھی نہ چھوڑا۔

مسعود بڑی خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ اس کو یہ بات سخت معیوب معلوم ہوئی کہ گیتی بے کہے سنے اتنی دیر صفدر یاسین کے ساتھ پارک میں بیٹھی رہی۔

وہ رکھائی سے بولا۔ ''یہ تو واقعی غلط حرکتیں ہوئی نا تمہاری۔۔۔۔۔۔ گیتی! ایک بات یہ ہے کہ تم بری بے باک حرکتیں کرتی ہو۔''

''لو اس میں بے باکی کی کیا بات ہے؟''

''بھلا تم کو چائنا مین کے ساتھ پارک میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اے لڑکیا میں اس کو بلانے گئی تھی۔ یہ تو ایک اتفاق تھا۔''

''ہاں پھر بھی'' مسعود کو یہ تو یقین تھا کہ یہ محض ایک اتفاق تھا لیکن وہ اس کی اس سادہ دلی سے متفق نہ تھا کہ وہ چائنا مین جیسوں کے ساتھ بیٹھ کر گپیں ہانکنے کو سرے سے کوئی غلط بات سمجھتی ہی نہ تھی۔

اس نے اس کو پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''لڑکیوں کی پوزیشن بڑی نازک ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ اس قابل کب ہوتے ہیں۔''

گیتی نے اس کی بات سننے کی کوشش ہی نہیں کی اور رنجیدگی سے سوچنے لگی۔ ''میری بات کو واقعی اس صفدر لیوچو کے سوا کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ بھئی اللہ! زندگی میں اتنی بہت سی باتیں نامناسب اور معیوب کیوں ہوا کرتی ہیں۔ فضول میں ہی لڑکیوں کی پوزیشن کو نازک بنا دیا گیا ہے۔''

وہ سخت جز بز اور الجھی ہوئی بیٹھی رہی۔ اور مسعود کو اس وقت اس کی یہ کیفیت بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی۔

اور جب ہر پھر کر مسعود کا زیادہ وقت یہیں گزرنے لگا' تو چچی جان کو اچانک ہی یہ احساس ہوا کہ پہلے تو مسعود کی شکل مہینوں نظر نہیں آتی تھی اور اب ایسی کیا خاص بات ہے کہ زیادہ وقت یہیں گزرتا ہے اور اس خیال کے آتے ہی انہوں نے گیتی کے اس رویے کا اندازہ بھی لگا لیا جو وہ مسعود کے ساتھ روا رکھتی تھی۔ اس اندازے سے ان کو ایک خاص مسرت سی ہوئی۔

''یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ ماں کو جس قدر کم حیثیت والے رشتہ داروں سے حقارت تھی اسی قدر ان کے تینوں بچے یکے بعد دیگرے ان ہی کی طرف جھکے۔ دو تو ان کے قابو میں آ گئے مگر یہ لڑکی تو جنات صفت ہے۔ اب یہ سلسلہ جو چلا ہے تو دیکھو اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' انہوں نے سوچا۔

اور پھر یہ ہوا کہ گیتی کے اس مختصر قیام کے دوران میں وہ دیدہ و دانستہ طرح دیتی رہیں۔ ان کے دل میں ایک دبی دبی سی خواہش

انگڑائیاں لیتی رہی۔ ''خدا اس کا غرور کا سر نیچا کرے جس نے صولت کی شادی میں میری اور میری لڑکی کی توہین کی تھی۔ اچھا ہے جو یہ لڑکی مچل جائے۔ میں تو صرف ان کی شکست دیکھنا چاہتی ہوں۔''

پر یہ چچی جان کا خیال خام تھا کہ وہ اس کے اس وقتی خیال کو راسخ کر رہی ہیں۔ اس کے ذہن میں تو جس گھڑی وہ خیال واضح ہو کر آیا تھا اسی وقت راسخ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کے ساتھ ساتھ مسعود کے ذہن کو جس رخ پر موڑ دیا تھا اس کے متعلق مسعود کے دماغ میں کوئی واضح نقشہ موجود ہو یا نہ ہو' خود اس کے ذہن میں کوئی الجھن یا پیچیدگی موجود نہ تھی۔ ''جو کچھ میں نے سوچ لیا ہے وہ سوچ لیا اور بس۔''

اس کے رہنے سے گھر میں بڑی رونق تھی۔ بالکل گھل مل کر اور بڑے کھلے دل کے ساتھ وہ یہاں رہ رہی تھی۔ طلعت کے علاوہ کامنی بھی اس کی گرویدہ تھی۔ مسعود بھی آتا جاتا تھا تو چاروں مل کر ادھم مچاتے رہتے۔ ان لڑکے لڑکیوں کی باتوں' چھوٹے چھوٹے جھگڑوں اور دلچسپیوں میں وہ اپنے سن و سال میں بھی کمی محسوس کرنے لگتیں۔

وہ دن بھی گویا پر لگا کر آئے تھے کہ اڑے چلے جا رہے تھے۔ اور اب گیتی کا نتیجہ نکلنے میں چند روز باقی تھے۔ وہ مارے ہول کے سب کچھ بھول کر واپس جانے پر تیار ہو گئی۔ بلا سے فیل ہونے کی شرمندگی گھر والوں ہی کے سامنے ہو گی۔

اس سہ پہر کو وہ آیا تو اس نے گیتی کو سفر کی تیاریوں میں مشغول پایا۔

وہ بیٹھی اپنے کپڑے تہہ کر کر کے رکھ رہی تھی۔ وہ آیا اور اس کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ آج صبح ہی سے اس کا دل بے وجہ اداس تھا اور وہی ہوا۔ وہ دور ہی سے دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ جا رہی ہے۔

''عجب بدسلیقہ لڑکی ہے۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''یہ کپڑے تہہ ہو رہے ہیں یا استری بگاڑی جا رہی ہے؟''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''تمہاری بلا سے' تم تو بڑے سگھڑ ہو۔''

''اونہہ' یہ بکس ہے کہ گلہری کا گوڈر'' اس نے جھک کر رکھے رکھائے کپڑے بکس میں سے کھسوٹ کر باہر ڈال دیئے۔ ''ایک ارجمند ہے' دیکھو کتنی صلاحیت سے کام کرتی ہے۔''

''خدا کی مار تم پر' لے کے رکھے رکھائے کپڑے نوچ ڈالے۔''

وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ ''بھئی مسعود! تم بڑے بدتمیز ہو۔''

''بکس تھا ہی بڑا گھڑا پے کا۔ اور یہ کیا گستاخی ہے۔ اپنے سے بڑوں کو بدتمیز کہتے شرم نہیں آتی۔ نالائق! اونہہ' تو اب یہ کپڑے رکھنا بھی مجھی کو سکھانا پڑیں گے۔''

اور اس نے اس کے تہہ کئے کرائے کپڑے کھول ڈالے۔

''ہٹو بھئی! خود تو سیکھ لو پہلے تمیز۔'' وہ بدماغی سے بولی۔

وہ روٹھ کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ اس کو اس کی یوں اچانک جانے کی تیاریوں کو دیکھ کر سخت رنج ہو رہا تھا۔

طلعت کامنی کی طرف تھی اور چچی جان دادی اماں کی طرف ابھی تھوڑی دیر ہوئی اٹھ کر گئی تھیں۔ اور گیتی یہاں اکیلی بیٹھی اپنا سامان درست کر رہی تھی۔ بمشکل تمام مسعود کے بکھیرے ہوئے کپڑوں کو سمیٹ کر الٹا سیدھا بکس میں ٹھونسا اور اپنی کوئی چیز تلاش کرتی ہوئی برآمدے سے گزری۔

''ارے بھئی! اب تو ہم جا رہے ہیں۔ فضول منہ پھلائے بیٹھے ہو۔''

''جاؤ' تم کو بلانے کون گیا تھا۔ جب ہی کیوں نہ چلی گئیں؟''

''جب میرا دل چاہا' جا رہی ہوں۔''

''ہاں جاؤ' منع کون کرتا ہے۔ بس مجھ کو تم نے بے چین کر دیا نا۔''

''اے مسعود! تو کیا تمہارا خیال ہے کہ میں یہیں بیٹھی رہوں؟ گھر نہ جاؤں؟''

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''بھئی عجب پاگل پن ہے۔''

''میں کچھ کہہ رہا ہوں تم سے؟'' مسعود کو اس کی بات کا جواب نہ بن پڑا۔

گیتی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ اترا ہوا تھا اور وہ بہت دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔

وہ ہنس پڑی۔ ''تم روٹھ کر کتنے اچھے لگتے ہو۔''

''نالائق گدھی! مجھ سے بات مت کرو۔ بس میں اسی دن کو تو ڈرتا تھا۔''

''دیکھو مسعود! میری بات تو سنو۔'' وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''اب اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ میں یہیں بیٹھی رہوں۔ تم بتاؤ نا یہ کیا بات ہوئی؟''

''بات کچھ بھی نہیں ہوئی۔ اب تم جاؤ۔ ٹھاٹ سے کالج میں داخلہ لینا اور مگن رہنا۔ اور کچھ دن بعد اپنی سہیلیوں کو لطیفے کے طور پر

مزے لے لے کر سناتا کہ ایک احمق ہوا کرتا تھا' مسعود۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اس سے مذاق کیا اور وہ بالکل ہی بے وقوف بن گیا۔ اور اس نے اتنا بھی نہ سوچا کہ بھلا اس کا اور میرا کیا جوڑ' کہاں راجہ بھوج اور۔۔۔۔۔۔

اچانک اس نے مسعود کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ ''مسعود! میری طرف دیکھو' کیا تم مجھ کو اتنا ذلیل سمجھتے ہو؟ کیا تم مجھ پر ذرا بھی بھروسہ نہیں کرتے؟''

مسعود نے اس کی طرف دیکھا۔ ان چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑے مضبوط ارادے کی چمک تھی اور منگولی وضع کے چہرے پر صداقت کا نور تھا۔

وہ بغیر کوئی جواب دیے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ ناسمجھ اور عاقبت اندیش نا اندیش لڑکی اچانک بڑی متانت سے حقیقت پسندانہ لہجے میں اس کو سمجھانے لگی۔

''دیکھو! انسان کو ہر معاملے میں خواہ وہ دل کا ہو یا دماغ کا' پریکٹیکل ہونا چاہیے۔ ہم نے تم نے جو وعدہ کر لیا ہے اس سے آگے ابھی کچھ سوچنا حماقت کے سوا اور کیا ہے۔ ویسے میں ارجمند کی طرح خاموش اور سعادت مند بیٹی تو ہوں نہیں۔ اب میں جاتے ہی اس بات کی اطلاع اماں بیگم کو دے دوں کہ وہ میری آئندہ زندگی کے متعلق فیصلہ کرتے وقت تمہارے سوا کسی کے متعلق سوچیں بھی نہیں۔ اس وقت تک جب تک کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو جاؤ۔ اور سنو! اب میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ خوب دل لگا کر پڑھوں گی' کبھی فیل نہ ہوں گی' بس پھر دونوں مل کر گزر کر لیں گے۔۔۔۔۔۔۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

وہ اس انداز سے بول رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت چھوٹا سا بچہ ہو اور وہ اس کو بڑی نرمی اور حلیمی سے بہلا رہی ہو۔

وہ یہ ساری باتیں اس آسانی سے کر رہی تھی جیسے یہ سب گڑیا کا کھیل ہو' جیسے بچپن میں وہ کھیل میں باتیں کیا کرتی تھی۔ بس یوں کر لیں گے' ہاں یہ ہو جائے گا۔

''ہاں تو گیتی! تم چلی گئیں اور دیکھو' اس برکھارت کی ساری بہاریں بھی تم اپنے ساتھ ہی لے گئیں۔ کالی کالی بدلی امنڈ گھمنڈ کر آئی ہے اور آموں کے کنجوں میں کوئلیں کوک رہی ہیں۔

اودی اودی گھٹا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں بھی مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے لق ودق اور تپتے ہوئے ریگ زاروں میں کھڑا ہوں۔ تم تو مجھے تسلی دے گئی تھیں۔

مگر میرا دل نہیں مانتا۔ تمہارا گھرانہ بڑے اونچے آسمانوں کی طرف اڑنے کا عادی ہے۔

تم نے برا کیا گیتی! یہ میرا فائنل ایئر تھا۔ تمہارے اس مذاق نے میرا سکون درہم برہم کر دیا۔ مسعود نے بارہا کتاب بند کر کے سوچا تھا۔

باب ۳۱

گھر میں ایک طوفان سا اٹھ کر رہ گیا۔

اماں بیگم دو دن تک ششدر اور سناٹے کے عالم میں رہیں۔ بھلا اس گیتی کی مجال اور ہمت تو دیکھو۔ ان کی برہمی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

پھر ایک دم ہی سنبھل سی گئیں۔ ایک ایکسپریس خط صولت کے نام گیا اور ایک ایکسپریس خط صولت کے پاس سے ان کے پاس آیا اور ان کی برہمی میں تخفیف ہو گئی۔

انہوں نے گیتی کو اپنے کمرے میں بلایا۔ حقارت سے اس کی طرف دیکھا' لیکن نرم لہجے میں کہا۔ ''اب اس وقت اس کا کیا موقع ہے۔ ابھی تو تم کو اپنی پڑھائی کی فکر کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اپنے فیصلے پر ایک بار پھر غور کر کے بتانا۔''

''جلدی کرنے کو تو میں نے بھی نہیں کہا۔'' وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھائے بغیر بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

اماں بیگم اپنی خوبیٔ قسمت پر طنز سے مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش میں اس بات کی انتہائی کوشش کی تھی کہ وہ کوئی چھوٹی بات نہ کرنے پائے اور بلند نظر ہو لیکن ان کی اولاد کو پستیوں سے محبت ہے۔ وہ خدا جانے ذلت کے گڑھوں میں گرنے کی کوشش کیوں کرتی ہے۔

خیر اگر قضا و قدر ان سے مذاق پر آمادہ ہے تو وہ بھی اس کے آگے ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں۔ ان کو خدا نے دو بار فتح مند کیا تھا تو تیسری بار کیوں مایوس ہو جاتیں۔

اماں بیگم کا کھلا ہوا خط صولت کی سنگھار میز پر پڑا تھا جس میں انہوں نے گیتی کی حماقتوں کی تفصیل لکھ کر اس سے مشورہ اور مدد طلب کی تھی۔ اس نے اپنے خوبصورت بالوں کو مصنوعی لہریں ڈالنے کے لیے پنوں میں جکڑتے ہوئے سوچا۔

''اچھا! تو یہ گیتی بیگم بہت ہی زور پر آئی ہوئی ہیں ــــــــ خوب! یہ تاب اور یہ مجال کہ جن مسئلوں پر زبان کھولنے کی جرات بڑے بھیا کو ہوئی اور نہ میں نے بولنا مناسب سمجھا' وہ ان مسائل پر اماں بیگم سے بڑے فراٹے سے گفتگو کر رہی ہیں۔ ویسے وہ

بدتمیز تو خیر ہمیشہ کی ہیں۔"

اس نے آئینے میں اپنی کشادہ اور روشن پیشانی دیکھی اور پھر نظریں جھکا کر اپنے خوب صورت پپوٹوں کا معائنہ کیا جن کی رنگت قدرتی طور پر ہلکی سرمئی تھی اور جس کے باعث اس کو کبھی یہ ضرورت نہ پڑتی تھی کہ ان کو مصنوعی طور پر سرمئی کرے۔

"بھئی! اس گیتی کی حرکتیں اور خیالات تو بہت ہی چھوٹے تھے۔ بچپن ہی سے اس کی عادتیں ہم سے بہت مختلف رہی ہیں اور یہ ضرور ہے کہ اماں بیگم کی سختیوں نے اس کو اور اپنے خیالات میں راسخ کر دیا۔ ضدی بھی تو کم بخت سدا کی ہے اور پھر نہ صورت نہ شکل۔

اس کی نظروں میں اچانک ہی وہ زردی مائل رنگت' چپٹا چہرہ اور چینیوں کی سی آنکھیں گھوم گئیں اور وہ خود بخود مسکرا دی۔ ویسے بھی گیتی کے لیے کوئی زریں موقع نکلنا مشکل ہی تھا۔

"اور جو وہ میری مانے تو بس کان دبا کر چپ چاپ جو اماں بیگم کہیں' کر لے۔۔۔۔۔۔۔ برخوردار بھی کہلائے گی اور پھر یہ فائدہ بھی ہے کہ جس طرح چاہو زندگی گزارو۔ ارے ہاں' یہ اخلاقیات اور طرح طرح کے اصول اور بندشیں' یہ تو بس مجبور قسم کے لوگوں کے ذہن کی اختراعیں ہیں اور اب مجھے جو جنرل آصف جاہ کی بیگم ہوں' کیا تکلیف ہے۔"

وہ مسکرائی اور اس نے دیوار پر لگے ہوئے لیمپ شیڈ میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی ارغوانی روشنی میں آئینہ کی سطح پر ابھرتے ہوئے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ گلابی رنگ کے باریک شب خوابی کے گون میں سے چھلکتی ہوئی اس کی موتی کی سی شفاف رنگت میں سے وہسکی کا سا سنہرا پن پھوٹ رہا تھا۔ اس نے انگڑائی لی اور ایک بار پھر اس کی نظر اماں بیگم کے خط پر پڑی۔

"اونہہ! کیا مصیبت ہے۔۔۔۔۔۔ گیتی اور اس کے مرگھلے مسعود سے زیادہ کئی باتیں ضروری ہیں۔ اب یہ وقت ان پر غور کرنے کا تھوڑی ہے۔ ٹھیک ہے ان کا بھی ان کے وقت پر انتظام ہو جائے گا۔"

اس وقت تو اس کو اپنے آپ سے بہت قریب جو چیز محسوس ہو رہی تھی وہ کرنل سجاد کا وجود تھا جو اس وقت اپنے میس میں بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہوگا' یا پھر اپنی پسندیدہ ڈرنک کے جام پر سنجیدگی سے جھکا ہوا اس کے یعنی صولت آصف جاہ کے تصور میں کھویا ہوا ہوگا۔

آہ کرنل سجاد۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کا وہ مضبوط اور دلربا سراپا!

کیا واقعی وہ اس مرتبہ کرنل سجاد کی طرف خلوص دل سے متوجہ تھی۔ وہ اب تک خود فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ اس سے پہلے ایک مدت نواز کی دلکش شخصیت اس کے اعصاب پر طاری رہی اور وہ کتنے عرصے تک محض اس کو خوش کرنے اور اس کی نظر میں مستند بننے کے خیال

سے ہندوستانی کلاسیکل میوزک کی مداح بنی رہی اور کیسے حضورِ قلب سے وہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر ان راگوں اور ٹھاٹھوں کو سنا کرتی تھی جو مطلق اس کے پلے نہ پڑتے تھے۔ اس کے کانوں میں بکرے کٹتے رہتے۔ روح الجھا کرتی پر وہ ان تمام آزمائشوں سے بڑے صبر و تحمل سے گزرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اس لیے کہ اس دیوتا تک رسائی حاصل کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا جس کا نام نواز تھا۔ اور جو یا تو اپنی ٹھیٹ کاروباری گفتگو میں غرق رہتا اور جب اس سے فرصت پاتا تو اپنے آپ کو ہندوستانی کلاسیکل میوزک میں غرق کر دینے کی کوشش کرتا۔ وہ ہر تان اور ٹمک پر لوٹ لوٹ جاتا' تڑپ تڑپ اٹھتا اور کبھی کبھی ترنگ میں آ کر کلب کی لاؤنج کے کسی گوشے میں بیٹھا بیٹھا اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔ ''ہاں تو بیگم صولت آ۔۔۔۔۔۔'' اور وہ کبھی اس کے شوہر کا نام پورا نہ کرتا۔ ''تو میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ جو آساوری راگ ہے نا' وہ صبحدم کا راگ ہے۔ اس کے سر فضا کی لہروں سے متعلق ہیں۔ فطرت کی ماورائی قوتوں کی باگیں اسی راگ کے ہاتھوں میں ہیں۔ اور اس کی روح کنول کے پھولوں سے نمودار ہوتی ہیں۔ اس راگ کی دیوی کا لباس کیسری ہے اور اس کے رنگ میں بھبوت ملی ہوتی ہے۔''

اور یہ سب کچھ سنتے سنتے وہ ایک بڑی دبی ہوئی سی آہ بھرتی۔۔۔۔۔۔۔ اوہ!

''کیوں کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں'' وہ پراسرار لہجے میں کہتی۔ ''نواز! مجھے اسی آن یہ محسوس ہوا کہ بھیریں راگ کی یہ دیوی میری نگاہوں کے سامنے کھڑی ہے۔''

''مگر میں۔۔۔۔۔۔ میں تو بھیرویں کی بات نہیں کر رہا تھا۔'' وہ برا مان جاتا۔

''یہی تو مصیبت ہے نا' کہ تم یہ کہہ رہے ہو اور بھیرویں سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔'' وہ بڑی معصومیت سے اس کو یقین دلا دیتی اور اسی آن نواز کی خوبصورت آنکھیں ان آنکھوں کو اپنے میں جذب کر لینا چاہتیں جن کے حضور بھیرویں اور آساوری مجسم ہو کر آتی ہیں۔

وہ سرد آہ بھر کر سوچتا۔ ''ذہین عورت بھی ایک نعمت ہوتی ہے۔'' اور پھر وہ ایک دم جنرل آصف جاہ اور خود اپنی بیوی کی بدمذاقیوں کا خیال کر کے بے حد جذباتی ہو جاتا۔ پھر اپنی ترنگ اور بے خودی میں ان خیالات کا اظہار کرنے لگتا اور بیگم صولت آصف جاہ بڑی مجبور اور صابری شکل بنا کر یوں بیٹھ جاتی' گویا اس کو واقعی آصف جاہ کی بدمذاقی کا سخت غم ہو۔ حالانکہ اس کو ایک ہی تو اطمینان تھا کہ آصف بے حد ٹھونٹھ قسم کا اور سادہ مزاج انسان تھا۔ اس کا شوہر آصف جاہ' جنرل آصف جاہ کی شخصیت سے بہت مختلف انسان تھا۔

ہاں تو یہ گیتی کا قصہ بھگتانا بھی اپنی جگہ پر ایک ضروری کام تھا لیکن کرنل سجاد سے اپوائنٹمنٹ اس سے بھی زیادہ اہم بات تھی۔ اور

کل اس اپوائنٹمنٹ کے بعد ہی وہ کچھ فیصلہ کرسکتی تھی اور فی الحال اس وقت ساڑھے دس بجے رات کو جو سب سے اہم بات اس کو درپیش تھی وہ تھی خوابگاہ میں جا کر آصف جاہ سے لگاوٹ کی باتیں کرنا۔ مثلاً یہ کہ "میری جان! تم کیوں اپنے کو تھکا لیا کرتے ہو' میں کہتی ہوں آصف! تم کچھ وقت اپنے بیوی بچوں کو بھی دیا کرو۔ اب دیکھو نا' سیما تو کئی کئی دن اپنے باپ کی صورت کو ترستی ہے۔ کل ہی مجھ سے پوچھ رہی تھی' امی! ابو کیا مجھ سے خفا ہو گئے ہیں جو مجھے کبھی گود میں نہیں اٹھاتے؟ میں نے کہہ دیا' میری چاند! تمہارے ابو کے پاس سب کے لیے وقت ہے' نہیں ہے تو بس اپنے بیوی بچوں کے لیے۔"

یہ تمام اور اسی نوعیت کی بہت سی اور باتیں وہ کچھ اتنے مظلوم انداز میں اور ایک سانس میں کر جاتی کہ آصف جاہ کے تمام شکوے شکایت دل ہی میں رہ جاتے اور وہ اپنی بے اعتنائیوں کا خیال کر کے اس درجہ شرمسار ہوتا کہ اس پر غنودگی سی طاری ہو جاتی۔ اور پھر صولت اطمینان کی سانس لے کر گہری نیند سو جاتی۔

دھیرے دھیرے اس نے اماں بیگم کا خط تہہ کر کے دراز میں مقفل کیا اور کمرے کی بتی بجھا کر اپنی خواب گاہ کی طرف چل دی۔

باب ۳۲

امتحان کا نتیجہ نکلا اور وہ سیکنڈ کلاس لے کر پاس ہو گئی۔ جس میں اس کا کوئی کمال تھا ہی نہیں۔ سینئر کیمبرج سائڈ کی طالب علم اگر اچانک میٹرک کے امتحان کا ارادہ کرلے تو اس کا پاس ہو جانا تو ظاہر ہی ہے۔

اور یہ بھی گیتی کے مزاج کی ایک اور ناہمواری اور چھوٹا پن تھا۔ کہ پہلے تو اپنی قابل اعتراض حرکتوں کی بنا پر اسکول جانے سے روک لی گئی اور جب پرائیویٹ امتحان کی بات چلی تو وہ بڑی قناعت سے میٹرک کے امتحان پر راضی ہو گئی اور اماں بیگم کو اس کی ذات سے دیئے ہوئے منجملہ صدموں کے ایک صدمہ یہ بھی پہنچا کہ ان کی ساری اولاد نے سینئر کیمبرج کیا تھا اور یہ میٹرک کا امتحان بھی اسی بھاگوان کی قسمت میں تھا۔

وہ اپنی خلاف توقع کامیابی کے باوجود رنجیدہ اور متوحش تھی۔ مسعود نے اس کی کامیابی کا قطعی نوٹس نہیں لیا۔ دو حرف مبارکباد کے بھی نہ لکھے گئے۔ کئی دن تک اس کے دل میں خلش سی رہی۔

نہ طلعت کا خط آتا اور نہ اس کو اس تمام قصے کی خبر ہوتی۔ طلعت نے اس کو ایک طویل خط میں لکھا۔

"ایک دن ہم صبح ناشتہ کر رہے تھے کہ اچانک دیکھا' صولت آپا چلی آ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی بچی بھی تھی۔ دادی اماں تو

ان کی اچانک آمد سے ہول گئیں۔ بیٹا! خیریت تو ہے؟ بغیر اطلاع اچانک کیسے آگئیں؟ ان سے انہوں نے صرف یہ کہا کہ مجھے یہاں پر گاڑی بدلنا تھی تو میں نے سوچا کہ لاؤ چند گھنٹے یہاں ٹھیرتی جاؤں۔ لیکن وہ کسی فکر میں اور سخت ناراض سی آرہی تھیں۔ کھانے کے بعد دوپہر کو وہ ہماری طرف آئیں اور امی جان سے کچھ دیر چپکے چپکے باتیں کیں۔ جس کے جواب میں انہوں نے زور سے کہا' نہیں بیٹا! تم کو جو کچھ کہنا سننا ہو اپنے آپ کہہ کر جاؤ۔ اول تو میں اس بیچ میں پڑنا نہیں چاہتی' دوسرے یہ کہ میری بات کا کوئی یقین کب کرے گا' یہی ہوگا کہ بیٹھی بیٹھی یہ خوب باتیں کرتی ہیں۔''

چنانچہ سہ پہر کو وہ اماں کو اور مجھے لے کر مسعود بھائی کے گھر گئیں اور وہاں جا کر انہوں نے جو سین پیش کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ انہوں نے ہاشمی پھپھو کی بے انتہا توہین کی۔ بڑے سخت کلمات کہے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ بڑے گھروں کی لڑکیوں کو پھانس کر لڑکوں کے مقدر نہیں بنائے جاتے ہیں۔ اور جب انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ پھر اپنے صاحبزادے کو سمجھایئے۔

ہاشمی پھپھو کو سخت ناگوار معلوم ہوا اور انہوں نے کہا۔''میں اس بے غیرت کی ذمہ دار ہوں اور نہ اس قسم کی کوئی ذمہ داری لے سکتی ہوں' جس کا دل چاہے خود سمجھائے۔''

تو صولت آپا اٹھ کر مسعود بھائی کے کمرے میں گئیں اور ان کو اتنے ذلیل لفظ کہے کہ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

پھر وہ وہیں سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ہاشمی پھپھو نے مسعود بھائی کو بے شمار صلواتیں سنائیں اور کہا مجھے تمہاری ذات سے ذلت کی نہیں عزت کی توقع تھی' آج تم نے مجھے بری طرح ذلیل کروایا ہے اور مسعود اگر تو غیرت دار ہے تو کبھی اس راستے پر بھی نہ چلیو جس پر ان لوگوں کا سایہ بھی نظر آئے۔ وہ ایک لفظ بولے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

''بھئی گیتی! برا نہ مانو تو میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس میں سراسر تمہارا قصور ہے۔ تم کو اس قسم کا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر نہیں' تم لوگ جانے کیوں اپنے کم حیثیت رشتے داروں کی زندگیوں سے کھیل کر خوش ہوتے ہو۔ مجھے تو سچ کہتی ہوں کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ تم پر غصہ ہے کہ تم نے اس قسم کی بات کی ہی کیوں؟ میں تو یہ سب لکھتی بھی نہ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے گھر بھر میں سب سے مختلف ہو۔ اس لیے بطور اطلاع تم کو لکھ رہی ہوں کہ اگر تم کو مسعود یا ان کی اماں سے ذرا بھی ہمدردی ہوگی تو اب ایسی کوئی بات نہ کرو گی جس سے ان لوگوں کی خودداری کو ٹھیس پہنچے اور تمہاری وجہ سے ان کو رنج پہنچے۔ ویسے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم سے خفا ہوں۔ میں اب بھی تمہاری اپنی طلعت ہوں۔''

طلعت کا خط اس کے سامنے میز پر پڑا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ گرا تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ نفرت اور غصے کی ایک آگ ہیجو اس کے سارے وجود کو جھلس رہی ہے۔ اس کی روئیں روئیں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں اور اس کا سر چکرا رہا تھا۔

اور پھر نہ جانے کب اور کس وقت وہ اٹھی اور اس کے قدم مالی کی کوٹھری کی طرف بڑھنے لگے۔ چھوٹی بٹیا کا اس طرف آنا نئی بات نہ تھی۔ اس نے بچپن سے لے کر اب تک یہ عادت نہ چھوڑی تھی کہ منہ اٹھایا اور کسی بھی نوکر کے کوارٹر میں گھس گئی۔ وہ ان کی چار پائیوں پر بیٹھتی' ان سے باتیں کرتی' ان کے دیئے ہوئے پان کھاتی اور ان کے بچوں سے کھیلتی۔ مگر اب ایک سال کے قریب ہونے آیا تھا وہ اس طرف نہ گئی تھی۔ اس کو اجازت ہی نہ ملی تھی' لیپی پوتی کوٹھریا کے آگے بانس اور پھوس کے ٹٹروں سے گھیر کر بنائے ہوئے ننھے سے آنگن میں کھاٹ پر بیٹھی مالن بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور دس بارہ سال کی سب سے بڑی لڑکی چوکے میں بیٹھی ترکاری چھونک رہی تھی۔

اس کو دیکھ کر مالن نے بچہ لٹا دیا' آنچل درست کیا اور بولی۔ ''ارے آج تو ہماری بٹیا آگئی۔۔۔۔۔۔۔اے بسنتی! ذرا نئے بان کا کھٹولا تو لا کر ڈال دے بٹیا کے لیے۔''

''کیا کہہ رہی ہو بہو!''

گیتی پرانے ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''کتنی پیاری سی جھونپڑیا ہے۔'' اس نے پھوس کی ٹٹی پر پھیلی ہوئی کدو کی بیل کے زرد زرد پھولوں کو دیکھ کر سوچا۔

''کیا بنا رہی ہو بسنتی؟'' گیتی نے میتھی کے بگھار کی فضا میں بکھری ہوئی خوشبو کو اپنے چوڑے چوڑے نتھنوں میں سمیٹ کر پوچھا۔

''آلو ساگ چھونکا ہے' کھاؤ گی بٹیا؟'' مالن کو اس کی عادت معلوم تھی۔

''نہیں رہنے دو' کہاں تم تکلیف کرو گی۔''

''نہیں بٹیا! لو ابھی میں پھلکا ڈالے دیتی ہوں۔'' مالن کی آواز میں مٹھاس تھی اور محبت کی گرمی۔

آڑ میں کھڑے ہو کر مالن نے دو گڑوی پانی چھل چھل کر کے ڈالا اور گیلے بدن پر دھوتی لپیٹ کر چوکے میں جا بیٹھی۔

بسنتی دوڑ کر کیلے کا نیا سا نرم نرم پتہ دھو کر لے آئی۔

گرم گرم پھلکا اتار کر مالن نے چھینکے پر سے چھوٹی سی کالی مٹی کی ہنڈیا اتاری۔ دیہات کا اصلی گھی لگایا اور اس کے لیے پتا سجا دیا۔ اچار کی پھانک' آلو ساگ اور املی کا نپا۔

گیتی نے بڑے شوق سے اور ٹوٹ کر مدت کے بعد مالن کے ہاتھ کا گرم گرم پھلکا کھایا اور اٹھ کر ہینڈ پمپ کے پاس جا بیٹھی۔ بسنتی نے پمپ چلایا۔ نئی دی ہوئی گریس کی ہلکی ہلکی بو میں بسے ہوئے ٹھنڈے پانی سے پر تسکین گھونٹ اس کے حلق میں اتر گئے۔ اسی ٹھنڈے پانی سے اس نے اپنا منہ دھویا اور اس کے دل کا سارا غبار چھٹ گیا۔ اس کے وجود کے اندر بھڑکتے ہوئے وہ شعلے سرد پڑ گئے۔ وہ پلنگ پر جا بیٹھی۔

''پان دے ری بٹیا کو۔'' مالن نے بسنتی پر حکم چلایا اور بسنتی نے جھٹ پیتل کی پٹاری کھولی۔

''اے بسنتی! ہمارے پان میں ٹھنڈک ضرور ڈالنا۔''

اور بسنتی پان لے کر آئی تو اس نے اس کو پاس ہی بٹھا لیا۔

''بسنتی! تم املی کا نپا کیسے بناتی ہو؟ میں نے کتنی دفعہ خانساماں سے پوچھا مگر وہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔''

''اے لو! املی کا نپا بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ املی کے کتارے بھگو کر پانی میں مل لیتے ہیں۔ پھر نمک مرچ اور شکر ملا کر باریک باریک پودینہ کتر کر ڈال دیتے ہیں۔''

پان میں پڑے ہوئے پیپر منٹ کی ٹھنڈک سے اس کا منہ سن ہو رہا تھا۔

اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ آنگن کے کونے میں رسی کی الگنی پر دھوتیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اینٹوں اور گارے سے بنائے ہوئے چبوترے پر گھڑے' پیتل کی بالٹی اور جھم جھماتی ہوئی گڑویاں قرینے سے رکھی تھیں۔ اور ان سب چیزوں میں کتنا سکون اور آہنگ تھا۔

گیتی سوچتی رہی' چاہے خانساماں کا گھر ہو چاہے مالی کا' ان گھروں میں زندگی بڑی سہل اور سادہ ہے۔ وہ کچی نیند اسی آنکھوں سے کچنال کے گھنے اور اونچے درخت کے سائے اور ٹٹروں پر پھیلی ہوئی لوکی کدو کی بیلوں کو تکتی رہی۔ ان سب چیزوں میں کتنی آسودگی اور راحت ہے۔ وہ ان دکھوں سے بھی خوب واقف تھی جو اس زندگی کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لیکن پھر بھی یہاں کبر و پندار کی نحوست نہ تھی۔ وہ بے چین سی فضا نہ تھی جو شائستہ قسم کی سرد اعصابی جنگ کے باعث طاری ہو جاتی۔ اس فضا میں سانس لینے والے جھائیں جھائیں لڑ کر دلوں کا غبار نکال لیتے ہیں۔ یہ فضا خاموش تھی اور لوریاں سی دیتی معلوم ہو رہی تھی۔ ہار سنگھار کے پیڑ تلے کورے بان کے کھٹولے پر بلا ارادہ ہی پیر پھیلا کر وہ سو گئی۔

آدھی دھوتی باندھے اور آدھی دھوتی اوڑھے جنیئو پہنے مالی اندر داخل ہوا اور اس کو یوں سوئے دیکھ کر بڑے پیار سے سوچا۔

''یہ تو سادھو مہنت بٹیا ہے! اس کے شریر میں تو جیسے گوتم مہاتما کی بے چین آتما براجتی ہے' جیسے محلوں اور داسیوں سے بیزار سدھارتھ اسی چنیا جیسی بٹیا کے شریر میں آبسا ہو۔''

ہوا کے ہر جھونکے پر لرزتی ہوئی ٹہنیوں سے ہارسنگھار کے زعفرانی ڈنڈیوں والے سفید پھول چپکے چپکے اس پر برستے رہے اور اس کے سوئے ہوئے وجود کے اندر طمانیت اور تسکین کے سوتے پھوٹتے رہے۔

اس نے نہ کھانا چھوڑا اور نہ آنسو بہائے نہ وہ منہ پھلا کر سں اور روٹھ کر بیٹھی۔ جب وہ سہ پہر بھر سو کر اندر واپس گئی تو بھی اماں بیگم نے اس سے کوئی باز پرس نہ کی۔ میز پر بے احتیاطی سے کھلا پڑا ہوا خط وہ دیکھ چکی تھی۔ اب ان کا مطلب پورا ہو چکا تھا اور وہ اس کو مزید چھیڑنا نہ چاہتی تھی۔

وہ ہفتہ گیتی نے بڑے سکون اور خاموشی سے گزارا اور پھر ایک دوپہر کو وہ اپنے باپ کے کمرے میں پہنچ گئی۔

''ابا میاں! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

وہ چونکے' اس گھر کی ریت کے مطابق ان سے کچھ کہنے سننے کی بات نرالی تھی۔ بچوں کا براہ راست ان سے کبھی تعلق رہا ہی نہ تھا۔

''ہاں بیٹی!'' انہوں نے ضروری کاغذات کی فائل پر سے سر اٹھایا۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے اپنے داخلے کے متعلق طے کرنا ہے' اب کالجوں کے داخلے شروع ہونے والے ہیں۔''

''ہاں' بڑی خوشی کی بات ہے' تم اپنی اماں سے بات کر لو۔'' انہوں نے دوبارہ کاغذات اپنے آگے سرکا کر اس کو اسی خشکی سے ٹالا جس طرح وہ دفتر میں آنے والے سائلوں کو افسر متعلقہ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

''نہیں' یہ نہیں ہو گا اس معاملے میں میں صرف آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے دھیرے سے فیصلہ کن آواز میں کہا۔

اس کا لہجہ اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ چونک سے گئے۔ کاغذات کی فائل انہوں نے ایک طرف سرکائی۔ آنکھوں پر سے عینک اتار کر کیس میں بند کی اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا بات ہے بیٹے؟''

''ابا میاں! میں یہاں داخلہ نہیں لوں گی' آپ مجھے لاہور بھیج دیجئے۔''

''کیوں؟'' وہ ایک دم چونک پڑے اور سوچنے لگے۔ آخر یہ بیٹھے بٹھائے اس کو کیا سوجھی کہ پورا ایک صوبہ پھلانگ کر لاہور جائے' کس

لیے۔صرف فرسٹ ائیر میں پڑھنے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔چہ خوش! اگر وہ اس درجہ سنجیدہ نظر نہ آ رہی ہوتی تو وہ یقیناً ہنس پڑتے۔

''تمہیں لاہور کا خیال کیسے آ گیا؟''

''بس ایسے ہی آ گیا۔'' اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''ایک بالکل اجنبی اور دور دراز شہر میں جا کر پڑھنے کی کیا تک ہے؟ لاؤ میں تمہاری دادی اماں کے پاس بھیج دوں۔تم جس کالج میں چاہو نام لکھوا لینا اور پھر سہولت سے ہوسٹل چلی جانا۔''

''نہیں' وہاں تو میں اب کبھی جاؤں گی ہی نہیں۔''

''کیوں کیا کچھ دادی اماں سے جھگڑا ہو گیا تھا؟ بیٹے! یہ تو بری بات ہے۔وہ بوڑھی اور ضعیف ہیں۔اگر کسی بات پر اعتراض کر بھی دیتی ہیں تو تم کو یہ سوچنا چاہیے کہ ان کا وقت گزر چکا ہے وہ تمہاری ہم خیال نہیں بن سکتیں اور ان کی زندگی کے اب دن ہی کتنے باقی ہیں جو ہم یا تم ان سے ناراض ہونے بیٹھ جائیں۔''

''میں اور دادی اماں سے ناراض ہوں؟ یہ کبھی ہو سکتا ہے' ابا میاں! آپ کو نہیں معلوم کہ وہ مجھے کتنا پیار کرتی ہیں۔مجھے ان کے پاس اتنا سکون ملتا تھا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ ان کے پاس سے کبھی نہ آؤں۔'' اس کی آواز بھر آگئی اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

''پھر ضرور طلعت سے تمہارا جھگڑا ہو گیا ہے' مگر بیٹا! وہ بھی تو تمہاری بہن ہے۔میرا تو کتنا دل چاہتا ہے کہ کاش میں اس کو اپنے پاس ہی رکھ سکتا' مگر خیر۔۔۔۔۔۔۔خیر۔۔۔۔۔۔۔''

وہ اس کے سامنے ان باتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے تھے جو اس کو یہ احساس دلا سکیں کہ اس کے ماں اور باپ کے درمیان کچھ اختلافات بھی موجود ہیں۔

''والدین کے اختلاف کا اثر بچوں کے ذہنوں پر بہت برا پڑتا ہے۔'' یہ ان کا قول تھا۔

اور وہ بھی ان کے روبرو اپنی ماں کی شکایت نہ کرنا چاہتی تھی۔اس لیے کہ اماں بیگم سے اصولی طور پر اختلاف ہونے کے باوجود اس کو احساس تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہیں اپنی ممتا کے تقاضے پر سے مجبور ہو کر۔۔۔۔۔۔۔اور سچ پوچھو تو اس کے دل میں اصل کدورت صولت آپا کی طرف سے آئی ہوئی تھی۔

''طلعت سے میری کوئی لڑائی نہیں ابا میاں! لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی سبب نہ ہونے کے باوجود ان کا کرنا ہمیں پسند

نہیں ہوتا۔"

انہوں نے غور سے اپنی اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کے ساتھ ہی پیدا ہونے والی دوسری بیٹی یعنی ارجمند اس سے عمر اور تجربے میں کہیں زیادہ چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس وقت بہت سنجیدہ اور بہت بڑی عمر کی نظر آ رہی تھی۔ اس کے تیور اس کے ارادے کی پختگی کی غمازی کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی اس بیٹی کے ساتھ اس گھر میں کبھی انصاف نہیں کیا گیا۔

"اچھا بیٹی! تو پھر یوں کرتے ہیں کہ تم کو لاہور کے کینیرڈ کالج میں داخلہ دلوا دیتے ہیں۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔"

وہ ان کی طرف چپ چاپ غور سے دیکھتی رہی۔ دراز قد خوب صورت مغلیہ خدوخال' شاندار مونچھیں اور بالوں کی سیاہی میں کروٹیں لیتی ہوئی بڑی پروقار سفیدی اپنی وجاہت اور آن بان کے باوجود بھی وہ محض "ابا" ہی نظر آ رہے تھے۔

"باپ بھی کتنی پیاری چیز ہوتی ہے۔" اس نے پیار بھری انکھیوں سے ان کو دیکھ کر سوچا۔

"اگر تم کو ہوسٹل میں رہنے کا شوق ہے تو میں ضرور بھیجوں گا۔" وہ مطمئن ہو کر وہاں سے چلی گئی۔

"یہ پہلی مرتبہ ہے جو میں بیگم اور ان کی اولاد کے بیچ میں دخل دے رہا ہوں۔" انہوں نے سوچا۔ "لیکن مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ گیتی کے معاملات سے مجھے دلچسپی لینا پڑے گی۔ اگر وہ ہمارے دوسرے بچوں سے مختلف اور ناقابل فہم ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے یا پھر اس سے باقاعدہ مبارزت مول لی جائے۔"

انہوں نے کاغذات کی فائل اپنے نزدیک کرتے ہوئے بڑے سکون سے سوچا۔ "گیتی! میری بیٹی! اگر تو اپنی ماں کے لیے ناقابل فہم ہے تو کوئی بات نہیں' تیرا باپ تجھے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔"

◆◆◆

فصل چہارم

باب ۳۳

اس نے الماری کے پٹ کھولے اور الٹ پلٹ پڑی ہوئی چیزوں کو قرینے سے رکھنے لگی۔ پھر اس نے الماری یوں ہی کھلی چھوڑ دی اور پلنگ پر جا بیٹھی۔ اس کمرے میں دو کے بجائے اب ایک ہی پلنگ تھا اور ایک ہی الماری تھی اور میز پر صرف ایک ہی لڑکی کی کتابیں اور سامان تھا۔

اس نے مغربی دریچے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ افق پر کالی کالی بدلیاں جمع ہو رہی تھیں۔ کوندا لپک رہا تھا اور کوئل کوک رہی تھی۔ پروائی کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور ارجمند نے جھرجھری سی لی۔ اس کو گئے پورا سال ہونے کو آیا تھا۔

”تم مجھ سے یوں جدا ہو جاؤ گی گیتی! میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ تم چلی گئیں اور زندگانی بالکل سونی ہو گئی۔ تم اپنے اول جلول پن سے کمرہ الٹ دیا کرتی تھیں اور بڑی ہماہمی سے میری ہر ایک چیز استعمال کر لیا کرتی تھیں تو میں تم سے لڑا کرتی تھی۔ لیکن اب تو دل بری طرح چاہتا ہے کہ تم سارا کمرہ الٹ دو۔ غسل خانے میں بے ترتیبی سے کپڑے پھیلا جاؤ اور وقت پر مجھے پنسل ملے اور نہ قلم۔ پہلے تم مجھے اپنی عادتوں کی وجہ سے ہر دم بے سکون رکھتی تھی۔ لیکن گیتی! میں نے اس سکون کی کب خواہش کی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم گھر بھر سے روٹھ کر یہاں سے گئی ہو۔ تم نے اپنے خط میں بھی یہی لکھا ہے کہ اماں بیگم اور صولت آپا نے مجھے جو دکھ دیا ہے اس کو میں کبھی معاف نہ کروں گی۔ انہوں نے اپنے حقوق کو ان کی جائز حدوں سے بڑھ کر استعمال کر لیا اور خوش ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے میرا جتنا بڑا نقصان کیا ہے اس کی تلافی اب کسی بات سے نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے ارجمند کہ تم میری جگہ ہوتیں تو اس بات کو خاموشی سے برداشت کرتیں اور شاید میں بھی یہی کرنے کی کوشش کرتی اگر انہوں نے میری وجہ سے مسعود کی توہین نہ کی ہوتی۔ میری حماقتوں کی بنا پر وہ کسی دوسرے کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا کیا حق رکھتی تھیں۔ انہوں نے جو غلطی کی ہے اس کا احساس دلانا میرا فرض ہے اور یہ میری مرضی ہے کہ میں انہیں یعنی صولت آپا کو معاف کروں یا نہ کروں۔ وقت ہر چیز اور بات کی تلافی خود بخود

کر دیتا ہے۔ ممکن ہے میں کبھی یہ بھول جاؤں کہ انہوں نے کبھی میرا قصور کیا تھا لیکن ارجمند' تم مجھے سمجھانے اور اپنے خطوں میں ان کی طرف سے صفائیاں پیش کرنے کی کوشش کروگی تو معاملہ الجھ جائے گا اور تم سے زیادہ شاید کوئی نہیں جانتا کہ میں بہت ضدی ہوں۔''

گیتی کے کئی دن پرانے خط کا مضمون لفظ بہ لفظ اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا اور وہ پھر سوچنے لگی۔

''ٹھیک ہے گیتی! یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ تم بہت ضدی اور مخلص ہو۔ میں نے تو تم کو ہمیشہ اپنے آپ سے بہت برتر سمجھا ہے اور میں تم سے ہمیشہ مرعوب رہی ہوں' اتنا کہ تمہاری تقلید کی ہمت بھی اپنے آپ میں نہ پاتی تھی۔ مگر یہ بتاؤ کہ میں کس خطا کی پاداش میں یہ سزا بھگتوں؟ تم کو کیا معلوم کہ تم سے جدا ہو کر میری شخصیت کی کس درجہ نفی ہو گئی ہے۔

ہاں گیتی' کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔۔۔۔۔۔۔ ابا اپنے کام میں لگے رہتے ہیں' اماں بیگم کو اپنے گھر بار کے ہزاروں دھندے ہیں۔ صولت آپا اپنے گھر اور بختیار بھیا ہوسٹل میں۔ اور بڑے بھیا کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ایک میں ہوں جس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مسلم وجود کو کسی نے چیر کر دو کر دیا ہے۔''

ارجمند نے اپنی فرشتوں کی سی آنکھیں جھپکائیں اور خاموش آنسو پھسل پھسل کر اس کے رومال میں جذب ہونے لگے۔ اس نے بے شمار سسکیاں لیں اور بے شمار کو اندر ہی اندر گھونٹ لیا۔ اس لیے کہ اماں بیگم کو اس کا اس طرح مظلومیت سے گھٹ گھٹ کر رونا قطعی پسند نہ تھا۔ اس نے آنسو خشک کیے اور اٹھ کر پھر الماری درست کرنا شروع کی۔ نون کھرے اور ضدی آنسوؤں کی ایک تازہ رو پھسلی اور پھسلتی چلی گئی۔ اپنی سسکیوں اور آواز کو گھونٹنے کے لیے اس نے کلائی کا گوشت دانتوں میں دبا لیا۔

اور ٹھیک وہی وقت تھا اور وہی اتوار کا دن جب اس کا دل اپنی ڈارمیٹری میں بری طرح گھبرانے لگا تھا۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں مگن تھیں۔ عطیہ رکارڈ بجا رہی تھی اور پھول بال کھولے کندھے پر تولیہ ڈالے نہانے کو تیار' کھڑے کھڑے گراموفون کی بجتی ہوئی گت پر منی پوری رقص کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔

وہ خود سیدھی سیدھی پلنگ پر دراز تھی۔ اور روتھ اس کو کوک رہی تھی۔ بھئی چائنا مین! کیوں اس طرح پڑی ہو تم؟ اٹھ جاؤ نا۔''

''ہاں بھئی' کیوں نیستی پھیلا رہی ہو؟'' عطیہ نے رکارڈ بدلا اور سب لڑکیاں اس کے ساتھ جھوم جھوم کر آوازیں ملانے لگیں۔

گیتی کا دل اس وقت بے طرح اداس تھا۔ وہ ایک جست مار کر اٹھی اور تیز بادامی رنگ کے شب خوابی کے لباس پر بڑے بڑے پھولوں والا ڈریسنگ گاؤن پہنتی ہوئی ڈرامیٹری سے باہر نکل گئی۔ کوری ڈور ویران تھا اور سائیں سائیں ہوا چل رہی تھی۔ کامن روم سے ریڈیو پر سمفنی آرکسٹرا کی۔۔۔۔۔۔ اور لڑکیوں کے ملے جلے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میوزک سیکشن کی طرف سے پیانو

کی گنتیں سنائی دے رہی تھیں۔جگہ جگہ یوکلپٹس کے اونچے اونچے درختوں کے سائے میں بنچوں پر بیٹھی ہوئی فورتھ ایئر کی لڑکیاں جھوم جھوم کر پڑھائی میں غرق تھیں۔

وہ پھر کوریڈور میں واپس آ گئی اور اس کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے سوچا' اللہ! ارجمند آخر میں تمہیں کہاں بیٹھ کر یاد کروں۔دیکھ رہی ہو اتی مجال نہیں کہ بھئی کوئی کسی کو یاد کرے۔ہاں سچ' سوائے مسعود کے خیال کے' کہ وہ میری جان سے آسیب کی طرح چمٹ کر رہ گیا ہے کسی کو یاد کرنے کی مہلت ہی نہیں' سچ کہتی ہوں' ذرا جو تنہائی اور مہلت ہو' ہوسٹل لائف میں ۔۔۔۔۔۔خیر ارجمند' اولڈ گرل! پھر سہی۔۔۔۔۔۔۔دیکھو' یہ چاند راتیں ختم ہو جائیں اور اودھم کم ہو تو کسی رات کو چپکی لیٹ کر تمہیں خوب یاد کروں گی' پر اس وقت میرا دل جو چاہ رہا ہے' سچ بھئی' بہت دل گھبرا رہا ہے۔دل چاہتا ہے اپنا گھر ہوتا اور۔۔۔۔۔۔۔تم سمجھتی ہو کہ مجھے اپنا گھر نہیں یاد آتا۔خیر اب تم یہ سب باتیں کیا سمجھو گی۔۔۔۔۔۔''

گیتی کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے قصداً گھر کے خیال کو ایک پٹخنی دی اور کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو گئی اور ڈارمیٹری میں آ گئی۔ اس نے پلنگ پر پھیلی ہوئی زرد چار خانے کی ساری کھینچی اور وہیں کھڑے کھڑے کپڑے بدلنے پر آمادہ ہو گئی اور عطیہ چیخی۔''کم بخت! آج پھر بیچ محفل میں کپڑے بدل رہی ہو؟''

''تو تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔''

''میں اپنی آنکھیں بند کر لوں۔۔۔۔۔۔مگر تم یہیں بدلو گی کپڑے؟''

''تو اور پھر کیا ہو سکتا ہے' پھول غسل خانہ دبائے بیٹھی ہے اور عقلیہ نے ڈریسنگ روم کا قبالہ لکھوا رکھا ہے' ہمیں باہر جانا ہے بھئی' ہم سے انتظار نہیں ہوتا۔''

''جاؤ جہنم میں' کم بخت بے شرم''

ایک دم عطیہ کا لہجہ بدلا۔''گیتی کہاں جا رہی ہو؟''

''جاتی کہاں' چاچی ہی کا نام ہے میری وزٹنگ لسٹ پر' وہیں جاؤں گی اور ذرا پکچر دیکھیں گے۔''

''کون سی پکچر؟''

''جون سی مل جائے گی۔''

''ارے کم بخت اکیلی جائے گی؟''

''تو اور کیا تم کو لے جاؤں' کم بخت کا وظیفہ سننے کو۔''

''بڑی تو مجھے لے جانے والی' میں خود ہی نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے نوٹس بنانا ہیں۔''

''تو لکھو۔''

وہ تیار ہو کر باہر نکل گئی۔ اسٹور میں سے اپنی سائیکل نکلوائی اور چاچاجی کے گھر کی طرف چل پڑی۔

باب ۳۴

میسن روڈ کی اس تنگ سی خاموش اور ہری بھری سڑک پر وہ پہلے اپنے ابامیاں کے ساتھ آئی تھی' جب وہ اس کا داخلہ کروانے کے بعد اس کو چاچاجی سے ملانے لائے تھے۔ اس کی ملاقاتی لسٹ پر صرف انہی کا نام تھا۔

''اور یہ چاچی اور چاچاجی! بس بہت ٹھیک ہیں۔'' اس نے سوچا تھا۔

چاچا یہیں کہیں کے رہنے والے تھے' مگر انہوں نے اور ابامیاں نے سکول میں ساتھ ساتھ پڑھا تھا اور ان کا بچپن ابامیاں کے وطن ہی میں گزرا تھا۔ عربی' فارسی اور بنگالی کے عالم تھے۔ انگریزی پر بھی عبور تھا۔ محکمہ تعلیم کے کسی شعبے میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے میسن روڈ پر ایک بنگالی عیسائی کی شراکت میں ایک مختصر سے بنگلے کا آدھا حصہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ نورالہدیٰ کے سوا ان کی کوئی اولاد نہ تھی اور اس کو بھی انہوں نے علی گڑھ بھیج رکھا تھا۔ اب تو وہ فرصت کے اوقات میں اپنے چھوٹے سے باغیچے میں مصروف رہتے تھے۔

چاچی گیتی کو بہت پسند تھیں۔ دراز قد' صاف رنگت' دبلی پتلی اور بڑی بڑی آنکھوں والی۔ گھر پر تو صرف وہ اور چاچاجی رہا کرتے تھے۔ نورالہدیٰ کو تو اس نے اب تک دیکھا ہی نہ تھا۔

چاچی گیتی کو کیوں پسند تھیں؟ یہ وہ خود نہیں بتا سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ تو اپنے مراق میں مبتلا رہتی تھیں۔ دن رات ہر ہر چیز کو پاک کیا کرتیں۔ دھنیا مرچ تک دھو ڈالتیں۔ نوکر کی جان بھی غضب میں رکھتیں۔ چیزیں پاک کر کر کے اور ہاتھ دھو دھو کر وہ خود بھی مراقی سا ہو چلا تھا۔ اور جب چیزوں کو دھونے' پاک کرنے سے فرصت ملتی تو وہ اپنے مفروضہ امراض کی فکر میں گھلنا شروع کر دیتیں یا پھر جاء نماز پر بیٹھی کلام پاک کی تلاوت کیا کرتیں۔

صاف ستھرا' کم فرنیچر والا' بے تکلف سا گھر تھا اور دنیا جہان سے بے تعلق چاچا اور چاچی۔ اور اسی لیے یہ گھر گیتی کے لیے بہت موزوں تھا۔ چاچا نے دیکھا اور ہنس دیئے۔ ''کیہ حال اے کڑیئے!''

وہ اس کا حال چال از راہ مذاق ہمیشہ پنجابی ہی میں پوچھتے تھے۔ وہ ان کو جھک کر آداب کرتی اور وہ سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے کاموں میں لگ جاتے۔

اور چاچی کا یہ تھا کہ دیکھتے ہی فوراً کہتیں۔

''بڑی کمزور ہو رہی ہو تو تو۔۔۔۔۔۔ اپنا دھیان رکھا کرنا لڑکی!''

اور فوراً عظمت کو آواز دیتیں۔ ''نی عظمتے! دودھ لا بی کے لیے۔'' اور کبھی دودھ کے بجائے گلاس بھر لسی منگا کر ہاتھ میں تھما دیتیں اور پھر اس سے پوچھتیں۔ ''کیا کھائے گی؟'' اور پھر اپنی دھلائی منجھائی میں غرق ہو جاتیں۔

اب چاہے گیتی کھرے پلنگ پر پڑی سویا کرے یا چٹائی پر لیٹی کوئی کتاب پڑھتی رہے' اس کو کوئی نہ چھیڑتا۔

جب چاہے وہ اپنی سائیکل اٹھا کر شاپنگ کو چلی جائے یا سینما دیکھ آئے۔ چاچی کو پوچھنے اور ٹوکنے کی فرصت ہی نہ تھی اور گیتی کبھی کبھی سوچا کرتی' اگر چاچی اپنے مراق میں اس درجے مبتلا نہ ہوتیں تو ان کا گھر کبھی اتنا پر سکون نہ ہوتا۔ ان کو بھی تیرے میرے قصوں سے فرصت نہ ملا کرتی اور یہ بھی بڑی مین میکھ نکالنے والی عورت ہوتیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوشمند ہونے سے تو اچھا ہے کہ انسان تھوڑا سا جگہ سے کھسکا ہوا ہو۔

سائیکل اس نے برآمدے سے لگا کر کھڑی کی اور اندر چلی گئی۔

''آداب' چاچی!''

چاچی نے گیہوں چنتے چنتے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ''بڑی عمر' نیک نصیب' آج تو بڑی دیر سے پہنچی ہو۔ میں تو سمجھی تھی آج تمہارا آنے کا خیال ہی نہیں۔''

''جی چاچی! بس آج کچھ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی' سستی سی آ رہی تھی۔''

خوشی اور تسکین کی ایک لہر چاچی کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔

''خیر ہے' لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو' نبض تو دیکھوں۔''

''نہیں' میں بالکل ٹھیک ہوں اب' چاچی میں دیر سے آئی ہوں' آپ کو وقت تو نہ ہوگی؟''

''خدا کا نام لے بیٹی' کیا آدمی گھر میں ناپ تول کر پکاتا ہے؟''

اور جب عظمت نے برآمدے میں چٹائی پر دستر خوان لگایا تو گیتی نے محسوس کیا کہ کھانا نہ صرف زیادہ اور بہت بہت ہے بلکہ پر تکلف بھی ہے اور جب وہ سب دستر خوان پر بیٹھ گئے تو عظمت نے اونچی سی آواز میں پکارا۔

''باؤجی! روٹی کھالو۔''

وہ چونکی۔ چاچا جی تو پہلے ہی سامنے کھڑے تھے۔ مگر کونے والے کمرے سے کھونٹی دار کھڑاویں کھٹکھٹاتا اور تولیے سے سر پوچھتا کوئی اور بھی نکلا۔ اور سلام دعا کئے بغیر چٹائی کے ایک کونے پر بیٹھ کر اس کو غور سے دیکھنے کے بعد اپنی ماں سے دھیرے دھیرے کچھ کہنے لگا۔

''یقیناً یہ میرے متعلق کچھ کہہ رہا ہے۔'' گیتی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

بہت اونچا قد' سیاہ چمکدار بالوں کا ڈھیر سر پر اور چہرے پر عجب خشکی اور بدماغی کا اثر۔

چاچی نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر ان کے سامنے پلیٹیں کھسکانا شروع کر دیں۔

''گیتی بچے! یہ نورالہدیٰ ہے۔'' چاچا جی نے بڑے فخر سے بتایا۔

''نورالہدیٰ ہے تو کیا کارنامہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ اتنا تو بدماغ لگ رہا ہے۔'' وہ سوچتی رہی۔

نورالہدیٰ اس سے بہت بڑا تھا۔ اس نے اس چینیوں کا سا رنگ روپ رکھنے والی لڑکی کی قطعی پرواہ نہ کی۔ مزے سے کھاتا اور لسی کے گلاس پر گلاس چڑھاتا رہا۔

چاچی کا کہنا تھا کہ وہ کچھ بیمار ہے اور دو ہفتے کی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ ویسے تو اچھا بھلا لگ رہا تھا۔

ڈھائی بجے تک وہ پڑی سوتی رہی اور پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر سائیکل اٹھا کر جانے کو تیار ہوگئی۔

چاچی اس کے لیے فرض کر کے چائے نہیں بنواتی تھیں کہ خود چاچا بھی چائے پیتے تھے۔ البتہ وہ چائے پر اس کے لیے کوئی نہ کوئی اچھی اور چٹ پٹی چیز ضرور بنوا دیا کرتی تھیں۔

''چائے نہیں پیئی؟'' انہوں نے اس کو جاتے دیکھ کر پوچھا۔

''چاچی! میں لیکچر پر جا رہی ہوں' دیر ہو جائے گی۔''

برآمدے میں کھڑے ہوئے ہدیٰ نے اس کو جاتے دیکھا اور بولا۔ ''یہ لڑکی بہت آزاد معلوم ہوتی ہے۔''

''آج کل سب ہی لڑکیاں آزاد ہیں اور یہ تو بہت فیشن ایبل اور بڑے گھر کی لڑکی ہے۔''

ہدیٰ کی ماں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ان کو اس کی آزادی پر قطعی اعتراض نہ تھا۔جو سچ پوچھو تو ان کے گھر میں لڑکی نہ تھی اور اس لڑکی کا یوں اپنے گھر میں آ کر رہنا ان کو بہت اچھا لگتا تھا اور جو وہ موڈ میں ہوتی تو ان کا ڈھیروں کام کر جایا کرتی تھی۔ٹکوزی سی کر دے گئی' کبھی چاچا کے کپڑوں کی مرمت کر گئی اور ایک بار تو اس نے ہدیٰ کی نئی شلوار قمیضوں اور پلنگ کی چادروں پر نام تک کاڑھے تھے جو چاچی کسی کے ہاتھ اس کو بھیج رہی تھیں۔

لیکن ہدیٰ کو اپنی ماں کی یہ بے نیازی پسند نہ آئی۔اور وہ جھنجھلا کر بولا۔''تو کیا بڑے آدمیوں کی لڑکیوں کے لیے آزادی نقصان دہ نہیں ہوتی؟''

''ہاں بیٹا' یہ واقعہ ہے کہ آزادی تو کم حیثیت گھرانوں کی لڑکیوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ان لڑکیوں کی پرورش دوسرے طور پر ہوتی ہے۔ان کی لڑکیاں ہم سے زیادہ ہوشیار ہوتی ہیں۔''

نورالہدیٰ کے باپ نے اخبار اپنی آنکھوں کے آگے سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

''اور پھر یہ لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو بہت ہی عجیب ہے۔اس کا کردار تو اس کے چہرے پر لکھا ہوا ہے۔فطرتاً سادہ اور بڑی پر سکون ہے۔مجھے تو اس پر رشک آتا ہے۔''

''تو آپ کو اس کے یوں گھومنے پھرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا؟'' لڑکے کو بلا وجہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

''قطعی نہیں' اس لڑکی کا یوں سائیکل سنبھال کر سینما چلے جانا ایسا ہی ہے جیسے تم اٹھ کر سینما چل دو۔''

''خوب!'' ہدیٰ نے زہر خند سے کہا۔

یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق تھا۔نئی نسل کا نمائندہ دقیانوسی بات کر رہا تھا اور بوڑھا باپ روشن خیالی کا ثبوت دے رہا تھا۔

باب ۳۵

پلازہ میں خاصا رش تھا۔وہ بھیڑ چھٹنے کے انتظار میں کھڑی پوسٹر پڑھتی رہی۔اس کے شانوں پر سے کسی اسی تصویر کو دیکھا اور کسی سستے برانڈ کے سگریٹ کا دھواں بری طرح اس کی آنکھوں میں گھس گیا۔

وہ برامان کر مڑی اور دو سیکنڈ بعد ہنس دی۔

''ارے! یہ تم ہو؟''

اس کے سامنے صفدر یاسین کھڑا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت دبلا اور زرد رو نظر آ رہا تھا۔

''ارے تم ۔۔۔۔۔۔۔ یہاں کہاں کوکو!'' اس کو ''کوکو'' پہلے کی نسبت بہت بدلی ہوئی نظر آئی۔ اس کی شریر اور لاابالی نظروں میں سنجیدگی اور افسردگی نظر آ رہی تھی۔

''میں یہاں کیپرڈ کے ہوسٹل میں ہوں۔'' اس نے ایک انجانی سی مسرت کے جذبے سے متاثر ہو کر جواب دیا۔

''تم کہاں رہے اتنے عرصے؟''

''میں گھر چلا گیا تھا۔'' وہ مڑ اُ کھڑکیوں پر سے بھیڑ کم ہو رہی تھی۔

''ارے سنو تو' ہو آئے تم گھر؟''

لیو چو کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے خوشی ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس کو یوں پاس کھڑا دیکھ کر گھر کا قرب کا احساس ہو رہا تھا۔

اس پردیسی انسان کو دیکھتے ہی اس کو اپنے گھر کا برآمدہ' باغ اور وہ مخصوص دیوار جس پر ایک ٹانگ ادھر ایک ادھر ڈال کر بیٹھا کرتی تھی۔ سب کچھ یاد آ گیا۔ آج وہ یوں ہی صبح سے ہوم سک ہو رہی تھی اور اب اس کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ وہیں پہنچ گئی ہو۔ اماں بیگم اپنے کمرے میں تختوں پر ظہر کی نماز پڑھ رہی ہیں۔ ارجمند سو رہی ہے اور بیرا کھانے کے کمرے میں شام کی چائے کے لیے برتن کھڑکھڑا رہا ہے جیسے وہ کسی سے خفا نہیں ہوا اس کا کسی سے بھی بگاڑ نہ ہو۔

اس کا بے اختیار دل چاہا کہ خوب روئے۔ مگر وہ چپ چاپ آگے بڑھی۔ مہینے کا آخر تھا۔ اس کا جیب خرچ ختم ہو چکا تھا اور اس کے پاس بہت تھوڑے پیسے تھے۔ وہ یوں ہی خبط میں اور کنسیشن کی امید پر چلی آئی تھی۔ اس نے ٹکٹ لیا اور مینیجر کے کمرے میں گئی۔

''آج کوئی کنسیشن نہیں دیا جا رہا ہے۔ آج اس فلم کا پہلا دن ہے۔'' مینیجر نے بے تعلقی اور خشکی سے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔

وہ نکلی تو صفدر اپنا ٹکٹ لے کر کھڑکی کے قریب سے ہٹ رہا تھا۔ وہ فکر مندی ہو رہی تھی۔ ناحق ہی وہ آئی۔ اس درجے میں جہاں دنیا بھر کے الٹے سیدھے لوگ بیٹھتے ہیں' اکیلے بیٹھ کر فلم دیکھنے کے خیال سے وہ پریشان تھی۔ صفدر گیٹ کی طرف چلا تو اس نے اس کو

آواز دی۔

''بات تو سنو۔''

وہ مڑا۔

''مجھے کنسیشن نہیں ملا۔''

''تم نے کس درجے کا ٹکٹ لیا ہے؟''

''جس کا تم نے لیا ہے۔''

''کیوں؟'' صفدر نے برا مان کر پوچھا۔

''میری پاکٹ منی ختم ہو چکی ہے۔ کنسیشن کے خیال سے لے لیا تھا۔''

''پھر ٹکٹ واپس کردو۔''

''اب کیسے کروں؟''

''بک جائے گا۔''

ایک دم ہی اس کی مت پلٹ گئی۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اس درجے میں بیٹھ کر فلم دیکھنے والے بھی تو انسان ہی ہیں۔ ان میں اور ہم میں ایسا کیا فرق ہے؟ جو ہم اتفاقیہ بھی ان کے درمیان بیٹھنے سے گھبرائیں۔ آخر ہم نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ اس درجے میں بیٹھنے والے سارے انسان خراب اور مکروہ قسم کے انسان ہوتے ہیں اور اس درجے میں جس میں اصولاً مجھ جیسوں کو بیٹھنا چاہیے۔ سب اعلیٰ قسم کے اچھے لوگ ہوتے ہیں۔

حسب عادت اس نے پھر بے ڈھنگی اور دنیا جہان سے نرالی باتیں سوچنا شروع کیں اور بولی۔ ''واہ! کیوں بک جائے گا۔ میں ضرور دیکھوں گی۔ اتنے دن سے مجھے اس فلم کا انتظار تھا اور اگلے ہفتے مجھے ہوسٹل سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ چلو پھر کیا ہوا' تم میرے قریب بیٹھ جانا۔''

''اچھا'' وہ جلدی میں تھا اور اس پر زبردستی کرنے کا اس کو کوئی حق بھی کیا تھا۔ نیوز ریل چل پڑی تھی۔ اندھیرے میں بچتے بچاتے وہ دونوں درمیانی کرسیوں پر جا بیٹھے اور بیٹھتے ہی صفدر نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ ''تم ابھی تک ویسی ہی گڑبڑ قسم کی ہو' کیوں اکیلی گھوما کرتی ہو۔ سارے زمانے میں کالج کی لڑکیاں گروپ بنا کر سینما اور دوسری تفریح کے لیے نکلتی ہیں اور تم یوں اکیلی گھومتی ہو۔''

''صفدر! اکیلے گھومنے میں کوئی حرج تو نہیں ہوتا۔ اور اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ جو گروپ ہو اس کی تمام لڑکیاں بڑی اچھی اور فرشتہ صفت ہوں گی۔ پتہ ہے لڑکیاں ایک دوسرے کو اتنا بہکاتی ہیں چو! میں اسی لیے ان کے ساتھ گھبراتی ہوں۔ بڑی بور ہوتی ہیں بعضی بعضی تو۔''

وہ بڑی سادگی سے چپکے چپکے اس کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اگر وہ اکیلی سینما دیکھنے آ گئی ہے تو وہ اس کو برا نہیں سمجھتی۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں۔''

''لیکن لوگ تو برا سمجھتے ہیں۔''

''لوگ۔۔۔۔۔۔!'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ہاں لوگ تو واقعی سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے تو انسانوں کی زندگیاں تلخ کر رکھی ہیں' عجب بونگے ہوتے ہیں۔ ان کو درحقیقت اچھائی یا برائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی وہ تو صرف اس بات سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ انہوں نے جن باتوں کو اچھی یا برا قرار دیا ہے افراد ان پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ اب وہ یہ سب باتیں کوڑھ مغز چینی یعنی صفدر یاسین کے دماغ میں کس طرح بٹھاتی جو خود بھی لوگوں ہی کا ایک نمائندہ ہے۔ بس ذرا ایک بات ہے' اس کا دل بڑا محبت والا اور مخلص ہے۔ تو خیر وہ خاموشی سے سوچتی رہی اور آلو کے چپس کھاتی رہی۔ الجھن اور مزاج کے خلاف حالات میں وہ فوراً کچھ کھانا پینا پیش کر دیتی تھی۔

انٹرول تک صفدر صورت حال پر اتنی سنجیدگی سے غور نہ کر سکا۔ انٹرول ہوتے ہی جھک سے بتیاں جلیں اور اس نے سوچا' مجھے یوں اس کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر لوگ کیا سوچیں گے۔ وہ پانی پینے کے لیے باہر چلا گیا اور وہ پورے وقت بیٹھی اجنبی لوگوں سے ڈرتی رہی اور سوچتی رہی' سچ تو کہتا ہے صفدر یاسین' واقعی اس طرح اکیلے پھرنا اچھا تھوڑی ہوتا ہے۔

یہ وقفہ اس کو کچھ زیادہ ہی لمبا محسوس ہو رہا تھا۔ گھنٹی بجی' بتیاں گل ہوئیں اور پھر وہ اس کے قریب آ بیٹھا۔ پردہ فلم پر صابنوں چائے اور فنائل کے اشتہارات چل رہے تھے اور صفدر اپنے کندھوں پر بلاوجہ ایک بوجھ اور ذمہ داری محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل فلم سے بھی اچاٹ ہو گیا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا اور بولی۔

''شکر ہے تم آ گئے۔ مجھے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ ڈرلگ رہا تھا۔''

''مجھے خیال ہوا کہ کوئی تمہیں میرے ساتھ بیٹھا دیکھے گا تو کیا کہے گا۔''

''کیا کہے گا۔۔۔۔۔۔ کہہ دیں گے کہ بھئی کنسیشن نہیں ملا' اس درجے میں اکیلے بیٹھنے سے تو اچھا ہے کہ تمہارے پاس بیٹھ

جاؤں۔"

"بھئی! تم بالکل پاگل ہو۔"

"کیوں۔۔۔۔۔۔۔پاگل پن کی کیا بات؟"

"بھلا تم سے کون پوچھنے بیٹھے گا" کوکو لوگ پوچھا نہیں کرتے سوچا کرتے ہیں۔"

"اونہہ! تو بھئی اب تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اب کبھی نہیں لیں گے یہ سانکٹ۔" وہ محض بھنائی۔ تو بہ صفدر نے تو بور کر دیا۔ بالکل جیسے اماں بیگم کا ہرکارہ ہو۔ اور پھر فلم دیکھنے میں غرق ہو گئی۔

فلم ختم ہو گئی۔ وہ سینما سے باہر اپنی سائیکلیں پکڑے کھڑے تھے۔

صفدر نے وطن جانے اور وہاں سے واپسی کی تمام باتیں بتائیں اور کوکو نے بڑی بے تکلفی اور فراٹے سے الف سے لے کر "ے" تک ہر بات سنا کر اس کو اپنے اتنی دور آ کر پڑھنے کی وجہ بتادی۔

"کوکو! ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔"

"تم نے ہوسٹل کی لڑکیوں کو بھی یہ سب سنایا ہے۔"

"اے لو ان کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں کیا پاگل ہوں۔"

"پھر تم نے مجھے کیوں سنا دیا؟"

"لو بھئی اور ہوئی' تم کو میں ہمیشہ سے جانتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ تم میرا بڑا خیال کرتے ہو۔ یاد ہے جب میری ٹانگ ٹوٹی تھی تو تم کس طرح میرا دل بہلاتے تھے' چپکے چپکے آ کر۔"

"ارے! اس لڑکی کو ابھی تک اتنی معمولی سی بات یاد ہے اور وہ اس کے لیے میری شکر گزار بھی ہے۔ مجھ جیسے بے حقیقت اور کم حیثیت پردیسی کی اتنی چھوٹی سی بات کو اس نے دیکھا رکھا۔"

صفدر یاسین لیوچو کی چھوٹی چھوٹی تکونی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک رو مچلی اور وہیں کی وہیں رہ گئی۔ اس کو دیکھ کر اس کو کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس سادہ دل اور بے وقوف لڑکی کو دیکھ کر اس کو یہ احساس ہوا تھا کہ وہ اس اجنبی سرزمین کی بجائے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہو۔

''السلام علیکم!'' کسی نے پیچھے سے آواز دی اور وہ دونوں چونکے۔ پڑوسی انجینئر کا خوش شکل لڑکا اکبر بظاہر بڑی بے نیازی اور بے خیالی سے مسکرا رہا تھا۔

اس نے رسمی طور پر اکبر سے اس کی خیریت پوچھی۔ لیو چو مودب سا اپنی سائیکل لے کر بہت پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔

''میں نے تو تم کو وہاں ہی میں دیکھ لیا تھا۔'' اکبر کی آنکھیں شرارت سے ہنسیں۔

''تو پھر تم بھی وہیں آ گئے ہوتے۔''

اکبر زور سے ہنس پڑا۔

گیتی نے اس کی آنکھوں کی شرارت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا اور سوچنے لگی۔ ''سچ ہی کہہ رہا تھا صفدر' مجھے واقعی یوں نہیں گھومنا چاہیے۔''

لیکن یہ بھی کوئی بات ہوئی' ہم اپنے متعلق زیادہ بہتر سمجھتے اور جانتے ہیں۔ پھر لوگ کیوں قیاس آرائی اور اعتراض کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ عجیب تھا اس کا مزاج۔ اچھی خاصی راہ پر آتے آتے بھٹک جاتی تھی۔

اچانک ہی وہ مڑی۔ اکبر سے مزید ایک لفظ کہے بغیر سائیکل پر سوار ہو کر آگے بڑھ گئی اور راستے میں کھڑے صفدر یاسین کو دیکھے بغیر گزر گئی۔

باب ۳۶

''دیکھ لیا! اب تو آپ نے صاحبزادی کی خودسری اور خودرائی کا نتیجہ۔ ضد تو پوری کر دی بیٹی کی۔'' انہوں نے ان کی شکل دیکھتے ہی پھر وہی داستان چھیڑ دی۔

''میری مرضی نہیں تھی کہ وہ اتنی دور بورڈنگ میں جا کر رہے' مگر نہیں' آپ کو تو میری ضد تھی۔'' وہ ان کی صورت دیکھتے ہی دانت کٹکٹا کٹکٹا کر اس طرح فاتحانہ انداز میں یہ قصہ دہراتا اور ان کو طعنے دینا شروع کر دیتی تھیں' گویا ان کو اپنے شوہر کی اس شکست فاش پر دلی مسرت ہو۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے ان سے بغاوت کی اور اپنی ایک اولاد کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اس سلسلے میں ان کو منہ کی کھانا پڑی۔ پہلے قدم پر ہی لڑکھڑا کر منہ کے بل گر گئے۔

اور اب وہ اندر آ کر پچھتا رہے تھے۔ بظاہر وہ بالکل خاموش سفید کرتے پاجامے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ لیکن ان کی

آنکھوں میں دکھ تھا اور چہرے پر ملال۔ ان کا خوبصورت اور بارعب چہرہ اچانک ہی ضرورت سے زیادہ عمر رسیدہ نظر آ رہا تھا۔
انہوں نے خاموشی سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو انتہائی غصے اور پریشانی کے باوجود نک سک سے درست کافوری سلک کی ساری میں تخت پر پیر لٹکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں سونے کی باریک باریک چوڑیاں اس وقت بھی بہت بھلی لگ رہی تھیں۔
اسی وقت ملازم نے آکر حقہ ان کے قریب رکھا اور واپس چلا گیا۔
جہانگیر میرزا نے بے چینی سے اپنی ٹانگ ہلائی اور حقہ کی نے اپنے قریب کر لی۔
''بس آپ کے پاس تو ہر بات کا جواب حقہ اور سگریٹ ہے۔''
''اس لیے بیگم کہ آپ کی بات کا جواب جو میرے پاس نہیں۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا اور حقے کا کش لیا۔
''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں فضول بکواس کر رہی ہوں اور وہ بدنصیب سیدھی راہ پر چل رہی ہے۔ باوا کے نام کو چار چاند لگا رہی ہے۔''
اور اب جہانگیر مرزا کے ضبط اور تحمل کی حدیں ختم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے غصے سے حقے کو پرے ہٹایا۔
''بکواس ہو یا نہ ہو فضول بکواس پر یقین ضرور کر رہی ہو۔ ایک لوفر لڑکے نے جو کچھ آ کر کہہ دیا یقین کر لیا۔'' ان کا لہجہ دھیما ہونے کے باوجود بے انتہا غصیلا تھا۔
''آپ کے نزدیک اکبر لوفر ہے۔ آخر اس کو کیا دشمنی ہے آپ کی صاحبزادی سے؟''
''بے شک میں ایسے لڑکوں کو لوفر ہی سمجھتا ہوں۔ آپ کے نزدیک قیمتی پوشاک اور اونچے گھرانے کا فرد ہونا ہی ایک شخص کے کردار کی ضمانت ہو تو ہو میرے نزدیک نہیں۔ میں اس سے بدرجہا بہتر۔۔۔۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے اور پھر بولے۔
''میری لڑکی سے اس کو یہ دشمنی ہے کہ میری طرح وہ بھی اس کو ناپسند کرتی ہے۔'' انہوں نے پھر بے چینی سے ٹانگ ہلانا شروع کر دی اور خود ہی بڑبڑائے۔ ''جب ایک مرتبہ بے وجہ کسی لڑکی یا لڑکے کا نام خود اس کے گھر والے اپنی ناسمجھی سے نکال دیتے ہیں تو دوسروں کو اس کے متعلق کہنے سننے میں کیا باک ہو سکتا ہے۔ ایک دفعہ سکول سے آنے میں دیر ہوئی تو تھوڑا سا شور مچایا تھا۔''
اسی وقت ارجمند نے پردہ کھسکا کر اپنے کمرے میں سے برآمدے میں جھانکا۔ ہر طرف کتنی خاموشی تھی۔ تختوں پر بچھی ہوئی اجلی دودھ سی چاندنی، چھوٹا سا زرد قالین اور دیوار سے لگا ہوا شفاف اور بے داغ گاؤ تکیہ، برآمدے کے نازک ستونوں سے لپٹی ہوئی بیل اور اس کے سرخ پھولوں کے گچھے اور آخری در والے کونے میں سفید میز پر رکھا ہوا لالوں کا سبز پنجرا۔ یہ سب چیزیں کتنی مانوس اور

پیاری تھیں۔اوپر سے نیچے تک انتہائی نفاست اور خوبصورتی سے بنا ہوا یہ گھر اس کا اپنا ہی گھر تو تھا۔لیکن اب کچھ دن سے وہ کچھ عجیب عجیب سا معلوم ہونے لگا تھا۔ ہر طرف سنسان' خاموش' دھیرے دھیرے رفتہ رفتہ اس گھر کی رونقیں رخصت ہو گئیں۔صولت آپا شادی ہو کر چلی گئیں۔پہلے جلدی جلدی آتی تھیں پھر دیر سے آنا شروع کر دیا اور اب تو بالکل ہی کم کر دیا۔بڑے بھیا ولایت جا بیٹھے کبھی نہ آنے کے لیے۔چچی جان نے بھی آنا چھوڑ دیا اور گیتی کو یہ سوجھی کہ وہ بھی بورڈنگ جا بیٹھی۔

گیتی کا نام اس نے بمشکل اپنے ابلتے ہوئے آنسوؤں کو پی کر دل میں لیا۔اور یہ اتوار کا دن کس قدر کھل جاتا ہے۔اس دن تو سارے وقت اس کا خیال جان سے چمٹا رہتا ہے اور وہ خط بھی تو اس قدر کم لکھتی ہے۔اس کا خیال بھلا دینے کی خاطر اس نے ابا میاں اور اماں بیگم کی طرف دیکھا جو دونوں ہی مکدر اور خاموش بیٹھے تھے۔یقیناً یہ وہی ناخوشگوار موضوع ہو گا جو اکبر کی لاہور سے واپسی کے بعد سے دن میں کئی کئی مرتبہ چھڑ جاتا تھا اور جس کی وجہ سے گھر میں اتنی کشیدگی اور افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔کتنا کم بخت ہے یہ اکبر بھی۔ خود تو ایک بات کہہ دی اور یہاں سب کو رنجیدہ کر دیا۔فرض کرو اس نے ایسی کوئی بات دیکھی بھی تھی تو اتنا بھی ظرف نہیں کہ اس بات کو خود اپنے آپ تک رکھا ہوتا۔پتہ نہیں لوگ اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے۔'' وہ آج اپنی رو میں گیتی جیسی باتیں سوچ رہی تھی۔حقہ پڑے پڑے سرد ہو گیا تھا اور وہ دونوں اس طرح خاموش بیٹھے تھے جیسے دو اجنبی بڑے معمولی سے تعارف کے بعد ایک دوسرے کے سامنے اس طرح بیٹھے ہوں کہ بات کرنے کا موضوع بھی انہیں نہ مل رہا ہو۔پھر وہ اٹھے اور اپنے کمرے میں جا بیٹھے۔شاید بیگم صحیح کہتی ہوں'میں نے ہی غلطی کی ہے جو اس کے کہنے پر اس کو بورڈنگ بھیج دیا اور اب اگر وہ بے راہ ہو گئی تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہو گی۔لیکن صولت کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے۔اس کے تو معاملے میں'میں نے بالکل ہی چپ سادھ لی تھی۔یہاں تک کہ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ آصف جاہ کو بے انتہا ناپسند کرتی ہے۔میں بیگم کے فیصلے کے خلاف کچھ نہ بولا۔ان کا یہ کہنا تھا کہ ساری ناپسندیدگی اور تمام فرق مٹ جاتے ہیں سوائے دولت کے فرق کے۔مجھے خوب احساس تھا کہ بیگم کو اپنی اولاد کے مزاج کا اندازہ نہیں۔وہ طبیعتیں اور ہوتی ہیں جن کے لیے ہر فرق مٹ جاتا ہے۔مجھے معلوم تھا کہ میری اولاد اتنی بے حس اور بے دماغ نہیں کہ اس کی ہر حس مٹ جائے۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔صولت نے آصف جاہ کی زندگی تلخ کر رکھی ہے'اس کو ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح کونے میں ڈال دیا ہے اور خود۔۔۔۔۔۔'' غصہ اور شرم سے ان کا چہرہ تمتما گیا۔صولت ان کے لیے باعث شرم بنی ہوئی تھی۔بظاہر بڑی گھر دار اور گرہست بیوی بنی تھی۔پھر بھی اس کے چرچے ہوتے ہی تھے۔ان کو ان چرچوں سے زیادہ اس کے دورخے طریقوں سے نفرت تھی۔ان کے نزدیک منافقت انسانیت کا بدترین گناہ تھا۔

اور پھر صولت کے علاوہ شہریار کا معاملہ تو ان کی سمجھ سے قطعی باہر تھا۔ وہ اتنا فرمانبردار' ہنس مکھ اور خوش باش لڑکا' خدا جانے کیوں ماں باپ اور گھر سے اس درجہ بیزار ہو گیا کہ واپسی کا خیال ہی ترک کر دیا۔ شہریار کا یوں بیٹھ رہنا ان کو بہت کھلا رہتا تھا۔ جیسے اس نے ان کی محبت شفقت اور ان تمام آرزوؤں کی توہین کر دی ہو۔

اب یہ ان کی فطری آن بان اور خاندانی تمکنت تھی کہ وہ اپنی پسپائی اور شکست کو بڑی بہادری اور خوبی سے نبھا رہے تھے۔ ان کے ہنسنے بولنے اور اپنے مشاغل میں محویت کو دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس شخص کے آئینہ دل میں ایک بہت دراڑ پڑ چکی ہے۔ اس کے خواب بکھر گئے ہیں اور اس کی زندگی میں ایک شدید خلا اور غم سے

بشنواز نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

گنگنایا کرتا ہے۔ بڑا بیٹا ہی تو انسانی زندگی کا سنگِ میل ہوتا ہے' وہ کھرا اور کھنکتا ہوا سکہ جو بازار میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے' جو کھوٹے پیسے کی طرح صندوقچے میں پڑا وقت پر کام آنے کا انتظار نہیں کرتا اور جو وہ ہی وجہ اور سبب بتائے بغیر روٹھ جائے تو انسان کی کمر نہ ٹوٹ جائے' دل نہ بیٹھ جائے۔ ان کی روشن اور غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ انہوں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اب کوئلوں نے کوکنا شروع کر دیا تھا اور آموں پر بور آ رہا تھا۔ جامنیں کالی ہو چلی تھیں اور بیلا چنبیلی پھول رہے تھے۔ ان کا دل اس دنیا سے سرد ہوتا جا رہا تھا۔ ایک مغموم سی خاموشی اور سپردگی ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

باب ۳۷

مدت کے بعد اس کو طلعت کا خط ملا اور اس نے بڑے اطمینان سے یہ خط کھولا تھا۔ گیتی کے مزاج میں بڑا سکون پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب ہر کام کو دھیمے پن اور آہستگی سے کرتی تھی۔

''اوہو! طلعت بیگم آج تمہیں پھر میرا خیال آ گیا۔'' اس نے مسکرا کر لفافے کو بڑی احتیاط سے کھولا۔

''گیتی! بہت سے پیار لو۔''

''یہ پڑھ کر وہ قدرے حیران ہوئی۔ کیا طلعت اب بھی اس کو برا نہیں سمجھتی۔ اور کیا اکبر کی اڑائی ہوئی خبر اس تک نہیں پہنچی؟''

''ویسے اکبر میاں نے میری رسوائی کا سامان تو پورا پورا کر دیا ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ارجمند نے اس کو سب کچھ لکھ دیا تھا۔

ہاں تو طلعت نے کل داستان لکھی تھی۔

''رفتہ رفتہ دادی اماں کو معلوم ہو گیا کہ صولت آپا یہاں کیوں آئی تھیں۔ ان کو بہت غصہ آیا۔ اور تم جانو جب کبھی ان کو غصہ آتا ہے تو وہ ایک آدمی کا غصہ گھر بھر پر اتارتی ہیں۔ تمام دن وہ ہم لوگوں پر ناراض ہوتی رہیں۔ وہ تم سے ذرا بھی ناراض نہیں ہیں۔ ان کو تو غصہ صولت آپا پر ہے۔ کہتی ہیں اس نے اس گھرانے کی ساکھ ختم کر دی۔ یہ گھرانہ اپنی دولت اور عجز کے لیے مشہور تھا۔ اس گھر کی عورت اور مرد کبھی سر اٹھا کر نہیں چلے۔ وہ شاید بھول گئی ہے اس کے باپ کی ماں خاندان کے سب سے غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ میرے باپ کے گھر سرِ شام چراغ گل کر دیے جاتے تھے۔ میری بہنوں کے نکاح شربت کے پیالوں پر ہوئے تھے اور میرے میکے کا گھر چھوٹا اور شہر کے گنجان ترین چھتے میں تھا۔ پر ایسی چوکھٹ پر تمہارے ہفت ہزاری دادا پردادا بیاہنے آئے تھے اور پھر سب کو معلوم ہے کہ اس گھرانے میں جتنی میری عزت اور توقیر ہوئی کسی دوسری بہو کی کبھی نہ ہوئی تھی۔ اور صولت نے میری بھتیجی کے بچے سے اتنی ذلت کا برتاؤ کیا۔

بس کیا بتاؤں گیتی! صولت آپا کا سارا غصہ ہم لوگوں پر اترتا رہا۔ اور پھر سنو کیا ہوا' دادی اماں نے ہاشمی پھپھو کو بلایا۔ سارے دن باتیں ہوا کیں اور پھر وہ دونوں چھوٹی نانی کے دالان میں گئیں' بہت دیر باتیں کرنے کے بعد ہاشمی پھپھو واپس چلی گئیں۔ دوسرے دن کوئی دس بجے ہاشمی پھپھو بغیر کسی اطلاع کے کامنی کو انگوٹھی پہنا گئیں۔ چھوٹی نانی نے تھرتھراتے ہاتھوں سے اپنی بقچیاں اور پٹاریاں ٹٹول ٹٹول کر ایک رنگ اڑا اور مخملی کیس نکال کر ان کے حوالے کیا۔ کیا بتاؤں گیتی' اس میں کتنے غضب کی دگ دگ کرتی انگوٹھی تھی۔ امی کہتی ہیں شاہی وقتوں کی ہے۔ ہاشمی پھپھو اور چھوٹی نا' کامنی کو باری باری گلے لگا کر روئیں۔

بات بھی رونے کی ہے۔ بیچاری کے ماں ہیں نہ باپ۔ وہ خود بھی رو رہی تھیں۔ ویسے مجھے خوب معلوم ہے۔ وہ مسعود کو بہت پسند کرتی ہے۔

ہاشمی پھپھو بڑی گھبرائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو۔ اس وقت میرا عجیب حال تھا۔ خیر تم یقین تو کیا کرو گی لیکن تمہاری شکل نظر کے سامنے تھی۔ اور دل بھرا آ رہا تھا۔ تم کو معلوم ہے کہ میری آنکھ میں آنسو نہیں ہیں۔ بس دھوئے دھائے دیدے لیے پھرتی رہی۔

امی نے مجھے زبردستی ان کے ساتھ بھیج دیا۔

وہ اسی وقت یونیورسٹی سے آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''تم کو دیکھ کر مجھے اپنی مرحوم دوست کا خیال آتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ تم سے کہوں کہ تم میرے گھر نہ آیا کرو۔''

''تو کیا تم نے اسی لیے ہمارے یہاں آنا چھوڑ دیا؟''

''ہاں طلعت' مجھے زندہ اور محسوس انسانوں سے دلچسپی ہے۔ میں قبرستانوں میں جانے کا قائل نہیں۔''

''تو کیا خیال ہے تمہارا' نہ آیا کروں؟''

''یہ تم نے بھی اسی بدتمیزی کی راہ اختیار کرلی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے اور اس سے' دونوں سے بڑا ہوں۔ تم دونوں میرا نام بھی لیتی ہو اور تم کرکے مخاطب بھی کرتی ہو۔'' اس نے بات ٹالی

''ہاں واقعی' وہ تمہارا نام لیتی تھی تو میں بھی لینے لگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ مر تو نہیں گئی طلعت' جو تم اس کے نام کے ساتھ ''تھی'' کا لفظ استعمال کررہی ہو۔ اور وہ تو مر کر بھی زندہ رہنے والوں میں سے ہے اور مجھے تو اس کی زندگی میں اس کا بھوت ستاتا رہتا ہے۔''

''اب تم اس بھوت سے اپنا پیچھا چھڑا لو۔'' میں نے کہا۔

''کہیں بھوتوں سے بھی کسی نے اپنا پیچھا چھڑایا ہے۔'' وہ ہنسا۔

''مسعود! یہاں آؤ۔'' ہاشمی پھپھو نے اس کو پکارا اور وہ اٹھ کر ان کے کمرے میں چلا گیا۔

میں وہیں دالان میں بیٹھی رہی۔

اندر سے حجت کی آوازیں آتی رہیں۔ آخر میں ہاشمی پھپھو کی غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تمہیں میری زبان کا بھی خیال نہیں۔ مسعود مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم مجھے یوں بے عزت کروگے۔ میں نے تمہاری حماقت کے باعث صولت کے ہاتھوں تھوڑی ذلت اٹھائی ہے؟ اور اب یہ دوسری ذلت اور سہنا ہے تمہارے ہاتھوں۔ بیٹے تو نام روشن کرتے ہیں' عزت افزائی کا سامان ہوتے ہیں اور تم میری توہین کا باعث بن رہے ہو۔''

اور پھر دونوں میں آہستہ آہستہ گفتگو ہوتی رہی۔ الفاظ میں نہیں سن پائی لیکن ان کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسعود کو سمجھا رہی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں نکلے۔ دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ سخت برہم اور رنجیدہ تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں وہی انگوٹھی تھی جو کامنی کی نانی کی پوٹلی میں سے برآمد ہوئی تھی۔

وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ ''مبارک ہو۔'' اور وہ بالکل تمہاری طرح بدزبانی پر اتر آیا۔ ''خدا سمجھے تمہیں' بڑی آئیں مبارک دینے والی۔۔۔۔۔منحوس گی تو خدا کی قسم تھپڑ دوں گا۔''

میں تو اس کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔

پھر اس نے اپنے کمرے سے آواز دے کر مجھے بلایا۔ وہ جوتوں سمیت اپنے پلنگ پر لیٹا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔

''اے! تم اپنی کامنی سے کہہ دینا کہ تم نے جتنا کچھ بھی پڑھا تھا وہ بھی ڈبو دیا۔ کیا تمہارے منہ میں گھنگنیاں بھری تھیں جو تم منہ سے یہ نہ پھوٹیں کہ میں ایسے بدمذاق سے منگنی کیوں کرلوں جو چینیوں جیسی زرد رو اور چپٹی شکلیں پسند کرتا ہے اور اس سے پوچھنا کہ اپنے ایمان سے خود ہی کہہ دے کہ کیا میں نے اسے سے نہیں کہا تھا کہ تم اس ہوا میں نہ رہنا۔ میرے دل میں تمہاری ذرہ بھر پروا نہیں اور اس بات پر تم نے ترخ کر یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے۔ تم جیسے بدمذاق' بھونڈی شکلوں اور چیاں چیاں جیسی آنکھوں پر مرتے ہیں۔ اچھی بات ہے کامنی بیگم تم پر میرا صبر پڑے گا۔ گھنی مسمی بنی بیٹھی رہیں اور انگوٹھی پہن لی۔''

وہ بے حد روٹھی ہوئی آواز میں بے ربط باتیں کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بس! اب یہ باتیں بند کرو اور اپنی طبیعت سنبھالو۔'' تو وہ بڑی بے بسی سے بولا۔

''طبیعت سنبھلی سنبھلائی ہے طلعت! لیکن اس کم بخت کو خدا سمجھے جس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔''

''کس سے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی کم بخت گیتی سے' کتنا ٹالا تھا میں نے اس کو' کتنا سمجھایا تھا۔ اس کا کیا بگڑا؟ اب میں ساری عمر روؤں گا۔ اچھا یہ بتاؤ' اب کیا ہوگا؟ اب کیا کروں؟''

میں نے موقع غنیمت سمجھا اور کہا۔ ''ہاں! دیکھو اب تم یہ کرو کہ لو یہ پانی پی لو اور سو جاؤ۔''

''ہاں! تمہارا خیال کچھ برا بھی نہیں۔'' وہ پانی پی کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ تمام شام اور پھر ساری رات وہ اسی طرح سوتا رہا۔ صبح اٹھا تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا لیکن بالکل خاموش۔ اس کے کالج چلے جانے کے بعد میں بھی گھر آ گئی۔

اس پورے ہفتے وہ ہماری طرف نہ آیا۔ باوجود بلوانے کے بھی اپنی ہونے والی ساس کو سلام کرنے نہ آیا۔ اور کامنی اس کے نہ آنے سے بالکل سہم سی گئی تھی۔ اس کو تو سب معلوم ہی ہے نا۔ وہ صبح ہی صبح آیا۔ اور صرف اپنی سسرال یعنی چھوٹی نانی کے دالان میں بیٹھا رہا۔ وہ وہاں سے ہٹیں تو وہ مولسری کے پیڑ کے نیچے آ گیا۔ جہاں میں اور کامنی بیٹھے تھے۔ اس کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔

''تمہاری صورت پر ماتم کیوں برس رہا ہے؟ میں مر تو نہیں گیا۔ ذرا ہنسا سیکھو اور یہ بیواؤں کے سے طریقے چھوڑ دو۔''

میں نے دیکھا کہ اتنی بات سن کر اس کا پیلا چہرہ نکھر آیا۔ اس نے بڑے انداز سے اپنی خوبصورت آنکھیں جھکا لیں۔ لیکن وہ بڑے اطمینان سے مولسری کے پھول چنتا رہا۔ پھر اس کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ بھنا کر سارے پھول پھینک دیئے۔ جانے کو مڑا اور پھر لوٹ آیا۔ ''ذرا مجھے بھی تو دکھادو۔ تمہاری ساس نے کیسی انگوٹھی پہنائی ہے؟''

وہ شرمائی تو اس نے جنگلی پن سے اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ ''بھئی! دیکھ لینے دو نا' خدا کی قسم یہ حد ہے کہ ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ منگیتر صاحبہ کی انگوٹھی کے نگوں کا رنگ کیا ہے۔ کچھ یاد ہے یہ کون سی صدی ہے؟'' اور پھر خود ہی بولا۔ ''ہٹاؤ' تم ایسے جھنجھٹ کہا پاتلی ہوگی۔ تمہارے لیے صدیاں اور لمحے سب برابر ہیں۔''

تو گیتی یہ رنگ ہیں دنیا کے۔ اور میرے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ مسعود کچھ دن کے بعد راہ پر آجائے گا۔ سب کچھ بھول جائے گا۔ پھر تم ہی کیوں بیٹھ کر فضول میں ان باتوں کو گھوٹتی رہو۔ امی تم کو دعا کہتی ہیں۔ عصمت باجی کا خط آیا ہے۔ وہ لوگ اور ان کا بچہ اچھی طرح ہیں۔''

گیتی نے یہ مفصل خط اطمینان سے لفظ بہ لفظ پڑھا۔ خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اور آنسو بہانے کی بھی کوئی جلدی نہ تھی۔ خط کو تہہ کر کے واپس رکھ دیا اور دل میں کہا۔

''مسعود! تم نے اچھا کیا کہ اپنی منگنی کروالی۔ اب خدا کرے تم کو خوب بڑا سا عہدہ ملے اور لمبی سی کار خرید کر تم اپنی خوبصورت آنکھوں والی بیوی کو لے کر ہمارے گھر آؤ تا کہ اماں بیگم دیکھ لیں کہ مسعود کو ان کی لڑکی سے کہیں اچھی بیوی مل سکتی تھی۔''

نہ معلوم کیوں اس کو اس تمام خط اور اطلاع کو پڑھ کر نہ ملال ہوا نہ بے چینی۔

باب ۳۸

اتوار کی اس صبح کو وہ سو کر اٹھی تو اس کا دل بلا وجہ ہی الٹا سیدھا دھڑک رہا تھا۔ ہر چیز سے تھکاوٹ اور افسردگی ظاہر ہو رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا لیکن فضا سوگوار سی محسوس ہو رہی تھی۔

پتہ نہیں آج مجھ کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس نے سوچا۔ اس لیے کہ دوسری لڑکیاں حسب معمول اپنے کاموں میں اسی خوش

دلی سے مصروف تھیں۔

ناشتے کے بعد بے دلی سے وہ کوریڈور میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ شفاف نیلگوں آسمان کے مقابل سفیدے کے درختوں کے سبز پتے کتنے خوبصورت نظر آ رہے تھے۔

آسمان کی شفاف نیلاہٹیں، درختوں کی سبزی اور اڑتے ہوئے کووں کی ڈار کی سیاہی، بالکل متضاد رنگوں کا یہ امتزاج اس کو آج سے نہیں بچپن سے ہی بہت بھلا لگتا تھا۔ اور اس وقت بھی شفاف نیلگوں آسمان تھا۔ اس کے مقابل درختوں کی سبزی تھی اور۔۔۔۔۔۔۔ سیاہی کا مختصر سا نقطہ اڑتا ہوا تنہا کوا۔۔۔۔۔۔۔ اس کا پریشان دل کچھ اور بھی سہم گیا۔ کووں کی اڑتی ہوئی سیاہ ڈار کے بجائے فقط ایک تنہا کوا۔۔۔۔۔۔۔ انگریزوں کے عقیدے کے مطابق اکیلا کوا بدخبر کا مظہر ہوتا ہے۔ خدا خیر کرے! کونونٹ سکول اور یورپین راہباؤں کے زیر سایہ تربیت پانے والے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی۔ اور پھر خود ہی اس نے زیر لب ''لاحول۔۔۔۔۔۔۔'' پڑھی۔ اگر یوں ہی ہوا کرتا تو قاعدے کی رو سے یہ تنہا کوا مجھے جب نظر آتا تھا جب طلعت کا خط ملا تھا۔ دو مہینے گزر جانے کے باوجود طلعت کے خط کی سطریں اس کے ذہن میں ابھر آئی تھیں۔

لیکن یہ بھی کوئی بدخبر ہوئی جو سچ پوچھو یہ تو واقعات اور حادثات ہیں۔ جو انسان کی زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ ٹھیک ہے اگر ایک شخص کی زندگی سے جو ہمیں پسند ہے، الجھنیں نکل گئیں تو وہ بدخبر تو نہیں ہوئی۔ ٹھیک ہے مسعود کی زندگی سلجھ گئی اور اب وہ بسہولت گزر جائے گی۔ جو سچ پوچھو تو بہت ممکن ہے کہ میرا وجود مسعود کے لیے عذاب بن جاتا۔ میری اور اس کی حیثیت میں جو فرق ہے وہ کسی نہ کسی روپ میں ہمیشہ باقی رہتا اور مجھے یقین ہے کہ وہ میرے نہ سہی تو میرے گھر والوں کے ہاتھوں احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنی شخصیت کھو بیٹھتا اور یوں وہ میری نظروں سے بھی گر جاتا۔

''ٹھیک ہے مسعود! مجھے تم سے اور اس اتفاق سے قطعی شکایت نہیں جس نے حالات کا رخ اس طرف موڑ دیا ہے۔'' اس لڑکی نے جس کا نام گیتی تھا، روئے زمین کی سی کشادگی اور فراخ دلی سے سوچا۔

اپنا دھیان اس واہمے سے ہٹا لینے کے باوجود وہ دیر تک اس اکیلے کوے کو نیلگوں بلندیوں میں بھٹکتا دیکھتی رہی۔ اور ایک انجانی سی وحشت اس کے ذہن پر مسلط ہوتی چلی گئی۔

ہوسٹل کی ڈاک، ہیڈ گرل اپنے دوسرے فرائض سے فارغ ہونے کے بعد تقسیم کرواتی تھی۔

گیتی کو ارجمند کا وہ خط گیارہ بجے کے بعد ملا۔ مختصر سا پریشان خط تھا۔ جس کی پہلی ہی سطریوں تھی۔

''دادی اماں کی حالت کی خرابی کا تار ملا تھا۔ اماں بیگم اور ابا میاں دونوں گئے ہیں اور میں یہاں اکیلی وحشت میں تنکے چن رہی ہوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

اور خط کے خاتمے پر مکرر کر کے لکھا تھا کہ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے' وہی ہو گیا جو ہونا تھا۔ اب تو ابا میاں اور اماں بیگم کی واپسی جلد ممکن نہیں۔

پتہ نہیں ارجمند پر اس خبر کا اثر کس انداز سے اور کتنا ہوا ہو گا۔

لیکن وہ جو اتنی دور سب سے ٹوٹی ہوئی پڑی تھی اس کے لیے یہ خبر بہت المناک تھی۔ دادی اماں جو اس کو بہت پسند کرتی تھیں' جن کے ساتھ محرابی دروں' شہ نشینوں' صحنچیوں' مولسری اور بیلے کے پھولوں کا خیال وابستہ تھا' جن کے وجود کے معنی پرانی مروت' رشتے داری کے لامحدود اور انمٹ سلسلے اور بڑے مضبوط سہارے تھے۔ وہ اب اس جہاں میں نہ تھیں۔ پون صدی کی اس زندگی کے ساتھ ساتھ ایک پوری صدی کی روایات بھی رخصت ہو گئی تھیں۔ بڑا سا خوب صورت اور بارونق مکان اس بھاری بھر کم وجود کے بغیر کیسا لگتا ہو گا' یہ بات اس کے خیال ہی میں نہیں آ رہی تھی۔

اس نے کنکھیوں سے آسمان کی نیلگوں وسعتوں کی طرف تاکا۔ اب وہ تنہا کوا فضا میں نہیں منڈلا رہا تھا۔ متعدد چیلیں موہوم نقطوں کی طرح ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھیں۔

''یہی تو۔۔۔۔۔۔۔ میرا دل اس کوے کو دیکھ کر بیٹھا جا رہا تھا۔'' اس نے خط میز پر ڈال دیا اور اپنے بستر پر منہ اوندھا کر لیٹ گئی۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ آنسو بہاتے بہاتے آنکھوں میں کھٹک سی ہونے لگی۔ حلق خشک ہو گیا اور بخار کی سی کیفیت معلوم ہونے لگی۔

''اچھا ہوا' جو ادھر کوئی لڑکی موجود نہ تھی ورنہ ایسے وقت لوگوں کی ہمدردیاں اور افسوس اور بھی کوفت کا سامان ہوتی ہے اور جب اس کے کمرے کی ساتھی لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں تو اس کو غافل سوتا ہوا پایا۔

وہ سو کر اٹھی تو بھی کسی لڑکی پر یہ ظاہر نہ ہوا کہ اس پر سے ایک بڑا صدمہ گزر گیا ہے اور اس کے گھر سے کوئی بدخبر آئی ہے۔ اس اظہار کی ضرورت بھی کیا تھی۔ یہ غم تو فقط اس کا اپنا غم تھا۔ جو پریشانی اور غم انسان کی اپنی ذات سے وابستہ ہو اس میں دوسروں کو حصہ بٹانے کی کیا ضرورت!

اور وہ غم بھی تو بڑا مقدس اور قیمتی ہوتا ہے جس کو انسان اکیلا اکیلا خاموشی سے سہہ لے۔

باب ۳۹

''انسان کو ماں باپ کی ضرورت آخر کب تک رہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔کوئی حد اور حساب بھی تو ہو'' جہانگیر مرزا نے حقہ اپنے نزدیک کیا اور چاندی کی منہال منہ میں دبا کر سوچا۔

وہ اس وقت برآمدے میں بید کی آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ برآمدے کے دروں میں لونیاں کی کونڈیاں لٹک رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت پتوں کے گچھے کونڈیوں کے چاروں طرف جھالر سی ڈالے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے لکڑی کے گملوں میں لگے ہوئے چھوٹے قسم کے پام کے درخت اپریل کی ہوا سے جھوم رہے تھے۔

''بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ ماں جس کے متعلق بارہا میں نے سوچا تھا کہ اب ہمارے فرائض سے فارغ ہو چکی ہیں اور جس کی ضرورت اب زندگی میں حقیقتاً بہت کم محسوس ہوتی تھی' دنیا سے اٹھ گئی تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اب ہی تو مجھے اس کی ضرورت تھی۔ نہ جانے کیا بات ہے' زندگی میں اتنی موتوں کا سامنا ہوا اور اتنے عزیز بچھڑ گئے مگر کسی کی موت نے یہ احساس نہ دلایا تھا کہ زندگی کے سوتے خشک ہو گئے۔ یوں کبھی نہ معلوم ہوا تھا کہ زندگی کی ہری بھری کھیتی کے قریب چھل بل کرتی شفاف نہر سوکھ گئی ہو۔ اور اماں جان تم نے تو اس وقت مر کر واقعی مجھ پر ظلم کیا ہے۔ میں ان دنوں بہت دکھی ہو رہا تھا اور کتنے ہی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ ایک چھٹی لے کر تمہارے پاس بالکل اکیلا جاؤں گا اور تمہارے قریب لیٹ کر بیٹھ کر سکون حاصل کروں گا اور وہ بہت سی باتیں جن کو سن کر سچے دل سے صرف ایک ماں کا ہی دل کڑھ سکتا ہے تمہارے سامنے بیٹھ کر کروں گا۔ تمہیں اپنے لیے کڑھتا دیکھ کر ہی میرے زخم مندمل ہو جاتے۔

بچپن میں میرے چوٹ چپٹ لگ جاتی تھی' میں گھر بھر میں سے تمہیں ڈھونڈھ کر تمہارے گھٹنے سے لگ کر رو لیتا اور اپنے دکھ پر تمہیں کڑھتا ہوا دیکھ لیتا تو میرا دکھ آدھا ہو جاتا اور اب جو مجھے زندگی کی شدید ترین دکھوں نے ستا رکھا ہے تو تم نے یوں آنکھیں پھیر لیں۔ اماں جانی! میں واقعی تم سے ناراض ہوں۔''

اپنی ان سوچوں پر وہ خود ہی مسکرا دیئے۔ حقہ پرے کھسکا دیا اور برآمدے سے اتر کر ٹہلتے ہوئے باغ کی طرف نکل گئے۔ مالی پھولوں کی نئی موسمی پود کے لیے کیاریوں کی گوڑائی کر رہا تھا۔ ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بندگی صاحب!''

''بندگی! ارے بھئی مالی! تم نے چوسے کی نئی قلموں کا کیا انتظام کیا؟'' انہوں نے اپنی مخصوص ٹھہری ہوئے بھیگی بھیگی سی مہربان آواز میں ملائی سے دریافت کیا۔

''ہاں سرکار! نئی قلموں کا تو انتظام جروری کرنا ہے۔'' مالی نے اپنی بیٹھی بیٹھی چھوٹی اور فلسفیانہ آواز نکالی۔

''ہاں' بس اب ان کی خبر لے ہی لینا چاہیے۔ اب کوئی دن جاتا ہے جو لو چلنا شروع ہو جائے گی۔ چلو ذرا آموں کی طرف چلتے ہیں۔''

انہوں نے عادتاً دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے لے جا کر باندھ لیے۔ اور دھیرے دھیرے ٹہلتے ہوئے مالی کے ساتھ اس قطعے کی طرف چلے جدھر آموں کے پیڑ اور قلمیں لگی تھیں۔ یہ حصہ مرکزی باغ سے بالکل الگ بنگلے کے عقبی حصے کی طرف تھا۔ گھنے اور تندرست آموں کے جھنڈوں پر بور کی جگہ اب ننھی ننھی کیریوں نے لے لی تھی۔ مختلف جھنڈوں کے پیڑوں کے تنوں پر دسہری' سفیدے' سیندوری اور مختلف قسموں کی پہچان کے لیے چونے اور سفیدے سے مختلف نشان لگے ہوئے تھے۔ لیکن وہ اور ان کا مالی محض پیڑوں کی اٹھان اور پتوں کی ساخت ہی سے پہچان لیتے' یہ لنگڑا اور یہ فجری۔۔۔۔۔۔

''اب کے سال یہ لنگڑا بہت پھل لا رہا ہے۔''

''ہاں' دیکھو''

''ای لنگڑا بڑے بھیا کی پھر مائس پر لگا یا رے' مل آپ جا کر لندھن بیٹھ رہے۔'' مالی کی آواز میں بڑا املال تھا۔

''ہوں''

''صاحب! اب بھیا کو بلائے لو۔''

''کہاں مالی! اب تو بلانا ہی ممکن نہیں۔ سن نہیں رہے ہو وہاں کتنی لڑائی ہو رہی ہے۔ اب تو وہ وہاں فوج میں شامل ہو گیا۔''

''ہاں تو وہ لڑیں' ہمارا بھیا کیوں ان کی لڑائی میں بولے۔ آرام سے پانی والے جہاز میں بیٹھ کر آ جائیں۔''

وہ اپنی فکرمندی کے باوجود ہنس دیئے' مالی کی بے خبری اور معصومیت پر۔ اور اب یہ معصومیت اور بھولا پن بھی تو دنیا سے مفقود ہوتا جا رہا تھا۔

''ایک اس معصومیت پر ہی کیا منحصر ہے' زندگی کا ہر طور ہی بدل رہا ہے جو آج کل ہے وہ کل نہیں رہے گا۔ نہ وہ محبتیں رہیں اور نہ

زندگی کی وہ رونقیں۔اب یہی دیکھ لو ہم دو سگے بھائیوں اور تیسری بہن میں ہی وہ ربط ضبط نہ رہا جو ہمارے بزرگوں میں تھا۔نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی تھکی جا رہی ہو۔"

ان دنوں وہ کچھ سوچنے لگتے تو سوچتے ہی چلے جاتے۔اپنے خیالات کے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے وہ پھر سے چوسے کی قلموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اب تو یہ ہو گئیں۔۔۔۔۔۔۔کیوں!تمہارا کیا خیال ہے' لگ جائیں گی نا؟"

"بس سرکار' یہ گرمی جھیل گئے تو جانئے ہو گئے۔میں نے پھوس کی چھپریاں بنالی ہیں ان کے لیے۔ایک دو دن میں چھادوں گا۔"

"میں نے کہا' سارے گھر میں تلاش کر لیا اور بھائی صاحب یہاں کھڑے ہیں۔"اعظم بیگ نے اپنی کراری سی اور عزیز داری کو بڑی وضاحت سے جتائی ہوئی آواز میں ٹوکا۔

اور وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"آؤ بھیا! کب آئے؟ ہاں میں ذرا اس طرف یہ قلمیں دیکھنے آ گیا تھا۔"

"وہ تو مجھے چھوٹتے ہی خیال ہوا تھا کہ بھائی صاحب اپنے کمرے برآمدے میں نہیں تو پھر آموں کے پاس ملیں گے۔"

اعظم بیگ کھسیانی سی خوشامدانہ ہنسی ہنسے۔"اس لیے کہ بھائی ہمارے عاشق ہیں آموں کے تو۔۔۔۔۔۔"

جہانگیر مرزا نے اعظم بیگ کو جوان کے رشتے دار تو ضرور تھے پر رشتے کی نوعیت واضح نہ ہو پائی تھی' بڑے غور سے دیکھا۔صاف ستھرا کھلے پائنچوں کا پاجامہ' گریبان کڑھا ہوا اجلا جھاگ سا کرتہ اور کالی سلیم شاہی میں یہ میانہ قد اور نحیف الجثہ انسان خاصی آن بان کا نظر آتا تھا۔

اگرچہ جہانگیر مرزا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ مخصوص کرتہ اور پاجامہ وہ مدت سے پہن کر آ رہے ہیں اور کرتے کے کرارے پن اور اجلے پن کے باوجود اس کی بوسیدگی اور بودے پن کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں پھر بھی ان کی نفاست سے چنی ہوئی آستین' موسم کے اعتبار سے مہکتا ہوا خس' موتئے یا گلاب کا عطر' کلے میں دبی ہوئی گلوری سے پھوٹتی ہوئی درجہ اول کے قوام کی خوشبو سے ہمیشہ مرعوب ہو جایا کرتے تھے۔ان کو دیکھ کر ان کو قطعی یاد نہ رہتا تھا کہ اپنے اس نامعلوم اور موہوم سی قرابت رکھنے والے عزیز کا ماہانہ انہوں نے بیگم سے چوری چوری باندھ رکھا ہے اور یہ کہ یہ سب ان کی ڈینگ ہے۔ان کی اسٹیشنری کی دکان چلتی چلاتی خاک نہیں ہے

اور وہ اسٹیشنری کی دکان ہو تو چلئے' وہاں تو دس بیس تختیاں' پندرہ بیس سلیٹیں' ملتانی مٹی' کالی روشنائی کی پڑیاں' کلک کے قلم اور روشنائی پھیلنے والے کاغذ کی کاپیوں کے علاوہ نیلی روشنائی کی ٹکیاں ہوتی تھیں۔ مگر اعظم بیگ جن کو عام طور پر بیگ صاحب کہا جاتا تھا' اپنی اسٹیشنری کی بات کرتے ہی کب تھے۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو بڑے فنکارانہ انداز میں اپنے مخاطب یا میر مجلس کے مذاق کے مطابق وہ لچھے دار گفتگو کرتے کہ کسی کو بھی ان کی دکان کی تختیوں اور سلیٹوں کا خیال نہ آتا۔

''ارے بھئی بیگ صاحب! تم خوب وقت سے آئے۔ میں تم کو یاد ہی کر رہا تھا۔''

''میں ہمیشہ ہی وقت پر آتا ہوں۔ کم سے کم آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ یہ بھی بھائی صاحب اخلاق کی اور محبت کی انتہا ہوتی ہے کہ آنے والا یہی خیال کرے کہ اس کا آنا بار خاطر تو ایک طرف رہا عین آرزو کے مطابق ہے۔''

''ارے نہیں' بیگ صاحب! آج تو تم وقت ہی پر آئے۔ میں کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ذکر کروں گا کہ ہمارے دسہری کی گٹھلی کچھ بڑی ہونے لگی ہے۔''

''دسہری کی گٹھلی۔۔۔۔۔۔۔ یعنی آپ کے باغ کے دسہری کی؟''

''ہاں ہاں' یہی ان پیڑوں کی۔''

''یہ واقعی تعجب ہے کہ آپ جیسا دیکھ ریکھ کرنے والا شخص اور اس کے دسہری کی گٹھلی خراب ہو جائے۔'' مارے جوش کے بیگ صاحب کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔

''نہیں میاں' مجھے دیکھ ریکھ کا موقع ہی کب ملتا ہے۔''

''یہ تو کچھ خدا رکھے ہمارے شہریار کا شوق زیادہ تھا۔'' بیگ صاحب نے آنکھیں مٹکائیں۔ ''اور اب وہ جم ہی جم ہیں۔''

''ہاں اور میرا تو تم جانو کہ گھر پر رہنا ہی کتنا ہوتا ہے۔''

''جی ہاں! جی ہاں! آپ کا تو زیادہ وقت دوروں ہی میں گزرتا ہے اور جو بچتا ہے تو وہ بھائی ہمارے جنگل جنگل اور گھاٹ گھاٹ گزارتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب شکار سے ہے۔''

بیگ صاحب ہنس دیئے۔

''میاں! یہی تو ہمارا ایک شغل ہے۔ برج اور شکار ہی تو میری زندگی کی تمام عیاشیوں کے حساب کتاب میں درج ہوں گے۔ باقی

تو ہر شق خالی ہی جائے گی۔"

اعظم بیگ ہنس دیئے۔

"ہاں تو بھئی' بتایا نہیں تم نے کوئی علاج۔۔۔۔۔۔۔میرا تو دل ان پیڑوں ہی سے کھٹا ہو گیا' جی چاہتا ہے نئی قلمیں لگواؤں۔"

"یہ تو ہئی' قلم تو برابر سے ہر قسم کی موجود رہنا چاہیے۔"

"تو ان کا اب کوئی علاج نہیں؟" جہانگیر مرزا نے مایوسی سے کہا۔

بیگ صاحب کو اب اپنی اہمیت کا واقعی احساس ہونے لگا تھا۔

"اصل بات یہ ہے بھائی صاحب کہ گٹھلی کی خرابی کا مطلب یہ سمجھئے کہ جڑ میں روگ ہے اور جڑ میں خرابی کی بہت سی وجوہ ہوتی ہیں۔"

دھیرے دھیرے ٹہلتے اور بیگ صاحب سے باتیں کرتے ہوئے وہ برآمدے میں واپس آ گئے۔

"ارے بھئی غفور' ذرا حقہ تو تازہ کر کے لاؤ۔ وہ اول نمبر تمبا کو رکھنا۔ وہی بیگ صاحب کے لیے جو خاص ڈبا رہتا ہے' اس میں سے۔"

وہ ان کو لیے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ ان کو اپنے گھر کبھی بھی کسی کا آنا نہ کھلتا تھا۔ بیوی کا موڈ خراب ہو جانے کے باوجود وہ آنے والے کو دیکھتے ہی شاد ہو جاتے تھے۔ لیکن بیگ صاحب کی طرف تو وہ خصوصیت سے متوجہ ہو جاتے تھے' تا کہ ان کو اپنی قرابت کی دوری اور حیثیت کی کمی کا احساس نہ ہونے پائے۔

"بھائی صاحب! آم تو ہم نے اپنے ایک صاحب کے باغ کا کھایا' ویسی خوشبو اور مزہ پھر کبھی نہ دیکھنے میں آیا۔"

"آم کی قسم تو محنت اور ریاض سے بنتی ہے بیگ صاحب! اور ہم جیسے تو محض اناڑی ہیں۔ آم کی شجر کاری تو ایک مستقل فن ہے۔"

"بالکل' بالکل" بیگ صاحب نے گردن چلائی۔ "یہ تو ایک علم ہے۔"

"یہ تو کہئے بھائی صاحب کچھ میاں شہریار کے آنے کی بھی خبر ہے؟" بیگ صاحب نے تشویش سے دریافت کیا۔

"آنے کی خبر۔۔۔۔۔۔" وہ ہنسے۔ "تو یہ کہو تمہیں جنگ کے رنگوں کی کچھ خبر نہیں ہے۔"

"خوب بھائی صاحب' یہ خوب کہا۔ اے جنگ کے رنگ تو ہم ہی دیکھ رہے ہیں' رزق ہمارے حصے کا اڑ گیا۔ ہر چیز پر کنٹرول ہو گیا سرکار کا۔"

جہانگیر مرزا نے اخبار اٹھایا۔ دراصل اب وہ شہریار کے ذکر سے کچھ چڑ جاتے تھے۔ ارے ہاں' اچھا بھلا لڑکا وہاں گیا اور جا کر بیٹھ رہا۔ وجہ کچھ نہ معلوم ہوئی۔ اور اب تو صاحبزادے نے اپنی جنگی خدمات بھی پیش کر دی ہیں۔ اب تو اس کا نام سنتے ہی ان کو طرح طرح کے وہم ستانے لگتے۔ دوسرے وہموں کے ساتھ ساتھ یہ وہم تو ان کے دل میں جم چکا تھا کہ وہ آئے گا کیوں نہیں ۔۔۔۔۔۔ ضرور آئے گا' پر مجھے اس کی شکل دیکھنا اب شاید نصیب نہ ہو۔''

اور جب اصرار کے باوجود بیگ صاحب کھانے کے لیے نہ رکے تو وہ اٹھے' دراز میں سے ایک بند لفافہ نکالا اور بیگ صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس میں دس دس کے چار نوٹ تھے۔ آج مہینے کی پانچ تاریخ تھی نا۔

ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو ایسا ہی ایک بند لفافہ ان کے ہاتھ سے سرک کر چپکے سے بیگ صاحب کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ یہ کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔

بیگ صاحب کے جانے کے بعد وہ کھڑکی کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ اس کھڑکی کے کنارے سے یہاں سے وہاں تک ان کی اپنی زمین اور اپنا مکان پھیلا ہوا تھا۔ باغ پر بہار آئی ہوئی تھی۔ ان کی پسندیدہ قلموں کے پیڑ کیریوں سے لدے پھندے کھڑے تھے۔ ابھی دو چار دن ہوئے ان کی بھینس نے کٹی دی۔ کنوئیں میں بجلی کی مشین چل رہی تھی اور گھر کا نظام بڑی خاموشی اور پابندی سے ہو رہا تھا۔ ہر طرف سکون تھا اور خاموشی۔

ماسوا ان کے غمزدہ دل کے' ان کے بچے منتشر اور پراگندہ تھے۔ وہ ان میں سے کسی طرف سے بھی مطمئن اور مسرور نہ تھے۔

''اے کاش! مجھے یہ سب کچھ میسر نہ ہوتا' مگر میرے بچوں اور ان کی ماں کے درمیان مفاہمت ہوتی۔ اے کاش! میں ان کے لیے ایک اجنبی کا درجہ نہ رکھتا۔ کتنی سچی بات کہی ہے بیگ نے ۔۔۔۔۔۔ گٹھلی کی خرابی کا مطلب یہ سمجھئے کہ جڑ میں روگ ہے اور جڑ کی خرابی کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔''

باب ۴۰

گیتی کے امتحان نزدیک آ گئے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا' اس کا دل گھر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ تمام سال وہ گھر نہ گئی تھی۔ وہ اپنی ضد سے آئی تھی اس لیے اس کو دسمبر اور بہار کی چھٹیوں میں بھی اماں بیگم نے نہیں بلوایا تھا۔ وہ تمام چھٹیاں اس نے ہوسٹل

ہی میں گزار دی تھیں۔ شروع شروع میں تو وہ خود بھی سخت بد دل تھی اور ان سے اس کو شکایت بھی تھی کہ ان لوگوں نے اس کی غلطی پر اس کو برا بھلا کہنے کی بجائے مسعود کی توہین کی اور اس کا دل دکھایا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ وقتی غصہ اور شکایت اس کے دل سے ڈھلتی چلی گئی۔

وہ ان کو ہر دوسرے ہفتے پابندی سے خط لکھتی تھی۔ جس کے جواب بھی اس کو ملتے رہتے تھے اور جب اس کو معلوم ہوا کہ اماں بیگم کا ارادہ اس کو کسی چھٹی میں بھی بلانے کا نہیں ہے تو وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ حسب عادت اس کو اس بے کہے پن کی سزا دے رہی ہیں تا کہ اگر اب وہ کہیں تو وہ چپ چاپ سے ان کی مرضی کے مطابق کالج میں داخلہ لے لے۔ اس کو معلوم تھا کہ اماں بیگم سوائے آئی ٹی کالج کے اس کو کہیں بھیجنا پسند نہیں کریں گی اور جو سوچ پوچھو تو وہ ان تمام باتوں پر دل سے راضی تھی۔ بھلا کوئی لڑکی بھی یوں اپنے ماں باپ کو ناراض کر کے اور ان کے خلاف جا کر خوش رہ سکتی ہے۔

اور پھر جب اس کو طلعت کا خط ملا اور اس کو معلوم ہوا کہ مسعود کی منگنی ہوگئی ہے اور وہ تھوڑی سی وقتی ناراضی کے بعد اب خوش ہے' یہاں تک کہ اس نے کامنی سے یہ فرمائش بھی کی ہے کہ تم یوں سوگوار چہرہ بنا کر نہ رہا کرو میں مر تو نہیں گیا۔۔۔۔۔۔۔ تو اس کو بالکل ہی اطمینان ہوگیا۔ اس کو دلی خوشی تھی کہ مسعود اس کی وجہ سے اپنی زندگی اجاڑ کر اور دنیا کو تج کر نہیں بیٹھا۔ اور جو ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ کتنی شرمسار ہوتی۔ اب رہی یہ بات کہ مسعود نے اس کے خیال کو اپنے دل سے نکال دیا اور اب اس کی زندگی میں اس کے خیال اور تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تو یہ سب تو اپنے دل کے معاملے اور باتیں ہوتی ہیں جن کو دھیرے دھیرے بھلایا بھی جا سکتا ہے اور سکون پذیر بھی کیا جا سکتا ہے۔

تو قصہ یہ تھا کہ اس کو اب کسی سے بھی کوئی شکایت نہ تھی اور وہ اب کسی سے بھی خفا نہ تھی۔ اس کو تو بس اب امتحان اور اس کے بعد ہونے والی چھٹیوں کا انتظار تھا۔ اس لیے کہ ابا میاں نے بھی یہی لکھا تھا۔ ''بس اب تم گرمیوں کی چھٹیوں ہی میں آنا۔ میں نے اور تم نے تمہاری اماں کی مرضی کے خلاف جو حرکت کی ہے ان کی ناراضی کے لیے وہی بہت کافی ہے۔ اب ان کو خوش کرنے کی یہی ترکیب ہے کہ جیسا وہ چاہتی ہیں وہی کرو۔ واقعی یہ میری اور تمہاری زیادتی تھی۔ ہم کو ایک دوسرے کے مشورے اور مرضی کا احترام ضرور کرنا چاہیے۔''

اور گیتی اس احترام پر راضی تھی۔ گھر سے اتنے دن تک دور رہنے نے اس کو ماں کی اہمیت کا احساس دلا دیا تھا۔

امتحان نزدیک تھے۔ اب اس نے باہر جانا بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔ بہت دن سے وہ چاچی کے پاس بھی نہیں گئی تھی۔ اب تو وہ گھر

پہنچنے کے خیال میں مگن تھی۔ اڑتے ہوئے وقت کے لحظہ لحظہ اور لمحہ لمحہ کا حساب رکھ رہی تھی۔

''توبہ ہے' یہ وقت بھی کتنا سست ہے' بالکل کچھوے کی چال چلتا ہے۔'' وہ اکتا کر کئی بار سوچ چکی تھی۔

''جب میری چھٹیاں ختم ہونے لگیں گی تو اس کی شروع ہوں گی۔ بھئی واہ' یہ بھی کوئی بات ہوئی۔'' ارجمند نے کڑھ کر سوچا۔

اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ پنجاب کے موسمی تقاضے اس کے علاقے سے خاصے مختلف ہیں۔ باوجود اس کے کہ گیتی اپنے خطوں کے خاتمے میں دو ایک سطریں ضرور موسم کے متعلق لکھتی رہتی تھی۔ مثلاً یہ کہ ''ارجمند! یہاں اتنی سردی ہے کہ تم یقین بھی نہ کروگی۔ تم تو وہاں زیادہ سے زیادہ ایک فل سلیوز سویٹر پہن کر گھوم لیتی ہوگی اور ہم یہاں سویٹر اور کوٹ پہن کر بھی کپکپاتے رہتے ہیں۔'' پھر مارچ کے آخر میں اس نے لکھا تھا۔ ''رات کا وقت ہے اور میں خیال ہی خیال میں دیکھ رہی ہوں کہ تم سب کے پلنگ اندر والے چبوترے پر بچھے ہوں گے اور ہم یہاں ابھی کمروں ہی میں سو رہے ہیں۔''

لیکن جب وہ گیتی کی آمد کے متعلق سوچتی' ایک خوف سا اس کے دل میں ابھرنے لگتا۔ اکبر کم بخت نے فضول ہی آ کر اماں بیگم کو پھر سے ناراض کر دیا اور اب جب وہ آئے گی تو ایک ہنگامہ مچے گا۔ اب خاصی ان کی خفگی ختم ہو گئی تھی اور وہ خود بھی گھر آنے کے خیال سے کس قدر خوش ہے۔

سنہری بالوں اور خوبصورت آنکھوں والی ارجمند ہنگاموں اور ناچاقیوں سے جس قدر گھبراتی تھی اسی قدر اس گھر میں ہنگامے برپا رہتے تھے۔ اماں بیگم کا مزاج گرم اور بے حد عملی تھا۔ وہ کسی کی ذرا سی لغزش کو بھی معاف نہ کر سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ اپنے مزاج کے خلاف کسی کی زبان سے نکلا ہوا ایک حرف بھی ان کو اس وقت تک کھٹکتا رہتا جب تک کہ ایک معرکہ نہ ہو جائے۔

مگر یہ بھی اس کا وہم ہی وہم تھا۔ اماں بیگم کے غصے اور برہمی کی ایک حد یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ وہ اس شخص کی طرف سے قطعی خاموشی اور بے نیازی اختیار کر لیا کرتی تھیں۔ اور اب اس سلسلے میں تو وہ ابا میاں پر اس قدر بول بک چکی تھیں کہ دل کا سارا غبار نکل چکا تھا۔

اور پھر ارجمند کے سوا ان کی تمام اولادیں ان سے اتنے عرصہ سے دور تھیں کہ وہ ان کے لیے راتوں کو بے چین رہنے لگی تھیں۔ اور گیتی نگوڑی کو انہوں نے بارہا خواب میں بے حد پریشان اور بیمار دیکھا تھا۔ اپنی انتہائی خفگی کے باوجود تقریباً ہر رات کو وہ آیت الکرسی پڑھ کر شہریار کے ساتھ ساتھ اس کو بھی حصار میں دے دیا کرتی تھیں۔ اور اب تو وہ آ ہی رہی تھی۔ انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ بس بہت رہ لی بورڈنگ میں' اب اس کو واپس تو بھیجنا نہیں ہے۔ یہاں نہیں پڑھے گی تو پھر بمبئی بھائی جان کے پاس بھیج دوں گی۔

مگر ارجمند کو ان کے دل کے حالات کا علم تھوڑی تھا' جوں جوں گیتی کے آنے کے دن قریب ہوتے جا رہے تھے وہ وہ اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

اور جس صبح وہ بغیر اطلاع پہنچی ہے تو ارجمند نے جو اس وقت صبح کی نماز کے لیے غسل خانے میں وضو کرنے گئی تھی' اس کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا مختصر سا سامان ایک بستر' ایک بکس اور اٹیچی کیس برآمدے میں پڑا تھا اور وہ اپنے چھوٹے سے چرمی بٹوے میں سے ریز گاری گن کر تانگے والے کو دے رہی تھی۔

ٹھن ٹھناک کر کے لوٹا ارجمند کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بے انتہا خوفزدہ تھی۔ اس نے ادھ کھلے کواڑ میں سے جھانک کر دیکھا۔ گیتی کا چہرہ جو پہلے سے بہت دبلا اور زرد ہو گیا تھا۔ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

وہ دھیرے سے غسل خانے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔ اور ایک لفظ کہے بغیر اس نے اپنی بہن کو گلے سے لگا کر اس کی گردن اور پھر پیشانی کو چوم لیا۔

''ارجمند!'' گیتی کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''تم نے اطلاع تو کر دی ہوتی' گاڑی تم کو لے آتی۔''

''تو کیا واقعی مجھے گاڑی لینے آ جاتی؟'' گیتی نے حیرت سے پوچھا۔

ارجمند کو اپنی بات پر خود یقین نہ تھا۔ اس لیے اس کی بات کا جواب دینا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔ چوکی پر جا نماز اسی طرح بچھی رہی اور وہ اس کے قریب کھڑی اس سے مختلف سوالات کرتی رہی۔

اچانک گیتی نے چونک کر پوچھا۔

''ارجمند! تم شاید نماز پڑھنے جا رہی تھیں۔''

''ہاں' بس میں وضو کرنے ہی تو آئی تھی غسل خانے میں' کہ تانگے کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی۔''

''تو پھر پڑھ لو نا نماز۔''

''ہاں! اب وقت تو کم رہ گیا ہے۔ تمہارا سامان تو اندر آ لے۔''

''تم باقاعدہ ساری نمازیں پڑھتی ہو؟''

''ہاں۔۔۔۔۔۔۔ اور تم؟'' ارجمند نے جھینپ کر کہا۔ اس لیے کہ گیتی اس کی ساری اچھی عادتوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

''ہاں' پڑھ تو لیتی ہوں مگر ساری نہیں۔صبح کو تو آنکھ ہی نہیں کھلتی۔مگر عشاء کی نماز تو میں ضرور پڑھتی ہوں۔''

''یہ کیوں؟''

''بس عادت جو ہوگئی ہے۔''

ارجمند حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔سب کے ساتھ ساتھ وہ بھی گیتی کے متعلق بدگمان ہوگئی تھی۔اس کا خیال تھا کہ وہ ہر چیز سے بیگانہ ہوگئی ہے اور سب سے مختلف راہ پر چلتی ہے۔اس کے باوجود وہ اس کو انتہائی محبت کا مستحق سمجھتی تھی۔

اور اب ارجمند کے سامنے گیتی کے سامان کا مسئلہ درپیش تھا جو ابھی تک برآمدے میں پڑا ہوا تھا۔

وہ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے گیتی سے کہہ رہی تھی کہ تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہ کی جو گاڑی تم کو لے آتی۔اب اتنی ہمت اپنے آپ میں نہ پا رہی تھی کہ کسی ملازم سے کہے کہ اس کا سامان کمرے میں لے آئے اور گیتی پر وہ یہ ظاہر بھی نہ کرنا چاہتی تھی کہ اماں بیگم گزشتہ تمام ہفتے اس کی شکل سے بیزاری کا اعلان کرتی رہی ہیں اور ایسے وقت میں جب کہ ابا میاں علاقے پر گئے ہوئے ہیں ان کا رویہ گیتی کے ساتھ کیسا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔کون جانے!

وہ آہستہ سے کمرے کے باہر نکل گئی اور اس کا بستر بدقت تمام اٹھا کر غسل خانے کے راستے داخل ہوئی۔

''ارے!یہ تم کیوں اپنے اوپر لاد کر لا رہی ہو؟'' گیتی کچھ نہ کچھ سمجھ کر چونکی۔''میں اٹھائے لاتی ہوں اپنا سامان۔''

اتنے عرصے تک گھر سے باہر رہ کر وہ ارجمند سے کہیں زیادہ سمجھدار اور معاملہ فہم ہوگئی تھی۔

وہ دونوں بکس پکڑوا کر لائیں اور اسی پر بیٹھ گئیں۔

وہ بات جو دونوں پر صاف روشن تھی' اس کے متعلق ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔

ارجمند سوچ رہی تھی۔''مگر یہ سب کتنی دیر کے لیے؟'' ناگواری سے بہرحال اسے دوچار ہونا ہے۔پھر بھی یہ اس کا اپنا گھر ہی تو ہے۔آخر یہ یہاں اس طرح چوروں اور ناخواندہ مہمانوں کی طرح کیوں آئی ہے؟''

اور وہ یہ سوچ رہی تھی ''تو کیا سال بھر تک اپنی سرکشی اور بے جا ضد پر نادم رہنے اور اس ارادے کے باوجود جو کچھ اماں بیگم کہیں گی وہی کروں گی اب بھی میرے لیے اس گھر میں جگہ نہیں؟ تو آخر میں کہاں جاؤں گی؟''

''چلو' تم منہ ہاتھ تو دھولو۔'' ارجمند نے اس سے کہا۔

''ہاں'' وہ گہری سوچ میں غرق تھی۔''میں نہاؤں گی۔ٹھیک ہے تم' اتنے میں نماز پڑھو میں نہاتی ہوں۔''

غسل خانے سے چھل چھل پانی گرنے کی آواز آتی رہی اور ارجمند کا دل نماز میں بھٹکتا رہا۔ اب وہ نہا کر نکلتی ہے۔ ذرا دیر میں اماں بیگم اپنی نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ جائیں گی اور پھر گھنٹی بجے گی جس کی آواز کے ساتھ ہی گھر والوں کا میز پر پہنچنا اس گھر میں اشد ضروری تھا۔

اور ان دنوں گھر میں تھا ہی کون ان کے سوا۔ وہ ہی تو ان دنوں اماں بیگم کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ناشتے یا چائے کی میز پر ختم کئے ہوئے ناشتے کی پلیٹ اور پیالی کے آگے سر جھکائے اپنے خوبصورت گلابی ناخنوں سے کھیلتی اور بڑی بڑی آبدار آنکھوں میں آنسو بھرے گیتی کی نافرمانیوں اور بدعنوانیوں پر اس کے بدلے پھٹکاریں سنتی ہوئی وہ دیر دیر تک ان کے سامنے بیٹھی رہتی تھی۔

اور اب آج وہ کیا انتظام کرے جو گیتی کے پہنچتے ہی ہونے والا ہنگامہ فرو ہو جائے۔ وہ ایک کے بجائے تین سجدے کر گئی اور جلدی جلدی سلام پھیر کر پھر سے نیت باندھ لی۔ ناگوار باتوں سے فرار کا ایک یہ بھی راستہ ہے کہ انسان پوری لمبی نماز پڑھے اور ساتھ ہی رکوع اور سجود کے وقفے طویل کر دے۔

ارجمند کو طویل رکوع و سجود میں لطف و کیف آ رہا ہو یا نہ ہو لیکن گیتی کو تمام رات کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہوئے لطف آ رہا تھا۔ تھکا ہوا' گھبرایا ہوا اور ڈرا ہوا جسم اور طبیعت' خنکی اور نرمی کے احساس کا ہی تو متلاشی ہوتا ہے۔

پانی کی چھل چھل کے درمیان میں گیتی کی دھیمی دھیمی گنگناہٹ کو سن کر ارجمند نے سوچا' میں اماں کے خوف سے اپنی نماز کو طول دے رہی ہوں اور گیتی دھیرے دھیرے سے نہا کر وقت ٹالنا چاہتی ہے۔ توبہ ہے میری! اس نے پھر نماز ختم ہونے سے پہلے سلام پھیرا' اس لیے کہ وہ التحیات کے بدلے الحمد پڑھ گئی تھی۔

''اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان کو نیکی اور سعادت مندی سے رہنا چاہیے۔ اب یہ گیتی کی وجہ سے بار بار میری نماز بھی خراب ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ فضول کی گناہگاری۔'' اس نے کڑھ کر سوچا۔

اور گیتی نے خنک اور خوشگوار پانی کی سرسراہٹوں کو محسوس کر کے سوچا۔ ''نرمی اور خنکی کے احساس میں کسی درجہ عفو اور درگزر کا احساس ہوتا ہے۔ پانی میں کتنا تقدس ہے۔''

اس کے چینیوں کے سے سیدھے اور سیاہ بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں بھیگ کر اور بھی سیاہ ہو گئی تھیں اور آنکھوں تک بکھر آئی تھیں۔ ان میں سے بہتی ہوئی پانی کی پتلی پتلی دھاروں کو اس نے اپنے لبوں پر محسوس کیا اور پھر دھیرے دھیرے ہونٹوں سے چوستے ہوئے سوچا۔ ''شاید اسی لیے ہندو اشنان کر کے محسوس کرتے ہیں کہ ان کے پاپ دھل گئے اور میں نے بھی تو گناہ کیا تھا' اپنی ماں کی نافرمانی

کرکے۔"

اور اس نافرمانی کے بعد سال بھر تک بے شمار نہا لینے کے باوجود اس وقت گھر کے لطیف اور خنک پانی سے نہا لینے کے بعد اسے اپنی معصومیت کا احساس ہو رہا تھا' جیسے گنگا یا ہردوار کے مخصوص گھاٹوں اور پانیوں سے نہا کر تقدس اور پوترتا کا احساس یاتریوں کو مطمئن کر دیا کرتا ہے اور اپنے گھر سے بڑی یاترا ابھی کوئی ہے۔ دلوں کے کعبے تو گھروں ہی میں ہوا کرتے ہیں۔

طمانیت کے ہلکے پھلکے احساس کے ساتھ وہ غسل خانے سے نہا کر نکلی۔ اس نے دیکھا' ارجمند آنکھیں بند کئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہے۔

"ارے! یہ اس وقت اس نے کون سی دعا مانگی ہوگی؟" وہ مسکرائی۔

بال آخر وہ گھنٹی بھی بج گئی جس کا تصور ارجمند کی نماز خراب کر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر گیتی کی طرف دیکھا جو سلک کے انگوری رنگ کے ڈھیلے پاجامے' سفید کرتے اور چنے ہوئے انگوری دوپٹے میں بڑی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"آج میں نے ایک مدت کے بعد غرارہ پہنا ہے۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے۔"

"ارے! تم کھڑے پاجامے کو غرارا کہنے لگیں؟"

ارجمند نے صرف اپنی بے چینی چھپانے کی غرض سے اعتراض کیا۔

"ہاں' بس غرارا ہی ٹھیک ہے۔ چلو ارجمند ناشتے کی گھنٹی ہوگئی۔" اس نے اس اطمینان سے کہا جیسے اتنی مدت بعد وہ نہیں' ارجمند آئی ہے۔

ارجمند کے چہرے کی سراسیمگی محسوس کر کے وہ دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہی ہوتا تھا۔ شرارت وہ کرتی تھی اور سہا ارجمند کرتی تھی۔

وہ دونوں ناشتے کے کمرے میں پہنچیں تو ہر بات ارجمند کی توقع کے خلاف ہوئی۔

اماں بیگم گیتی کو اچانک دیکھ کر اندرونی طور پر چونکنے کے باوجود بڑے اطمینان سے چائے دان اور پیالیوں والے سرے پر بیٹھی رہیں جیسے وہ یہیں موجود تھی اور ہر روز دونوں بہنیں ناشتے پر اسی طرح آتی ہوں۔"

نزدیک پہنچ کر دونوں نے صبح کا سلام کیا تو انہوں نے گیتی کو خاموشی سے گلے لگایا اور آہستہ سے بولیں۔

"تم کس وقت پہنچیں؟"

''ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔''

''ہاں' میں نے تانگے کی کھڑکھڑاہٹ تو سنی تھی' اطلاع کر دیتیں تو گاڑی لے آتی جا کر۔''

اور اتنی ہی بات پر اس کے آنسو بہہ نکلے۔

انہوں نے اس کے سیاہ بالوں پر پیار کیا اور چائے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

یہ اولاد کم بخت بھی عجب چیز ہوتی ہے اور واقعی سچ کہتے ہیں ان کے ابا کہ سختی سے تو اور ضد پکڑتی ہے۔ ان کی خوبصورت آنکھوں میں نامعلوم طور پر نمی آ گئی تھی اور گلا بھر رہا تھا۔

ارجمند نے دیکھا چائے دان ان کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ ناشتے کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے لوازم وہ اپنی جڑواں بیٹیوں کو توجہ سے دیتی رہیں۔

بچے یوں ارد گرد بیٹھ کر کھاتے ہوئے کس قدر اچھے لگتے ہیں اور بڑے ہو جانے کے باوجود کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ مدت کے بعد وہ اشتہا اور شوق سے ناشتے کی مختلف چیزیں کھاتی رہیں۔ اس صبح ناشتہ کتنی دیر میں ختم ہوا تھا۔

''اللہ میاں نے میری دعا سن لی بلکہ جو کچھ مانگنے اور تمنا کرنے کی میں ہمت بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ بھی پوری کر دی۔'' ارجمند کو اپنی صبح کی نماز کے خراب ہونے کا ملال جاتا رہا۔

''ہاں' گھر ہی تو سب سے بڑا تیرتھ ہے۔ دلوں کے کعبے گھروں ہی میں بنا کرتے ہیں۔'' گیتی نے برآمدے کے تخت پر رکھے ہوئے ترکاری کے طشت کے قریب بیٹھ کر اماں بیگم کے ساتھ ترکاری بناتے ہوئے سوچا تھا۔

رات کو سوتے وقت انہوں نے جب شریف کو تاکید کی کہ ''دیکھو سوتے وقت چھوٹی بٹیا کو اوولٹین اور دودھ ضرور دے دینا اور ہر رات کو دیا کرو' بہت زرد ہو رہی ہے۔'' تو شریف نے سوچا۔ ''میں نے تو سنا تھا کہ بیگم صاحب چھوٹی بٹیا سے ناراض ہیں۔ یہ خانساماں بھی بس بے پر کی اڑاتا ہے۔''

باب ۴۱

ہر طرف لوبان اور اگر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اندر اور باہر کے برآمدوں میں ابھی تک دری اور سفید چاندنیوں کا فرش ہو رہا تھا۔

الائچی دانے اور چنے سمیٹے جا چکے تھے اور سیپارے جمع کر کے اونچی جگہ پر رکھ دیئے گئے تھے۔ اندر کی طرف کمروں میں قیمتی لیکن صوفیانے کپڑوں میں ملبوس بیویاں جگہ جگہ پر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ باہر مردانے میں مولوی جا چکے تھے اور آنے والوں کی موٹریں بھی رفتہ رفتہ سرک گئی تھیں۔ اس لیے کہ باہر مردانے میں کوئی موجود ہی نہ تھا سوائے بختیار کے جو رات ہی پہنچا تھا اور بڑے ابا ابھی ابھی تھوڑی دیر ہوئی آ کر اترے تھے۔ اور اس اچانک واقعے نے ان کی طبیعت پر ایسا اثر کیا تھا کہ سب نے ان کو لیٹ جانے کا مشورہ دیا تھا اور بختیار اس وقت ان ہی کے پاس خاموش بیٹھا تھا' ان کی بند آنکھوں اور مرجھائے ہوئے چہروں کو تکتا ہوا۔

اماں بیگم سفید کپڑوں میں ملبوس اپنی مسہری پر نیم خوابیدہ حالت میں لیٹی تھیں۔ پنکھا تیزی سے چل رہا تھا اور ان کے کپڑوں سے خس کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو اڑ کر پورے کمرے میں پھیل رہی تھی' جو طبیعت کو بحال رکھنے کے خیال سے کسی نے ان کو لگا دی تھا۔ ان کی مسہری کے قریب ہی مصری چمڑے کی گول سیٹ پر ارجمند بیٹھی ان کے خوبصورت سڈول ہاتھوں کو دبا رہی تھی جو آج سنہری چوڑیوں سے خالی تھا۔

اور گیتی سب سے الگ کمرے میں پلنگ پر اوندھی لیٹی تھی۔ اس نے تکیے میں دھنسا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے پپوٹے سوج رہے تھے اور چہرہ بھر بھرایا ہوا تھا۔ گھر بھر میں ایک وہی تھی جس کے کپڑے واقعی میلے ہو رہے تھے۔ آج تیسرا دن بھی آدھا گزر جانے کے باوجود اس کے دل کی بے قراری ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے سوجی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔

''یوں بھی کبھی ہوا کرتا ہوگا ابا میاں۔۔۔۔۔۔۔ کہ دورے پر سے کسی کی لاش واپس آئے۔ تم نے تو حد کر دی' مجھ سے ملنے کی ذرا بھی تمنا نہ تھی تم کو۔ اور میں نے سال کا ایک ایک دن گن گن کر کاٹا ہے۔''

اچانک ہی اس کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ ان کے سامنے کھڑی بورڈنگ جانے کی ضد کر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ان کی آواز گونج رہی تھی۔

''اچھا بیٹی! تو پھر یوں کرتے ہیں کہ تم کو لاہور کے کنیرڈ کالج میں داخلہ دلوا دیتے ہیں۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔''

وہ دراز قد خوبصورت سراپا اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ مغلیہ خدوخال شاندار مونچھیں اور بالوں کی سیاہی میں کروٹیں لیتی ہوئی بڑی پروقار سفیدی' وہ ساری وجاہت اور آن بان اس کے پیش نظر تھی۔

''ہائے رے میرے باپ!'' اس نے پھر تکیے میں اپنا منہ چھپا لیا۔ ''اور جو مجھے پتہ ہوتا کہ اس کے بعد تم پھر مجھے نہیں ملو گے تو

میں کا ہے کو تم کو چھوڑ کر جاتی۔ میں واقعی بڑی کم بخت ہوں۔''

اس کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ خود کو بہت تنہا اور غیر محفوظ تصور کر رہی تھی۔

حادثہ تو پورے خاندان پر گزرا تھا مگر گیتی اس کو ذاتی اور انفرادی حادثے کے طور پر لے رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے غم میں کوئی شریک نہ تھا۔ بختیار اور ارجمند اس وقت سے اماں کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے اور وہ سب سے الگ الگ کنارے کنارے بیٹھی رہی تھی اور ماں نے یہ بات شدت غم میں بھی محسوس کی تھی کہ وہ اس غم کو الگ تھلگ ہو کر منا رہی تھی اور جب کسی نے بڑے ابا کی آمد کا سن کر اس کو مشورہ دیا تھا کہ جاؤ بیٹی چچا کے گلے لگ کر رو لو تو اس کو یہ مشورہ قطعی بے جا لگا۔ بڑے ابا کو ایسی کیا دلچسپی تھی ان سے ہم سے۔ برسوں برسوں نہیں آتے تھے۔ نہ بھائی کی خبر لیتے تھے۔ مل گئے تو بہت خوش ورنہ کچھ نہیں۔ مجھے ان کے گلے لگ کر اور ابا کی یاد آئے گی۔

''اور اب صولت آپا آ کر ایک گڑبڑ مچائیں گی۔ فضول میں کنٹرول شروع کر دیں گی۔'' صولت کی آمد کا تار دیکھ کر اس نے سوچا۔ بیاہی ہوئی سمجھدار بیٹی کو دیکھ کر اماں بیگم چیخیں مار مار کر روئیں۔ اس وقت تک انہوں نے کمال کا ضبط کیا تھا۔ دونوں بچیوں کے خیال سے' ارجمند اپنا غم اور ملال بھول کر ہر کسی کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔

رو دھو کر اور کچھ دیر نڈھال پڑے رہنے کے بعد صولت اپنے حواسوں میں آ گئی۔ نہائی دھوئی اور گھر کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی اور اب اماں بیگم ایک بچے کی طرح اس کے ہاتھوں میں آ گئی تھیں۔ وہ بڑی ہراساں تھیں۔ ایک تو اتنا اچانک اور غیر متوقع حادثہ اور پھر جو در حقیقت ان کو اور گھر کو سنبھال سکتا تھا ان سے ناراض اور دور تھا۔

صولت نے گھر کا انتظام اپنے ذمہ لیا۔ تو ارجمند کو اپنے اور گیتی کی طرف نظر کرنے کی فرصت ملی۔ اور اس کو اپنے آپ پر تعجب تھا۔ وہ جو عام زندگی میں بے حد کمزور خیالات کی جلدی گھبرا جانے اور سہم جانے والی لڑکی تھی۔ اس حادثے کے وقت سب سے زیادہ مضبوط ارادے اور حواس کا ثبوت دے رہی تھی۔ اس نے اس اچانک حادثے کو ایک ہونی اور فطری بات کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ وہ بڑے صبر و استقلال سے صولت کی آمد تک گھر کی دیکھ بھال کے علاوہ اپنی ماں کو سنبھالتی رہی تھی اور اس کے برعکس گیتی جو بہت نڈر اور حادثوں کی شوقین اور جسمانی طور پر اس سے مضبوط تھی' اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اور اب ہر طرف سے فرصت پا کر ارجمند کو محسوس ہوا کہ سب سے زیادہ توجہ کی مستحق گیتی ہی تھی۔ غم نے اس کو ظاہری طور پر نڈھال نہیں کر دیا تھا' بلکہ اس کے اعصاب پر بری طرح اثر ڈالا تھا۔

باہر سے آنے والے تو اب پہنچنا شروع ہوئے تھے۔ ایک مدت کے بعد گھر دونوں طرف کے رشتہ داروں سے بھر گیا تھا۔ جیسے صولت آپا کی شادی میں سب جمع ہوئے تھے۔ گیتی نے چپکے سے سوچا۔ ''اس مجمع میں دادی اماں اور خود اس کے باپ کی کمی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ماں بیٹے کہیں اور گئے ہوئے ہوں اور ہاں ایک ہاشمی آپا نہ تھی۔ پر وہ تو اسی دنیا میں موجود تھیں، وہ بھی اور ان کا لڑکا بھی ۔۔۔۔۔۔ اور پھر بھی وہ دونوں نہ آئے۔ گیتی نے ایک لحظہ کے لیے کڑھ کر سوچا اور پھر خود ہی یہ بھی سوچنے لگی۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو یہی کرتی۔ فضول دنیا سازی سے فائدہ؟

بمبئی سے ماموں میاں اور ممانی جان آئے تھے۔ ماموں میاں تو دوسرے دن واپس چلے گئے۔ ممانی جان ہفتہ بھر ٹھیریں لیکن ان کو بچوں کی طرف سے بہت فکر تھی۔ چلنے سے ایک دن پہلے انہوں نے اماں بیگم کو پھر مجبور کیا کہ وہ دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر ان کے ساتھ ہی چلیں اور عدت وہیں پوری کریں۔

اور یہ سن کر اماں بیگم کئی دن بعد پھر پھوٹ کر روئیں۔ ''نہیں، یہ عدت یہیں پوری ہوگی اسی دہلیز پر۔'' اور پھر وہ اپنی بھاوج سے مخاطب ہوئیں۔ ''تم چلی جاؤ، اماں جان بیمار ہیں اور میری پریشانی نے ان کا حال اور بھی خراب کر رکھا ہوگا۔ ان کو سنبھالو اور جب وہ بہتر ہو جائیں تو تم ان کو میرے پاس بھیج دینا۔ اب میں ان کو نہیں چھوڑوں گی۔''

''ضرور! کیوں نہیں اور اب ان کا دل بھی آپ کے بغیر وہاں نہ لگے گا۔ ابھی تو ہم نے جہانگیر بھیا کی بیماری کا بتایا تھا۔ ورنہ نہ جانے کیا حال ہوتا۔''

اماں بیگم کے آنسو چل نکلے۔

عصمت کو پہنچتے پہنچتے ایک ہفتہ لگ گیا تھا۔ اس کا بچہ چھوٹا تھا اور اس کے پاس کوئی ملازم نہ تھا۔ پھر وہ دوڑ کر آ گئی تھی۔ اس کی تندرستی پہلے سے زیادہ نکھر آئی تھی۔ زبیر کی محدود آمدنی تھی اور اسی میں اس کو گزر کرنا تھا۔ ویسی ہی سیدھی سادی سی تھی جیسے شادی سے پہلے ۔۔۔۔۔۔ مطمئن، خاموش اور ہمیشہ کی طرح ہر ایک معاف کر دینے والی۔ اس کو اپنے چچا ابا سے بڑا پیار تھا۔ اور اس نے چچی اماں کو قطعی معاف کر دیا تھا جو ایک زمانے میں اس کی شکل سے بیزار تھیں۔ اس نے ہوش سنبھال کر اپنی ماں کو سفید لباس میں بغیر زیور چوڑی کے دیکھا تھا اور اس بات کا اس کو قطعی احساس نہ تھا لیکن اس نے اپنی چچی اماں کے خوبصورت ہاتھ ننگے دیکھے تو ان پر آنکھیں جھکا کر اس نے اتنے آنسو بہائے کہ وہ بھیگ گئے۔ بغیر آواز نکالے اور سسکیاں لیے یہاں تک کہ ان کے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''صبر کرو میری بچی!''

وہ واقعی بچوں کی طرح ان کے سینے میں منہ چھپا کر اور زیادہ بے قراری سے آنسو بہانے لگی۔ اور اس وقت ان کے سینے میں پھڑ کتا ہوا بے قرار دل اچانک ہی پگھل گیا۔ ''یہ تو میرے شہریار کی نشانی ہے۔ اس کی خاموش اور بے زبان محبت کا مزار۔'' انہوں نے جھک کر اس کے چمکتے بالوں کو پیار کیا اور بے شمار آنسو پھسل پھسل کر موتیوں کی طرح بکھر گئے۔

''میری ماں دل کی بری نہیں ہے۔'' دور بیٹھی ہوئی گیتی نے سوچا اور کتنے ہی دن بعد دوڑ کر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ کمر کے گرد لپیٹے ہوئے تھے اور آج وہ پہلی بار ان سے چمٹ کر رو رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ آج محض اپنے شوہر اور اس سے وابستہ عیش و آرام کو نہیں رو رہی تھی بلکہ اس بیٹے کے لیے رو رہی تھی جو ان سے بہت دور تھا اور جس کی واپسی کی امید موہوم تھی۔

''اور جو آج بڑے بھیا ہوتے یہاں تو میں اتنی بے آسرا کیوں ہوتی۔'' منہ سے کچھ کہے بغیر اس نے ماں کی گود سے سر اٹھا کر عصمت کی گود میں رکھ دیا۔

وہ ان دنوں کچھ ایسی ہی وحشت زدہ حرکتیں کرتی تھی۔ اتنی کہ بعض وقت ارجمند کو اس کی دماغی صحت پر شک ہونے لگتا تھا۔

عصمت کا بچہ چھوٹا تھا اور پھر وہ زبیر کو بھی بیمار چھوڑ کر آئی تھی۔ کچھ چچی جان بھی اس کا زیادہ رکھنا مناسب نہ سمجھتی تھیں۔ وہ تیسرے چوتھے دن واپس چلی گئی۔

صرف بختیار ہی اس کو اسٹیشن چھوڑنے گیا تھا۔ اور جب وہ اس کو اچھی طرح بٹھا کر اس کا سامان بھی لگوا چکا تو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر اس کے بچے کی بند مٹھی کو کھولتے کھولتے اچانک بولا۔

''عصمت آپا! کیا طلعت کو اس موقع پر بھی آنا واجب نہ تھا؟''

اس کے تین چار دن کے قیام کے دوران میں بختیار نے نہ ہی کوئی خاص توجہ کی تھی اور نہ ہی کوئی ذکر طلعت کا کیا تھا۔ اس وقت وہ اس کی بات کو سن کر چونک سی گئی اور کوئی جواب نہ دے سکی۔

پہلے تو خیر یہ بہانہ ہوتا تھا کہ دادی اماں کی وجہ سے نہیں آئی اور اب کیا یہ اس کے سگے چچا کی موت نہ تھی۔

عصمت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''بختیار! تم کو خیال نہیں کہ اس پر کتنا اثر ہوگا۔''

''کیا معلوم، ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ابا میاں صحیح طور پر آپ لوگوں کی خبر گیری نہیں کر پاتے تھے لیکن پھر بھی۔'' بختیار کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''ایسی باتیں مت کرو۔خبر گیری کرنا اور بات ہے۔ چچا ابا کا دل کتنا وسیع اور فراخ تھا۔'' عصمت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''مگر طلعت کے نزدیک تو نہیں تھا۔'' بختیار کا لہجہ روٹھا ہوا تھا۔ ''بات یہ ہے کہ ہم لوگ اسی سزا کے مستحق ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' اس نے بختیار کو گلے لگا لیا۔ ''تم ایسا کوئی خیال دل میں نہ لاؤ میرے بھیا! غم کسی محفوظ جگہ پر جا کر اور بیٹھ کر تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ جو غم ہمارے اپنے ہوتے ہیں وہ ہم سب سے الگ ہو کر چپ چاپ ہی مٹانا چاہتے ہیں۔''

اچانک عصمت کا بچہ رو پڑا اور زور زور سے ٹانگیں چلانے لگا۔

اور بختیار عصمت سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔

''لو بھئی' تم نے مجھے گلے لگایا تو تمہارا بیٹا جل گیا۔''

''بدمعاش تو میرے بھیا سے جل گیا؟'' عصمت نے بچے کو گود میں اٹھا کر بختیار کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ ''تجھے معلوم ہے مجھے اپنا بھیا کتنا پیارا ہے۔''

ریل نے سیٹی دی اور بختیار جلدی سے بچے کو پیار کر کے اتر گیا۔ ''زبیر بھیا کو میرا آداب کہیے گا۔''

''اچھا' اب تم یہ ڈنڈا چھوڑ کر پیچھے تو ہٹ جاؤ۔ اب تو یہ رینگ رہی ہے۔''

''اچھا خدا حافظ'' بختیار نے پلیٹ فارم پر چھلانگ لگائی۔

''بسم اللہ! خدا حافظ! اللہ نگہبان!''

اس نے چلتی گاڑی سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہجوم کو دیکھا جن میں ملا جلا اس کا بھائی کھڑا تھا۔

جو سچ پوچھو تو ہمارا یہی ایک بھائی ہے۔ خدا بڑے ابا کے لڑکوں کو رکھے' وہ تو ٹھیک سے صورت بھی نہیں پہچانتے۔ اور بڑے بھیا ان کے متعلق تو سوچتے بھی وہ ڈرتی تھی۔ پتہ نہیں ان کا خیال آ جائے تو میں کیا کیا سوچ جاؤں۔

باب ۴۲

صبح سے وہ گودام میں بیٹھی صولت آپا کی ہدایت کے مطابق بکس الٹ پلٹ کرتی اور ان کو ٹھیک کرتی رہی تھی۔ نہ جانے اس سے صولت آپا کا کیا مطلب تھا۔ گھر کے سارے مہمان رخصت ہوئے تو انہوں نے کمرے وغیرہ درست کروانے کے بعد آج یہ بکھیڑا پھیلا دیا۔ وہ ابا میاں کے گرم اور ٹھنڈے سوٹ الگ الگ کر کے رکھتے رکھتے' ان کی بندوقوں اور کارتوسوں کو چھانٹتے چھانٹتے شل ہو

گئی تھی۔ اور ساتھ ہی ان کی چیزیں جن کو ان کے پیارے پیارے ہاتھوں نے چھوا اور بار ہا استعمال کیا تھا۔ دیکھ دیکھ کر اس کا دل گھٹا جا رہا تھا۔ آنسو پیتے پیتے اور اپنی سسکیوں کو دباتے دباتے وہ بہت ہی تھک گئی تھی اور اس کو گیتی سے بھی سخت شکایت تھی کہ آرام سے ملکہ بنی لیٹی ہے۔ یہ نہیں کہ آ کر ذرا سا ہاتھ بٹا لے۔

ایک طرف صولت آپا ایزی چیئر ڈالے بیٹھی برسوں پرانے گروپ اور اکیلی تصویریں دیکھ اور چھانٹ رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس کو ہدایتیں بھی دیتی جا رہی تھیں۔ نیم کے پتوں اور فنائل کی گولیوں کی بدبو اس کے ہاتھوں اور دماغ میں بس چکی تھی اور اب اس کے دماغ میں صرف یہ خواہش تھی کہ جلدی سے کام ختم ہو اور جان چھوٹے۔ مگر صولت آپا کی موجودگی میں یہ بھی مشکل تھا۔ ایک ایک چیز کی تہہ اور شکن کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔

اور جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کو سخت بھوک لگی ہے اور بھوک کے کلیجے میں فنائل کی بو تیز بن کر لگ رہی ہے۔ بکسوں میں تالے لگوا کر صولت آپا نے گودام کو تالا لگایا اور چابیوں کا گچھا اس کو دیا کہ اماں سے کہنا احتیاط سے رکھ لیں۔

''ارے صولت آپا نے بڑا کام کروا دیا۔ خدا اس کو خوش رکھے۔'' اماں بیگم نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے تو ہوش ہی نہ تھا اس سب کا۔''

''مگر ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ ہو جاتا کسی دن اور گودام بھی ٹھیک۔ میری تو جان چورا ہو گئی۔'' ارجمند نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

اور کمرے میں گھستے ہی اس کا خون کھول گیا۔ کتابیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ بستر شکنوں سے پر اور مسلے ہوئے۔ لکھنے کی میز الٹی پڑی تھی اور دروازے کھڑکیاں چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ گیتی بڑے اطمینان سے تین تکیے سر کے نیچے رکھے ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔

''توبہ ہے گیتی! حد کرتی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ تم کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ کمرہ درست کر لیتیں۔''

گیتی نے ایک لفظ کہے بغیر کتاب نیچی کی اور ارجمند کی طرف یوں دیکھا گویا پوچھتی ہو کہ۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا کہا تم نے؟

''دیکھو تو سارا کمرہ الٹا پڑا ہے۔ اگر ذرا سا درست کر لیتیں تو کیا حرج تھا۔ اور کچھ نہیں تو شریف کو ہی بلا کر صفائی کروا لیتیں۔''

''میں نے کہا کہ تم خود آ کر کرو گی اسی انتظار میں رہی۔''

''مجھے فرصت کب تھی۔ صبح سے صولت آپا نے گودام میں جوت رکھا تھا۔ تم تو کبھی اتنا بھی نہیں کرتیں کہ ذرا ساتھ لگ جاؤ۔''

بجائے اس کے کہ وہ ارجمند کو بتاتی کہ اس کی طبیعت کتنی خراب' ویران اور اچاٹ ہو رہی ہے اور جو کام بھی شروع کرتی ہے اسی سے الجھن اور وحشت ہونے لگتی ہے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی' کتاب ہاتھ سے ڈال دی اور برا مان کر بولی۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو' اس گھر میں میرا وجود بالکل بے فائدہ اور بے معنی ہے۔ میں کسی کے کام نہیں آتی اور میری موجودگی نے تم کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ تمہاری ہر چیز الٹ گئی۔''

وہ اس انداز سے کبھی سوچتی تھی اور نہ بات کرتی تھی۔ اس کی بات سن کر ارجمند حیرت زدہ سی ہو گئی۔

''گیتی! میرا یہ مطلب تو نہیں ہے اور بھلا تمہاری موجودگی مجھے کیوں پریشان کرنے لگی؟ یہ کمرہ جتنا تمہارا ہے اتنا ہی میرا ہے۔ ہم ہمیشہ ہی اکٹھے رہے ہیں۔''

''مگر خیر۔۔۔۔۔۔۔ اب تو ایک سال سے ہم ساتھ نہیں رہے' تم کو سکون اور قاعدے کی عادت ہو گئی ہے۔'' وہ طنز سے ہنسی۔

''بات یہ ہے کہ اس گھر میں میں ہی جنگلی اور وحشی ہوں۔''

''اب تم فضول میری بات کو اتنی سنجیدگی سے لے رہی ہو۔ میں نے تو بے خیالی میں ایک بات کہہ دی تھی۔ چلو میں ہی درست کئے لیتی ہوں۔''

وہ چیزیں سمیٹنے اور ان کو ٹھیک ٹھاک کر کے رکھنے لگی۔

گیتی کو وہم ہو رہا تھا کہ اب وہ یہ بھی اسی پر غصہ کر کے کر رہی ہے۔ وہ اٹھ کر ارجمند کے ہاتھ سے چیزیں چھین چھین کر رکھنے لگی۔

''تم کیوں کر رہی ہو؟ ہماری وجہ سے تمہارا کمرہ خراب ہوا ہے' ہم ہی ٹھیک کریں گے۔''

''فضول میں ہی غصہ کر رہی ہو۔'' ارجمند نے بھی تیز لہجے میں کہا اور اس کے ہاتھ سے میلا تولیہ لے لیا جو مسلا مسلایا میز پر پڑا تھا۔

اور تولیہ ہاتھ سے نکلتے ہی گیتی کی طبیعت بے قابو ہو گئی۔

''لو۔۔۔۔۔۔ لو!'' اس نے ساری کتابیں ہاتھ مار کر زمین پر گرا دیں۔ ''میں خوب سمجھتی ہوں' سب مجھ سے بیزار ہیں۔ اب اس گھر میں کسی کو میری ضرورت نہیں۔''

وہ بے بسی سے پلنگ پر گر گئی اور چیخ چیخ کر یہی کہتی رہی۔

''کسی کو ضرورت نہیں' ہائے کسی کو ضرورت نہیں' مجھ سے ہر کوئی بیزار ہے۔''

اماں بیگم نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں جو بے حد دل خراش تھیں اور بے بسی کے عالم میں اس کے منہ سے نکلتی چلی آ رہی تھیں۔ ان میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ اس کے قریب جاتیں۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے تھر تھر کانپتی رہیں۔ صولت اسی وقت غسل خانے سے نکل کر آئینے کے سامنے بیٹھی بال سلجھا رہی تھی۔ کنگھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے سوچا۔ ''اوہ یہ گیتی' اس کم بخت کا اس گھر میں پیدا ہونا کیا بہت ضروری تھا؟''

وہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی اس کے کمرے کی طرف چلی۔

چیختے چیختے اس کے ہاتھ سرد ہو گئے' چہرہ سفید ہو گیا اور ہونٹ خشک۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کے اس حال پر صولت کو ذرا بھی اس سے ہمدردی نہ ہوئی۔ اس سے زیادہ ہمدردی کے قابل ارجمند نظر آ رہی تھی۔ جو میز کے پاس نادم اور سراسیمہ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ خاموشی اور صبر کی تصویر یہ لڑکی واقعی قابل رحم نظر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے دھیرے سے ارجمند سے پوچھا۔ ارجمند نے مختصر ترین جملوں میں بات بتائی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

''بچاری بچی!'' اس نے ارجمند کی ہمدردی اور محبت سے دیکھا۔ ہر بات کو کس صبر و سکون سے برداشت کر رہی ہے۔ اس وقت یہ سب کے کس قدر کام آ رہی ہے۔

''نہیں' اس میں تمہاری غلطی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا مزاج بنا ہی لیا ہے ایسا کہ کسی کو زبان ہلانے کی ہمت نہ ہو۔''

اس نے دھیرے سے کہا تھا۔ مگر شاید گیتی نے سن لیا۔ کیونکہ وہ اب چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

''ساری غلطیاں میری ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ساری غلطیاں میری ہیں۔''

صولت نے بیزاری اور حقارت سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور پوری قوت سے چلا چلا کر اپنی آواز تک بٹھالی تھی۔ شکر ہے کہ سب جا چکے ہیں اور پھر وہ اونچی آواز میں ارجمند سے مخاطب ہوئی۔

''اب تم دیکھو' تم بہت حمایت لیتی ہو۔ میں ان کے ان ہی فیلوں کی وجہ سے بات ہی بہت کم کرتی ہوں۔ مجھے جو بھی کہنا سننا ہوتا ہے تم ہی سے کہتی ہوں۔''

اور یہ واقعہ تھا کہ صولت جس دن سے آئی تھی' سوائے اس کے کہ پہلے دن تو اس کو گلے سے لگایا تھا وہ اس کے وجود کو تسلیم ہی نہ کرتی تھی۔ لیکن ارجمند سوچ رہی تھی۔ ''آج سے پہلے تو اس نے کبھی یوں نہ کیا تھا۔''

اپنے متعلق اتنے سخت الفاظ سن کر اس کی چیخوں اور بے بسی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اسی قدر اپنے کمرے میں اماں بیگم کی

حالت غیر تھی۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ''خدا ایسی اولاد کسی کو نہ دے۔''

بختیار باہر برآمدے میں ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا۔ اور اب یہ آوازیں اس تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ اس نے منہ اونچا کر کے آواز سنی۔ کسی کا دل بگڑ رہا ہے۔۔۔۔۔۔ یا خدا میری ماں بہنوں کو صبر کی توفیق بھی تو دے دے۔ اس نے سوچا اور جلدی جلدی اندر چلا گیا۔

خلاف توقع یہ گیتی تھی جو پہلے دن بھی اس قدر چیخ چیخ کر نہ روئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر ارجمند اور صولت کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ ضرور ان میں سے کسی کی بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔

''ارے۔۔۔۔۔۔ ارے گیتی! میری بات تو سنو! میری طرف تو دیکھو۔''

وہ اس پر جھک گیا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے جو برف کی طرح سرد تھے۔

''ارجمند! کھڑی کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔۔ پانی لاؤ۔'' وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ''گیتی! تم کو کیسے خیال ہو گیا کہ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں' سب کو ضرورت ہے۔ ادھر دیکھو' سب سے زیادہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

اس نے اس کے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر پیچھے کر دیئے اور پیار سے اس کی سرد پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟'' بختیار نے اس کو چمکارا۔

''کیا بات!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''بہت بری بات ہے بختیار بھائی!''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے اس کو پانی پلایا' آنسو پونچھے اور چمکارا۔ ''کوئی بات نہیں' صرف تم بیمار ہو رہی ہو میری گڑیا! دیکھو تم اب خاموش ہو کر سو جاؤ۔ تم مجھے پریشان کر رہی ہو۔ تمہاری وجہ سے سب پریشان ہو رہے ہیں۔''

''اچھا' اچھا! اب میں کسی کو پریشان نہیں کرتی۔'' اس نے بختیار کی گود میں منہ چھپا لیا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ آہستہ آہستہ اس کا سر سہلاتا اور اس کو تھپکتا رہا۔

دھیرے دھیرے پست ہو کر وہ سو گئی۔

وہ آہستہ سے اس کے پاس سے اٹھا اور ارجمند کو بلا کر سمجھانے لگا۔ ''ذرا اس کی بات کو صبر سے برداشت کر لیا کرو۔''

''مگر بختیار بھائی! بات تو کچھ تھی ہی نہیں۔'' وہ حیرانی سے بولی۔

''نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔میں اب تمہیں کیا بتاؤں' اس کے دل سے زیادہ دماغ اور اعصاب متاثر ہیں اور یہ خیال تو اس کے دل میں جم ہی چکا ہے کہ اس سے سب ناراض ہیں۔''

''اچھا' خیر! تم اپنی نصیحتیں چھوڑو۔۔۔۔۔۔۔بینک کے سب کاغذات ایک جگہ کرلو۔ سب کاغذ برآمدے میں پھیلے پڑے ہیں۔'' صولت نے بیزاری سے کہا اور وہ سر جھکائے باہر چلا گیا۔

دھیرے دھیرے اس نے سارے کاغذ سمیٹے اور علیحدہ علیحدہ فائلوں میں لگاتے ہوئے سوچا۔ ''ہر ایک چیز سے زیادہ اہمیت ان کاغذوں ہی کو دی جا رہی ہے۔ نہ مرنے والے کے متعلق سوچو اور نہ زندوں کی طرف دیکھو۔ بس ان کاغذوں کے متعلق سوچے جاؤ اور ان ہی کی طرف دیکھے جاؤ۔ ٹھیک ہے۔ ان سے زیادہ ضروری اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ یہ ابا میاں کے بینک کے کاغذات ہیں۔ ان کے باغوں اور اراضی کے فائل اور ہمارے ناموں کی پالیسیوں کے کاغذات۔۔۔۔۔۔۔اور واقعی یہ ہر زندہ اور مردہ انسانوں سے زیادہ اہم ہیں۔ یہی تو انسان کو دوسروں کی نظروں میں اہم بناتے ہیں۔''

وہ یہ تمام باتیں بار بار اس لیے سوچنے بیٹھ جاتا تھا کہ وہ نوگرفتار تھا۔ اس کا آج تک کبھی ان عجیب وغریب قسم کے فارموں اور ناقابل فہم دستاویزوں سے معاملہ نہ پڑا تھا۔ اور اس نے تو الجھ کر یہ تک سوچا تھا کہ کس قدر خوش نصیب ہوتی ہے وہ اولاد جس کے باپ ترکے میں اس کے لیے الجھنوں اور کاغذات کے پشتارے نہیں چھوڑ جاتے' جن کے سامنے ان ناقابل فہم کاغذوں کے فائلوں کی بجائے زندگی کا وسیع وعریض میدان ہوتا ہے اور اپنے دست وبازو۔

اور اس کو یہ تمام باتیں سوچنے کا حق تھا۔ اس لیے کہ وہ کم عمر تھا اور ناتجربےکار۔

دوپہر کے مختلف وقفوں میں اس کی آنکھ کھلتی اور لگتی رہی۔ ہر بار جب اس کی آنکھ کھلتی تو اس کو محسوس ہوتا کہ وہ خوب اور کافی سے زیادہ سو چکی ہے۔ اتنی کہ اس کی ساری تکان اور سارا غصہ دور ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بیداری کے خیال سے گھبرا رہی تھی۔ بیداری' جس کا دوسرا نام حقیقت ہے۔۔۔۔۔۔۔حقیقت اور وہ بھی تلخ ترین حقیقت' یعنی ایک ایسی شرمناک حرکت کا تصور جو کبھی وہ اپنے ذہن میں لا ہی نہیں سکتی تھی۔

ذرا سی فضول سی بات اور وہ بھی ارجمند کی بات پر اتنا فیل مچانا کہ سارا گھر حیران پریشان ہو جائے' اس کو اپنے آپ پر خود تعجب تھا۔ اس لیے کہ اس کو احساس نہ تھا کہ اس کے اعصاب کس حد تک ہیجان پذیر ہو چکے تھے اور ذہنی طور پر وہ خود کو کس درجہ تنہا تصور کر

رہی تھی۔ ہر بار جب اس کی آنکھ کھلتی تو سب کا سامنا کرنے کا خوف اس پر طاری ہو جاتا اور گرد و پیش کی تنہائی اور خاموشی کو غنیمت تصور کر کے از سر نو کروٹ لیتی چند لمحے آنکھیں بند رکھتی اور پھر دھیرے دھیرے کوئی تھپکیاں دے کر سلا دیتا۔ غفلت اور بے خبری کی یہ کیفیت کس درجہ آرام دہ معلوم ہو رہی تھی۔

ارجمند نے ایک مرتبہ آ کر اس کے کمرے کے پردے برابر کر کے پنکھے کی رفتار درمیانے درجے کی کر دی تھی تا کہ ہوا کی تندی اس کی نیند میں خلل انداز نہ ہو اور جب پانچ بجے کے قریب وہ غسل خانے سے ہاتھ منہ دھو کر نکلی تو نیلے رنگ کی بہت ہلکی روشنی والا لیمپ بھی روشن کرتی گئی تھی۔ اندھیرے میں سوتے سوتے آدمی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور یہ تمام باتیں اس نے محض عادتاً کی تھیں۔ اس لیے کہ آج وہ دراصل گیتی سے ناراض تھی۔ ذرا سی بات پر اتنا شور مچایا اور ناحق شرمسار کیا۔ خصوصاً بختیار بھائی تو یہی سمجھے کہ نہ جانے میں نے کیا کچھ کہہ دیا ہے۔

اور ساری بات تو یہی تھی۔ گیتی کو اس کی خفگی کا احساس ہی تو تنہائی کا خوف دلا رہا تھا۔

آخری مرتبہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کو خفیف سا شبہ ہوا کہ وہ تمام رات سوتی رہی ہے اور اب صبح ہو رہی ہے۔ لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔ اس وقت آٹھ بج چکے تھے۔ کمرے میں لیمپ کی مدھم مدھم روشنی پھیل رہی تھی اور واقعی صبح کا گمان دلا رہی تھی۔

''اب میں کب تک یونہی سوئے چلی جاؤں گی۔'' اس نے اپنی ہمت آپ ہی بندھانا شروع کی۔ ''اور اچھا ہے جو سب کے سب میری صورت دیکھتے ہی لعنت ملامت کرنا شروع کر دیں۔ انسان جیسا کرے ویسا ہی بھگتنے کو تیار رہے۔'' اب وہ خود کو ایذا میں مبتلا دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ اپنا بستر برابر کر کے کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ گرمی کی یہ شام خاموش اور نسبتاً خنک تھی۔ باغ میں پانی لگایا گیا تھا اور راستے پر چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ باغ کے اندھیارے کے عقب سے جھینگروں کی جھن جھن اور سائیں سائیں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ آسمان پر اکا دکا تارے جھلملا رہے تھے۔

تنہائی کا احساس اور بھی دبیز اور گہرا ہو کر اس کے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا۔ مظلومیت کے احساس کے بجائے اس کو اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کو ہر طرف سے اتنی پھٹکاریں اور ملامتیں پڑیں کہ اس کو اپنے سے ہمدردی پیدا ہو جائے اور وہ خود کو مظلوم تصور کرنے لگے۔ اور اسی سب کے لیے تیار ہو کر اس نے غسل کیا' کپڑے بدلے اور برآمدے میں سے ہوتی ہوئی صحن میں آ گئی۔ صحن کے پکے فرش پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا اور صحن کے چاروں طرف بنی ہوئی کیاریوں کے پودے پائپ کی بوچھار سے اس قدر

دھو دیئے گئے تھے کہ گرد و غبار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بجلی کی روشنی میں موتیئے کے بھیگے بھیگے سبزے میں سفید ادھ کھلی کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح صحن میں اجلے اجلے شفاف بستر قطار سے لگے تھے اور پلنگوں کے پاؤں میں پھنسے ہوئے سبز سبز بانسوں پر مچھردانیوں کی شفاف چھتیں سی بنی ہوئی تھیں۔

نماز کی چوکی پر اماں بیگم برف سی اجلی ساری میں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان سے ذرا ہٹ کر نیچی سی تپائی پر بیٹھی ہوئی صولت سر ڈھکے ہوئے قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔ بختیار ایک آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا اور ارجمند اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھی صولت کی بچی سے کھیل رہی تھی۔ یہ پورا کنبہ جو ایک جگہ جڑا اور سمٹا ہوا بیٹھا تھا' سوگواری اور غم کے مشترکہ احساس نے ان کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا اور ایک ناقابل تلافی نقصان کے احساس کے باوجود ان کے چہروں پر طمانیت کا تاثر تھا۔

اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی تنہائیوں کا احساس اور بھی گہرا ہو گیا۔ وقت کے وہ لمحات جو آگے بڑھتے ہوئے زمانے کا ساتھ نہیں دیتے' تنہائیوں کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔

''تو گویا میں گیا وقت ہوں۔'' اس نے افسردگی سے پوچھا۔ ''کیا یکتائی بہت اذیت دہ چیز ہے۔ تو پھر دو عالم کے خالق کی تنہائیاں کیا کہتی ہوں گی۔''

جہانگیر مرزا کی یہ لڑکی جس کا نام گیتی آرا بیگم تھا' جب سوچنے پر آتی تو ہمیشہ نامعقولیت کی حد تک سوچتی چلی جاتی۔

وہ ہر قسم کی گفتگو اور انداز تخاطب کے لیے تیار ہو کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اماں بیگم کی چوکی کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

اماں بیگم تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ صولت نے قرآن شریف کا ورق الٹا تو گیتی نے خود کو ملامت کی کہ میں اپنے اس باپ کے لیے بھی تو کچھ نہیں کر رہی ہوں جس کا غم اپنے حسابوں اس شد و مد سے منانے کی کوشش میں مصروف ہوں۔

اچانک اس کو خیال آیا کہ اسی جگہ جہاں اس وقت بختیار بھائی کی کرسی ہے' ان کی کرسی ہوتی تھی۔ ان کے قریب کیوڑے اور گلاب میں بسا اور موتیئے کے ہاروں سے لپٹا ہوا حقہ ہوتا تھا۔ تمباکو' آگ اور چلم کی کوری مٹی کے امتزاج سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو کی گرم گرم لپٹ۔۔۔۔۔۔ کتنی ہی دفعہ اس گرم گرم لپٹ کے سوندھے پن سے بے خود ہو کر اس نے چوری چوری حقے کے کش لیے تھے۔

''شکر ہے کہ میرے باپ نے کبھی شراب نہیں پی' نہیں تو اس شخص کی ذات سے وابستہ ہو کر اس شراب میں بھی وہ جاذبیت پیدا ہو جاتی کہ میں ضرور چکھ لیتی۔'' اس نے سوچا۔

''ٹھیک یہیں' جہاں اس وقت بختیار بھائی کے قدم ہیں' میرے باپ کے قدم ہوا کرتے تھے۔'' اس کا دل چاہا اٹھ کر اس جگہ ماتھا ٹیک دے اور ساری مٹی اپنی پیشانی میں جذب کر لے۔

اور یہ قاعدہ بھی کتنا اچھا ہوتا ہے کہ لوگ ماں باپ کے قدموں تلے کی خاک چھو کر اپنی پیشانی سے لگا لیں اور یہاں اس کے بہت قریب اس کی ماں جاء نماز پر بیٹھی تھی۔ دھلے ہوئے سوتی کپڑوں کی بھینی بھینی سی خوشبو کی لپٹیں اس کے جسم سے اٹھ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان قدموں میں جھک جائے۔ اس وقت اس کا قلب گداز ہو رہا تھا اور مزاج میں رقت تھی۔

اسی وقت اماں بیگم نے دعا مانگ کر تسبیح نیچے رکھ دی اور وہ ان کے فضیحتوں کی بوچھاڑ کے لیے سیدھی ہو بیٹھی۔

''یہ تم نے اچھا کیا کہ نہا لیں۔۔۔۔۔۔سر میں درد تو نہیں؟'' ان کی آواز میں ملائمت' درگزر اور سمجھوتہ تھا۔

وہ حیران رہ گئی۔

ان کی آواز سن کر بختیار نے اخبار نیچا کر لیا۔

''ماں جی! بھوک لگ رہی ہے۔'' بختیار لاڈ میں آ کر ان کو ماں جی ہی کہا کرتا تھا۔

''ہاں بھوک تو لگی ہوگی' کھانا تو تیار ہے۔۔۔۔۔۔ذرا تم کھانا لگوا لو۔'' وہ گیتی سے مخاطب ہوئیں۔

وہ بغیر جواب دیئے کھانا لگوانے چلی گئی۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں اور ایک بار پھر چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس لیے اس کی ماں کے ہاتھ میں صلح کی سفید جھنڈی نظر آ رہی تھی۔

◆◆◆

فصل پنجم

باب ۴۳

ابا میاں کی پالیسیوں والی فائل کو اس نے بند کیا اور میز پر رکھ دیا۔ وہ ان کاغذوں سے اب تھک چکا تھا۔ شکر ہے کہ یہ آخری فائل تھی جو آج ہی مکمل ہوئی تھی۔ اب وہ ان تمام الجھنوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ جو اس کے باپ نے ورثے میں چھوڑی تھیں۔ اب تک تو ان فائلوں اور کاغذوں نے اس کو یہ بیٹھ کر سوچنے کی مہلت بھی نہ دی تھی کہ اس کو کس نوعیت کا نقصان پہنچا تھا۔

اقتصادی نقطہ نظر سے یقیناً یہ بدحواس کر دینے والا حادثہ نہ تھا۔ سوال تو بے فکری اور ذہنی آسودگی کے اس زیاں کا تھا جس سے اس کے باپ کی موت نے اسے محروم کر دیا تھا۔ لڑکے کی زندگی کا یہی تو مرحلہ اور عمر ہوتی ہے جب اس کو اپنے باپ کی ذہنی رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور جو وہ نہ ہو تو بڑے بھائی کی ہمدردی اور توجہ ہو۔ ’’اور جس سے مجھے بڑے بھیا کی خود غرضی اور ضد پہلے ہی محروم کر چکی ہے۔‘‘ اس نے حد درجہ کڑھ کر سوچا۔ ’’واہ بڑے بھیا! یہ بھی کوئی کیریکٹر ہوا کہ حالات اور الجھنوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے انسان میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم نے کیوں گریز و فرار کی راہ اختیار کی۔ بات یہ ہے نا کہ شروع سے تو تمہاری ہر بات مانی گئے۔ ہر ضد پوری کی گئی۔ مخالفت اور الجھن کے نام سے تم کو واقف ہونے ہی نہیں دیا گیا اور جو اچانک ہی تمہاری ماں تمہارے مقابلے پر آ گئی تو تم بھاگ لیے۔ اور اپنے حسابوں تم ان کو سزا دے رہے ہو۔ لیکن سزا تو تم نے اپنے آپ کو دی ہے اور اپنے باپ کو دی اور اب میں اس کو بھگت رہا ہوں۔ کاش! اس وقت تم وہاں یوں نہ جا چھپنے ہوتے کہ تمہارے باپ کی اطلاع تم تک پہنچنا اور تمہارا آنا دونوں ہی ناممکن ہو گیا ہوتا۔ تو میں سکون سے اپنی پڑھائی پوری کرتا اور مجھے تنہائی اور ذمہ داری کا اتنا شدید احساس نہ ہوتا۔‘‘

اس نے کڑھ کر دیوار پر لگی ہوئی اپنے باپ کی نوعمری کی تصویر کی طرف دیکھا۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں اور پروقار مسکراہٹ۔

’’واقعی بڑے بھیا ان سے بہت ملتے ہیں اور میں تو اپنے گھرانے سے بہت مختلف ہوں۔‘‘

''یہ واقعہ تھا۔ بختیار اپنے باپ چچاؤں سے بہت مختلف تھا۔ دبلا پتلا جسم' گیہواں رنگت اور لمبی لمبی سیاہ آنکھیں۔ کچھ روگی سا اور مسکین طبیعت لڑکا تھا۔ نہ گھر میں اس کی زیادہ وقعت تھی اور نہ ہی اس نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔

''لڑکیوں میں گیتی اور لڑکوں میں میں اپنے گھرانے سے مختلف ہوں۔ سنا ہے جو بھائی مر گیا وہ بڑے بھیا سے بھی زیادہ حسین اور گورا چٹا تھا۔''

گرمی بڑھ گئی تھی اور شریف نے کمرے کے دروازے میں خس کی ٹٹی جما کر فوارہ کھول دیا تھا۔ جھر جھر کر کے ننھی ننھی بوندیں بوچھار کی شکل میں ٹٹی پر برس گئیں۔ ٹھنڈی اور سوندھی خوشبو کا ایک بھپکا سا اٹھا اور اس کے تھکے ہوئے اعصاب پر چھا گیا۔ ایک تندا سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی اور وہ ناوقت سو گیا۔ بارہ کے گھنٹے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے آپ کو اس کمرے میں اور اس پلنگ پر پا کر سوچ میں پڑ گیا۔ ''میں یہاں کیوں اور کس لیے ہوں؟ یہ پلنگ اور کمرہ تو ابا میاں کا ہے اور میں نے آج یہ کیا حرکت کی کہ ان کے پلنگ پر لیٹ کر سو گیا اور وہ خود کہاں سوئے ہوں گے؟'' وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اچانک ہی اس کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اس مرتبہ تو جس دن سے وہ آیا تھا اسی کمرے میں مقیم تھا اور اسی پلنگ پر لیٹ رہا تھا۔ اس نے تاسف سے سجے سجائے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس وقت ایسی نیند آئی کہ ذہن سے ہر حقیقت نکل گئی۔ اپنی حماقت کے احساس کے باوجود اس کے ذہن میں بار بار سوال اٹھ رہا تھا۔ ''وہ خود کہاں سوئے ہوں گے؟'' اس کا جواب بھی اس کے ذہن میں موجود تھا۔ اس کھلے میدان میں دھوپ کی تمازت اور لو کی جھلسا دینے والی شدت اور بھی بڑھ گئی ہو گی۔ اس کا دل چاہا کہ دروازے پر سے خس کی ٹٹی نوچ کر پھینک دے اور خود جھلستی ہوئی دھوپ میں جا بیٹھے۔ خس کی خنکی اور سوندھی خوشبو اور خس کا عطر ان کو کس درجہ محبوب تھا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ تن زیب کے باریک اور نفیس کرتے میں جھمکتا ہوا وہ سجیلا اور خوبصورت شخص دھوپ میں کھڑا تپ رہا ہے۔

بختیار نے اپنی نمناک آنکھیں بند کر لیں اور پروں کے نرم نرم تکیے میں منہ چھپا لیا اور جب تکیے کے درمیانی حصے نے اس کی آنکھوں کی نمی کو جذب کر لیا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ کھانے کی گھنٹی بج رہی تھی۔

''ہمارے گھر کے کسی بھی معمول میں تو فرق نہیں آیا۔ صرف وہ شخص کہ جس سے گھر عبارت تھا' موجود نہیں۔ یا خدا یہ زندگی کتنی مضحکہ خیز سنجیدگی سے اپنے معمول برقرار رکھتی ہے۔''

اماں بیگم نے اس کی سرخ سرخ آنکھوں اور بھیگی بھیگی پلکوں کو دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔

''کیوں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں! ذرا نا وقت آنکھ لگ گئی تھی۔'' بختیار نے سر جھکا کر کہا اور پھر سوچا۔ ''اماں بیگم کا شاید یہ خیال ہے کہ میں اپنے باپ کے لیے آنسو نہیں بہا سکتا اور میری آنکھوں کی سرخی کی کوئی خاص وجہ ہونا چاہیے۔''

کھانے میں گوشت خرفے کا ساگ تھا۔ ککڑی کا رائتہ تھا اور کیری کا گڑمبا۔ کھانے کی یہ ترکیب دیکھ کر ایک بار پھر وہ بے چین ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خاص ابا میاں کی فرمائش سے یہ کھانا پکا ہو۔ اس نے ہر کسی چیز کو چھوڑ کر دال کا ڈونگا اپنے آگے سرکا لیا۔ اور یہ دال بھی تو مٹر کی تھی۔ مٹر کی دال' خشکا اور املی کا نپا۔۔۔۔۔۔ بختیار کی آنکھوں میں سرخی اور بھی بڑھ گئی۔ اس کے حلق میں نوالے اٹک رہے تھے اور وہ بار بار پانی پی رہا تھا۔

اماں بیگم نے اس کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کیا اور آنکھوں کی سرخی کو بغور دیکھا۔

''اگر آنکھوں میں تکلیف تھی تو گلاب کا عرق ڈلوا لیتے۔''

''ہاں' گرمی بھی تو اس غضب کی ہے۔'' صولت نے گوشت اور ساگ اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میرے ابا کو کس قدر پسند تھا یہ۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

بختیار نے اپنا سر اور جھکا لیا۔

پٹ سے دو آنسو اماں بیگم کے خوب صورت ہاتھوں پر ٹپکے اور انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر رائتہ اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ ارجمند سر جھکائے بے دلی اور صبر سے کھاتی رہی۔ گیتی نے پلیٹ ایک طرف سرکائی اور بغیر کہے سنے میز پر سے اٹھ کر چل دی۔ ہر شخص ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگا' سوائے بختیار کے۔

اور وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی آنسو بہا بہا کر سوچ رہی تھی۔ ''عجب تھیوریاں ہیں صولت آپا کی! پہلے ان کے پسندیدہ کھانے ترتیب سے پکوا کر سجاتی ہیں اور پھر کھاتے کھاتے رقت بھری آواز میں جتاتی ہیں کہ ابا میاں کو فلاں چیز کتنی پسند تھی۔ اب کیا یہ ضروری ہے کہ فالسے کا شربت ضرور ہی گھر میں بنے۔ تاکہ ہر بار اس کا فالسائی رنگ دیکھ کر اور عجیب سی خوشبو سونگھ کر دل پھٹنے لگے۔ انہیں یہ شربت کتنا پسند تھا۔''

اور وہ پھر آنسو بہانے لگی۔ یہ واقعہ تھا کہ گھر میں اتنی مرتبہ فالسے کا شربت بنا لیکن گیتی نے بلا کوئی سبب بتائے منہ سے نہیں لگایا۔ لیکن صولت یہ سب جان بوجھ کر تو نہ کرتی تھی یہ تو زندگی کا روزمرہ تھا۔ انسان گئے ہوئے وقت کو آواز دے کر لوٹ آنے پر مجبور تو نہیں

کر سکتا۔

اور اس انسان کا بھی کیا کیا جا سکتا ہے جس کے اعصاب بے سکون ہو چکے ہوں اور طبیعت سکون پذیر ہونے میں آ ہی نہ رہی ہو۔ گیتی بھی ان دنوں ضرورت سے زیادہ جذباتی اور ہر کسی سے برگشتہ و بدگمان ہو رہی تھی۔

''اس نے پھر بے تکی باتیں شروع کر دیں۔'' اماں بیگم نے سہم کر سوچا۔

وہ خود ان دنوں افسردہ خاطر ہو رہی تھیں اور ان کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی ان قابل اعتراض حرکتوں پر صولت اس سے الجھے اور اس کو ڈانٹنے ڈپٹنے کھڑی ہو جائے۔ فضول کا ہنگامہ ہوگا۔ ''یہ گیتی بڑی گستاخ اور اثر پذیر طبیعت کی ہے۔ اس کے منہ لگنا خود اس کے حق میں ٹھیک نہیں۔'' اور اب جا کر ان کی سمجھ میں یہ بات آ چلی تھی۔ ''پھر یہ صولت بھی روز بروز جھکی اور جھلی ہوتی جاتی ہے۔ اپنے مزاج کے خلاف تو کوئی بات برداشت کرتی ہی نہیں۔ اور یہ بھی کمال ہے۔ شادی سے پہلے یہ بڑی حلیم اور خاموش مزاج ہوا کرتی تھی۔ دراصل آصف جاہ نے اس کی ضرورت سے زیادہ ناز برداری کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ انہوں نے سوچا اور فکر مندی سے بات کو ٹالنے کی غرض سے بختیار کے آگے خشکے کی پلیٹ بڑھا دی۔

''پتہ نہیں کیا بات ہے شاید گیتی کی طبیعت خراب ہو گئی۔'' ارجمند نے حیرت سے کہا۔

''نہ طبیعت خراب ہے نہ کچھ۔ دماغ البتہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ زیادہ ناز برداری کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔'' صولت نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''ناز برداری کم بخت کی کون کرتا ہے؟'' اماں نے دبی زبان سے صفائی پیش کی۔ ''میں تو اس سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔ ضرورتاً بات کرتی ہوں۔''

''کیوں؟ اور پھر کس طرح ناز برداری کی جاتی ہے اور یہ نہ بولنے کا بھی تو یہ مطلب ہے کہ ان کے مزاج سے ڈر لگتا ہے۔ ہماری مجال تھی جو ہم اتنی زبان چلاتے اور اپنی من مانی کرتے۔'' صولت کے لہجے میں سخت کڑھن تھی۔ ''اور بھئی! ان کا تو یہ ہے کہ اللہ بخشے ابا میاں خاص طور پر ان کے ہر معاملے میں دلچسپی لیتے تھے۔''

صولت کا لہجہ اتنا کٹیلا ہوا اور تیز تھا کہ بختیار نے چونک کر اماں بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش تھیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے گھر میں ہر بات کو اس درجہ طول کیوں دیا جاتا ہے۔ ذرا سی بے حقیقت بات کو اتنا کھینچا جاتا ہے کہ وہ باقاعدہ پیچیدہ معاملہ بن جاتی ہے۔ اگر وہ کھانے پر سے اچانک اٹھ گئی تو ایسی کیا بات ہو گئی۔ ہر شخص کو کم سے کم اپنے گھر میں

اتنا اختیار ہوتا ہی ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کوئی اضطراری حرکت کر لے۔"
اس دوپہر کھانا بے لطفی سے ختم ہوا۔ اور اماں بیگم اپنے کمرے میں چاندی کے حیدر آبادی پاندان کے قریب بیٹھی ہوئی بے حد شکست خوردہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ سفید اور آنکھیں مغموم۔ ان کا ہر نظریہ اور اصول ٹوٹتا اور ختم ہوتا چلا جا رہا تھا' بغیر کسی کے توڑتے ہوئے۔ ان کی ساری محنت اکارت گئی تھی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو کیا بنانا چاہا تھا اور وہ کیا بن گئے۔ مگر سوال یہ تھا کہ آخر انہوں نے ان کو بنانا کیا چاہا تھا؟ اور اس کا جواب انہیں خود نہ معلوم تھا۔

باب ۴۴

گھر کے موجودہ اخراجات میں تخفیف اور کمی کا سوال بظاہر تو معمولی تھا لیکن بختیار کے لیے ایک ناقابل حل مسئلہ تھا۔ صولت اگر یہ مشورہ نہ بھی دیتی کہ بختیار اب یہ بہت ضروری ہے کہ گھر کے اخراجات کم ہوں' ضروری خرچ کے علاوہ سارے فالتو خرچ بند کرواؤ اور بھئی' میں تو صاف کہتی ہوں کہ اماں بیگم سے ایک بار بیٹھ کر کہہ دو کہ ان خرچوں کے علاوہ بھی گزر ہو سکتی ہے تو بھی بختیار اس مسئلے کے متعلق سوچتا۔

اور جب واقعی یہ سوال در پیش ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ کتنا پیچیدہ تھا۔ آخر وہ کون سا خرچ کم کر دیا جائے۔ شریف اور خانساماں کے بغیر تو وہ کبھی اپنے گھر کا تصور کر ہی نہ سکتا تھا۔ جمعدار اور دھوبی؟ آخر ان میں سے کسے کم کر دیا جائے؟ اب لے دے کے ایک مالی رہ جاتا ہے۔ بختیار نے برآمدے کے در میں کھڑے کھڑے مالی کو کیاریاں صاف کرتے دیکھ کر سوچا۔

پورچ کے خوب صورت دروں کے نازک نازک کھمبوں پر گلابی رنگ کے نازک اور خوبصورت پھولوں کے جھومر سے لٹک رہے تھے اور ان کے عقب میں لان کا سبزہ چمک رہا تھا جو اس گرمی میں بھی شاداب اور نم نظر آ رہا تھا۔ آم اور لیچی کے مضبوط پیڑ گرم ہوا میں جھوم رہے تھے۔ بھیگے ہوئے تھالوں میں کھڑے ہوئے قطار در قطار گلابوں میں سفید زرد اور گلابی پھول کھل رہے تھے۔ پھاٹک پر چڑھی ہوئی زرد چنبیلی میں اتنے پھول آئے تھے کہ پتوں کی کاہی کاہی سی ہریالی ان کی زردی میں چھپی سی جا رہی تھی' جیسے کالی رات میں ستارے جگمگا رہے ہوں۔ باغ کے کنوئیں کے اندر سے مشین کے دھک دھک چلنے چلنے کی آواز چلی آ رہی تھی اور ان تمام چیزوں نے مل جل کر فضا میں کتنا استحکام اور استقامت پیدا کر رکھی تھی۔

کیاریوں کی نلائی کرتے کرتے مالی نے زمین میں' جونمی کے باعث کالی نظر آ رہی تھی' اپنی کھرپی کا پھل گاڑا اور کھڑا ہو گیا۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا۔ وہ لیچی کے پیڑ کے پاس جا کر رک گیا۔ لمبے لمبے سبز پتوں کے درمیان سے عنابی اور زردی مائل سبز لیچیاں جھانک رہی تھیں۔ مالی نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر کمر پر باندھ دیئے اور بڑے غور سے رسیلے خاردار پھلوں کے بوجھ کے جھکے ہوئے پیڑ کو دیکھا۔ اس کی گھنی برش ایسی مونچھوں کے تلے دبے ہوئے موٹے موٹے سیاہ ہونٹ ایک واضح تبسم کے اثر سے پھیل گئے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں طمانیت اور سکون تھا۔ بارآور مشقت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آسودگی اس کے ٹھسرے ہوئے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

باغ کی پچھلی طرف بانسوں کے پیچھے مالی کا کوارٹر تھا' جس کی چھوٹی سی لپی پتی کوٹھریا میں اس پتھر کی ترشی ہوئی مورتی کی طرح مضبوط اور سیاہ فام مالن نے اپنے نو بچوں کو جنم دیا جس کی چال کا البیلا پن آج تک اسی طرح موجود تھا۔ چلتے میں اس کے پیروں میں کانسی کے کڑوں سے چھڑے ٹکراتے اور چھن چھن پائل بجا کرتے۔ اپنے بچپن سے بختیار مالن کی چال سے پیدا ہو کر فضا میں بکھرتا ہوا یہ عجیب سا نغمہ سنتا چلا آیا تھا۔ وہ شروع سے لے کر اب تک اس کی گود میں ایک عدد سیاہ فام اور چوڑا چوڑا کاجل لگی آنکھوں والا بچہ دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ ارے! مالن کے ان نو بچوں کی نالیں تو یہاں اسی کوٹھریا کی دہلیز کے آگے گڑی ہیں۔

فکر اور تشویش سے اس کا سر چکرا گیا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ اور واپس اسی کرسی پر آ بیٹھا جہاں وہ اخبار پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اخبار اٹھا لیا اور سوچا۔ ''ارے! یہ اخبار اگر نہ ہوا کرتے تو لوگ اتنے ڈھیر سارے وسوسوں اور پریشانیوں سے بھاگ کر کس کے دامن میں پناہ لیا کرتے۔''

کھس کھس کرتے ہوئے قدموں کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور اپنے کرتے کی آستین اوپر کھسکاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''السلام علیکم چچا!''

''وعلیکم السلام! جیتے رہو! بڑی عمر! ہم تو دعا ہی دیں گے بھتیجے کو۔ اب تم لوگوں نے سلام علیکم کا فیشن نکال لیا ہے تو نکال لو۔ بزرگ تو پھر بھی دعا دیں گے۔'' اعظم بیگ نے ہر ہر لفظ کو جما جما کر ادا کیا۔

بختیار نے ان کو غور سے دیکھا۔ سرخ بھبوکا سا رنگ' چھوٹی چھوٹی بھوری مونچھیں اور دبلے پتلے۔ اس کی اور ان کی کب کی واقفیت تھی۔ اس نے تو ان کو کبھی کبھی ابا میاں کے پاس آتے دیکھا تھا۔ وہ بھی مہینے کی شروع تاریخوں میں۔ اور اب اس مرتبہ یہاں آ کر یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ابا میاں کے آخری کام کے سلسلے میں یہ بڑے کام کے ثابت ہوئے۔ ان کے قریبی دوست وغیرہ تو گول

کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے سگریٹوں کے کش لگاتے رہے اور یہ ہر طرف دوڑتے پھرے۔ غسل تک اپنے ہاتھ سے دیا اور پھر اس کے آنے کے بعد وہ بڑی سنجیدگی سے اس کے پاس تعزیت کو آلے۔ حالانکہ اس تکلف کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے لفظوں میں تو اظہار افسوس نہ کیا تھا لیکن ان کے چہرے کی افسردگی اور بجھا ہوا انداز بتا رہا تھا کہ جیسے ان کا کوئی نقصان ہو گیا ہو۔ دوسری مرتبہ جب وہ آئے تو انہوں نے اس سے کہا۔ ''اگر اندر پردہ نہ ہو تو میں بھی گھڑی بھر کو بھاوج کے پاس ہو آتا۔'' اور ان کے لہجے میں التجا اور ہراس تھی۔

بختیار انہیں اندر لے گیا تو اماں بیگم نے ان کے پاس آ کر بیٹھنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ویسے ہی تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی ناگواری سے چھالیہ کترتی رہیں۔ دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد وہ خود ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنے سلام کا جواب لیے بغیر ہی لوٹ گئے۔

''ان سے اور اماں بیگم کی کس بات پر ناراضی ہو سکتی ہے۔'' بختیار نے سوچا۔ حالانکہ ان کو تو یہ تک خبر نہیں تھی کہ وہ ابا میاں کے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔ اس دن کے گئے آج آئے تھے۔

اور آج کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان پر کوئی سخت تکلیف گزر رہی ہے۔ اس قسم کی تکلیف جیسے کوئی اپنی تقدیر کا آخری فیصلہ سننے والا ہو۔ آج وہ بے تکلف بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں امید و بیم اور پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

بات کی تمہید کا سرا ابھی انہیں نہیں مل رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر کی بے تکی خاموشی کے بعد انہوں نے بے تکا سا سوال کیا۔

''میاں! تم نے شہریار کو بھی اطلاع کی بھائی صاحب کے حادثے کی؟''

''اب ان کو اطلاع کیا دی جائے۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ سوائے پریشان ہونے کے وہ کر بھی کیا سکیں گے۔''

بختیار نے دھیرے سے کہا مگر وہ سوچ رہا تھا' جو شخص فرانس کے مورچے پر سیلی ہوئی بدبودار خندقوں میں اپنا وقت گزار رہا ہو' جس کے دائیں بائیں سرد بے جان جسم اور ٹھٹھرے ہوئے زخمی بکھرے ہوں جو اپنے مردہ ساتھی کی جیبیں ٹٹول کر نکالے ہوئے سیلے اور خون آلودہ سگریٹ کو سلگا کر گرمی' روشنی اور تسکین کے لمحاتی احساس کو ہی زندگی کی سب سے بڑی عشرت سمجھ رہا ہو اس پر اپنی ہی چھت کے نیچے آسائش سے مر جانے والے باپ کی اطلاع پہنچنے یا نہ پہنچنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

اور کون جانے کہ اب اس گھڑی اور اس لمحے میں بڑے بھیا۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے خیالات کی دلیری پر آپ ہی حیران رہ گیا اور اس نے اپنے خیال کی نوعیت کو پلٹ دینے کا فیصلہ کر کے سوچا۔ وہ اب کہاں پر ہوں۔ شاید جرمنوں کی قید میں ہوں۔ ہاں' یہ ٹھیک

ہے۔ اس حد تک سوچ لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔ پر وہ اپنے مسکراتے ہوئے، نشیلی آنکھوں اور شاہزادوں کے سے ڈیل ڈول والے بڑے بھیا کی ذات سے کوئی تصور وابستہ بھی کیسے کر سکتا تھا۔

اعظم بیگ اب دور برآمدے کے باہر کہیں خلا میں کچھ تک رہے تھے اور بے چینی سے دھیرے دھیرے پیر ہلا رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے کرتے کی بائیں طرف والی جیب میں ہاتھ ڈال کر پانوں کی ڈبیہ اور سلمے ستارے کے کام کا میلا سا بٹوہ نکالا۔ پان موڑ کر منہ میں رکھا اور بٹوے سے نکال کر چھالیہ اور تمبا کو پھانک لی۔ خوشبودار پتی کے تمباکو اور الائچی کا ایک بھبکا ان کے منہ سے نکلا اور فضا کے اس مختصر سے حصے میں پھیل گیا جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔

اچانک بختیار کو کچھ یاد آ گیا۔

''اعظم چچا! حقہ تازہ کرواؤں؟''

اعظم چچا کی مغلئی وضع کی بھوری آنکھیں بے حد ملائم اور رقیق نظر آ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار تھے۔ بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا اور منہ پھیر کر بولے۔

''نہیں میاں، میں حقہ نہیں پیوں گا۔''

وہ اٹھ کر گیا اور شریف سے کہا۔ ''صاحب والا حقہ تازہ کر کے یہاں دے جاؤ۔''

اور جب چلم پر چمکتی ہوئی دو دو کش رکھے ہوئے سوندھی سوندھی مہکار والا وہ مانوس حقہ ان کے سامنے لا کر رکھا گیا تو ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ انہوں نے سر جھکا لیا اور پھر اپنی طلب کے آگے بے بس ہو کر مہنال پکڑ کر منہ سے لگا لی۔ بہتی ہوئی آنکھوں کے باوجود وہ کش لگاتے اور دھواں فضا میں بکھیرتے رہے۔

اچانک بختیار کو کچھ یاد آ گیا۔ ابا میاں کی ڈائری کے متعدد ورقوں پر اخراجات کی مد میں اس نے اعظم بیگ کے نام کے آگے چالیس روپے کی رقم لکھی ہوئی دیکھی تھی۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا۔ اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلا اور پھر کنکھیوں سے اعظم چچا کی طرف دیکھا، جو افسردہ اور خاموش بیٹھے حقے کے کش لے رہے تھے۔

کمرے میں دس دس روپے کے چار نوٹ لیے وہ دیر تک سوچتا رہا۔ نہ معلوم ابا میاں کس طور سے یہ روپیہ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوں گے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو عمر اور رشتے میں اس کے بزرگ ہیں، ان کے ہاتھ میں کس طرح یہ نوٹ تھمادے اور پھر اس نے دراز کھول کر ایک سادہ لفافہ نکالا، نوٹ اس میں رکھے اور لب لگا کر لفافہ چپکا دیا۔ اور سوچا اب جو ہو سو ہو، آج اور فی

الحال تو میں انہیں مایوس نہیں کروں گا۔ اس کو مطلق خبر نہ تھی کہ اپنے اس غریب رشتے دار کو اس کا باپ بھی یوں ہی ایک بند لفافہ چپکے سے تھما دیا کرتا تھا۔

کمرے سے نکل کر آتے ہوئے بختیار نے سوچا۔ ''ایک شریف آدمی کے لیے ایک شریف آدمی کی مدد کرنا بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ اور پھر جھکی ہوئی شرمسار نظروں سے لفافہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اعظم بیگ نے باچھوں میں پھیلتی ہوئی پیک کو واپس سڑپتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اس شخص کا سا تاثر تھا جس کو کسی نے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ اور اس نے جب ان کی طرف نظر کی تو اس کو محسوس ہوا کہ جس وقت سے وہ آکر بیٹھے ہیں، پہلی مرتبہ ان کے چہرے پر اطمینان اور سکون کی جھلک نظر آئی ہے۔ لفافہ انہوں نے بغیر کچھ کہے کرتے کی جیب میں رکھ لیا اور خاموشی سے بیٹھے حقے کے کش لگاتے رہے۔ اور جب حقہ سرد ہو کر خاموش ہو گیا تو انہوں نے اس سے رسمی طور پر سوال کیا۔ ''اب تو تمہاری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں ۔۔۔۔۔۔ تم جانے والے ہو گے۔''

''جی ہاں، فی الحال تو علاقے پر جانے کا سوال ہے، کچھ دن کو۔''

''اور پھر علی گڑھ چلے جاؤ گے؟ بھاوج اور لڑکیاں بالکل تنہا ہو جائیں گی۔'' انہوں نے تشویش کا اظہار کیا۔

''یہ سب پرانے نوکر موجود ہیں اور پھر آصف بھائی تو محاذ پر ہیں۔ اب تک تو صولت آپا ڈلہوزی میں رہ رہی تھیں۔ اب خیال یہ ہے کہ وہ گھر کو کرائے پر اٹھا دیں اور آصف بھائی کی واپسی تک یہیں رہیں۔ ان کے بچے آ جائیں گے تو اور بھی رونق ہو جائے گی۔''

''اچھا تو کیا صولت بٹیا نے ڈلہوزی میں کوئی گھر بنوا لیا ہے؟'' اعظم بیگ نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''مگر یہ کیا کہ اتنی دور سب سے الگ بنوایا ۔۔۔۔۔۔ نینی تال میں بنواتیں۔'' یہ ان کی عادت تھی کہ بات میں ایک جملہ معترضہ ضرور شامل کر دیا کرتے تھے۔

''معلوم نہیں، کیوں؟'' بختیار نے باعث بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔

اور ان کو بھی اب زیادہ دیر تک بیٹھنے میں کوئی مصلحت نہ نظر آ رہی تھی۔ ''اچھا بھئی اب چلتے ہیں۔'' انہوں نے کاہلی سے کہا۔

''بیٹھیے، کھانا کھا کر جائیے گا۔'' بختیار نے اخلاقاً صلاح کی۔

''نہیں بھئی، تمہاری چچی انتظار کرتی ہیں۔''

پھاٹک کے قریب پہنچ کر اعظم بیگ نے احتیاط سے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور جیب میں سے لفافہ نکال کر لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چاک کیا۔ دس دس کے پورے چار کڑکڑاتے ہوئے نوٹ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ بختیار نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کہ ان کے چہرے کا انقباض اور تجسس اب جا کر دور ہوا۔

باب ۴۵

روانگی سے پہلے بختیار نے ارجمند اور گیتی کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ ''دیکھو! مجھے تم سے کچھ باتیں کہنا ہیں۔ واپسی پر میں اتنے کم وقت کے لیے رکوں گا کہ پھر شاید بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ دیکھو! تم دونوں اماں کا خیال رکھنا۔ وہ تنہا ہیں اور اس صدمے کے علاوہ بڑے بھیا کی وجہ سے بھی پریشان رہتی ہیں۔ اپنے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اب ان حالات ہی میں گزارا کرنے کی کوشش کرو۔ میں اپنی سی ہر کوشش کروں گا کہ گھر کے طریقوں اور دستور میں کم سے کم تبدیلی آئے۔ بس دو ہی سال کی بات ہے۔ میری پڑھائی ختم ہو جائے۔ پھر تم لوگوں کو فکر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ فی الحال تم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو۔''

وہ دھیرے دھیرے اپنی چیزیں اور ضروری کاغذات سمیٹ رہا تھا اور گیتی کونے میں رکھے ہوئے چمڑے کے گول مصری مونڈھے پر چڑھی اپنے دونوں گھٹنوں کو سمیٹے ہاتھوں کے حلقے میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں کھڑکی کے باہر بھٹک رہی تھیں جہاں میٹھے کھلونے والا بانس پر لپٹی ہوئی رنگ برنگی نرم نرم شکر کی لگدی میں سے شکر توڑ توڑ کر مالی کے بچوں کو ننھے ننھے چڑیاں اور چوڑیاں بنا بنا کر دے رہا تھا۔

''میٹھے کھلونے والا'' گیتی کے بھٹکے ہوئے ذہن میں ہلچل مچی۔ ''ہم کتنے شوق سے یہ کھلونے لیا کرتے تھے اور جب ابا میاں کے پیچھے پڑتے تھے تو پھر وہ احاطے بھر کے بچوں کو جمع کرنے کا حکم دیتے تھے اور پھر ان سب کو کھلونے دلواتے تھے۔ جتنے جس کا جی چاہے بنوائے۔ یہاں تک کہ رنگ برنگی شکر کی ساری لگدی ختم ہو جاتی۔ اور میٹھے کھلونے والا اپنا ٹنڈ منڈ ننگا بانس اٹھا کر ان کے عمر و اقبال کو دعائیں دیتا چل دیتا تھا۔ اور صولت آپا کی شادی میں ہم نے کتنے کھلونے بنوائے تھے۔ مسعود نے اور میں نے تو ڈبا بھر لیا تھا۔ مسعود! ایک کسک سی اس نے محسوس کی۔ پتہ نہیں دل میں یا دماغ میں، کہاں وہ درد اور محرومی کی چمک سی ہوئی۔

تو وہ یوں بختیار کی باتوں سے خالی الذہن اور بے تعلق بیٹھی کھڑکی کے باہر تک رہی تھی اور ارجمند اپنی ذمہ داریوں کے سمجھتے ہوئے بڑے سلیقے سے بختیار کے کپڑے تہہ کر کے بکس میں جما رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ضبط کی کوشش میں اس نے اپنے پتلے گلابی ہونٹوں کے سرے کو دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ بختیار کی آواز کی نرمی اور اس کے لہجے کی افسردہ سی ذمہ داری نے اس کے دل کو پگھلا دیا تھا۔ بغیر آواز کے دو آنسو بختیار کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ٹپک گئے جس نے اپنی ٹائی دینے کے

لیے ابھی اس کے آگے ہاتھ بڑھایا تھا۔

"ہیں، ارجمند! اولڈ گرل!" بختیار نے اپنا پرانا بے پروا لب ولہجہ واپس بلانے کی ناکام کوشش کی۔ "ارے! تم رو رہی ہو؟ ڈونٹ بی سلی۔" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم تو بڑی سمجھدار لڑکی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے نا؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر شفقت سے مسکرایا۔ اور ارجمند نے جلدی جلدی اپنے آنسو پوچھ لیے۔

"بڑی سمجھدار! کیا کہنے ہیں۔" گیتی کا جذبہ رشک اس وقت بھی بیدار تھا۔ وہ تلخی سے ہنس دی۔

بختیار مڑا "اور ہاں گیتی، مجھے تم سے خاص طور پر یہ کہنا ہے کہ اب تم عقل سیکھ لو اور۔۔۔۔۔۔"

"اور تم بالکل مٹی کا مادھو بن جاؤ۔ بہت اچھا سرکار!" گیتی گئے دنوں کی یاد کے اثر سے اس وقت شگفتگی کے موڈ میں تھی۔

"احمق پن کی باتیں نہ کیا کرو۔ میرا مطلب ہے کہ اب تم کو اور ارجمند کو زیادہ سمجھداری سے کام لینا چاہیے۔"

گیتی سے انفرادی طور پر مخاطب ہو کر بختیار کی عقل ہمیشہ الٹ جاتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر کو بخوبی ادا نہ کر پاتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اس کی بزرگی تسلیم کرنے کو سرے سے تیار نہ تھی۔ تین سال کی چھٹائی بڑائی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ "ہم نے بختیار بھیا! تمہارے ساتھ کنچے اور چوڑیوں کے ٹکڑے کھیلے ہیں اور تمہاری وکٹ کیپری کی ہے۔" وہ ہمیشہ لاپروائی سے اس کی نصیحت کا جواب دیا کرتی تھی۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔"

"کچھ بھی مطلب نہیں۔" بہت دھیرے سے گیتی نے زیر لب کہا۔

بختیار نے بات جاری رکھی۔ "اب صولت آپا یہیں آ کر رہیں گی۔ جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی اس وقت تک ان کا ڈلہوزی میں اکیلے دونوں بچوں کے ساتھ رہنا فضول ہے۔ ان کے یہاں آ کر رہنے سے تم لوگوں کو بڑی بے فکری رہے گی اور ہاں گیتی! تم ذرا ان سے گستاخیاں کم کرنا۔"

ان کی بات سنا کرو، وہ تمہارے بھلے کو کہتی ہیں۔ ان کا مطلب تم کو برا بھلا کہنے سے یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ وہ تم کو حقیقت میں برا سمجھتی ہیں۔ اماں کی خوشی اور سکون کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ تم دونوں ان کے اور صولت آپا کے مشوروں پر عمل کیا کرو۔"

"ابا کا دل بہت بڑا تھا۔ جب فصل پر پہلی مرتبہ کوئی چیز منگاتے تو گاڑی بھر کے منگواتے تھے۔ گھر کے نوکروں چاکروں تک کا دل سیر ہو جاتا تھا۔ ان کو شور مچاتے اور ہنس ہنس کر کھاتے کھیلتے ہوئے لوگ کتنے اچھے لگتے تھے۔" صولت آپا کے مستقل طور پر رہنے

کی خبر سے فکر مند ہو کر وہ پھر اپنے ماضی کے محفوظ قلعے میں جا گھسی تھی۔

''سن رہی ہو' میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' بختیار نے اس کے چہرے کے کھوئے کھوئے تاثر کو محسوس کر کے کہا۔

''ہاں'' وہ چونکی' سب باتیں اس کے ذہن میں گڈ مڈ ہو چکی تھیں۔ ''صولت آپا کو آخر یہاں آ کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے بچے بھی فضول میں جگہ سے بے جگہ ہوں گے۔''

''احمق ہو تم تو۔'' بختیار جھلا گیا۔

''ارجمند تو عقلمند ہیں۔'' اس کی آواز بے حد کڑھی ہوئی تھی۔ اور پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

بختیار غصے اور رحم کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اس زود رنج لڑکی کو دیکھتا رہا۔

باب ۴۶

''اے ہے! آسمان پر بدلیاں آ رہی ہیں۔'' صولت نے موہوم سی سبزی مائل آسمانی رنگ کی ساری کا آنچل سر پر ڈالتے ہوئے سوچا اور لان پر لگی ہوئی بید کی کرسیوں کے درمیان پڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی چوکور میزوں پر پڑے ہوئے خوش رنگ میز پوشوں کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور پھر لان کے سرے پر لگی ہوئی بڑی سی میز پر مشروبات کے جگ' گلاس اور کھانے پینے کی مختلف چیزیں لگوانے لگی۔

''دیکھو شریف! تم ایسا کرو کہ دہی بڑوں کی چاٹ کا مسالا الگ رکھ دو اور سونٹھ املی الگ جگ میں لاؤ۔ لوگ اپنی پسند کے مطابق خود ڈال لیں گے۔''

برف سے سفید کپڑوں میں ملبوس اپنی خوبصورت آنکھیں ادھر ادھر گھماتی ہوئی ارجمند برآمدے سے نکل کر اس طرف آئی۔ ایک بہت صورت بڑا سا ڈبہ تحفوں والی میز پر رکھنے کے بعد بڑی پیاری اور دھیمی سی آواز میں صولت سے بولی۔

''صولت آپا! مبارک ہو' خدا کرے سیما کی اگلی سالگرہ آپ آصف بھائی کی موجودگی منائیے۔''

''ارے ہاں' کاش یوں ہی ہو۔'' نہ جانے کیوں ان کی آواز میں ذرا بناوٹ سی تھی۔ حسب عادت انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولیں۔ ''بھلا اتنی فورمیلٹی کی کیا ضرورت تھی۔ تم لوگ تو ان کو ہر وقت دیتے ہی رہتے ہو۔''

ارجمند جواب دیئے بغیر فوراً انتظام میں مصروف ہوگئی۔ بہت ہلکے گلابی رنگ کی پھول سی فراک اور گلابی رنگوں میں سیب کے سے سرخ گالوں والی سیما اچھلتی کودتی سیڑھیوں پر سے اترتی چلی آرہی تھی۔ اس کے سیاہ بال اور آنکھیں ماں کے بجائے خالہ گیتی سے بہت زیادہ مشابہ تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے باپ یعنی آصف جاہ سے زیادہ مشابہت رکھتی تھی۔ وہ تیتری کی طرح خوش رنگ اور ہلکی پھلکی تھی اور ماں کی کڑی نگرانی اور تربیت کے باوجود بے فکر اور لاپرواہ تھی۔

''یہ دیکھو دیکھا تم نے! یہ تمہاری فراک مسل گئی ادھر سے۔'' اس کی ماں نے دیکھتے ہی اس کو ٹوکا۔

''کوئی بھی تو نہیں۔'' اس نے پھرکی کی طرح گھوم کر اپنے دامن کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

''مسلی کیسے نہیں؟'' اس کی ماں نے جھڑکا۔

اور ارجمند نے جھک کر اس کا دامن برابر کرتے ہوئے۔ ''سچ تو ہے صولت آپا' وہم ہوگیا ہے آپ کو۔''

''ارجمند بھئی' لینا ذرا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ غبار اور جھنڈیاں تو لگا لو جلدی سے۔''

''اور اس خاکسار کے لیے کیا حکم ہے؟'' صولت نے گردن گھما کر دیکھا۔ اکبر اپنے مخصوص مسخرے انداز میں ڈرامائی پوز میں جھکا ہوا تھا۔

''اس خاکسار کے لیے یہ حکم ہے کہ فی الحال اپنا مسخرہ پن ملتوی رکھے اور۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔'' صولت وجیہہ اور خوش شکل اکبر کے لیے کام سوچنے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ میں کیوں نہ امرود کے کچالوؤں کی چاشنی اور دہی بڑوں کا نمک مرچ چکھ ڈالوں؟''

اس نے ارجمند کو اشارے سے منع کیا کہ وہ بول نہ پڑے کہ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں ایک عدد گلاب جامن موجود تھی۔

''اچھا تو ٹھیک ہے اکبر میاں! تم ذرا آئس کریم کی مشین کا چارج لے لو۔''

''یہ بھی کچھ ایسا برا نہیں۔'' اکبر نے کہا اور پچھلے برآمدے کی طرف گھوم گیا۔

اور پھر اسی وقت غسل خانے کے دروازے کی چٹخنی کھول کر سفید شلوار اور تیز اور دھاری دار وائل کی قمیض اور چنے ہوئے زرد دوپٹے میں گیتی برآمد ہوئی۔

''کتنے غلط راستے سے یہ نکلی ہے۔ یہ ہمیشہ ہی غلط راستہ اختیار کرتی ہے۔'' صولت نے سوچا۔

اس کے چہرے کی زردی اس کے دوپٹے سے میل کھا رہی تھی۔ اور اس زردی کے مقابل آنکھوں اور بالوں کی بھیگی بھیگی سیاہی

اور بھی نمایاں نظر آ رہی تھی۔

وہ بالکل مہمانوں کی طرح آ کر نسبتاً کنارے پر رکھے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''اچھا! تو یہ ترتیب واقعی اچھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سلیقہ اور جدت تو صولت آپا پر ختم ہے۔'' اس نے سوچا۔

سیما نے ارجمند سے ہاتھ چھڑایا اور کود کر گیتی کے پاس پہنچ گئی۔ ''میرا تحفہ؟''

''سیما تمہاری یہ فراک بہت پیاری ہے۔''

''اونہہ۔۔۔۔۔۔۔ ہوگی۔ آپ میرا پریزنٹ لائیے۔''

''سیما! اردو میں بات کرو۔''

''کرلوں گی۔۔۔۔۔۔۔ کرلوں گی۔'' سیما جھنجلائی۔

''اچھا' یہ بتاؤ یہ تم اپنی سالگرہ کس واسطے مناتی ہو۔۔۔۔۔۔۔ تحفے لینے کے لیے یا اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے؟''

''اوہ بھئی! تحفے لینے کے لیے بھی۔'' اس نے تحفے پر زور دے کر کہا۔ ''اور۔۔۔۔۔۔۔ دوستوں سے ملنے کے لیے بھی۔ پر یہاں پر میرا دوست ہے ہی کب کوئی؟ ممی فضول مجھے ڈلہوزی سے لے آئیں۔''

''ہاں' میرا بھی یہی خیال ہے۔'' گیتی نے دور خلا میں تکتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے تحفہ؟'' اس نے گیتی کی بند مٹھی کھول کر دیکھی' جو خالی تھی۔

''توبہ ہے' مل جائے گا تحفہ بھی۔۔۔۔۔۔۔ بے صبری تو نہ کرو۔''

''اچھا لیجئے' اب میں صبر کرتی ہوں۔'' سیما کچھ مایوس ہو کر چل دی۔

''لو بھئی! تحفہ تو لیتی جاؤ۔'' گیتی نے پکارا۔

''اونہہ! یہ کیا ہے؟'' اس نے بے اعتنائی سے چھوٹی سی بچی کی تصویر کو دیکھا جو چاندی کے چھوٹے سے فریم میں مسکرا رہی تھی۔

''یہ۔۔۔۔۔۔۔ یہ تصویر تمہاری ممی کی ہے۔ جب وہ تمہارے برابر تھیں۔''

''سچ!'' سیما مسکرائی۔ ''آپ نے دیکھا تھا ممی کو جب وہ میرے برابر تھیں؟''

''نہیں سیما' میں نے تو نہیں دیکھا مگر تصویریں دیکھی ہیں۔ اب ایک دن میں تمہیں وہ البم دکھاؤں گی جس میں ہم سب کے بچپن کی تصویریں ہیں۔''

''ممی دیکھیں' گیتی آنٹی نے مجھے کتنا پیارا پریزنٹ دیا ہے۔''

سیما نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دی۔

''سیما! پھر تم نے مجھے آنٹی کہا۔''

''پھر کیا کہوں؟''

''خالہ کہو' خالہ بی کہا کرو۔''

''میری آپا کہتی ہے' آنٹی بولو۔'' سیما نے بالکل آپا کے لہجے میں کہا۔

''آپا کم بخت کو گولی مارو۔ وہ تم کو کرنٹی بنا دے گی' ممی' ڈیڈی' آنٹی کہلوا کہلوا کر۔''

''آپا کم بخت کو گولی ماردوں؟'' سیما نے حیرت سے پوچھا۔

''گیتی! خدا کے واسطے اب یہ مکروہ لفظ اس کے سامنے نہ بولنا۔ وہ پھر اس کو دہرائے گی۔'' صولت نے کہا۔

''تو کیا ہرج ہے' بامحاورہ زبان آجائے گی۔''

''اے ہٹو! نوج یہ کم بخت بد بخت محاورے ہوں۔''

''بہرحال' یہ نفرت اور جذبے کے اظہار کے عام تاثرات اور وسیلے ہیں' اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' گیتی نے سر کے جھٹکے سے آنکھوں پر جھکے ہوئے بال پیچھے کیے اور اطمینان سے منہ میں پڑا ہوا چیونگ گم چبانے لگی۔

''خیر' شریفوں کی زبان تو یہ نہ ہونا چاہیے۔''

''اب ہو یا نہ ہو' کم سے کم انسان کو اپنے نفرت' غصے اور محبت کے اظہار پر قدرت تو ہونا چاہیے۔ مجھے تو مہذب انسانوں پر ترس آتا ہے کہ نفرت اور غصے کا اخراج بھی نہیں کر سکتے۔''

ارجمند نے اس کے ہمیشہ کے ہٹیلے اور سرکش لہجے کو محسوس کیا اور سہم کر صولت کی طرف دیکھا۔

لیکن آج صولت کی چہرے پر کوئی تیوری تھی اور نہ برہمی کے آثار۔ اور یہی تو صولت آپا کی تعریف ہے۔ وہ وقت اور موقع کے لحاظ سے اپنے مزاج کی کیفیتوں کو اتنی اچھی طرح کنٹرول کر لیتی ہیں۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

''گیتی! بس اب تم اپنے فلسفے کو رہنے دو۔ ذرا باورچی خانے میں جا کر دیکھو۔ اور شریف سے کہنا کہ کبابوں کے ساتھ کی پوریاں بہت بڑی نہ ہونے پائیں۔ چھوٹی اور پھولی ہوئی پوری کباب کے ساتھ چلتی ہے۔''

''اماں بیگم کی آواز پر مڑ کر گیتی نے دیکھا۔ وہ عصر کی نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر آئی تھیں۔

اور یہ سیما کی سالگرہ کی بڑی معمولی سی تقریب تھی جو ابا میاں کے بعد اس گھر میں پہلی مرتبہ جا رہی تھی۔ اور صولت جو اپنے بچوں کی سالگرہیں اور چھوٹی موٹی دعوتی تقریبیں بھی بہت اہتمام اور دھوم دھام سے منانے کی عادی تھی' اس تقریب کو ایک جشن بے چارگی سے زیادہ حیثیت نہ دے سکی تھی۔

اس کی ڈلہوزی سے واپسی پر دونوں لڑکیوں اور اماں بیگم کے کمروں کے علاوہ سارا گھر اس کے اور بچوں کی ضرورت اور سہولت کے مطابق ٹھیک کر دیا گیا تھا۔ بچے فقط دو ہی تھے اور وہ خود صرف ایک' لیکن حال کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی قوت تو وہی تھی۔

صولت کو آصف جاہ کے محاذ پر جانے کا سخت احساس اور قلق تھا۔ اسی وجہ سے اس کی دل بستگی بھی ضروری تھی اور سیما کی یہ سالگرہ بھی اس کی دل بستگی ہی تھی جس میں سوائے چند بچوں' اکبر اور اس کی ممی کے اور کوئی مدعو نہ تھا۔

''اور یہ اکبر اور اس کی ممی کس حق سے اس پارٹی میں شریک ہیں جب کہ ان دنوں ان کے گھر کوئی چھوٹا بچہ نہیں۔'' گیتی نے خوب صورت پہاڑی کاٹیج کی شکل کے کیک پر پانچ باریک باریک ننھی ننھی شمعیں جماتے جماتے سوچا تھا۔

''یہ وقت اور یہ لمحہ بھی ماضی کے گہوارے میں جا سوئے گا۔ یہ شمعیں تعداد میں بڑھتی جائیں گی اور زندگی لحظہ بہ لحظہ' تل تل کر کے گھٹتی جائے گی' ہمارے ان جانے میں۔'' اس نے گھبرا کر سر کو جھٹکا۔ ''یاد ہے گزشتہ سے پچھلے سال ہم نے ابا میاں کی سال گرہ منائی تھی اور بختیار بھیا نے کیک کے گرد پچپن شمعیں جمانے کے بعد گن کر کہا تھا۔'' اُفوہ! کیک پر تو جگہ بھی باقی نہیں رہی۔'' تو دادی اماں فوراً برامان گئی تھیں۔ ''اے بھئی! یہ تم لوگ کیوں شمعیں جلاتے اور گنتے ہو؟ ہم تو ہر سال ایک سونے کا چاند کچے کلاوے میں چپکے سے بغیر گنے باندھ دیتے ہیں اور شیرینی پر نظر دے دیتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے میں نے اپنے لڑکوں کے چاند گن کر نہیں دیکھے۔ خاقان کے بعد میں نے ان کا کلاوہ گنا تو کل بتیس چاند تھے۔ اور پھر جب بختیار بھیا نے ابا کو کیک کے پاس کھڑا کر کے ان کے ہاتھ میں شمعیں روشن کرنے کے لیے ماچس کی ڈبیا دی تو کہا۔ ''مبارک ہو ابا میاں' زندگی کے پچپن کامیاب سال!'' تو ابا میاں اچانک اداس ہو گئے تھے۔'' کون جانے اس میں کل کتنے کامیاب سال ہوں گے بختیار!''

گیتی کیک اور شمعوں کے پاس سے دور ہٹ کر چلی آئی۔

''یہ تمہارا اپنا میکہ ہے' یعنی تمہارا گھر۔۔۔۔۔۔جس میں تمہارا بچپن اور تمہارے سارے خواب محفوظ ہیں اور جب ہی تو تم اس آسمانی ساری میں اپنی عمر اور تجربے سے کئی سال کم نظر آ رہی ہو۔ صولت آصف جاہ! میں سچ کہتا ہوں۔ تمہارے اندر کوئی اسرار ضرور

ہے۔کوئی اسرار ضرور تھا جس کو مصلحت اور ضرورت کی دبیز تہوں کے تلے چھپا دیا گیا ہے۔لیکن تمہاری روح کا وہ پوشیدہ اسرار تمہاری آنکھوں میں خوابیدہ نظر آتا ہے اور کبھی کبھی وہ ہر قید اور بندش سے آزاد ہو کر تمہاری شخصیت پر محیط ہو جاتا ہے۔''

یہ کرنل سجاد تھا جو اپنی جیپ کے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے بڑی کیفیت کے عالم میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اور اس کو دیکھ رہا تھا جو بڑے انہماک سے اپنی بچی کی سالگرہ منانے میں مصروف تھی۔

''وہ کبھی بھی وقت پر نہیں پہنچتا۔میں نے آج تک کسی فوجی کو وقت سے اتنا بے نیاز نہیں دیکھا۔جب ہی تو وقت کی لہریں اس کے قریب سے گزرتے گھبراتی ہیں۔سجاد!تمہاری روشن پیشانی اور خماریں آنکھوں میں ابدیت ہے اور لازوال قوت۔تم آؤ گے اور ضرور آؤ گے۔مگر دیر سے آؤ گے اور پھر حسب عادت مسکرا کر کہو گے۔''میں اقبال نہیں پھر بھی دیر سے آتا ہوں۔''

روشن شمعوں کے ارد گرد کھڑے ہوئے مہمانوں کے درمیان' سیما کا ہاتھ پکڑے ہوئے' اس کی درازی عمر کی دعا گاتے صولت نے یہ سب کچھ سوچا اور بلا ارادہ اس کی نظر اٹھی۔وہ اسی طرح اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے گردن جھکائے نیم وا نظروں سے اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے آج ہی پہلی دفعہ اس نے اس کو دیکھا ہو۔وہ مسکرائی۔اس کے شفاف خوب صورت دانت اپنے مخصوص انداز میں چمکے اور وہ ٹھٹک گئی۔

''آ گئے نا آخر تم؟''اس نے سوچا اور پھر اسی انہماک سے ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیر سیما'' گانا شروع کر دیا۔

وہ جیپ سے اترا۔اس کی تھکی ہوئی نظر کے سامنے اٹنشن ہوا اور پھر ہجوم میں شامل ہو گیا۔

اس نے سیما کو ڈھیر سارے پیار کئے۔اس کے ہاتھ میں چھری پکڑوا کر کیک کٹوایا۔پھر اس کو گود میں اٹھا کر اپنی جیپ کی طرف لے گیا اور پھر وہ دونوں پیکٹوں' خوب صورت ڈبوں اور مٹھائی کی تھیلیوں سے لدے پھندے واپس آ گئے۔

''اے میاں!اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔''اماں بیگم نے اپنے طور پر تکلف کیا۔

''بس یہ ایسے ہی کرتے ہیں۔کوئی یہ پوچھے بھئی کہ تم کو سالگرہوں میں بلاتا کون ہے؟''صولت نے لیے دیئے انداز میں کہا۔

اور سجاد نے بغیر کوئی جواب دیئے اعظم کو چھیڑنا اور ستانا شروع کیا۔''یار اعظم!سنا ہے تمہارے باوا وہاں ٹریکٹر چلا رہے ہیں بلکہ گھاس کاٹ رہے ہیں۔''

''اوں'واہ!وہ تو وہاں لڑائی لڑ رہے ہیں۔''

''کیسی لڑائی.........زبانی لڑائی؟تو پھر اب کب تک لڑے جائیں گے؟''

مغرب کی اذان ہو رہی تھی، اماں بیگم نماز کے لیے اندر چلی گئیں۔

"اذان کی آواز آ رہی ہے اور بہت پر سکون کیفیت فضا میں موجود ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ سکون کو بے سکونی میں تبدیل کرنے میں مصروف ہیں۔" گیتی نے بچوں کو میوزیکل کشن کھلاتے کھلاتے سوچا۔

اکبر کی ممی ایک طرف بیٹھی ارجمند سے باتوں میں مصروف تھیں اور اکبر کرنل سجاد کی خاطر داریوں میں، جواب براہ راست صولت آپا سے باتیں کر رہے تھے۔

"اور کچھ کرنل صاحب آپ کے لیے؟" اکبر نے بڑی تہذیب سے جھک کر پوچھا۔ "آپ کے لیے کوئی چاٹ یا کوئی سی ڈرنک ------ میرا مطلب ہے کہ ڈرنک کریں گے آپ؟"

"نہیں میاں! میں ڈرنک نہیں کرتا۔" سجاد نے اپنی بھاری گھمبیر آواز میں کہا اور اپنی کشادہ پشت صوفے سے لگا لی۔

"ارے! تو یہ کاہے کے کرنل ہوئے۔" اکبر نے اپنی نو عمری اور نا تجربہ کاری کی بنا پر حیرت سے سوچا۔ "بڑھیا پوسٹ، اعلیٰ معیار زندگی اور کلب لائف کے باوجود ڈرنک نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کرنل سجاد! تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟"

لیکن کرنل سجاد میں یہی دو خرابیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ دوسرے اس کا ذہن اجلا اور ستھرا تھا۔ اس میں کسی قسم کا کامپلیکس نہ تھا اور وہ اپنی سطح سے بہت نیچے اتر کر دوسرے کی سطح پر آ جانے کا قائل تھا۔

اکبر کی بات کا جواب دے کر وہ پھر صولت کی طرف مخاطب ہو گیا۔

"کوئی خط ------ کوئی اطلاع؟"

"کس کی؟"

"تمہارے سرتاج کی۔"

"تم سے مطلب؟" وہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔

"نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ کچھ تو خیر خبر ہونا چاہیے۔"

"اچھا! اگر میں یہ کہوں کہ مجھے آج ہی آصف کا کا خط ملا ہے اور انہوں نے اس میں سیما کی سالگرہ کا ذکر کر کے اس کو بہت بہت پیار بھی لکھا ہے ------ تو پھر بتاؤ، تم کیا کہتے ہو؟"

"اونہہ! میں کیا کہوں گا ------ یہ تو شکر کا مقام ہے کہ تمہارے بچوں کے باپ کو ان کی سالگرہوں کا اتنا خیال ہے اور تمہیں

اس کی خیریت آج ہی معلوم ہوئی ہے۔'' سجاد نے جلتے ہوئے سگریٹ کا آخری حصہ ایش ٹرے میں مسل دیا اور نیا سگریٹ سلگا کر انہماک سے کش لیتا رہا۔

اور صولت سوچ رہی تھی۔ ''نہیں' سجاد! تمہارے نزدیک یہ شکر کا مقام کب ہے' تم تو اس آسرے پر میری خیریت پوچھتے ہو کہ میں اس کے گرفتار ہو جانے' گم شدوں کی فہرست میں آجانے یا زخمی ہو جانے کی خبر سناؤ' اور یہ تو زیادتی ہوئی نا تمہاری! وہ بے چارہ وہاں لڑ رہا ہے' دوسروں کے مفاد کی خاطر سہی' لیکن اس میں تھوڑی بہت اس کی اپنی اور اس کی وساطت سے اس کے بیوی بچوں کی غرض بھی شامل ہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم محاذ پر بھیجنے کے بجائے یہیں انٹیلی جنس کے کاموں پر مامور کئے گئے۔''

اکبر کی امی اکتا کر جا چکی تھیں اور مہمان بچوں کو ان کی آیا ئیں لے لے کر جانا شروع ہو گئی تھیں۔

گیتی جانے والے بچوں کو غبارے اور مٹھائی کی تھیلیاں تقسیم کرنے کے بعد ادھر سامنے والی کرسی پر آ کر ٹک گئی اور اس نے شریف سے کہا۔ ''اگر تم مجھے ایک گلاس شربت کا پکڑا دو تو بہت ثواب کماؤ گے۔''

بات کرتے کرتے سجاد کی نظر اس پر پڑی جس کی آنکھوں اور بالوں کی سیاہی زرد رنگ کے دوپٹے اور قمیض کے مقابل زیادہ چمکدار نظر آ رہی تھی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں میں بچوں کے ساتھ مل کر اس قدر ہنس لینے کے بعد بھی' ایک بڑے نقصان ہو جانے کے بعد والی' افسردگی اور گہرا ملال تھا۔ سجاد نے جب سے آنا شروع کیا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ اس کو گھومتے پھرتے دیکھا تھا۔ لیکن یہ احساس آج ہی ہوا کہ یہ اپنے گھر بھر میں سب سے کتنی مختلف ہے۔

کرسیاں' میزیں اور پارٹی کے تمام لوازمات لان سے سمیٹ لیے گئے تھے اور دونوں لڑکیاں بھی اندر چلی آئی تھیں۔ سجاد دیر تک لان پر خاموش بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد صولت اس کی خبر لیتی رہی۔ اور وہ بدلی جو شام کو برسنے کی دھمکی دے رہی تھی' اب گھور گھٹا بن گئی تھی۔

باب ۷۴

''یہ بھئی! اب اکبر سے اتنا تپاک اور ربط ضبط رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ٹھیک ہے ایسے حادثوں اور پریشانی کے وقت دوست دشمن سب ہی دوڑ پڑتے ہیں۔ اب ان کے ابا کے مرنے میں اکبر نے پھر آنا جانا شروع کر دیا لیکن صولت کو اب اس لڑکے کو زیادہ منہ

نہ دینا چاہیے تھا۔'' اماں بیگم نے بغیر کسی کے خیال دلائے ہوئے سوچا۔

''ذرا سی بات اور اس قدر رنگ دے کر ادھر ادھر بیان کرتا پھرا۔ اور وہ کب اس بات سے انکار کرتی ہے۔ جو حقیقت تھی وہ بیان کردی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ وہ سدا کی من چلی ہے کم بخت۔ اب جو سینما دیکھنے کی دھن آئی تو تیسرے درجے میں بیٹھ گئی اور ڈر لگا تو اس چینی کی آڑ پکڑ لی۔ اور خیر بات جو بھی ہوا کبر کو اب منہ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر صولت تو ہر بات میں کہہ دیتی ہیں کہ آپ نہیں جانتیں۔ اب یہ کچھ عرصے پہلے وہ ایک بار بھی یہ بات کہتی تو میں اس کا منہ بنا دیتی۔ لیکن اب تو واقعی مجھے اپنی سوجھ بوجھ پر کسی قسم کا بھروسہ ہی نہیں رہا۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ اب تک میں غلطیاں ہی غلطیاں کرتی چلی آئی ہوں۔ ٹھیک ہے، ہم سب غلطیاں ہی کرتے رہتے ہیں۔ ہماری زندگی ہی ایک بڑی زبردست غلطی ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ درست چیز وقت ہے۔ وہی رفتہ رفتہ ہر غلطی اور صحیح بات کو سامنے لے آتا ہے۔ صبح کی نماز کے ان وسوسوں کے گھبرا کر انہوں نے دعائے جمیلہ اپنے سامنے کھول کر رکھ لی۔

سرخ اینٹوں کے چبوترے کے سرے پر کمرخ کے درخت کے سائے تلے بان کی کھری چار پائی پر لیٹے لیٹے اس نے جولائی کی ملگجی دھوپ میں خاکستری چڑیوں کو اپنا رزق تلاش کرتے دیکھا اور خوشی کی ایک انجانی سی لہر اس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی نیم وا آنکھوں کے گوشوں سے گدلائے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ سرخی مائل بھوری کپاس کے پھوؤں کے مانند بادلوں سے سارا آسمان بھرا پڑا تھا۔ اور آسمان تلے خوبصورت گھنے پتوں اور نازک سے تنے والا میانہ قامت کمرخ کا پیڑ اس کے وجود پر سایہ کئے ہوئے تھے۔

پتوں کے گچھوں کے درمیان سنہری کمرخیں جھانک رہی ہیں۔ نیچے میں ہوں اور اس سب سے اوپر میرا خدا ہے۔ وہ رب لایزال جو اس وقت تک دائم و قائم رہتا ہے جس وقت تک کہ ہمارے عقیدے سالم رہتے ہیں اور یہ ننھی سی خاکستری چڑیاں ننھی سی مٹیالی گیندوں کی مانند اپنی ہم رنگ مٹی میں چہلیں کر رہی ہیں اور جب تک یہ سب کچھ ہے، مجھے اپنے دل میں کدورت رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے، جس کو گرد و غبار اور دھول میں اٹے ہوئے بے حد روشن مناظر سے نفرت ہے، جس کو بارش کے اچھوتے پانیوں میں نہائے ہوئے دھلے دھلائے سبز سبز اور دھندلائے ہوئے سے اتنے پیارے لگتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ یا یہ سب کچھ میرے اندر جذب ہو جائے گا یا پھر میں ان میں تحلیل ہو جاؤں گی۔ مجھے روشن اور ننگی حقیقتوں سے بے پناہ نفرت ہے۔ اسی لیے تو میں تلخ یادوں کے روشن چراغوں کو گل کر دینا چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے وجود پر کہر اور دھند کے اسرار محیط ہو جائیں جن کی اوٹ سے میں زندگی کے جمیل اور خوش کن پہلوؤں ہی کا نظارہ کر سکوں۔ جاؤ اکبر! میں نے تم کو معاف کر دیا اور صولت آپا تمہیں بھی، جس

نے اتنی فضول بات میرے متعلق مشہور کرنے والے کو دوبارہ گھر میں بلانا شروع کر دیا ہے۔ صفائے قلب اور درگزر کے احساس سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

آج بھی تو تم آنے والے ہو۔ اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ متوقع وقت سے بہت بعد میں پہنچو گے۔ اور خیر میں بھی تو تمہارے انتظار میں اپنی آنکھیں دروازوں کے ساتھ ٹانک کر بیٹھنے والی نہیں ہوں۔''

صولت نے اپنے سامنے پھیلائے ہوئے ریشم کے دھاگوں میں سے سرخ ریشم تلاش کرتے کرتے سوچا۔ سامنے اعظم بیٹھا لکڑی کے کٹے ہوئے بے ترتیب ٹکڑوں کو ترتیب سے جوڑ جوڑ کر ایک تصویر بنانے کی کوشش میں تھا اور سیما لکھ رہی تھی۔

''دیکھو سیما! پھر تم نے جلدی جلدی ہاتھ چلانا شروع کیا۔ عمدہ اور خوبصورت لکھائی ٹھہر ٹھہر کر کی جاتی ہے۔''

سیما نے سر کو جھٹکا دے کر منہ پر آئے ہوئے بال پیچھے کیے اور بولی۔ ''میں تو ہاتھ کو ٹھہرانا چاہتی ہوں مگر وہ جلدی کرتا ہے۔''

''اونہہ! بالکل گیتی کی طرح بال پیچھے کرتی ہے۔'' صولت نے کڑھ کر سوچا۔

ارجمند کمروں اور غسل خانوں کی صفائی کروا کر نکلی تو بھیگے ہوئے تولیوں کو باہر دھوپ میں کھڑی ہوئی گھوڑی پر لا کر سلیقے سے پھیلایا اور ہاتھوں سے برابر کرنے لگی۔

''اتنی دھوپ ہے کب جو ارجمند یہ تولیے لا لا کر پھیلا رہی ہے۔ مگر ہاں رفتہ رفتہ ہوا اور ملگجی دھوپ ان کی نمی کو دور کر دے گی اور ان میں بدبو پیدا نہیں ہونے پائے گی اور میں کتنی نکمی ہوں۔ واقعی کچھ کام نہیں کرتی۔ لیکن میں کروں کیسے۔۔۔۔۔۔۔ اتنی تو کاہلی آنے لگی ہے ان دنوں۔''

چبوترے کے آخری سرے پر دیوار پر پھیلی ہوئی گہرے نارنجی پھولوں والی بیل کی غیر ضروری شاخوں کو چھانٹتے چھانٹتے مالی نے کمرخ کے پیڑ کے نیچے گیتی کو اس طرح لیٹے دیکھ کر سوچا۔ میں نے اس گھر میں کبھی کسی کو اس طرح کھری چارپائی پر بے فکری سے لیٹے نہیں دیکھا۔ یہ تو کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم جیسی ہو۔ جیسے غریب گھروں کی مہراروئیں کھا پکا کر درختوں کی چھایا تلے پیر پسار کر ستانے لیٹ جاتی ہیں۔''

''اچھا تو آج سجاد صاحب کے آنے کا دن ہے۔ شریف نے دوپہر کے کھانے کے لیے صولت کی بتائی ہوئی فہرست پر غور کر کے نتیجہ نکالا۔ ''آم کی آئس کریم' آلو گوشت' خشکہ اور ارہر کی دال۔ سجاد صاحب کا آنا کچھ برا نہیں۔ بچے بھی خوش ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بھیا کے جانے کے بعد سے گھر کتنا سونا ہو گیا ہے۔ اور گھر میں مرد نہ ہو تو نہ گھر میں کوئی مصروفیت رہتی ہے نہ گڑبڑ نہ رونق۔ بس کھلایا

پلا یا اور نوکر حقے لے کر شاگرد پیشے کے کوارٹروں میں جا بیٹھے اور یوں خالی بیٹھے بیٹھے حقے گڑگڑانے سے انسان کی اپنی ذات کی کس قدر زبردست نفی ہوتی ہے۔" اس قسم کی بات شریف براہ راست سوچ تو سکتا ہی نہ تھا لیکن ایک احساس تھا جو ہر وقت اس کو کھائے لیتا تھا۔

پورچ میں گاڑی روک کر جب سجاد اتر رہا تھا تو اسی وقت گیتی نہا کر برآمدے میں آئی تھی۔ پانی کے لمس اور غسل کے اثر سے چہرے پر پیدا ہونے والی تازگی کے باوجود اس کی آنکھوں میں تکان اور افسردگی تھی۔

"آداب!" اس نے سجاد کو اپنے اتنے قریب برآمدے کی سیڑھیوں پر دیکھ کر سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"جیو!"

اور اس کو اس کے بہت قریب سے گزرنا پڑا۔ بیسن' سوتی سفید کپڑوں اور کیوٹی کے میلکم پاؤڈر کی ملی جلی خوشبو کا ایک لطیف سا احساس اس کے ذہن کو چھوتا ہوا نکل گیا۔

"بیسن اور سفید سوتی کپڑوں کے سوندھے پن کے ساتھ ساتھ پاؤڈر کے اس مخصوص برانڈ کی خوشبو میں کتنی لطافت اور کتنا تقدس ہے۔ خوشبوؤں کا یہ کورا کورا سا لطیف امتزاج اب کس تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ بیش قیمت سینٹوں' کولون اور تیز عطر میں ڈوبے ہوئے' سرسراتے خوش رنگ کپڑے میری آنکھوں اور ذہن کی اولین سطحوں سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور یہ سوندھی سوندھی خوشبو تو روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔"

سجاد کی نظر ایک لحظہ کو گیتی کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر ٹھٹک گئی جو کشادہ' مضبوط اور اپنی دونوں بہنوں کی لمبی اور مخروطی انگلیوں سے بہت مختلف مضبوط انگلیوں والا تھا۔ اس کے ناخن کٹے ہوئے اور بے حد تندرست رنگ کے تھے۔ مگر ۔۔۔۔۔۔ مگر یہ لڑکی ۔۔۔۔۔۔ اس کے خدوخال اور اتنی سیاہ آنکھیں ۔۔۔۔۔۔ بھئی' یہ تو بڑی دلچسپ نظر آتی ہے۔

وہ اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

ان دنوں اماں بیگم دوپہر کا کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں جا لیٹتی تھیں اور ظہر کی نماز کے وقت تک تنہا رہتی تھیں۔

"اچھا ہے اس طرح ان کے تھکے ہوئے دل و دماغ کو سکون ملتا ہے۔" صولت کا خیال تھا۔

کھانے کے بعد لنگڑے آم کاٹتے کاٹتے اچانک سجاد بولا۔

"اچھا! اب دیکھنا یہ ہے کہ کس نے سب سے زیادہ کھانا کھایا ہے۔"

''یہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ معلوم ہے' جو سب سے زیادہ بھوکا ٹوٹا ہوگا اسی نے کھایا ہوگا۔ صولت نے مارے نفاست کے آم کی بڑی سی گٹھلی الگ پلیٹ میں رکھ دی۔

''خیر' جناب یہ آپ کا خیال ہے۔ ہمارے میس میں ایک سے ایک کھانے پکتے ہیں۔ آج کل لکھنؤ کا باورچی ہے۔''

''میں کوئی کسی کا نام تھوڑی لے رہی ہوں۔''

''بس تو پھر ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔''

سجاد نے ایک چھری کو میز پر رکھ کر تیزی سے گھمایا اور چھری کی نوک گیتی کی سمت رک گئی۔

''بھئی خوب' اتنی دیر سے مجھے یہی شک ہو رہا تھا۔''

صولت نے کنکھیوں سے دیکھا کہ گیتی جو ہر دوپہر کے کھانے پر اوبھی اوبھی سی شکل بنائے آ کر بیٹھتی تھی اور اتنے دنوں سے بڑے سے بڑے لطیفے پر بھی یوں ہنستی تھی' جیسے کسی پر احسان کر رہی ہو' اس وقت بڑی خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔

''سجاد! پرسوں تم کہاں گئے تھے؟'' صولت نے سوال کیا۔

''یہ ہمارے راز ہیں' ہمارے اپنے اسرار' صولت آرا بیگم! تم کو ان میں دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ جنگ کے زمانے میں سوالات کم سے کم کرنا بہتر ہوتا ہے اور میرا مطلب یہ ہے کہ محبت کے زمانے میں بھی۔'' آخری جملہ نسبتاً دھیرے سے کہا گیا تھا۔

''تم فوجی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پر اسرار بنتے ہو۔ اور ہاں سجاد میاں سلمہ' تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم میرے دیور ہوتے ہو اور رشتے میں بڑی بھاوج کا نام لینا ہماری تہذیب کے خلاف ہے۔'' صولت نے گیتی کی طرف نظر اٹھائی اور پھر اپنے آم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

سجاد نے اپنی گہری گہری نظریں کھڑکی کی جالیوں کی طرف کر لیں۔

''رشتے کا ہونا یا نہ ہونا میری یا کسی کی بھی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تو سب ہمارا حسن اخلاق ہے کہ ہم لوگوں اس مغالطے میں مبتلا رکھتے ہیں کہ بھئی ہاں رشتہ ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے اور خصوصاً تمہارے آصف جاہ سے میرا رشتہ یوں بھی موہوم سا ہے۔ بات یہ ہے صولت آرا بیگم کہ تہذیب کے اور وہ بھی ہماری تہذیب کے خلاف تو بے شمار باتیں ہوا کرتی ہیں۔'' روشن پیشانی والے کرنل سجاد نے یہ تمام باتیں سوچیں اور صولت کا جواب دیئے بغیر بولا۔ ''کھانے کے بعد آج ہاتھ دیکھے جائیں گے تاکہ جن جن لوگوں کے متعلق جو جو شک ہیں وہ سب یقین میں بدل سکیں۔''

''چلو تم اپنا جوتشی پن اپنے پاس رکھو' ایک لفظ تو درست بتاتے نہیں۔''

''کیا یہ تم اپنے ایمان سے کہہ رہی ہو؟ میں نے جب پہلی مرتبہ تمہارا ہاتھ دیکھا تھا تو کیا میں نے تم کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ۔۔۔۔۔۔''

''شریف!'' صولت نے گھبرا کر شریف کو آواز دی جس کے قدموں کی چاپ سن کر اس کی جان میں جان آ گئی تھی۔

شریف کو دیکھ کر اس نے تیزی سے برتن اٹھوانے اور احکامات دینے شروع کر دیئے۔ اس لیے کہ کرنل سجاد نے جو بے حد دور کے رشتے سے اس کا دیور بھی ہوتا تھا' پہلی مرتبہ اس کا ہاتھ دیکھتے ہی چھوٹ سے کھلی کھلی آواز میں کہہ دیا تھا۔'' آپ کو اپنے شوہر سے قطعی لگاؤ نہیں۔ آپ کی ساری زندگی ایک زبردست لیکن کامیاب ایکٹنگ ہے۔'' اور اس کی شفاف گہری گہری آنکھوں کی برہنہ صداقت کے آگے وہ اس بات سے انکار نہ کر سکی تھی۔

صولت کی نشست والے کمرے کے سامنے گول برآمدے میں بیلوں سے ڈھکی ہوئی خوب صورت جالی لگی تھی۔ وسط میں یک رنگ شتری قالین کے اردگرد گہرے سبز اور سرخ چمڑے سے منڈھی ہوئی چھوٹی چھوٹی مونڈھیاں پڑی رہتی تھیں اور ایک سرے پر کتابوں کی نیچی سی الماری پر اس کی اپنی تصویر بڑی تنہائی سے مسکرایا کرتی تھی۔

جب سے برسات شروع ہوئی تھی صولت دوپہر کو بچوں کے سو جانے کے بعد اسی برآمدے میں بیٹھ کر سلائی یا پڑھائی کیا کرتی۔ اسی شتری رنگ کے قالین پر کشن پیٹ کے نیچے دبائے اوندھے لیٹے ہوئے سجاد نے دونوں لڑکیوں کو بڑی بے تکلفی سے آتے دیکھا اور پاس رکھی ہوئی ایش ٹرے میں سگریٹ کا آخری سرا مسل دیا۔ پھر ان کو نظر اٹھا کر یوں دیکھا جیسے کبھی ان سے واقفیت نہ ہو۔

''تو سجاد بھائی! اب ہاتھ دیکھے جائیں گے نا؟''

''اونہوں! ہاتھ یوں نہیں دیکھے جاتے' پہلے سوا سوا روپیہ لا کر سامنے رکھو تو کچھ باتیں بتاؤں گا اور پھر اگر سب کچھ پوچھنا ہو تو پھر پورے پانچ رکھنا ہوں گے۔'' سجاد نے سگریٹ سلگا لیا۔

''آپ کوئی جوتشی ہیں پیشہ ور؟'' ارجمند نے ایک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اب دیکھ بھی چکیے۔'' گیتی وہیں قالین پر بے تکلفی سے بیٹھ کر بولی۔ ''صولت آپا! کیا یہ واقعی اچھا ہاتھ دیکھتے ہیں؟''

''دیکھتے ہوں گے۔'' صولت نے پاس رکھی ہوئی تپائی پر بکھرے ہوئے ریشموں میں سبز رنگ کا ریشم تلاش کرتے ہوئے کہا۔

''تم کو دیوانہ بنانے کے سوا کچھ بھی نہیں کریں گے۔''

''خیر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا! ابھی پتہ چل جاتا ہے۔ اچھا تو پھر لڑکی ذرا دوڑ کر ایک طشتری آٹا تو لے آنا ذرا سا۔''

سجاد سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور پتلون کے پائنچے اوپر سرک گئے تھے۔

''کیوں! سوا روپے سے اب آٹے پر اتر آئے۔'' ارجمند ہنسی۔

''مذاق میں نہ ٹالو' آٹا لاؤ۔ دیکھو' آج ابر ہے نا' اس لیے ہاتھ کی لکیریں چمکیں گی نہیں آٹے کے بغیر۔''

لپک کر ارجمند ایک طشتری میں آٹا لے آئی۔

''اچھا تو اب بیٹھو' تمہارا ہی ہاتھ پہلے دیکھے دیتا ہوں۔''

بچوں کی سی معصوم دلچسپی سے وہ ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گئی۔

''اونہہ! یہ سا نہیں' عورتوں کا بایاں ہاتھ دیکھتے ہیں۔ لو اب یہ آٹا مٹھی میں لے کر مٹھی کھول دو۔ ہاں! اب یہ طشتری میں گرا دو۔ بس! ذرا سیدھا رکھو ہاتھ۔''

اتنی بہت سی ہدایتیں سن کر ارجمند کو ہنسی آنے لگی۔

سجاد برا مان گیا۔ ''تو لو اب تم ہنس ہی لو۔''

''نہیں' اچھا اب نہیں ہنستی۔''

''افوہ! توبہ کس قدر بزدل واقع ہوئی ہے یہ لڑکی' معلوم ہوتا ہے کہ جب تمہارا پتلا تیار ہو چکا ہو گا تو اس میں غلطی سے لڑکی کے بجائے چوہیا کی روح ڈال دی گئی ہو گی۔''

اچانک ہی ہاتھ کا رخ موڑ کر وہ شادی اور بچوں والی لکیریں ٹٹولنے لگا۔

''ارے بھئی! یہ بتایئے کہ ہم پڑھیں گے کتنا؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''توبہ کرو' تم کیا پڑھو گی۔۔۔۔۔۔۔اتنے کچے دل کی لڑکیاں پڑھا وڑھا نہیں کرتیں۔''

''پھر؟'' ارجمند کی آواز مری گئی۔ ''پھر کیا ہو گا؟''

''ہونا کیا ہے' جو ہوتا چلا آیا ہے وہی ہو گا۔ نہ ہاتھ میں کوئی حادثہ ہے اور نہ کوئی امتیاز۔ تم بڑی سلیقے مند اور نیک دل لڑکی ہو۔''

''اور؟''

''اور کیا؟ کچھ نہیں' تم جیسی بے شمار لڑکیاں ہوتی ہیں۔بس اب تو تم اللہ اللہ کرو۔جس نیک بخت کے پلے بندھو گی اس کی تقدیر کھل جائے گی۔صولت سے کس قدر مختلف ہے ہاتھ تمہارا۔''

''صولت آپا کا ہاتھ کیا کہتا ہے؟'' ارجمند نے اشتیاق سے پوچھا۔

''پتہ نہیں' کیا کہتا ہے؟ یہی تو پلے نہیں پڑتا۔'' سجاد نے سوچتی ہوئی دھیمی آواز میں کہا۔

''گیتی کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھوں نے محسوس کیا کہ ارجمند کے ہاتھ پر غور کرتے ہوئے اس شخص کی گہری گہری خوبصورت آنکھوں میں خفیف سی افسردگی جھانک رہی تھی۔

باہر بوندا باندی بڑھ کر اب بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔اچانک ہی ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے۔ہوا بے حد خنک تھی۔

''بھئی گیتی! ذرا پنکھا دھیما کر دو۔'' سجاد نے حکم صادر کیا۔

''میرے خیال میں بند ہی کر دو۔'' صولت نے جھرجھری سی لی کے بے حد ہلکے نارنجی رنگ کی چکن کڑھی ہوئی ساری کا پلو اپنے بازوؤں کے گرد لپیٹ لیا۔

''موسم کتنا خوشگوار ہو گیا ہے۔'' ارجمند نے بڑے روایتی انداز میں موسم کی تعریف کی۔

''خوشگوار۔۔۔۔۔۔۔۔بلکہ دلچسپ'' سجاد نے صولت کی طرف دیکھا۔

''کافی پیو گے سجاد؟''

''ہاں کیوں نہیں' نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

''ارجمند! ارے بھئی کدھر گئیں؟'' اماں بیگم کی آواز دور سے گونجی۔اور ارجمند نے سجاد کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت سے اپنا نرم اور چھوٹا سا ہاتھ چھڑا لیا۔

''اچھا بھئی گیتی! تمہارا ہاتھ اب پھر کبھی سہی۔''

''واہ جناب! ابھی دیکھیے۔''

''ابھی کیسے دیکھیں؟ اندھیری تو جھک آئی ہے۔'' سجاد نے برا مانا۔

''تو کیا ہوا؟ میں ڈے بلب والا لیمپ لگائے لیتی ہوں۔''

''اچھا' پہلے ذرا کافی تو بنا لاؤ۔'' صولت نے گیتی کو ٹالا۔

''یہ کام میرے خیال میں تم خود کرلو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ دو چھوٹی بہنوں اور میکے کے نوکروں کے درمیان رہ کر تم کام کاج سے قطعی بے نیاز ہوتی جاتی ہو اور یقیناً موٹی بھی ہوتی چلی جاؤ گی۔ اور میرے جیسے رشتے کے دیوروں کے لیے یہ تمام امور تشویش کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔''

''یہ سجاد بھائی جب صولت آپا سے اتنی گستاخی سے بولتے ہیں تو میں واقعی لرز جاتی ہوں۔ وہ اور کسی کی اتنی بات برداشت کریں۔'' گیتی نے ڈر کر سوچا۔

بغیر کسمسائے ہوئے صولت نے ناتمام نکوزی سلائی کی ٹوکری میں رکھی' ریشم کے بکھرے ہوئے تار دھیرے دھیرے سمیٹے اور دبے قدموں کافی بنانے چلی گئی۔

''اچھا' تو پھر اور کیا کیا سوچتی ہو تم؟'' صولت نے کافی کی ٹرے سمیت برآمدے میں آتے ہوئے سجاد کی آواز سنی۔

''کچھ نہیں سجاد بھائی! بعض وقت یہی خیال آتا ہے کہ آخر انسان جو کچھ سوچتا یا محسوس کرتا ہے اس کو سچ سچ کہہ دینے میں کیا حرج ہے میں کہتی ہوں۔'' قدموں کی چاپ کو محسوس کر کے وہ ادھوری بات کر کے خاموش ہوگئی۔

''ہاں' ہاں! میں سمجھتی ہوں' تمہاری عمر میں بھی ایسی ہی باتیں سوچا کرتا تھا۔ بلکہ اب بھی تم طبیعت کے اعتبار سے مجھ سے بہت ملتی ہو۔''

ہم خیالی اور ہم نوائی کے خیال اور جذبے کے تحت وہ بڑی خوش دلی سے ہنس پڑی۔

اپنے مزاج اور اعصاب کی باگوں کو کس وقت روک کر رکھنا چاہیے اور کس وقت ان کو ڈھیلا چھوڑ دینا بہتر ہے' یہ صولت بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

ناگواری کے باوجود وہ بڑے نارمل انداز میں اپنی نشست پر بیٹھی سکون سے قہوے کے سفوف کو تھوڑے سے پانی میں پھینٹتی اور اس کے سفیدی مائل جھاگوں کو غور سے دیکھتی رہی۔

لیکن گیتی کی چھٹی حس نے اس کے چہرے کی خفیف سی تمتماہٹ اور آنکھوں کے سوچتے ہوئے انداز کو بھانپ لیا۔ اب یہ بعد میں مجھے ضرور ڈانٹیں گی۔۔۔۔۔۔ مگر کس بات پر؟

''چکن کی کڑھائی والی یہ نارنجی ساری' تمہارے چہرے کا نارنجی نارنجی سا عکس' قدرے افسردگی سے سوچتی ہوئی کھلی کھلی یہ آنکھیں' عنابی رنگ کا کافی سیٹ جس کا سنہرا کام ماند پڑ چکا تھا۔ یہ چاندی کا سماوار بوگن ویلیا کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی جالیوں سے

گھرا ہوا یہ برآمدہ' اس میں بچھا ہوا شتری رنگ کا قالین اور اس کے مقابل سرخ اور سبز مصری چمڑے کی سیٹوں کے علاوہ یہ کپ دیو گھرانے کے سے خدوخال والی تمہاری بہن' یہ سب مل جل کر کتنا مکمل اور آشنا ماحول بنا رہے ہیں۔ اندر یہاں سکون ہے اور بے تکلفی اور باہر جھوم کر آئی ہوئی کالی گھٹا۔ درختوں کی سبزی کو سیاہی میں بدلتی جا رہی ہے۔ یہ موقع میری زندگی میں اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں' اس تمام منظر میں ایک تنکے کی بھی کمی یا بیشی نہیں ہے۔ میں اس منظر اس سے آج سے نہیں ہمیشہ سے واقف ہوں۔ کب اور کیسے؟ یہ میں خود نہیں بتا سکتا۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ بے حد خوش کن اور جانی پہچانی باتیں ہیں۔ کون جانے یہ سب کچھ میں نے رات کی تنہائیوں میں دبے قدموں میں نیند میں در آنے والے کسی خواب میں دیکھا ہو۔ خواب جو ہمارے شعور اور لاشعور کی پگڈنڈیوں پر انجانے مسافروں کی طرح سفر کرتے ہیں جن کی سرعت اور توانائی' لمحات اور وقت کی گرفت سے آزاد ہوتی ہے اور پھر کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا لمحہ کوئی بسرائی ہوئی آن اسی طرح پکڑ میں آ جاتی ہے۔ جیسے یہ لمحہ اور آن اس وقت میری گرفت میں ہے۔ جب ہی تو بعض وقت انسان بعض لوگوں کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ لے' یہ تو وہی جانی پہچانی شکل ہے' جس کی تلاش مجھے ہمیشہ سے تھی۔"

صرف سجاد ہی نہیں بلکہ وہ تینوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ آخر سجاد نے سگریٹ سلگا لیا اور کافی کی ایک چسکی لی۔

"ہاں تو گیتی' تم مجھے اپنا ہاتھ پھر کسی دن اور بھی دکھانا۔ تمہارے ہاتھ میں کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جن کے متعلق تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"خیر' میرے خیال میں اس وقت تو اب یہ چلی جائیں' ورنہ اماں بیگم ناراض ہوں گی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کم سے کم ایک گھنٹہ آرام کرنا ہمارے گھر کے دستور میں شامل ہے۔"

"تو پھر تم کو بھی اس وقت آرام میں ہونا تھا؟"

"میں۔۔۔۔۔۔۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ میرا دستور العمل اور طریق اب اس گھر کے دستور کا پابند نہیں ہے۔"

دبے قدموں سے سر جھکائے گیتی وہاں سے اٹھ گئی۔

اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد صولت کی باتوں کا جواب ہوں' ہاں میں دیتے دیتے کرنل سجاد قالین پر اوندھا لیٹا سو گیا۔

باب ۴۸

میں سوتی ہوں تو سوتی ہی چلی جاتی ہوں۔ پتہ نہیں مجھ کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ سب جاگ جاتے ہیں اور میں جاگ کر سو جاتی ہوں۔ اور میری بیداری بھی کس کام کی؟ بے مقصد بیٹھی کچھ سوچتی رہتی ہوں یا پھر کسی ایک چیز کو اس حیرت اور اچنبھے سے دیکھا کرتی ہوں جیسے وہ کوئی بہت ہی عجیب اور حیرت انگیز ہو۔ اور بعض وقت تو گزرتے ہوئے واقعات اتنے مانوس اور جانے پہچانے ہوتے ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ بعض بالکل اجنبی شکلیں اتنی جانی پہچانی ہوتی ہیں کہ جیسے ہم ان کو جنم جنم سے جانتے چلے آتے ہیں۔ جب ہی تو بعض شکلوں کو دیکھتے ہی ہم ان سے مانوس اور بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اب سجاد بھائی ہی کو دیکھ لو کہ ان کی صورت دیکھ کر پہلے دن سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کو تو ہم بہت مدت سے جانتے تھے۔ سجاد بھائی! واقعی ہاتھ بہت اچھا دیکھتے ہیں۔''

اس نے اپنے کشادہ اور مضبوط ہاتھ کو اپنی آنکھوں کے آگے پھیلا کر گھورا۔

''تو کیا واقعی میری زندگی میں بہت غیر متوقع قسم کے حادثے اور واقعات پیش آئیں گے؟'' وہ پریشان سی ہو گئے۔ ''اونہہ! بھئی اب آئیں گے تو آیا کریں۔ ابھی سے فکر کرنے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

اس نے ہاتھ فوراً نیچا کر لیا اور تکیے کے نیچے دبا کر اس پر کروٹ لے لی۔ ''اب نہ معلوم کب آئیں گے سجاد بھائی' کچھ اور باتیں بھی تو بتانے کو کہی ہیں۔''

''اچھا' تو تمہارے صاحب بہادر کا خط آ ہی گیا! کیا لکھا ہے؟'' صولت نے پڑھتے پڑھتے خط میز پر ڈال دیا۔

''جو محاذ پر سے آنے والے تمام خطوں میں لکھا ہوتا ہے۔''

''ایک بات کہوں؟'' وہ ہنسا۔

''کیا؟'' صولت نے مشکوک نظروں سے اپنے رشتے کے دیور کرنل سجاد کو دیکھا۔

'' کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ مجھے ایک بات کا ڈر رہتا ہے کہ تمہارے صاحب کبھی جاپانیوں میں رل مل کر کسی دھوکے کا شکار نہ ہو جائیں۔''

''شکر کرو کہ جنگ چینیوں سے نہیں ہو رہی ہے۔'' صولت نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں' یہ بھی ایک بات ہے۔'' سجاد بھی اسی سنجیدگی سے بولا۔

''ایک بات بتاؤں؟'' صولت کی ہنسی میں شوخی تھی۔

''ضرور۔۔۔۔۔۔۔ایسی بات جس کو بتانے سے پہلے تم اس خوش دلی سے ہنس سکتی ہو میں ضرور سننا چاہتا ہوں۔''

''شادی سے پہلے ایک پھیری والے چینی لڑکے نے معلوم ہے مجھ سے کیا کہا تھا؟ وہ مجھ سے کہنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔کیا تم کو یہ چیانگ کائی شیک پسند ہے؟ میری مانو تو اس کی شادی اپنی بہن سے کروادو۔اس کا اشارہ گیتی کی طرف تھا۔''

''ارے گیتی! گیتی تو ان دنوں بہت چھوٹی رہی ہوگی' بالکل بچہ'' سجاد نے معترض آواز میں کہا۔

''سجاد! تمہاری مزاح کی حس بالکل ہی ختم ہوتی جاتی ہے۔ظاہر ہے وہ ان دنوں چھوٹی ہوگی۔اس کی شکل بالکل چینیوں کی سی ہے نا۔''

''ہاں! ہے تو سہی۔۔۔۔۔۔۔بڑی پرسکون' بڑی خاموش شکل ہے اس کی۔۔۔۔۔۔۔اور وہ تم سب سے بہت مختلف لڑکی ہے۔'' سجاد کی آواز میں ایک گہری دلچسپی کا عنصر تھا۔

''ہمارا گھر ارجمند کی زیادہ عزت کرتا ہے اور اس لڑکی میں بڑی صفتیں ہیں۔''

''ہاں' ارجمند میں صفتیں ہیں عام انسانوں کی تمام بڑی صفات اس میں موجود ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' صولت نے تعجب سے پوچھا۔

''کچھ نہیں'' سجاد نے اپنے آپ سے کہا۔''ارجمند کی صفات گیتی کی بے صفائی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔اپنی کم صفاتی کے احساس اور بے مقصدیت کی کوفت نے اس کی روح کو جس اذیت' کمتری اور گداز سے ہم کنار کر رکھا ہے اس کو کوئی صفت نہیں پہنچ سکتی۔''

''کیا منہ ہی منہ میں بول رہے ہو؟'' وہ ہنسی۔

''ایں۔۔۔۔۔۔۔کچھ نہیں۔'' وہ چونکا اور پاس بیٹھی ہوئی سیما سے مخاطب ہوگیا۔''سیما بی! تم نے موم بتی دیکھی ہے' جسے شمع کہتے ہیں۔''

''ہاں انکل سجاد! میرے پاس دو بڑی بڑی سفید موم بتیاں ہیں۔۔۔۔۔۔۔لاؤں؟''

''لاکر کیا کروگی؟'' وہ ہنسا۔''اچھا' لاؤ۔۔۔۔۔۔۔میں تم کو ایک تماشا دکھاؤں۔''

سیما لپک کر گئی موم بتیاں لانے کے لیے۔

''یہ کیا سجاد! تم بیٹھے بیٹھے شگوفے چھوڑتے ہو۔بچوں کو موم بتیوں کا کھیل بجھا دینا اور پھر وہ دن رات جلائیں گے۔دیکھ لینا اب تم آگ لگوا کر رہو گے۔''

''صولت ڈیئر! تمہارے دل میں اتنے وسوسے' اتنے گمان اور شک کس نے بھر دیئے ہیں؟ حسن تو بے نیازی اور بے پروائی کا دوسرا نام ہے۔ کبھی اچھے گمان بھی کر لیا کرو۔''

''پھر تو حسن کا دوسرا نام دیوانگی ہو گیا۔ آگے پیچھے کا آدمی سوچ ہی نہیں سکتا کہ بھئی ہم خوبصورت ہیں۔''

''تم بہت پریکٹیکل ہو یا حد سے زیادہ جذباتی؟'' سجاد کی اپنی آواز بے حد بھاری بھاری اور جذباتی ہو رہی تھی۔

''یہ لیجئے موم بتیاں! اب دکھایئے تماشا!'' سیما مارے اشتیاق کے سجاد کی گود میں چڑھ آئی۔

''بھئی ہٹ کر تو بیٹھو' پھر دکھائیں گے۔''

''ماچس لائیں۔''

''ارے ہٹو' ماچس لا کر کیا کرو گی؟ میرے پاس لائٹر ہے۔ لو بس دیکھو یہ جل گئی۔''

''اور دوسری والی بھی تو جلایئے۔''

''واہ' یہی تو کھیل ہے۔''

موٹے موٹے' چھوٹے ہاتھوں پر اپنا چہرہ لگائے سیما بغور موم بتی کے سفید موم کو گاڑھے دودھیا سیال کی شکل میں پگھل پگھل کر ادھر ادھر بہتے دیکھتی رہی اور جب آدھی سے بھی کم بتی رہ گئی تو اچانک سجاد نے پھونک مار کر شمع بجھا دی۔

''ہاں بھئی سیما! اب تم سنبھل جاؤ۔ اب تمہارا ٹیسٹ ہے۔''

''جی' سنبھل گئی۔''

''بتاؤ' اب دونوں میں سے کون سی موم بتی پیاری لگ رہی ہے؟ یہ چکنی' صاف اور پوری اور لمبی یا یہ جلی اور پگھلی ہوئی چھوٹی بتی؟''

''انکل سجاد! یہ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ ۔۔۔۔۔۔۔'' سیما نے انگلی اٹھائی۔ ''یہ جلی ہوئی کتنی پیاری معلوم دے رہی ہے۔ یہ جو موم بہہ بہہ کر ادھر ادھر جم گیا ہے' کتنا پیارا لگ رہا ہے۔''

''شاباش' دیکھو جیسے ویران قلعے کے کھنڈر' جیسے دریا کی موجوں کی کاٹ میں آئی ہوئی چٹانیں۔'' سجاد کی آواز کھو سی گئی۔ پھر وہ ہنسا۔ ''مبارک ہو' تمہاری بیٹی میں وہ دانائی موجود ہے جس سے تم محروم ہو۔'' سیما بیٹی! تمہاری ممی کہتی ہیں کہ ان کو یہ صاف سیدھی سی اور بے جلی موم بتی خوبصورت لگتی ہے۔''

''اونہہ! ممی تو بور ہیں بالکل!'' سیما نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائی اور اٹھ کر بھاگ گئی۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

سجاد کا یہ خیال غلط تھا۔ صولت دانائی سے محروم نہ تھی۔ اس کی دانائی ایک چھپے ہوئے رمز کی طرح اس کے وجود میں پوشیدہ تھی۔ اسی بنا پر اس کا چہرہ اچانک ہی مکدر اور افسردہ نظر آ رہا تھا اور آج وہ ہر دن سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اتنی کہ سجاد کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔

اور پھر وہ ڈھلتی ہوئی شفق کے سایوں میں اس کے بہت قریب آ گیا۔ جیسے کسی بہت ہی پر اسرار چیز کے مشاہدے کے لیے اس پر جھک جائے۔

اچانک ہی وہ اٹھ کر دوسرے سرے پر جا بیٹھی۔

''سجاد! ایک بات بتاؤ گے؟'' اس کی آواز مضبوط اور فیصلہ کن تھی۔

''کیا؟'' وہ بے بس سا ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

شاید اس نے اپنے سوال کا رخ بدل دیا اور بولی۔ ''یہ آج تم کو کیا ہو رہا ہے؟''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد بولا۔ ''میری طبیعت الجھ سی گئی ہے۔ پتہ نہیں، مجھے خود نہیں معلوم۔ لیکن مجھے ہوا کچھ ضرور ہے۔'' اس کی گہری گہری خوبصورت آنکھوں میں واقعی الجھن تھی۔

وہ بغیر کچھ کہے سنے اٹھ کر چل دیا۔ اس کی جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر صولت نے صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹیک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بڑی تکان سی محسوس کر رہی تھی۔

''میں تم کو بالکل نہیں سمجھ پا رہی ہوں سجاد! تم مجھے تھکائے دے رہے ہو اور میں بالکل ہی بوکھلا گئی ہوں۔ تم ان تمام لوگوں سے کیوں اتنے مختلف ہو جو شادی کے بعد سے اب تک میری زندگی میں آئے۔''

''صولت آپا! آپ نے میری کتاب میز پر سے اٹھائی ہے؟'' گیتی دزدیدہ قدموں سے داخل ہوئی۔

''کون سی کتاب؟'' صولت کی آواز تھکی ہوئی تھی۔

ایک تھکی ہوئی نظر ادھر سے ادھر ڈالنے کے بعد گیتی بولی۔

''گون ود دی ونڈ'' (Gone with the Wind)

''گون ود دی ونڈ؟'' صولت نے آہستہ سے کہا۔ ''ارے! وہ تو چلتے وقت سجاد کے ہاتھ میں تھی۔''

''توبہ! کتنے برے ہیں سجاد بھائی؟ میں نے تو ابھی ختم بھی نہیں کی۔''

''اپنا بھی تو بے تکا پن دیکھو' کتاب ڈال کر کیوں چلی گئی تھیں؟''

''بھول گئی تھی۔''

''بھول گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔'' صولت نے نقل اتاری۔ ''ہاتھ تو دکھانے آئی تھیں' بھلا کتاب ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بس محض دکھاوا کہ ہم اتنے پڑھنے والے ہیں۔ دوسروں کو خواہ مخواہ مرعوب کرنا۔''

گیتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مرعوب کرنے کے خیال پر لعنت ہے۔ بس بے دھیانی میں ہاتھ لیے چلی آئی تھی۔ مگر صولت آپا کی بات کا جواب دینے کا مطلب یہ تھا کہ مزید نصیحت اور فضیحتہ سننے کو تیار ہو جاؤ۔ وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل آئی۔

صولت کے دل میں وسوسہ اور حسد سر اٹھا رہا تھا۔ وہ ان دنوں تنہا اور آزردہ تھی۔ اتنے عرصے مطلق العنان زندگی گزارنے اور فوجی کلبوں اور میسوں کی پارٹیوں میں نمایاں مقام حاصل کرتے رہنے کی عادی ہو جانے کے بعد اب اسے ڈلہوزی کا وہ خوبصورت خوابناک اور پرسکون کاٹیج یاد آ رہا تھا اور اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں آ کر اس نے کوئی عقلمندی نہیں کی۔

باب ۴۹

چھوٹی لائن پر گاڑی دھچک دھچک کرتی' دھواں اڑاتی' قدم قدم پر سیٹیاں دیتی' عین مین یوں چلتی جیسے کوئی بچہ اسکول جانے سے قطعی بے نیاز بستہ اچھالتا' کدکڑے لگاتا' راہ میں ٹھہر ٹھہر کر دھیمے سے مسر مسر چلے۔ اور تب کہیں جا کر پتلا اور سرخ مورم اور سفید جنگلوں والا مدنا پور کا اسٹیشن آتا۔ جس کے وسطی کنارے پر پانی کا نلکا لگا ہوا تھا اور یہاں وہاں تین چار لکڑی کی سبز رنگ کی بنچیں پڑی تھیں۔

سفید جنگلے پر نیلے پھولوں والی ریلوے کریپر اس قدر پھیلی ہوئی تھی کہ بعض بعض جگہ تو جنگلا نظر ہی نہ آتا تھا اور لکڑی کے ستونوں پر کھڑا ہوا ٹین کا شیڈ تھا جس میں سے بکنگ آفس' ٹکٹ گھر کی کھڑکی اور ایسی ہی دو چار اناپ شناپ کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ سرخ مورم والے چبوترے پر سفید پتھر پر کالے حرفوں میں مدنا پور کا نام اردو ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ یہ ان اسٹیشنوں میں سے ایک اسٹیشن تھا جہاں ریلوے کا عملہ آدھی وردی میں پھرتا تھا۔ یعنی دھوتی یا پاجامے پر ریلوے کا روپہلی بٹنوں والا نیلا یا سفید کوٹ اور چھجے دار ٹوپی لگائے گارڈ' اسٹیشن ماسٹر یا ٹکٹ چیکر پھرتے رہتے ہیں۔ رات کے راؤنڈ کے وقت ان کے ہاتھوں میں گیس کی چھوٹی چھوٹی لالٹینیں ہوتی ہیں۔ وہ بھاری قدموں اور خوابناک آوازوں میں ماتحتوں سے پوچھ گچھ کرتے اچانک غائب ہو جاتے

ہیں۔ان کے جاتے ہی اسٹیشن سنسان ہو جاتا ہے تو پھر کوئی ٹوٹا مارا بیڑی سگریٹ اور موم پھلی والا مٹی کے تیل کی کپی خوانچہ پر جمائے سوئی سوئی آواز میں صدا لگاتا ہے۔''موم پھلی گریم' پان بیڑی سگریٹ''

یہاں پر قلی بھی باید و شاید نظر آتا ہے۔کیونکہ مسافر لوگ تو اسٹیشن سے پہلے ہی راستے میں جہاں ریل کی رفتار کم ہوئی اپنی پوٹلیاں' گٹھڑیاں پھینک پھینک کراترتے جاتے ہیں اور پھر اپنی لوہے کی شام والی لٹھیا کے سرے پر پوٹلیوں کے علاوہ نعل ٹھکے ہوئے جوتے بھی ٹانگ کر کچی راہوں پر پگڈنڈی پگڈنڈی ہو لیتے ہیں۔

مدنا پور سے آگے کی سڑک کچی تھی اور کوس دو کوس چل کر پگڈنڈیوں میں بٹ جاتی تھی جو کھیتوں کھیت گزر کر ادھر ادھر گم ہو جاتی تھیں۔اسی سڑک کے ساتھ ساتھ نہر کی سڑک تھی اور یہی سڑک عالم پور بستی کو جاتی تھی۔عالم پور بستی تقریباً سوڈیڑھ سو گھروں کا گاؤں تھا۔کھیتی باڑی کرنے والوں کے علاوہ دوسرے تمام پیشہ ور آٹھ آٹھ دس دس گھروں کے ٹولوں میں بٹے ہوئے تھے۔

جدھر سے نہر موڑ کھا کر تقریباً بستی کے اندر آئی تھی۔اس سرے پر آموں کی بڑی بگیا تھی۔خاص زمیندار صاحب کی بگیا اور اسی کے ساتھ ان کی چھوٹی سی کھپریل والی بنگلیہ تھی۔کہلاتی تو بنگلیہ تھی مگر اچھی خاصی کشادہ کوٹھی سی تھی' جس کے کوارٹروں میں منشی جی کا کوارٹر بھی تھا۔منشی جی بوڑھے تھے اور مالک کے خیر خواہ۔انہوں نے بختیار بھیا کو چٹھی ڈال دی تھی کہ اب یہ ضروری ہے کہ بھیا تم آ کر اپنا علاقہ دیکھ بھال لو۔میرا بھی کا ٹھیک ہے۔میں تو منجھلے بھیا سے پورے دس سال بڑا تھا۔

مارکین کا انگا' گھر کا دھلا پاجامہ اور نیلی دھاری دار قمیض پہنے منشی جی اپنی منتشر اور سفید جھک سی داڑھی سمیت مدنا پور پر موجود تھا۔ان کی عینک کی سفید کمانی کے بائیں طرف دھاگا لپٹا ہوا تھا اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

''یہ ہماری زمینوں کا مختار ہے۔''بختیار نے منشی جی کے میلے ٹینس شو کو گھورا جس کے پنجوں میں سے ان کی ٹیڑھی میڑھی انگلیاں جھانک رہی تھیں۔

''رکو بھیا! تانگہ کر لیوں' تمیری اطلاع دیر سے ملی۔اپنا تانگہ باہر گوا ہے۔''

''نہیں یکے پر چلئے' میں یکے پر بیٹھوں گا۔''

اور جو منجھلے بھیا زندہ ہوتے نا تو منشی جی چیخ کر بختیار سے پوچھتے۔''کا گھاس کھائے گئے ہو؟'' مگر اب تو وہ مالک کی حیثیت سے اپنے علاقے کی پڑتال کو آیا تھا۔

منشی جی نے یکہ کر لیا۔اس کا سوٹ کیس اور پتلا سا ہولڈال دیکھ کر ناں بھوں چڑھائی۔''یہ آئے ہیں! نہ پیچوان ساتھ میں اور نہ

بندوق۔ اکیلے ٹونٹھ سے اسٹیشن پر اتر کر کھڑے ہوئی گئے۔ ان کی کیا بات تھی۔ جانت رہیں کہ رعیت ہاتھ جوڑے کھڑی ہے' پر شریف کو سدا ساتھ لائے۔''

''بھیا! شریف نا ہیں اترا؟''

''منشی جی! شریف کیا کرتا آ کر؟''

اب اس کا کیا جواب تھا۔

''اپنا تانگہ آج کہاں گیا ہے؟'' بختیار نے پوچھا۔

''تحصیل دار کی زنانی سواریاں کرم آباد گئی ہیں منت اتارنے۔

تانگہ کل ہی سے مانگ لیا تھا انہوں نے۔''

''ہوں'' بختیار نے ایک گہری سی سانس لی۔

چھن من کرتا یکہ جونہی نہر کی سڑک پر مڑا بختیار کو ششتوں (جولاہوں) کے ٹولے کی مسجد کے سفید مینار نظر آئے۔

''منشی جی! یہ پچھلے دنوں مسجد کا کیا جھگڑا تھا؟''

''کچھ نہیں بھیا! لوہارن کے ٹولے سے پرشاد جار ہا تھا مندر کو کوئی منت پوری کرنے کے لیے' اوئی عین نماز کے وقت باجے تاشے پیٹتے اور گھونگا بجاتے مسجد کے آگے سے نکل رہے تھے۔ تم جانو روکا راکی میں تو جھگڑا ہوہی جات ہے۔''

''پہلے کیوں نہیں ہوا کبھی؟''

''پہلے کی بات چھوڑو۔'' منشی جی جھلائے۔ ''پہلے اب کی طرح روز روز چھوکرے شہروں میں کام ڈھونڈے واسطے بھی تو نہیں جاتے تھے۔ سارے خناس یہ شہروں سے سر میں بھر کے لاتے ہیں۔ پہلے کی بات اب کہاں!'' منشی کی زبان پر آتے آتے رک گیا کہ اب تم اپنے ہی کو دیکھو۔ نہ بیچواں نہ شریف۔ ٹھونٹھ کے ٹھونٹھ آ کھڑے ہوئے۔''

''منشی جی بجلی تو ٹھیک ٹھاک ہے۔''

اچانک ہی منشی جی کی آواز میں چہکار آ گئی۔ ''گھوڑی تو آج صبح ہی بیائی ہے۔ اکرام تو پھولا پھولا پھر رہا ہے۔''

''ارے ہاں' اکرام کیسا ہے؟ میں کتنے دنوں پیچھے یہاں آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بھیا' گھر والی گزر گئی۔'' منشی کی آواز میں عجب سپاٹ تن تھا۔

اچانک ہی بختیار کو اکرام کا اصطبل کے برابر والا کچا مکان یاد آ گیا جہاں اس کی بیوی چھوٹا سا گھونگھٹ کاڑھے گھی میں موئی موئی سرخ سرخ روٹیاں سینکا کرتی تھی۔

''اری بھیا سے تو گھونگھٹ نہ کیا کر۔'' اکرام ہنستا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ کر پوچھتا۔ ''بھیا! ہمری سکھائی گنتی یاد ہے؟''

اور بختیار اٹک اٹک کر سنانے لگتا۔

''اکے ایک' نرنجن دوئی' دوئی کے دتیہ' تینوں کھوٹ پرتمی' چاروں بید پران' پنجواں پانڈوا' چھٹا نرائن سنگھ'' اور پھر اس کی آواز لڑکھڑائی۔

''بھول گئے بھی اکرام''

''پھر بھیا! امتحان کیسے پاس کرت ہو؟''

''تو یہ گنتی کب آتی ہے امتحان میں۔''

''لو اب ہم سناوت ہن' اکے اک' نرنجن دوئی۔''

اکرام کی زبان چلی تو پھر انیسویں رانی کنجی بیسواں راجہ ہربنس پر ٹھہرتی۔ اور بختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑتا۔ ''پھر ہم کو سواری کب کراؤ گے؟''

''پہلے بڑے بھیا کو بیٹھال لینے دیو پھر تم کرنا۔ بڑے بھیا بڑے ہیں تم چھٹکے ہیں۔''

مگر بختیار اپنی چھوٹائی پر کبھی نہ پچھتاتا۔ اس لیے کہ بڑے بھیا نے اپنی ذات سے کبھی اپنی بڑائی نہ جتائی تھی۔ وہ اس کو ترستا دیکھ کر فوراً رکاب سے قدم نکال لیتے۔ بختیار تم کرلو سواری۔''

اور آج وہ بڑے بھیا کا قائم مقام بن کر آیا تھا۔ گھر والیوں تک نے کواڑوں کی اوٹ اور دیواروں پر سے جھانک جھانک کر چھوٹے بھیا کو اکے پر بیٹھے آتے دیکھا۔

''ارے جیتے رہیں! بھائیوں کی جوڑی بنے رہے۔ بڑے بھیا نہیں ہیں تو یہ چھٹکا ہے۔ جب آیا رہا تو بالکل کچا کچا منہ رہا۔'' بختیار کے ان جانے میں اس کی رعیت کی عورتوں نے بھرے گلوں سے اس کی دعائیں دیں۔

دیہات کی پوری فضا ایک فطری نغمے اور موسیقی سے بسی ہوئی تھی۔ علی الصباح گھروں سے اڑ اڑ کر آتی ہوئی چکی کی گھرر گھرر کے ساتھ پیسنے والیوں کے گیت' کنوؤں میں ڈوبتے ہوئے ڈولوں اور لوٹوں کی بلق بلق چرخی پر لپٹتی ہوئی رسی کی سرر سرر اور رہٹ کی روں

روں' پھر رات کے سکوت میں نہر کے پانی کی شل شل اور سب پر مستزاد چلنے پھرنے والیوں کے جھانجن' پائلوں اور بچھوؤں کا بجنا یہ سب کچھ کیا تھا؟ ایک نغمہ پیہم اور ابدی موسیقی' جس کی گت پر کسانوں کے ہاتھ چلتے تھے۔ وہ زمینوں کا سینہ چیر کر کچا سونا نکالتے تھے۔ جب ان کی ہری بھری فصلوں کے گاتے ہوئے بے آواز نغمے چرا کر ہوا بختیار کی بنگلیہ کی طرف آتی تو وہ ساری جانچ پڑتال بھول جاتا۔

''ارے! میں اس زمین سے کیا حساب کتاب لوں! نغموں اور شفقت اور بے نیازی سے بھی کسی نے باز پرس کی ہے؟''

اور پھر چراغ میں بتی پڑے سارا کاروبار ختم ہو جاتا۔ کرمی ٹولے کی کچی دیواروں پر سے اڑتی ہوئی ڈھولک کی دھمک میں فضا کا سارا بوجھل پن اور گرمی تحلیل ہو جاتی۔ تھالی کٹورا بجنے لگتا اور بھولے بھالے البیلے نغمے بکھر جاتے۔

سیں انجم گڈھ سے آیا ہے سنار۔۔۔۔۔۔ چھوٹی نندی

کا ہے سنار جھلنیاں دے کے مسکیلا

کہ ہمرے سیاں ہو جہیں ناراج

کا ہے سنار تو بھیلا مو سے ناراج

اسی دم چوپال سے ایک لمبی تان بلند ہوئی

آلھا اودل بڑے لڑیا' جن کی بات کہی نہ جائے ئے ئے

ابھی آلھا پوری نہ ہوتی کہ اکرام کی بوڑھی اور مسخری آواز فضا میں لہراتی۔

اوروں نے بویا الماجھلا

مدھو نے بویا کودنیا

سب کی آوازیں تکرار میں آخری مصرعہ دہراتیں۔

اور اکرام کی آواز پھر اٹھتی۔

ارے کاٹ کاٹ کر زجو بھمیں۔

داہ میں پڑگئیں گڑبڑیاں

''یہ اکرام اتنا مسخرہ کیوں ہے؟'' بختیار سوچتا۔ ''میں جو اس کی گود میں کھیل کر بڑا ہوا ہوں۔ مجھ پر وقت کی رفتار کا اثر ہو رہا ہے۔

میری خوش دلی اور ہنسنا بولنا سنجیدگی سے بدل رہی ہے۔ مگر اکرام کی خوشدلی لازوال ہے۔ میرے گھر میں نجاریاں اور کوٹھے اکرام اور اس کے ساتھیوں کی خوشیاں چھین کر بھرے ہوئے ہیں۔ پھر بھی میری زندگی میں خوف، پچھتاوے اور وہم وگمان ہیں۔ یہاں خالی ہاتھ ہیں، نیم برہنہ جسم، یقین ہے، معصوم عقیدے اور خوشیاں ہیں۔ مسجد اور مندر کی بات پر لاٹھیاں تان کر لڑ لینے والے دونوں فریق اب چوپال میں مزے سے آوازیں ملا کر گا رہے ہیں اور میں یہاں اس خوبصورت اور آرام دہ بنگلیہ میں تنہا ہوں۔ ارے! ہم تو جنم جنم سے اکیلے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے مہذب آباء واجداد انفرادی زندگی پر زور دیتے رہتے ہیں اور ان کی زندگی اجتماعیت سے عبارت ہے۔''

بختیار کے وجود پر افسردگی کی تہ دبیز ہوگئی۔ کھپریل کے برآمدے میں اس کا پلنگ تھا۔ باہر دھیمی دھیمی بارش مسلسل پھوہار کی شکل میں برس رہی تھی اور یہ ایک اور نغمہ تھا جس نے دیہات کو محیط کر رکھا تھا۔ دور نہر کے کنارے باغوں اور گھنے درختوں میں گیدڑ ہوک رہے تھے۔

پھوہار سے بچنے کے لیے اس نے اپنا پلنگ اوپر کھینچا اور چادر سر تک کھینچ لی۔ کھڑکے کی آواز سن کر چوکیدار نے زمین پر ڈنڈا زور سے مارا۔ ''جاگت رہو!''

''ارے امو! بھیگ تو نہیں رہے؟ سو جاؤ۔''

''نہیں بھیا! چھپرے تلے ہوں۔ تم سوؤ۔ میں جاگت ہوں۔''

''تم سوؤ میں جاگت ہوں۔'' بختیار نے دل میں دہرایا اور ملول ہوگیا۔ یہ بھی ایک عجیب فرمائش ہے۔ ہاں رامو ہم سو رہے ہیں اور تم جاگ رہے ہو۔''

''رامو سو جاؤ۔'' بختیار کی آواز میں حکم کا انداز تھا۔

''اچھا بھیا!''

بان کی کھٹیا جو پانی میں بھیگ کر بولنے لگی تھی زور سے چلائی۔ اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

گھوڑی اب سواری کے قابل ہو چکی تھی۔ اکرام نے اس کے کھریرا کیا تھا اور نہلا دھلا کر سواری کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ اس کی باگیں پکڑ کر ٹہلاتا ہوا بھیا کی سواری کے لیے برآمدے تک لے آیا۔

خاکی برجیس اور قمیض میں لمبے اور دبلے سے بھیا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اللہ بری نجر سے بچائے۔ اتنے دنوں میں یہ چھوٹا سا لڑکا بڑا اور ذمہ دار ہو گیا ہے۔ وہ آیا بھی تو کئی سال کے بعد تھا۔

''لو بھیا! اب یہ بجلی آئے گی تمری سواری کو۔'' اکرام نے گھوڑی کی باگیں بختیار کے ہاتھ میں تھما دیں۔

اچانک ہی اکرام کو خیال آ گیا۔ دونوں بھائی آتے تھے تو پہلے بڑے بھیا سواری لیتے تھے۔ پھر ان کو بیٹھنے کو ملتا تھا۔''

اور بالکل یہی خیال بختیار کو آیا۔ ''آج پہلی ہی بار میں سجی بنی اور اٹھلا اٹھلا کر چلتی ہوئی بجلی اس کے سامنے لا کھڑی کر دی گئی تھی۔ ورنہ پہلے بڑے بھیا سواری کرتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ دل کے اتنے کچے تھے کہ بختیار کی بے چین اور للچائی ہوئی نظروں کو دیکھتے ہی رکاب میں سے قدم نکال لیتے۔ بختیار تم پہلے سواری کر لو۔ اور جو وہ یہاں موجود ہوتے تو پھر میں یہاں آتا ہی کیوں۔ وہ جانتے اور ان کا کام۔''

گھوڑی کی لگام پکڑے پکڑے باتیں کرتا کرتا اکرام بنگلیہ کے پھاٹک آ گیا۔ ہری بھری باڑھ کے درمیان چمکتے ہوئے سفید جنگلے والے پھاٹک سے نکلتے نکلتے۔ بختیار کا کتنا دل چاہا کہ اکرام پہلے کی طرح اپنی مخصوص مسخری آواز میں لہک لہک کر بے تکلفی سے پوچھے ''اور بھیا! ہمری سکھائی گنتی بھی یاد ہے؟ مگر اکرام کے اور اس کے بیچ میں مدارج اور مراتب حائل ہو چکے تھے۔

''صاحب کے گزرنے کے بعد بڑے بھیا کے قائم مقام کی حیثیت سے مالک تو تم ہی ہو اور میں تمہارا ادنیٰ سائیس'' یہ فقرہ اکرام کے بشرے پر صاف صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔

بختیار نے گھوڑی کو ایڑ لگاتے لگاتے مڑ کر دیکھا۔ سرخ کھپریلوں اور لکڑی کے ترشے ہوئے نازک ستونوں والی بنگلیہ' کھمبوں پر لپٹی ہوئی زرد اور سفید گلاب کی بیلیں' گہرے گہرے دبیز پتوں والی نرسی کی باڑھ میں سے چمکتا ہوا سفید پھاٹک' یہ سب کچھ کتنا نظر نواز تھا۔ اس چھوٹی سی بنگلیہ کے اندر آرام و آسائش کا ہر سامان خوش مذاقی اور ترتیب سے لگا ہوا تھا اور اس طرف بنگلیہ کے پیچھے اصطبل کے ساتھ اکرام کا پنڈول مٹی سے لپا ہوا کوٹھا اور چھپر تھا۔ جس میں ساری عمر ان کی دو چار پائیوں' پیتل اور کالی مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا بختیار کو کوئی تبدیلی اور اضافہ نظر نہ آیا تھا کوٹھے میں الگنی پر پڑے ہوئے کپڑوں کے علاوہ دھان کے ریشوں سے بنے ہوئے بڑے سے ٹوکرے میں آنے جانے کے کورے اور رنگین جوڑے تھے اور چولہے کے اوپر بنے ہوئے طاقچوں میں سجے ہوئے برتن اور اب جب کہ اس کی بیوی مر چکی ہے تو اکرام چپ چاپ جائے گا' کونے سے نریل اٹھائے گا اور چار پائی پر بیٹھ کر خاموشی سے تمباکو پینے لگے گا اور اب کبھی وہ ہنس کر بڑی برابری سے اس سے صلاح نہیں کرے گا۔ ''بھیا تمکھو پیو۔''

اور بختیار اب کبھی یہ سوال نہ کرے گا۔ ''اکرام تم تمبا کو کو تمکھو ئیا کیوں کہتے ہو۔''

''بھیا پیار ماں کہت ہوں۔'' یہ سب باتیں اب کبھی ہوا کی مرتعش لہروں پر نہ گونجیں گی۔ اس لیے کہ بختیار اب بڑا ہو گیا تھا۔ اکرام نہیں بختیار بڑا ہو گیا تھا۔

''کچھ لوگوں کے بڑے ہو جانے سے اتنا زبردست فرق کیوں پڑ جاتا ہے۔'' بختیار نے سوچا۔

اور جب وہ کھیتوں کے اس پار سے گھوم کر نہر کے کنارے کنارے آموں کی بگیا کے پاس سے بجلی کو دلکی چلاتا آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ہیروں کے ٹولے کے ادھر پیپل کے تلے وہ چبوترا ہمیشہ کی طرح سکون اور قناعت سے پھیلا ہوا تھا جس کے کنارے کنارے تلسی کے پودے تھے اور پیپل کی جڑ میں سجے ہوئے چڑ بتوکی شکلوں والے دیوتا اسی طرح بڑے ناز اور کرختگی سے سیندور کے ٹیکے لگائے ایک ان دیکھی مسکراہٹ سے مسکرا رہے تھے۔ ان کے بالکل مقابل میں بیٹھا ہوا ننگے بدن رمچرنا گلے میں جنیوڈالے آلتی پالتی مارے اپنے گول مدور پیٹ کو ہلا ہلا کر رامائن کا پاٹھ کر رہا تھا۔

بختیار کے ارادے نے گھوڑی کے قدم اور سست کر دیئے تھے۔ کتنی مرتبہ وہ ان گول مٹول اور لمبوترے دیوتاؤں کو لے بھاگا تھا اور ہر مرتبہ ابا میاں خود اس کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کے اپنے ہاتھوں سے رکھوا کر آئے تھے۔

اس کی بے کیف اور یکسانیت لیے ہوئے آواز رامائن کے بول فضا میں بکھیر رہی تھی۔

بختیار نے ٹھٹک کر سوچا۔ ''بھرت کی ماں کیکئی نے جو رام جی کی سوتیلی ماں تھی ان کو چودہ سال کا بن باس دلوایا تھا۔ اس لیے کہ وہ بھرت کے راج کا راستہ صاف کرنا چاہتی تھی۔ اور بھرت کے راج کا راستہ صاف ہو گیا۔ مگر وہ بھی ایک ضدی تھا۔ رام راج کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے بھائی کی کھڑاویں لا کر اس نے سنگھاسن پر رکھ دی تھیں۔ لیکن میری ماں نے جو میرے بھائی کی اپنی سگی ماں ہے ایسی کوئی بات ایسے کسی ارادے سے نہیں کی۔ میرے باپ نے ایسا کوئی بچن کسی کو نہیں دیا تھا۔ پھر بھی میرے باپ کے بڑے بیٹے نے اپنے لیے بن باس کا انتخاب کر لیا۔ اس کے ساتھ کوئی سیتا کوئی لچھمن نہیں گیا۔ پھر بھی وہ دیس دیس کی لنکاؤں میں راون سے لڑتا پھر رہا ہے۔ راون جس کے قدموں میں ان گنت سیتاؤں کا تقدس اور ان کی مانگوں کا سیندور بکھرا پڑا ہے۔ راون جو ہر عہد میں زندہ رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور بڑے بھیا! تم تو نہ جانے کہاں اور کس محاذ پر لڑ رہے ہو گے۔ میں کس طرح تمہاری کھڑاویں پاؤں گا۔''

بختیار نے بڑے تاسف سے سوچا۔ اس لیے کہ وہ اس وقت اپنے منصب اور ذمہ داریوں کو بھرت سے کہیں زیادہ کٹھن سمجھ پا رہا

تھا۔ وہ سنگھاسن پر رام جی کی کھڑاویں رکھ کر ہر بات سے بری الذمہ ہو گیا تھا اور مجھے براہ راست اتنے بہت سے لوگوں کے حقوق ادا کرنے پڑ رہے ہیں۔ اپنے کنبے کا حق' اس دھرتی کا حق جو اپنی کوکھ میں میرے اور میرے کنبے کے لیے سونا چھپائے ہوئے ہے اور ان محنت کشوں کا حق جو اپنے دم خم اور دست و بازو کے بل بوتے پر دھرتی سے سونا اگلوا کر اس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں ان کے تو بے شمار حق ہیں اور ان گنت احسان۔

''اللہ میرے ان کے حق سے کوئی کب ادا ہو سکتا ہے۔'' بختیار سوچ کر ہی بوکھلا گیا۔ ''نہ جانے میرے باپ اور ان کے بھی باپ کو تر کے اور ورثے میں یہ زمینداری اور زمین ملی ہو گی تو انہوں نے ان سے متعلق بھی ایسی ہی ذمہ داری محسوس کی ہو گی یا نہیں۔''

وہ اس وقت خود کو بہت ذمہ دار اور اہم محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ عملی زندگی میں اس قسم کی باتیں سوچنے والے سخت غیر ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک دلچسپ بات تھی کہ وہ یہاں آنے سے پہلے اپنی بہنوں خصوصاً گیتی کو نصیحت کر رہا تھا کہ تم کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے۔ وہ ذمہ داری سے اتنی بعید باتیں سوچ رہا تھا۔

باب ۵۰

استری اور کلپ سے اکڑی ہوئی وردی اور پالش سے چمکائے ہوئے جوتے اس کے منتظر تھے۔ پلنگ کے پاس رکھی ہوئی بڈ ٹی ٹھنڈی ہو چکی تھی اور سگرٹ پی پی کر اس نے اپنے تکیے کے سامنے والے سرے پر راکھ ہی راکھ جھاڑ رکھی تھی۔ جلے ہوئے کاغذ اور تمباکو کی نکھری ہوئی سفیدی میں چمکتے ہوئے جا بجا سیاہ ذرات کس قدر نمایاں نظر آ رہے تھے۔

اس نے بے دلی سے منہ اونچا کر کے دیکھا۔ صبح کے نمودار ہونے میں ابھی بھی کافی وقت تھا۔ ''اور کیا میں آج تمام رات جاگتا رہا ہوں۔'' تمام رات اس کی نیند ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتی رہی تھی اور اس وقت وہ قطعی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا وہ تمام رات جاگتا رہا تھا یا بیچ بیچ میں سوتا بھی رہا تھا۔

اور یہ کرنل سجاد تھا جس کی عقل اتنی خوشگوار نمود صبح کے وقت اس درجہ گنگ ہو رہی تھی۔ ''اونہہ! اب پھر ایک گھپلا اور گڑ بڑ ہو گئی۔'' اس نے دانت پیسے۔ ''میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے' پتہ نہیں کیوں؟ ایک راستے پر بڑے خلوص سے چلتے چلتے میرا دل پٹری کیوں بدل دیتا ہے؟ اور اس مرتبہ یہ ساری گڑ بڑ بھی صولت آرا بیگم تمہاری پھیلائی ہوئی ہے۔ اگر اس وقت اور اس لمحے جب کہ میں تم پر جھکا

ہوا تھا تم اچانک ہی صوفے کے دوسرے سرے کھسک کر مجھ سے یہ سوال نہ کرتیں کہ ''یہ آج تم کو کیا ہو رہا ہے؟'' تو شاید یہ کچھ بھی نہ ہوتا اور اس مرتبہ میرا دل پٹڑی ہرگز نہ بدلتا۔

''تم نے آخر مجھ سے یہ سوال کر کے مجھے سوچنے پر مجبور کیوں کیا کہ ہاں واقعی آج مجھ کو کیا ہو رہا ہے۔ یقین جانو صولت آرا بیگم! میں تمہارا سوال سن کر خود متعجب ہو رہا تھا۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ میں اس وقت تک تمہارا انتظار کروں گا جب تک تم خود اکتا کر کوئی صورت پیدا نہ کرو گی۔ لیکن تمہارے اس سوال نے چونکا کر مجھے اپنا تجزیہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ تم جانو کہ میں اس معاملے میں تمہاری بہن گیتی کا ہم خیال ہوں کہ آخر انسان جو بھی کچھ سوچے اس کے اظہار سے بھی کیوں باز رہے' تو میرا تجزیہ یہ تھا کہ مجھے تمہاری اس چینیوں کی سی وضع قطع والی بہن سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا اور اس سے بچنے کے لیے میں نے تمہارے دامن میں پناہ لینا چاہی تھی۔ لیکن تم نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے احساس دلا دیا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور مجھ کیا ہو رہا تھا؟ تمہارے ایک مختصر سے سوال نے مجھے راستہ دکھا دیا ہے۔ اور جو تم مجھ سے یہ سوال نہ کرتیں تو یقین جانو کہ میں تمام عمر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا کہ میرا مرکز خیال تمہاری ذات ہے۔''

گھبرا کر سجاد نے نرم نرم تکیے کی گہرائیوں میں اپنا منہ چھپا لیا' جس میں مرغابیوں کے پر بھرے ہوئے تھے۔ مرغابیوں کے پر جن کو وہ نومبر اور دسمبر کے درمیانی وقفوں میں گھاٹوں اور جھیلوں کے کنارے ڈیرے ڈال ڈال کر شکار کیا کرتا تھا۔ ''تنہا زندگی کا اس سے بھی اچھا کوئی مصرف ہو سکتا ہے۔'' وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔

اور زندگی کی یہ تنہائیاں بھی ایک مدت سے اس کے وجود کا ایک حصہ بن چکی تھیں۔ رضیہ کی موت کے واقعے کو بھی گزرے اب کتنے سال ہو چکے تھے۔ مگر رضیہ کی زندگی یا موت سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ رضیہ اس کی زندگی میں خواہ خواندہ مہمان بن کر آئی تھی اور نہ ہی کبھی یہ شرف حاصل کر سکی۔ ''خوب صورت' تعلیم یافتہ اور طرح دار عورت بھی کبھی کبھی زندگی کا سچا ساتھی بننے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ کیوں؟'' سجاد کو اپنے اس سوال پر خود حیرت تھی۔

اور اس عورت کی موت کے بعد جس کی موت کا سجاد کے ذہن پر فقط اتنا ہی اثر ہوا تھا جتنا کسی واقف کار کی موت کا اثر ہو سکتا ہے۔ اس نے پھر کبھی گھر بسانے اور اپنی تنہائی دور کرنے کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔ اس لیے کہ شاید وہ ذہنی رفاقت کے حصول کی امید سے مایوس تھا۔ اس کی خاندانی وجاہت' شخصیت اور عہدے نے لڑکیوں کے علاوہ شادی شدہ عورتوں تک کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا اور وہ بھی بڑی ستم ظریفی سے بڑے سنجیدہ انداز میں ان کی طرف مائل نظر آتا۔ لیکن ان میں سے ایک کا بھی اس کے دل کی گہرائیوں

کی تو بڑی بات ہے اس کی سرحدوں کے آس پاس بھی گزر نہ ہو پاتا۔

اور پھر اس کی ملاقات اپنے دور پرے کے رشتے دار بھائی آصف جاہ کی بیوی سے ہوئی۔ صولت آصف جاہ کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ بڑی جلدی دوسروں کی ذات سے خود کو منسلک کر لیتی ہے اور اس کے خیالی مرکز بدلتے رہتے ہیں۔ اور درحقیقت یہ خبر بھی اس خبر کی طرح بے حقیقت تھی کہ کرنل سجاد خوب صورت اور خوش مذاق عورتوں کا بڑا قدردان ہے۔

سجاد کو صولت کی روح کی گہرائیوں میں ایک بڑی ترسی اور کھوکھیائی ہوئی عورت کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ تاہم وہ اس کی حد درجہ پر تمکنت اور بیگماتی شکل' اس کی بے حد نفیس اور نازک عادتوں سے روز بروز متاثر ہوتا گیا جن سے بڑی بڑی خوش جمال عورتیں محروم ہوتی ہیں۔ دراصل وہ صولت سے زیادہ اس پس منظر کا گرویدہ تھا جس میں صولت کی شخصیت پروان چڑھی تھی۔ وہ پس منظر جس کی تشکیل کئی عظیم اور خوبصورت عناصر کے امتزاج سے ہوئی تھی۔

''اچھا! میں یوں ہی' دور ہی دور سے تمہاری پرستش کرتا رہوں گا۔'' اس حقیقت کو جان لینے کے باوجود کہ صولت کو آصف جاہ کی ذات سے کوئی لگاؤ اور دلچسپی نہیں' اس کو اپنی گھرداری اور بچوں میں مصروف دیکھ کر وہ بارہا سوچ چکا تھا۔

''اگرچہ میرے اور تمہارے ذہنی افق ایک دوسرے سے بہت بعید ہیں۔ لیکن پھر بھی تمہارے اندر ایک مکمل عورت کی ساری نرمی' گرمی اور تمام روپ موجود ہے اور یہ بھی ایک بڑا غنیمت اتفاق جانو۔''

کرنل سجاد اپنے رشتے دار بھائی آصف جاہ کی خوب صورت لان پر پڑی ہوئی آرام دہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بڑی قناعت سے سوچا کرتا تھا۔ ''زندگی یوں بھی گزر جائے تو کیا برا ہے۔''

پھر رفتہ رفتہ بلکہ بہت جلد اس پر انکشاف ہوا کہ صولت اس کو بڑی مانوسیت اور احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ خاموش اور ٹھنڈا ہوا احترام جو بہت جلد محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ خیال کس درجہ خوش کن اور مغرور کر دینے والا ہوتا ہے اور پھر اس کے لیے جو پہلے ہی سے قانع اور راضی برضا ہو۔

''یقین جانو تم سے ملنے سے پہلے مجھے اپنی کمتری کا احساس نہ ہوا تھا۔'' اس نے یہ سب بھی بارہا چپکے چپکے سوچا تھا۔

اور پھر اس کی توقع کے خلاف صولت نے اس کو اپنے آپ سے بے تکلف کر لیا تو اس کی وہ زبان بھی آپ سے آپ چل پڑی جو وہی کچھ کہنا چاہتی تھی جو دماغ سوچتا تھا۔

اور صولت ایک حد تک ڈھیل دیتے دیتے اچانک ہی رسی کو ذرا تان لیتی تو وہ اپنی جگہ پر لوٹ آتا۔

''ٹھیک یوں ہی سہی، مگر اب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو کبھی اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا صولت!'' اور یہ بات اس نے صولت کو کبھی بھی نہ بتائی تھی۔

جنگ کا آغاز ہی اس طرح ہوا کہ آصف جاہ کو اپنی بریگیڈ سمیت کوچ کا حکم مل گیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر فوجی اسی دن کے انتظار میں ساری ساری عمر گزار دیتا ہے۔ مگر سجاد انٹیلی جنس میں کچھ ایسے کاموں پر مامور تھا کہ محاذ پر جانے سے زیادہ اس کا یوں چھپتے پھرنا زیادہ سودمند تھا اور اس کے اب تک محاذ پر بھیجے جانے کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوا تھا۔

آصف جاہ کے محاذ پر جانے کے بعد سے اس کا دل کبھی کبھی خودغرضانہ انداز میں بڑی گھناؤنی اور بے رحمانہ توقعات وابستہ کر لیتا۔

''میں اتنا گر گیا ہوں؟'' کبھی کبھار اس کا ضمیر چونک کر خود سے سوال کرتا۔ اس کو بعض وقت صولت سے، اس کے اور اپنے تمام ماحول سے اور خود اپنے آپ سے بھی نفرت محسوس ہونے لگتی اور ایسی ہی ایک کیفیت میں اس نے پہلی مرتبہ غور سے اس لڑکی کو دیکھا تھا جو اسی وقت نہا کر نکلی تھی اور جس کے پاس سفید سوتی کپڑوں، بیسن سے دھلے بالوں اور کیوٹی کورا پاؤڈر کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی جس کی آنکھوں میں ملال اور افسردگی تھی۔ اعتماد اور تقویت اور سہارے کا ایک بے پناہ انداز لیے ہوئے اس کم سن لڑکی نے بڑی تکلفی سے ہاتھ اٹھا کر اس کو سلام کیا تھا۔

''آداب بھائی!''

''جیو!'' اس نے بظاہر شفقت سے کہا تھا لیکن وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ''بظاہر تم کم سن نظر آتی ہو۔ لیکن تمہاری آنکھوں میں صدیوں کا پرانا پن ہے۔ مجھے یوں جان پڑتا ہے جیسے تمہاری سوچ اور تمہارا تفکر بہت قدیم ہو۔ تمہارے قدم تیز ہوں اور وقت بہت پیچھے رہ گیا ہو، گیتی آرا۔۔۔۔۔۔ کیا یہ صحیح ہے کہ میں تم سے ہمیشہ سے واقف ہوں؟ لیکن تم کون سی گپھاؤں میں چھپی بیٹھی تھیں؟ اپنے گیان اور ریاضت میں مصروف۔ لوگوں کے حساب تو تمہاری ظاہری عمر میری موجودہ عمر سے تقریباً تین گنی چھوٹی ہے۔ اچھا تو اب میں اس رمز سے واقف ہو گیا کہ رضیہ اور اس کے بعد بھی میری زندگی میں آنے والی بے شمار عورتیں کیوں خود کو ناخواندہ مہمان تصور کرتی تھیں۔ میرا خانہ دل کشادگی سے محروم ہے اور وہ مختصری جگہ پہلے ہی پر ہو چکی تھی۔''

کرنل سجاد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے تکیہ گود میں رکھ کر اس پر کہنیاں مضبوطی سے جما لیں اور سگریٹ سلگا لیا۔

''اور وہ چھوٹی سی لڑکی اس وقت بڑے آرام سے اپنے اجلے اور شفاف بستر پر سوئی پڑی ہو گی۔'' وہ مسکرا دیا۔

باب ۵۱

اماں بیگم نے خط پڑھ کر جاءنماز کے کونے کے نیچے رکھ دیا تھا اور وظائف کی کتاب نکال کر خاموشی سے پڑھنے لگی تھیں۔

''چھوٹے بھیا نے لکھا ہے کہ مجھے اب واپسی کا وقت نہیں مل سکے گا اور میں وہیں سے کالج چلا جاؤں گا۔'' ارجمند نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکتے ہوئے گیتی کو مخاطب کیا' جو پلنگ پر لیٹی ہوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔

آسمان پر بھوری اور قرمزی بدلیاں دھیرے دھیرے جمع ہو رہی تھیں اور ارجمند کا دل بے اختیار پینٹنگ کرنے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن اس کے تو سارے رنگ' سارے کینوس اور سارے برش نہ جانے کہاں الٹ پلٹ پڑے تھے۔ اب گھر کی فضا اور ماحول میں وہ اگلا سا سکون اور ٹھہراؤ موجود نہ تھا' جس میں کھو کر انسان نہ جانے کیا کچھ کر لیا کرتا ہے۔

''اونہہ! اچھا تو ہے' وہیں کے وہیں چلے جائیں۔ کیا کریں گے یہاں آ کر۔ یہ گھر اب گھر ہی کب رہ گیا ہے۔ پتہ نہیں' مجھے تو کبھی یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ اپنا گھر نہ ہو اور ہم سب مہمان ٹھہرے ہوئے ہوں۔ خود اماں بیگم بھی جیسے صولت آپا کے گھر مہمان آئی ہوئی ہوں۔''

اور یہ بات خود ارجمند کے دل میں بھی تھی لیکن وہ اور بھلا اتنی عجیب بات اپنی زبان سے ادا کرتی یا واضح طور پر سوچ بھی سکتی تھی۔ ایسی بے دھڑک قسم کی سوچیں تو گیتی کے حصے میں آ گئی تھیں۔

ادھر ایک ہفتے سے تو وہ اس سے بہت ہی ناخوش تھیں۔ کیوں؟ یہ واضح طور پر خود اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔'' اور سجاد بھائی کے سامنے تو جان بوجھ کر میری انسلٹ کرتی ہیں۔ خیر بھئی! ان کے تو وہ دیور ہیں' میرا کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اب ان کی موجودگی میں ان کے سامنے آیا ہی نہ کروں گی۔ برا لگتا ہے کسی غیر مرد کے سامنے اپنی ہتک کرواتے۔'' اس نے سوچا تھا۔

مگر اس کی نوبت نہ آ پائی۔ اس لیے کہ اس ہفتے کے آخر میں اچانک ہی سجاد نے اپنا تبادلہ کروا لیا۔

''سنا ہے' سجاد بھائی محاذ پر اپنی خواہش سے جا رہے ہیں۔''

ارجمند کو اطلاعات بہم پہنچانے کا ازحد شوق تھا۔ وہ بڑی بزدلی اور کم ہمتی سے چپکے چپکے خبر رسانی کا کام کیا کرتی تھی۔ اور آج تو وہ صولت سے کچھ ناراض بھی تھی۔

اس نے صبح صبح بلا وجہ اس کو ذرا سی بات پر بہت باتیں سنائی تھیں۔ ان کا موڈ بری طرح خراب تھا۔ کتنے ہی دن بعد ان کو اپنے میاں کی یاد آئی تھی اور دوپہر کو بیٹھ کر انہیں خط بھی لکھا تھا۔

''اچھا ہے' کہیں جا بھی چکیں۔'' گیتی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ اس نے دلائی سر تک کھینچ لی۔ اور گرمڑی مار کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

''اونہہ! کیا ناوقت سونے کی کوشش کر رہی ہے یہ بھی۔'' ارجمند چڑ کر کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی۔ بعض وقت یہ اس کی خبروں کا ذرا بھی نوٹس نہ لیتی تھی۔

صولت کو اماں بیگم سے کوئی ضروری بات کرنا ہوتی تو وہ ان کے قریب رکھی ہوئی چھالیہ کی ٹوکری اپنے سامنے کھینچ کر سروتہ سنبھال لیتی اور سر ڈھک لیا کرتی تھی۔

اب تو وہ خود بھی سمجھ جایا کرتی تھی کہ آج ضرور کوئی فیصلہ کن بات کرنے والی ہے اور نہ جانے کیوں ان کا دل اس بات کو تاڑ کر ہی دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی فیصلہ کن باتیں اور مشورے اکثر سراسیمگی اور تبدیلیوں کا باعث بن جاتے تھے۔

اس کو بات کرنے کے موڈ میں دیکھ کر انہوں نے وظیفے کی کتاب ہاتھ سے رکھی اور عینک اتار کر گھٹنے کے قریب ہی کتاب پر رکھ دی۔

''میرا خیال ہے' آج کی ڈاک میں بختیار کا خط بھی میں نے دیکھا تھا۔'' صولت نے بات شروع کر دی۔

''ہاں' یہ لو۔'' انہوں نے جاء نماز کے نیچے سے خط نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

اراضیات' ملکیت اور فرد حقیقت کے بے کیف اور خشک تذکروں کے علاوہ خط مختصر تھا۔ اس نے یہی لکھا تھا کہ میری چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں۔ کل پرسوں تک میں یہیں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ جب تک صولت آپا وہاں موجود ہیں مجھے آپ کی تنہائی کی اتنی فکر نہیں ہے۔

''یہ تو اچھا کیا کہ وہیں سے چلا جائے گا۔ یہاں آتے اور پھر وہاں جاتے' فضول کا خرچہ ہوتا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ مگر یہاں ہو کر جاتے تو ذرا یہ تو اطمینان ہو جاتا کہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیتی۔ اتنے دن گاؤں میں رہ کر الٹا سیدھا کھایا پیا ہوگا' نہ جانے کیسی صحت رہی ہوگی۔''

''اماں! آپ بھی فضول کے وہم پالتی ہیں۔ ماشاء اللہ ہر طرح تندرست لڑکا اور پھر کھلی آب و ہوا اور گاؤں کے گھی دودھ کو تو آپ

ہم سے بہتر جانتی ہیں۔"

"پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا؟" صولت نے برا مانا۔ "اب لڑکے تو کولہے سے لگ کر بیٹھ نہیں سکتے۔"

اس کی بات کا جواب دینا انہوں نے مناسب نہ سمجھا۔ بڑی بے بسی سے سامنے کی طرف دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔

"اب یہ تم کیا جانو۔ اس کو تو وہی سمجھ سکتا ہے جو اپنے ایک بیٹے سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہو۔ اس کے لیے دوسرا کیا چیز ہوتا ہے' یہ تم کو میں سمجھا بھی نہیں سکتی۔"

ملول ہو کر انہوں نے عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لی اور گاؤ تکیے کے قریب رکھی ہوئی "تذکرہ الاولیاء" ہاتھ میں اٹھالی۔

"اب پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"کس بات کے متعلق؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"لڑکیوں کے متعلق؟"

"لڑکیوں کے؟" وہ چونک سی گئیں۔ ان کے متعلق فی الحال سوچا بھی کیا جا سکتا ہے۔

"ہاں اور کیا؟" وہ ان کی بے تعلقی پر تھوڑا سا جھنجھلائی۔

"تم بتاؤ' کیا سوچوں؟" وہ بے بسی سے بولیں۔ ان کا غم ابھی اس درجے تازہ تھا کہ دل و دماغ پورے طور پر سوچنے سے اب تک قاصر تھا۔

"یہی کہ گیتی کا کالج بھی اب ایک ڈیڑھ مہینے بعد کھل جائے گا اور پھر ان کو لاہور جانا ہے۔"

"لاہور۔۔۔۔۔۔اے! اب لاہور جانے کا کیا تک ہے؟ بس یہیں پڑھیں گی۔"

"میرا نہیں خیال ہے کہ وہ مان جائے۔"

"کیوں؟ وہ گھر کی مجبوری نہیں سمجھتی؟" اماں بیگم نے صولت کی گیتی کی طرف سے اس درجہ بدگمانی پر برا مانا۔

کچھ وہ اب تک سمجھ رہی ہیں کچھ جب سمجھ لیں گی۔ آپ نے ان کو گھر کی کس بات اور کس معاملے سے ہمدردی اور دلچسپی لیے دیکھا اتنے دن میں؟"

بعض باتوں میں جھوٹ کے ساتھ ساتھ حقیقت کچھ اس انداز سے مل جاتی ہیں کہ ان پر یقین کرنے میں کوئی قباحت نظر نہیں

آتی۔

اور اماں بیگم نے بھی اس بات کو تھوڑی بہت مان لیا۔

''بھئی! اب تک نہیں سمجھا اور دلچسپی نہیں لی تو اب زبردستی لینا پڑے گا۔''

''یہی تو میرا مطلب ہے کہ ان کو جو اللہ بخشے ابا میاں نے اس درجہ ڈھیل دے رکھی تھی اس میں اب کچھ کمی ہونا چاہیے۔ اب وہ وقت گزر گیا نا جب وہ آپ کو بھی نظر انداز کر جاتی تھیں۔ اپنے متعلق خود فیصلے کر کے ابا میاں کو مطلع کر دیا کرتی تھیں۔''

گیتی کی اس خودسری کے ذکر سے ہی اماں بیگم کو وہ تمام واقعات یاد آ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی اور دھیرے دھیرے پان پر کتھا چونا لگاتی رہیں۔

''اور میں کہتی ہوں لاہور میں وہ جس طرح چھٹی گھومتی رہی ہیں اب تک' وہ اب تو نہیں چل سکے گا۔ اب تو یہ ہے کہ ان کو یہ احساس دلایا جائے کہ آنکھیں کھول کر بہت احتیاط سے قدم رکھنا ہے۔ اب سر پر وہ سایہ نہیں رہا جو دوسروں کی زبانوں اور اعتراض سے بھی محفوظ رکھتا تھا۔''

اماں بیگم نے ٹوکری میں سے چھالیہ کے باریک دانے چن کر پان میں ڈالے اور گلوری بنا لی۔

''نہیں' بس کہہ جو دیا کہ اب وہاں جانے کا سوال ہی نہیں باقی۔ تو پھر یہ سب فضول باتیں کہنے اور سمجھانے سے حاصل! بس اب دو چار دن میں کالج کھلتا ہے' میں یہیں نام لکھواؤں گی۔

''اچھا' میری بھی آپ لکھ رکھیے جو وہ یہاں رہ کر پڑھ لے۔''

''ارے تو بھئی' کہاں منہ کالا کر دوں کم بخت کا؟'' وہ اپنی بے بسی اور اس کم بخت لڑکی کے تاریک مستقبل پر سخت جھنجھلائی ہوئی تھیں۔ ''کوئی علاج بھی ہے اس کا؟''

''ہے کیوں نہیں' صرف ایک علاج ہے۔''

''وہ کیا؟''

''شادی ہونا چاہیے اب ان کی۔''

''اے ابھی سے۔'' وہ سٹپٹا گئیں۔ اصل میں ان کی نظر اور خیال میں کوئی مناسب لڑکا اور رشتہ موجود ہی نہ تھا۔

''کیوں اماں بیگم! گیتی ننھی سی ہیں اور ہم تو بڈھے تھے جو اپنے باپ کے برابر شخص کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح

گویا بس اب کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ حالانکہ اس وقت ہمارا باپ ہمارے سر پر موجود تھا اور ان کے لیے جن کے سر پر باپ بھی نہیں ''ابھی سے'' کا سوال ہے۔'' صولت یہ سب ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔ اس نے سروتا ٹوکری میں ڈال دیا اور پاندان آگے گھسیٹ لیا۔ حالانکہ وہ پان کبھی کبھار کھاتی تھی۔

وہ خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کو چکر سا آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا تکیے پر سر ٹیک کر چیخیں مار مار کر روئیں۔

''اے! تو کوئی کم بخت ملے بھی جو اس کا ہاتھ تھما دوں اس کے ہاتھ میں۔ اب تو سنا ہے مسعود انجینئرنگ کے تیسرے سال میں ہے۔''

''مسعود!'' صولت نے ایسے جھرجھری سی لی جیسے کوئی بہت ہی مکروہ کیڑا نظر کے سامنے پڑ گیا ہو۔ خیر اس قسم کا کوئی ارادہ تو اماں بیگم کا بھی نہ تھا۔ اور صولت اس بات کے متعلق گفتگو بھی کیا کرتی۔

''ممانی جان کا خیال کیا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ان کا خیال ہوتا۔۔۔۔۔۔۔ اول تو اس قسم کی بات کا موقع ہی اب تک نہیں آیا۔ ویسے ان کا ہمارے یہاں کوئی ایسا خیال نہیں تم خوب جانتی ہو بھابی جان کا رویہ' وہ تو ملاقات کی حد تک رہنا چاہتی ہیں۔''

''اور یہ بھی آپ یاد رکھئے کہ اگر ان کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا بھی تو وہ ارجمند کو انتخاب کرتیں۔ گیتی کی طرف تو کبھی ان کا خیال جا ہی نہیں سکتا۔ وہ دس دفعہ کہہ چکی ہیں کہ شاہ بانو نے عجب جنگلی لڑکی اٹھائی ہے۔ اس سے کون گزر کرے گا۔''

''نہیں تو' ان کو ہم اپنی جنگلی لڑکی دینا بھی نہیں چاہتے۔'' ایسی باتیں تو ماں کو بری لگتی ہیں۔ وہ بھی بگڑ گئیں۔

''یہی تو میں کہتی ہوں کہ ان کی تو بس کہیں کھپت ہو جائے تو بہت ہے۔ ان کے لیے تو پچھلے حالات اور جائیداد وغیرہ دیکھنا ہی فضول ہے۔ یہ تو بس کہیں غیروں میں چلی جائیں۔ ایسوں میں کہ جہاں ان کی قدر ہو سکے۔''

''تو بیٹا! ایسا رشتہ بھی تو ملتے ملتے ہی ملے گا۔'' اماں بیگم نے ناوقت کے موضوع سے اکتا کر پھر کتاب ہاتھ میں اٹھالی۔

''آنے والا وقت کتابوں کے ذریعے ٹالا جا سکتا تو پھر تو کسی تدبیر کی ضرورت ہی نہ رہتی۔'' صولت نے کتاب ان کے ہاتھ سے اٹھالی۔

''تو پھر بتاؤ' اب میں کیا کروں؟ میری نظر میں فی الحال نہ کوئی ایسا رشتہ ہے اور نہ میرا دل و دماغ ابھی اس کام کے لیے تیار۔''

''رشتہ تو خیر میرے پاس موجود ہے۔ آپ البتہ اپنے دل و دماغ کو تیار کر لیجئے۔'' لہجے کے سکون کے باوجود صولت کی گفتگو میں

تلخی تھی۔

''تو پھر بتاؤ اور میرے دل و دماغ کا کیا ہے۔ تم مناسب سمجھتی ہو تو تم کوئی اس کی دشمن تو ہو نہیں۔ تمہیں اختیار ہے۔''

''بھئی میں تو اس لڑکی کے فیل مچانے سے ڈرتی ہوں۔'' صولت نے سر جھکا کر دبی زبان سے کہا۔ ''مجھ سے تو اکبر کی والدہ کئی بار کہہ چکی ہیں۔''

اماں بیگم نے چونک کر صولت کی طرف دیکھا۔ ''کس کی والدہ؟''

''اکبر کی اور کس کی؟''

''کس کے لیے کہتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ارجمند کے لیے یا اس کے لیے؟''

''گیتی کے لیے خاص طور پر کہہ رہی تھیں۔''

''اکبر نے تو اس کے لیے یہ کچھ خبریں اڑائیں تھیں۔'' انہوں نے سوچا لیکن مصلحتاً کچھ نہ بولیں۔

''خود اکبر کا بھی خیال ہے کیا؟''

''تو اور آج کل کی روشن خیال مائیں یوں کب منہ اٹھا کر پیغام دے دیا کرتی تھیں۔''

اماں بیگم خاموشی سے چھالیہ کترنے لگیں۔

''پھر بتائیے کیا خیال ہے؟''

''ہوں۔۔۔۔۔۔'' انہوں نے سوچ میں لمبی سی ہوں کی۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہی تھیں۔

''اب دیکھئے وہ انجینئری کر چکا ہے اور ملازم بھی ہو گیا۔''

''تم گیتی کا بھی تو خیال معلوم کر لو۔''

''میں اس کے منہ نہیں لگتی۔''

''تم کیوں لگو ارجمند سے کہو۔''

''اس کی عقل سمجھ آپ کو معلوم ہے۔ بھلا وہ رائے دینے کے قابل ہے۔ یہ حق تو انہی کو ملتا ہے جن کو اپنے اچھے برے کی تمیز ہو۔''

اور وہ سوچنے لگیں کہ یہ کیسے ممکن ہے چاہے واجبی طور پر سہی یہ بات خود ان تک سے پوچھی گئی تھی۔

لیکن وہ یہ بات صولت سے تو کہہ نہیں سکتی تھیں۔ انہیں خود اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ انہوں نے صولت کے لیے ایک

ہی گنجائش رکھی تھی اور وہ یہ کہ اس کا جواب اقرار میں ہوگا۔صولت عافیت کوش اور سہولت پسند تھی۔اس نے اچھی لڑکیوں کی طرح اپنے گزشتہ ارادوں اور خیالات کو خیر باد کہا اور ان کی مرضی کے عین مطابق جواب دے دیا اور اب وہ گیتی کو بھی فقط اتنی ہی رعایت دینے کو تیار تھی کہ اس کے فیصلے میں صرف ایک ہی گنجائش رکھی جائے جو خود اس کو دی گئی تھی۔

◆◆◆

فصل ششم

باب ۵۲

پچھتاوے اور غور و فکر اسی وقت کار آمد ہوتے ہیں جب وہ انسان کی زندگی میں اس کے غلط اقدامات سے پہلے آئیں اور صلاح دیں۔ یہ تھوڑی کہ وہ انسان کے پاس اس وقت آئیں جب چھکا چھک کرتی ہوئی ریل اس کو گھر سے پانچ اسٹیشن آگے کھینچ لائے۔ اس وقت تو پچھتاوے، نتائج اور ہوشمندی یکے بعد دیگرے ملامتوں کے طوق لیے آگے بڑھیں تو یہ تو انسان کو دیوانہ ہی بنانا ہوا نا!

وہ جھنجلائی اور اس نے اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکالا۔ رات تاریک اور گرم تھی۔ آسمان پر اکا دکا ستارے جھلملا رہے تھے۔ اندھیارے اور سنسان جنگل میں گھستے ہوئے انجن نے جیسے سہم کر چیخ سی ماری تھی۔ تنہائی اور خوف کے احساس سے گھبرا کر اس نے گردن اندر کر لی۔ اس کے حواس سلب ہو رہے تھے اور ہاتھ پیروں کی قوت بھی شل ہو رہی تھی۔

''اور یہ سب کچھ کچھ یوں اور کیسے ہوا؟'' اس نے خیالات کے بکھرے ہوئے سلسلوں کو ایک بار پھر سمیٹنے کی کوشش کی۔ ساری کارستانی تو بس اسی ایک تار کی تھی، جو بمبئی سے آیا تھا اور جس نے اماں بیگم کو ایک غم کی خبر سنائی تھی۔ اپنی ماں کی موت کی اطلاع پر وہ چیخ چیخ کر روئی تھیں۔ اور اسی دن سوار بھی ہو گئی تھیں۔ ایک غم زدہ انسان جب اور بھی غم زدہ ہو جاتا ہے تو دلوں سے اس کے غم کا احترام بھی اٹھ جاتا ہے۔ وہ اس کے غم کے احساس کو بھی کھو دیتے ہیں۔

چنانچہ یہ معرکہ بھی ان کے جانے کے تیسرے دن ہوا۔ اول تو اکبر کا ذکر اس انداز میں کہ اب حالات اور وقت کو دیکھتے ہوئے مناسب یہی ہے کہ اماں بیگم کی واپسی کے بعد چپ چپاتے انگوٹھی پہنا دی جائے۔ یہ فیصلہ کن انداز گیتی قطعی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اس کا اعصابی توازن پوری طرح برقرار بھی نہ ہو پایا تھا کہ یہ بات اتنے برہم کن انداز میں چھڑ گئی اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ خود اس کی ماں بھی موجود نہ تھی۔ اس کا ذہنی سکون درہم برہم ہو گیا۔ صولت کے فیصلہ کن باقتدار لہجے نے اس کی رہی سہی قوت بھی سلب کر لی تھی۔

اور جو اگر صولت کو یہ خبر ہوتی کہ گیتی میں یہ عجیب و غریب صلاحیت موجود ہے کہ جب وہ حالات کا اندازہ کر کے ایک بار کسی بات پر خود کو تیار کر لیتی ہے تو پھر اتنی خاموشی اور سپردگی سے ہتھیار ڈال دیتی ہے کہ بڑے بڑے صلح جو اور عافیت پسند حیران رہ جائیں' تو پھر وہ اس کو نفسیاتی طور پر ہی اپنا ہم خیال نہ بنا لیتی۔ مگر نہ معلوم کیوں اس نے کبھی بھی اپنی اس بہن کو اس قابل نہ سمجھا تھا کہ اس کو سمجھنے اور اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے۔ وہ تو اس سے متعلق اپنے ذہن میں مفروضے تیار کر لیتی اور ان ہی پر مصر رہا کرتی۔

اس بار جو گیتی کا اعصابی نظام درہم برہم ہوا تو اس نے نہ چیخیں ماریں' نہ ہاتھ پھیرا ٹھائے اور نہ اپنے رونے پیٹنے سے دوسروں کو ہراساں کیا۔ دھیرے دھیرے بڑے سکون سے حجت اور جوابدہی کی۔ بڑے ضبط سے ہونٹ بھینچ کر صولت کے غلط اور بے بنیاد الزاموں کو انگیز کیا اور ایسا معلوم ہوا کہ زیادہ سے زیادہ وہ تنہائی میں رو دھو کر بیٹھ رہے گی اور چند دن کو یہ ذکر ٹل جائے گا۔

مگر یوں نہ ہوا۔ تنہائی میں جبکہ اس کی ماں بھی موجود نہ تھی' اس نے خود کو بہت بے سہارا محسوس کیا۔

''اب چونکہ ساری بات اماں بیگم کی غیر حاضری میں ہوئی ہے' اب ملزم میں ہی ٹھہرائی جاؤں گی۔'' اس نے سوچا تھا۔ ہر بات اور ہر صورت حال حقیقت سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر اور ناقابل برداشت نظر آئی تھی۔

شام کو بازار کی مفصل خریداری کے بعد جب ارجمند اور صولت گھر واپس آئیں تو پھاٹک میں گھستے ہی ان کو باغ اور در و دیوار پر چھائی ہوئی افسردگی اور سناٹے کا احساس روزمرہ سے کچھ زیادہ ہی ہوا۔

''کتنی اداس شام ہے یہ'' ارجمند نے چندن کے درختوں کے عقب میں پھولی ہوئی شفق کو افسردگی سے دیکھا۔ اور پورچ میں بکھری ہوئی خشک پتیاں اس کے قدموں تلے چرمرا کر رہ گئیں۔

برآمدے کی بتی جل رہی تھی لیکن کمرے اور گیلری میں اندھیرا تھا۔

''اب یہ سو کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر رہی ہے۔'' ارجمند نے خاموشی سے سوچا۔ ''اچھا ہے' اس طرح اس کا مزاج راہ پر آ جاتا ہے۔''

''بچے ابھی تک سیر کر کے واپس نہیں آئے۔'' صولت نے کڑھ کر سوچا۔ ''یہی تو مارگریٹ کی عادت ہے۔ اب گاڑی کا ہتھا ہاتھ میں ہوگا اور اپنے کسی آشنا سے آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں ہو رہی ہوں گی۔ سیما الگ بور ہو رہی ہوگی۔ اور اب دیکھو کھانے کا وقت ان کے الگ گڑبڑ ہوگا۔ خیر گیتی کو کہاں اتنی توفیق جو جلد واپس آنے کی تاکید کر دیتیں۔'' وہ سخت جز بز اندر داخل ہوئی۔

اور یہ اتنی حیران کن' اتنی ناقابل یقین بات تھی کہ صولت کے حواس گم ہو کر رہ گئے اور زندگی میں پہلی بار پچھتا کر اس نے سوچا کہ واقعی اس نے گیتی کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ زیادتی کرتی چلی آئی ہے۔ اندھیرے کمرے میں کھڑے

ہوئے اس کا چہرہ گرم گرم آنسوؤں سے بھیگ کر تر ہو گیا۔ وہ اس وقت ارجمند کو بھی منہ دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

خوف' بے بسی اور شرمندگی کا ایک بے پناہ احساس تھا جو اس پر غالب ہوتا چلا گیا۔ اور دوبارہ جب ارجمند نے کمرے میں داخل ہو کر بتی جلائی تو وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ کھانے کے کمرے میں دونوں بچوں اور مارگریٹ کے غل مچانے کی آوازیں چلی آ رہی تھیں۔

''بابا! تم لوگ یہ پڈنگ نہیں کھائیں گا تو ہم ممی کو بولیں گا۔''

''بول دے' ضرور بول دے۔'' اعظم جاہ کی آواز گونجی۔

صولت کو یوں بے ہوش دیکھ کر ارجمند کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ حیرت' ملال اور شرم کے تمام احساسات سے گزر کر اس وقت فقط ایک بے بسی کے احساس سے دوچار تھی۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ بے حد پریشان تھی۔ سنسان اور اکیلی گیلری کی دیوار سے سر ٹیک کر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس کی انگلیاں ٹیلیفون کے ڈائل پر گھومیں اور اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

''ہلو! اکبر.......... یہ میں ارجمند بول رہی ہوں۔'' اس نے ماؤتھ پیس کے بالکل قریب منہ لا کر سرگوشی میں کہا۔

''خیریت؟'' اکبر کی نرم اور پرسکون آواز نے ڈھارس بندھائی تو اچانک ہی اس کی سسکیاں نکل گئیں۔

اکبر نے مزید کچھ پوچھے بغیر ریسیور ہاتھ سے رکھا' گاڑی میں بیٹھا اور وہاں پہنچ گیا۔

مارگریٹ کی مدد سے وہ صولت کو پلنگ پر لٹا چکی تھی۔ اکبر کو تیزی سے گیلری میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ ''ناحق ہی میں نے گھبرا کر اس کو فون کر دیا۔'' وہ پچھتائی۔

یہ بھی غنیمت ہے کہ گیتی ملازموں کو بڑا معقول عذر اور وجہ بتا گئی تھی۔ ''بمبئی سے تار آیا ہے' اماں بیگم کی طبیعت خراب ہے۔ اس وقت صولت آپا اور ارجمند تو جا نہیں سکتیں' میں جا رہی ہوں۔''

صولت کی بے ہوشی اور گیتی کی عدم موجودگی' دونوں کی بات ایک بہانے سے بن گئی۔

''میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر کے آنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اکبر سے کہا۔ وہ اب مزید لوگوں کو اکٹھا کرنے اور مطلع کرنے پر تیار نہ تھی۔

اور اب صولت ہوش میں آ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے آنکھیں کھولیں۔ حیران نظروں سے اپنے اوپر جھکے ہوئے اکبر کو دیکھا اور بہت ٹھنڈی سانس لی۔

"صولت آپا کیا بات ہے؟" اکبر نے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں اکبر" صولت کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے' جس کو اکبر نے بڑی آہستگی سے اس کے آنچل میں جذب کر دیا۔

صولت کے آنسوؤں نے ارجمند کو ایک بار پھر بے قابو کر دیا اور وہ کمرے سے باہر نکل کر برآمدے کی دیوار سے ٹیک لگائے خاموش آنسوؤں سے رونے لگی۔ اکبر نے اس کو باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ وہ دبے قدموں باہر نکل آیا۔

"ارجمند! تم تو بڑی سمجھدار اور بہادر لڑکی ہو۔" اس نے اس کو سمجھایا۔ اور آہستہ سے کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کرسی کے ہتھے پر سر ٹکائے آنسو بہاتی رہی۔

"دیکھو' خدا سے دعا کرو۔ انشاء اللہ خالہ جان جلد ٹھیک ہو کر آئیں گی۔" وہ اس کو پھر سمجھا رہا تھا۔

اس تنہائی اور بے بسی کے عالم میں ارجمند کو وہ بہت ہمدرد اور غنیمت نظر آ رہا تھا۔ وہ پھر سے اٹھ کر اندر آ گئی۔ مارگریٹ صولت کو اسپرٹ ایمونیا پلا رہی تھی۔

"ارجمند یہاں آؤ۔ میرے پاس آ جاؤ۔" صولت نے اس کی سرخ آنکھوں اور سفید چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ارجمند بے تابی سے اٹھی اور صولت کے سینے پر سر ٹیک کر آنسو بہانے لگی۔

اس کے سیاہ' نرم' لہردار بالوں پر صولت نے بڑی نرمی سے ہاتھ پھیرا اور خود بھی خاموشی سے رونے لگی۔

خدا اس خاندان پر رحم کرے۔ ایک حادثے کے بعد دوسرا ہو رہا ہے۔" اکبر نے ایک طرف کھڑے ہو کر سوچا۔

"مارگریٹ جاؤ' بچوں کو جا کر سلا دو۔ اکبر میاں اب میں ٹھیک ہوں۔ تم کو خدا خوش رکھے کہ وقت پر دوڑے چلے آئے۔" صولت نے اکبر کا شکریہ ادا کیا۔

"اگر آپ کہیں تو میں اس وقت یہیں رک جاؤں۔ امی کو فون پر بتا دوں گا۔"

"نہیں بھیا! ہمیں ضرورت ہوگی تو تمہارے سوا اور کسی کو تھوڑی بلائیں گے۔ کوئی بات ہوئی تو ٹیلیفون کر لیں گے۔"

"بتاؤ' میں نے کیا غلط بات کہی تھی؟ اس لڑکے میں کیا برائی ہے؟ اتنا ہمدرد لڑکا۔۔۔۔۔۔" اس کے جانے کے بعد صولت نے دھیرے سے کہا۔

رفتہ رفتہ گھر کے سب کام اپنی رفتار پر آ گئے۔ صولت کو رات کے کپڑے بدلوا کر ارجمند اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے بتی جلائی۔ اس کے برابر بچھا ہوا دوسرا پلنگ خالی تھا اور اس کا بستر بے شکن' گھر بھر سے زیادہ اسی کمرے پر ویرانی اور افسردگی طاری تھی۔

باب ۵۳

اسے کہاں جانا چاہیے تھا اور کہاں کا ٹکٹ خریدنا مناسب تھا۔۔۔۔۔۔۔یہ سب سوچنے کا دل ودماغ ہی کب تھا۔ اور جو یہی کچھ سوچنے پر آمادہ ہوتی تو پھر ٹکٹ خریدنے کی نوبت ہی کیوں آتی۔

اس کے تو ذہن پر صرف ایک فقرہ پوری چٹان بن کر حاوی ہو گیا تھا۔ ''گیتی! جیسی تم ہو بس کیا کہوں! تم ہمیشہ ہم سب کے لیے دردسر بنی رہیں۔ اس سے تو تم مر جاتیں تو بہتر تھا۔''

اس نے صولت کی اس بات کو بھی خاموشی سے سن لیا تھا لیکن ہونٹ بھینچ کر یہ بھی سوچا تھا ''میں کیوں مر جاؤں' صولت آپا! تمہیں کیا حق ہے مجھے اس قسم کا مشورہ دینے کا؟ یہ زندگی مجھے تم نے قرض نہیں دی تھی۔ یہ خدا کا تحفہ ہے جو مجھے اور صرف مجھے اور میرے لیے عطا ہوا ہے۔ اس کی حفاظت میرا فرض ہے اور اس زندگی کے متعلق ہر فیصلہ کرنا بھی محض میرا اپنا حق ہے۔ ہاں' آج سے میں کسی کے لیے دردسر نہ بنوں گی۔''

اور اب ریل کے اس کمپارٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی جب وہ تیزی سے قصبوں اور علاقوں کو طے کرتی چلی جا رہی تھی تو اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال بار بار آ رہا تھا۔ ''اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ جوان جہان لڑکیوں سے تیز و تلخ باتیں نہیں کرنا چاہیے۔''

''اور لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ ذرا سی بات پر اچانک مشتعل بھی نہیں ہونا چاہیے۔''

اس کے برہم اور روٹھے ہوئے دل کی گہرائیوں میں سے ایک بے حد مدھم اور خوفزدہ آواز نے سر اٹھایا اور اس کے غیظ و غضب کے آگے خود ہی سر جھکا کر کہیں گم ہو گئی۔

لاہور کے سوا وہ کہیں اور کا ٹکٹ بھی لے سکتی تھی۔ یہ خیال کہ ابھی تو وہاں کالج اور ہوسٹل سب بند ہوں گے' اس کو اس وقت آیا جب لاہور سے فقط چند اسٹیشن کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

نو بجے رات کو جب وہ اسٹیشن پر اتر کھڑی ہوئی تو دل نے پوچھا تھا۔ ''مگر تم جاؤ گی کہاں؟''

وحشت اور سراسیمگی نے اچانک ہی اس کے اعصاب کو مضبوط اور دماغ کو حاضر کر دیا تھا۔

وہ اسٹیشن سے باہر نکلی اور مریل سی گھوڑی کی راسیں تھامے نہ جانے کس نشے میں اونگھتے ہوئے کبڑے تانگے والے کو ہوشیار کر

کے چاچاجی کا پتہ بتایا۔ شہر میں مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ میسن روڈ کی سڑک حسب عادت ابھی سے خاموش اور نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مریل سی گھوڑی کے سموں کی ٹاپیں اور تانگے کی کھڑ کھڑاہٹ اس کے دل پر بم کے دھماکے بن کر گزر رہی تھیں۔

''اللہ میرے! یہ بلیک آؤٹ تو رات کو اور بھی ہولناک بنا دیا کرتا ہے۔'' اس نے سوچا۔

اور اب سے پہلے یہ بلیک آؤٹ کی ریت جس کی اب وہ عادی ہو چلی تھی' ایک بہت دلچسپ سی چیز لگا کرتی تھی۔ سڑکوں اور گھروں کی بیرونی بتیوں کا گل ہونا کھڑکیوں پر کالے پردوں کا سرشام سے کھینچ دیا جانا اور اسی عالم میں فرضی ہوائی حملوں کے مصنوعی سائرنوں کا بجنا' مکمل تحفظ کے احساس میں موہوم سے خوف و ہراسانی کا ملا جلا جذبہ کتنا دلچسپ اور خوب صورت تجربہ معلوم ہوا کرتا تھا۔

اور آج اچانک ہی بلیک آؤٹ کی تاریکی سے گھبرا کر اس نے سوچا۔ ''یا اللہ! یہ جنگ ۔۔۔۔۔۔ مگر یہ جنگ کتنی اچھی چیز ہے۔'' اچانک اس کے ذہن نے پلٹا کھایا۔ '' آن کی آن میں بستیوں اور معاشرتوں کا صفایا کر دینے والی۔ نہ کسی کو کسی کے خلاف غم و غصہ کو پالنے کی مہلت اور نہ کسی کو اپنی فاش غلطیوں پر پچھتانے اور نادم ہونے کی ضرورت۔ بڑے بھیا بھی کتنے خوش نصیب ہیں۔ اپنے مزے سے ہوائی حملوں' توپوں' بموں میں گھرے ہوئے فقط اپنے کام سے کام رکھ رہے ہیں اور ایک میں ہوں کہ اب کل دیکھو کیا دن دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ اور ایک کل ہی پر کیا منحصر ہے۔

''ارے! یہ میں نے آخر کیا کر ڈالا۔'' اچانک وہ اپنے آپ پر سخت حیران ہو کر بولی۔ ''کاش! یہ جرمن یا جاپانی اب اس شہر پر راتوں رات ہی بمباری کر جائیں تو میں مر کر ختم ہو جاؤں۔'' اس نے اس شہر پر بمباری کو چشم تصور میں دیکھا جہاں وہ صولت کے غلط فیصلے اور غصے سے بچنے اور پناہ لینے آئی تھی۔

تانگے کے رکنے کے ساتھ ہی اس کے خیالوں کی آمد بھی رک گئی۔ ''اور اب کیا کروں؟'' یہ سوال پھر اس کے چھوٹے سے گھبرائے ہوئے ذہن میں بھٹکا۔

''کرو کیا' اپنا سر ۔۔۔۔۔۔ اب جو پہلا خیال آتا جائے وہی کرتی جاؤ'' اس نے اپنے آپ کو دل ہی دل میں ڈانٹا۔ اور جوزف ولسن کے کتوں سے بچتی بچاتی اس برآمدے کی طرف بڑھی جس طرف چاچاجی کے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔

چاچاجی بنیان اور تہمد میں کھڑاویں کھٹکھٹاتے آئے اور دروازہ کھول کر جھانکا اور حیران رہ گئے۔

''ارے گیتی! تم ۔۔۔۔۔۔ خیریت تو رہی؟''

''سلام علیکم چاچاجی!'' اس نے جھکی ہوئے اور مری ہوئی آواز میں کہا۔

''ارے عظمت!'' چاچاجی نے آواز دی۔ ''بی بی کا سامان اتارو۔''

''چاچاجی! تانگے میں سامان نہیں ہے۔'' وہ تانگے والے کو پیسے دے کر بولی۔

''یہ لڑکی اس وقت بلا اطلاع اور بے سروسامان آئی ہے اور صورت سے خستہ اور افسردہ نظر آرہی ہے۔'' انہوں نے بغور اس کو دیکھا۔ کچھ پوچھنا گچھنا اور کریدنا ان کی خصلت ہی میں نہ تھا۔

اس گڑبڑ میں چاچی جی کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ پلنگ پر بیٹھی چھینک کھانس رہی تھیں۔

جیسے وہ اندر داخل ہوئی انہوں نے سوال کیا۔ ''ایسے ناوقت پہنچنا تھا تو تار تو دے دیا ہوتا' تیرے چاچاجی اسٹیشن پر چلے جاتے بیٹی! کیا کالج کھل گیا؟۔۔۔۔۔۔۔۔اب جی' تم عظمت کو تو بلاؤ' لڑکی کو روٹی تو کھلائے۔''

''چاچی جی! میں نے کھانا کھالیا ہے۔'' گیتی نے جھوٹ بولا۔ ''میں نے ناوقت آکر آپ کو پریشان کیا ہے۔''

چاچی کے پلنگ سے کچھ فاصلے پر ایک خالی پلنگ تھا جس کا بستر اس وقت تک بے شکن تھا۔ اچانک ہی اس کو خیال ہوا کہ اس کو شدت سے نیند آرہی تھی۔ اور وہ چاچی کے پاس ان کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''گیتی آرا۔۔۔۔۔۔۔ ہمارا دوست تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟'' چاچاجی پلنگ کے قریب رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ کر بولے۔ گیتی منہ کھول کر چاچاجی کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھنے لگی۔ اس وقت تک اس نے ایک مرتبہ بھی اپنے باپ کے متعلق یہ لفظ نہ کہا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔

''میں یہ لفظ کیسے کہوں' اپنی زبان سے؟'' اس نے سوچا۔

اس کی خاموش افسردگی نے ایک بار پھر ان کو چونکا دیا۔

''خیر تو ہے بیٹی؟'' وہ بھی اٹک سے گئے۔

''انتقال سے زیادہ آسان تو شاید فوت ہوجانا ہے۔'' اس نے سوچا اور بڑی دقت سے بولی۔ ''چاچاجی! وہ تو فوت ہو گئے۔''

''ہائیں۔۔۔۔۔۔۔!'' چاچا کے کسرتی چھریرے جسم کے بوجھ تلے اسٹول ڈگمگایا۔

''کب۔۔۔۔۔۔۔کیسے؟ اور تم نے مجھے اطلاع بھی نہ دی۔''

اب اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ بے تکلف آنسو بہا رہی تھی اور چاچا کب کا تاڑ چکے تھے کہ ان آنسوؤں میں باپ کی موت کے غم

کے علاوہ کوئی اور غم بھی موجود ہے۔

''ہائے ہائے! کب؟'' چاچی کی چھینکوں میں اضافہ ہو گیا۔

''ہاں میری بچی!چاچا کی قانع اور خاموش آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گیتی کے سر پر انہوں نے ہاتھ پھیرا۔ ان کے اپنی کوئی بیٹی نہ تھی اور بیٹیاں ان کو بہت پیاری لگتی تھیں۔

اور پھر وہ اپنا اسٹول اس کے بالکل قریب کھسکا لائے۔

''بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ وقت کی زد میں نہیں آتے۔ میرا اور جہانگیر کا رشتہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب تو ہم برسوں آپس میں نہ ملتے تھے۔ مگر میرے اور اس کے درمیان ایک مرتبہ جو ناتا طے پا گیا پھر کبھی نہ ٹوٹا۔''

اور پھر وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوئے۔''اب یہی تم دیکھو لاہور میں اس کا ایک میں ہی اکیلا واقف نہ تھا۔ مگر اپنی بیٹی کو صرف میرے ہی گھر آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ ہمارے ابا جی ہمیشہ ہی ادھر رہے۔ ان کو تو پنجاب کی عادت ہی نہ رہی تھی۔ جو کبھی کنبے رشتے میں شادی غمی ہوتی تو مارے باندھے آتے اور جلد ہی واپس چلے جاتے۔ میں نے اور جہانگیر نے سارا بچپن ساتھ گزارا تھا۔

چاچا جی کی آواز اچانک ہی گھٹ گئی تھی۔''یہ بچپن کے ساتھی مرتے ہیں تو یوں لگتا ہے بچپن ختم ہو گیا۔'' پھر وہ اپنی مخصوص پرسکون آواز میں اپنی اور جہانگیر مرزا کی اکٹھی کی ہوئی شرارتوں کا ذکر کرتے رہے اور پھر وقت نے اس کے اور میرے راستے الگ کر دیئے اور وہ تو ہونے ہی تھے۔ مگر ہمارے دل الگ نہیں ہوئے۔''

''اور یہ نورالہدیٰ آج کدھر ہے؟'' وہ خالی پلنگ کی طرف دیکھ کر یوں بولے جیسے بات ٹال رہے ہوں۔

''کہتا تھا' آج سینما دیکھنے جا رہا ہوں۔'' چاچی نے دو چھینکوں کے درمیان کہا۔

''اچھا' اچھا' بیٹی! اب تم سو جاؤ' تھکی ہوئی ہو۔'' ان کی آواز میں شفقت تھی۔

جب وہ پلنگ پر لیٹی تو اس کے ذہن میں وہ پہلی سی سراسیمگی اور کھلبلی نہ تھی۔

سینما سے واپسی پر ہدیٰ نے اپنا بستر باہر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے پلنگ سے تھوڑی ہی دور پر عظمت سو رہا تھا۔

اس نے عظمت کو جگا کر پوچھا۔''کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔۔ میرا پلنگ یہاں کیوں ڈال دیا؟''

اس کو خیال ہوا کہ شاید اس کے ماں باپ کو اس کا سیکنڈ شو میں جانا برا لگا ہے' جب ہی تو آج پلنگ باہر ڈلوا دیا ہے۔ مگر ابا جی تو کبھی ایسی بات کرتے نہیں۔ جتنی دیر میں عظمت آنکھیں مل مل کر ہوشیار ہوا اتنی دیر میں اس نے کتنی باتیں سوچ ڈالیں۔

''کیوں عظمت! میرا پلنگ یہاں کیسے آ گیا؟''

''آتا کیسے باؤ جی' میں لایا ہوں۔''

''کیوں؟'' ہدیٰ نے جھڑک کر سوال کیا۔

''مہمان آ گئے۔''

''کون آ گیا؟''

''وہ کالج والی بی بی' جو یہاں آیا کرتی تھی۔''

''ہائیں! وہ اس وقت کیسے آ گئی؟ کوئی اور بھی ہے اس کے ساتھ یا اکیلی آئی ہے؟''

''اکیلی ہی ہے' مجھے کیا پتہ کیسے آ گئی؟ صبح آپ معلوم کرنا باؤ جی! اب تم سو جاؤ۔'' عظمت کو خود سونے کی جلدی تھی۔

مگر ہدیٰ کی طبیعت میں کرید تھی۔

صبح سب سے پہلے موقع ملتے ہی ہدیٰ نے گیتی کی اچانک آنے کے متعلق ماں سے دریافت کیا۔

''چپ رہو' مجھے خود حیرانی ہے' مگر تمہارے باپ تو ایسی باتوں سے ناراض ہوتے ہیں۔''

''پھر بھی' پوچھنا تو تھا۔''

''وہ تو میں پوچھ لیتی مگر آتے ہی اس کے باپ کے مرنے کی بات چھڑ گئی۔''

''اوہو! یہ کب ہوا؟'' ہدیٰ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

اس کو گیتی سے ہمدردی تھی' لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ اس طرح بے وقت تن تنہا اچانک کیوں آ گئی۔

گیتی ایک سال تک یہاں رہ چکی تھی اور پنجابی اتنی مختلف زبان تو تھی نہیں جو قطعی اس کے پلے پڑتی ہی نہ ہدیٰ کے سارے شک و شبے اس نے سن لیے۔

''یہ چاچا جی اور چاچی تو اتنے اچھے ہیں کہ آدمی ساری عمر ان کے گھر پڑا رہے مگر یہ ہدیٰ کم بخت نہ جانے کہاں سے آن مرا۔'' گیتی نے ہدیٰ کے گھر بیٹھ کر ہدیٰ کے متعلق سوچا۔ اور بھی اس کا تو کالج کھل چکا ہے۔ یہ علی گڑھ کیوں نہیں گیا' اب تک؟ پتہ نہیں جائے گا بھی واپس کہ نہیں۔

اور ہدیٰ کے واپس جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ تو مسلم لیگ کے الیکشن کا کام کرنے پوری پارٹی کے ساتھ آیا تھا اور کسی خاص کام

سے لاہور ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سب گیتی پوچھتی تو اس کو معلوم ہوتا۔

''پتہ نہیں' یہ ہدیٰ کب بخت میرے متعلق کیا کیا سوچ رہا ہے اور اپنے ماں باپ کو بھی کیا کچھ سمجھائے گا۔'' یہ سوچ کر اس کا دل اتنا گھبرایا ہے اس نے سوچا کہ اب وہ یہاں سے بھی بھاگ جائے۔ بس اسی غسل خانے کے پچھلے دروازے سے کہیں کو نکل جائے۔ مگر اب کیا انسان ساری عمر اسی طرح بے سوچے سمجھے پڑا بھاگتا رہے۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اب اس کو عقل آ رہی ہے' مگر دھیرے دھیرے۔

وہ ناشتہ کرنے چاچی کے پاس آ بیٹھی۔ چاچا جی کرسی پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے اور چاچی ناشتے سے پہلے کھانے والی معجون کی ناپ تول میں مصروف تھیں۔ صحن میں انار کے گھنے پیڑ کے نیچے چھوٹی سی میز پر شیو کا سامان رکھا تھا اور ہدیٰ کرسی پر بیٹھا بظاہر اپنے منہ پر صابن کا برش پھیر رہا تھا لیکن انکھیوں سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔

''جیسے خفیہ پولیس نے اس کو خاص الخاص میری نگرانی پر مامور کیا ہو۔'' گیتی نے کڑھ کر سوچا اور بے دھیانی میں ہدیٰ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اعتراض کی گہری جھلک موجود تھی۔

گیتی کا دل گھبرانے لگا مگر بظاہر وہ سر جھکائے ناشتہ کرتی رہی۔ اب چاچا جی اپنے دفتر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

''چاچا جی مجھے اپنے ساتھ دفتر لے چلو۔'' اس کے دل نے پکار کر کہا' لیکن لب خاموش رہے۔

''اور جو یہ چلے گئے تو ہدیٰ مجھے پولیس والوں کے سے سوال کرنے بیٹھ جائے گا۔'' اس نے سہم کر سوچا۔

''واقعی! میں نے بھی کیا غلطی کی ہے جو میرے پاس واپسی کے روپے ہی بچ گئے ہوتے تو میں واپس ہی چل دیتی۔ وہاں سے چلی تو ٹھاٹ سے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا۔ حد ہے بیوقوفی کی۔ بھلا یوں بھی کوئی گھر سے بھاگا کرتا ہے۔'' اب اس کے دل نے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ وہ گھر سے بھاگ آئی ہے۔

اس کو جمعدارنی کے نواسے' دلارے کا خیال آیا جو ہر نوجوان لڑکے سے بڑے بھول پن سے پوچھا کرتا تھا۔ ''کیا تم بھی بمبئی بھاگ گئے تھے؟'' اور پھر خود ہی جلدی سے کہتا۔ ''میلا ماما بھی بمبئی بھاگ گیا ہے۔'' اس نے سوچا' اب مجھ میں اور دلارے کے ماما میں کیا فرق رہ گیا۔

ہدیٰ کے چہرے سے تجسس ٹپک رہا تھا کہ وہ اس کو اکیلے میں ملے تو وہ کرید کرید کر اس کے اس طرح آنے کا سبب پوچھے اور اگر ضرورت ہو تو نصیحتوں اور فضیحتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جائے۔ اس کو ایسی آزادی اور بے ڈھنگی لڑکیوں سے خدا واسطے کا بیر تھا اور پھر وہ

اٹھ کر باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

شکر ہے کہ وہ چاچا سے پہلے ہی نکل گیا تھا اور اب دن کا وہ حصہ شروع ہو چکا تھا جب بچے سکولوں کو اور مرد دفتروں کو سدھار چکے ہوتے ہیں اور عورتیں گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ چاچی برآمدے میں پیڑھی پر بیٹھی کاغذ کی پتلی بتیاں ناک میں پھرا پھرا کر چھینکوں پر چھینکیں لے رہی تھیں۔

گیتی نے محسوس کیا' آسمان پر بغیر کسی تمہید کے بھوری بھوری گھٹائیں اٹھ آئی ہیں اور موسم سہانا ہو گیا ہے۔ بھوری بھوری گھٹاؤں کے مقابل۔۔۔۔۔۔ لان کا سبزہ' جھاڑیاں اور دور دور تک نظر آنے والے درختوں کی ہریالی بہت شاداب اور گہری نظر آ رہی تھی۔ حبس اور گھٹن میں اچانک ہی کمی ہو گئی تھی فضا میں خوش گواری اور خاموشی تھی۔ اس کا دل اور بھی غمگین ہو گیا۔ پتوں کے درمیان دھیرے دھیرے سرسراتی ہوئی ہوا' جیسے یکایک جوش میں آ گئی اور زور شور سے چلنے لگی۔ ہرے بھرے درختوں پر زلزلہ سا آ گیا اور پھر ہلکا سا ترشح ہو کر رہ گیا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر پھر پلنگ پر آ بیٹھی۔ آج سے پہلے اس کو اپنی زندگی اتنی فضول اور بے مصرف کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

''صولت آپا کچھ ایسا غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں۔'' اب ہر بات خود بخود اس کو درست معلوم ہوتی جاتی تھی۔

''دراصل اس مسئلے کو ہدیٰ نے الجھا دیا ہے ورنہ کوئی بات ہی نہ تھی۔ میں تو چاچا سے پیسے لے کر دو ایک دن میں واپس بھی جا سکتی تھی اور یہ ہدیٰ کم بخت۔۔۔۔۔۔'' وہ پھر غلط طریقے پر سوچنے لگی۔ ''یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف کیوں ہو جاتے ہیں۔ خیر' یہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ گھر ہدیٰ کا ہے۔ مجھے اس کی ناگواری کا احساس ہونا چاہیے اور جلد سے جلد کچھ کرنا چاہیے۔''

اور جب چاچی باورچی خانے سے آ کر پلنگ پر لیٹیں تو اس نے ان سے پوچھا۔ ''چاچی جی! میری سائیکل کدھر رکھوائی تھی آپ نے؟''

''تمہاری سائیکل سامان والے کمرے میں بند ہے۔ عظمت سے کہنا' نکال دے گا۔''

باب ۵۴

گھر سے تو وہ بے مقصد ہی نکلی تھی' یہاں خیال کر کے کہ ذرا ادھر ادھر گھوم پھر کر اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ سکے گی' لیکن وارث روڈ پر چند چینی عورتیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' خاموشی سے جاتی نظر آئیں تو دفعتاً اس کے ذہن میں صفدر کا خیال آ گیا۔

''اوہ! شکر ہے' اس شہر میں ایک شخص ایسا بھی موجود ہے جو شروع سے لے کر آخر تک میرے ساتھ ایک ہی طرح پیش آتا رہا ہے' جس کا دل ارجمند کی طرح کبھی نہیں بدلتا۔''

''لیکن ارجمند کے ساتھ یہ کم بختی ہے کہ اس کا دل مجبوریوں کے ہاتھوں بے بس ہے۔'' یہ خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس کی سائیکل صفدر کی دکان کی طرف مڑ گئی۔

صفدر دکان کے پچھلے حصے میں مشین پر کام کر رہا تھا۔

چھوٹی سی نیکر اور بنیان پہنے' پسینے میں شرابور' وہ سائیکل کو تالا لگا کر سیدھی اندر چلی گئی۔ کٹے ہوئے جوتوں کے پارٹ بریکٹوں پر جمے ہوئے تھے اور ہر طرف چمڑے کی بدبو پھیل رہی تھی۔ فرموں پر چڑھے ہوئے جوتے قطار سے لگے ہوئے تھے۔ صفدر نے مشین پر سے نظر اٹھائی۔

''ارے! یہ تم ہو؟''

''اب تو مجھے ہر کوئی دیکھ کر حیران ہی ہو گا۔'' اس نے دکھے دل سے سوچا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ حساس ہو گئی تھی۔

''ہاں' یہ میں ہی ہوں۔'' اس کی آواز کی سنجیدگی اور فکرمندی نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔

اور وہ مشین پر سے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''چلو' باہر چلتے ہیں۔''

''اچھا' پھر کسی وقت سہی۔ اس وقت تو تم مصروف ہو۔'' وہ جانے کو مڑی۔

''نہیں' مجھے فرصت ہے۔۔۔۔۔۔۔ آؤ۔''

وہ گلی میں نکل آئے۔ گلی میں کم حیثیت عیسائیوں کے علاوہ چینیوں کے بھی دو چار گھر تھے۔ گلی بھر میں چمڑا کٹنے کی بو بسی ہوئی تھی۔

چپٹے چپٹے چہروں اور بیٹھی ہوئی ناکوں والے بچے گھروں کی دہلیزوں کے قریب کھیل رہے تھے۔ نسبتاً خوشحال گھروں کے آگے بطخیں نالی کی کیچڑ میں چپچ چپچ چونچیں مار رہی تھیں۔ سستی اور جھولی ہوئیں فراکتیں پہنے ہوئے عیسائی عورتوں کے درمیان چھوٹے قدوں والی موٹی موٹی چینی عورتیں اونچے اونچے کوٹ اور تنگ تنگ سے پاجامے پہنے سودے کی ٹوکریاں اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ ہر ایک کے چہرے پر جمی جمائی' سیدھی سادی زندگی کی طمانیت اور آسودگی تھی۔ گیتی نے رشک سے ان کی طرف دیکھا اور پھر اس امید سے صفدر کی طرف دیکھا کہ وہ اس سے پوچھے کہ بے موسم یہاں کیوں گھوم رہی ہے۔ یہ تو کالج کی لڑکیوں کے گھومنے کا وقت نہ تھا۔

اور وہ خاموش کھڑا سوچ رہا تھا۔ ''مجھے معلوم ہے' پھر تم کسی غیر معمولی پریشانی اور چکر میں مبتلا ہو اور یہ سب تمہاری اپنی ہی کسی حرکت کا نتیجہ ہوگا۔''

بات خود ہی چل پڑی۔ اس نے سب کچھ بیان کرنے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔ ''صفدر! آج بھی تمہارا خیال ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔''

وہ چپ تھا۔

''بتاؤ نا' تمہارا کیا خیال ہے؟''

اور وہ سوچ رہا تھا۔

''اب میں کیا بتاؤں کوکو! جب معاملات یہاں تک آ پہنچے ہیں کوکو! تو اب مجھے یہی کہنا پڑتا ہے کہ تم نے ٹھیک ہی کیا۔ تم کو الزام دے کر فائدہ بھی کیا ہوگا' غلطی تمہاری نہیں ان کی ہے' جنہوں نے اپنے اختیارات کو حد سے زیادہ وسیع تو سمجھ لیا' لیکن تم کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔'' آج وہ اس کو ملامت کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔

''تم نے غلط کیا یا صحیح۔ یہ وقت یہ ثابت کرنے کا نہیں ہے۔ اب تو سوچنا یہ ہے کہ تم کو ان لوگوں پر کسی طرح اپنے آنے کی وجہ ظاہر کرنا چاہیے۔ واقعی ہدیٰ کے شکوک بھی بے جا نہیں۔ کوئی وجہ تو بتاؤ نا۔''

''ہاں' بھئی! اب یہ تو تم ہی بتاؤ گے۔'' وہ دکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر سادگی سے اس کی طرف تکنے لگی۔ ''میرا تو دماغ اس وقت تک کوئی بہانہ تراش نہیں سکا۔''

''میں بتاؤں؟'' اس نے اس طرح فاتحانہ اس کی طرف دیکھا' جیسے کسی نہ حل ہونے والے معمے کا جواب اچانک ہی اس کو سوجھ گیا ہو۔

''ہاں' بتاؤ۔'' وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

مگر اس اثناء میں وہ اپنے سوچے ہوئے فقرے کو خود ہی مسترد کر چکا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ جو بات وہ تجویز کرتی ' وہ اس کو رد کر دیتا اور جو بات وہ سوچتا' اسے قطعی معقول نظر نہ آتی۔

بات دراصل یہ ہے کہ اتنی نامعقول بات کو بنانے کے لیے کوئی معقول عذر یا بہانہ تراشا بھی کب جاسکتا ہے اور ساری بات تو یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہ تھا۔

اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ملکوں' خطوں اور وطنوں کا تو ایک ڈھونگ ہے۔ انسان کو فقط انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ صفدر میرا کون لگتا ہے اور اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے جو وہ میرے لیے اس درجہ فکر مند کھڑا ہے۔

''میں سوچتی ہوں کہ اب میری پڑھائی تو ممکن نہیں۔ اب مجھے کچھ کرنا چاہیے۔''

''پڑھائی ممکن نہیں' یہ تم کہہ رہی ہو گوکو!'' اس نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ''تم' جو اتنی چھوٹی سی لڑکی ہو۔''

اس کی نظر میں اس کے باغ کی وہ دیوار گھوم گئی' جس پر وہ بڑے ٹھسے سے چڑھ کر بیٹھا کرتی تھی اور اس دلچسپ سے چہرے والی لڑکی کی عام لڑکیوں اور بچوں سے بہت مختلف باتوں کو سننے کے لیے وہ پہروں اپنی سائیکل دیوار سے ٹیکے کھڑا اس سے الجھتا اور چھیڑا کرتا تھا۔

''کیا خیال ہے تمہارا؟'' وہ اب بھی اسی طرح سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔

''اپنا خیال اب میں کیا بتاؤں؟'' وہ رکا۔ ''میرا خیال تو یہ تھا کہ تم کہو تو کل میں تم کو گاڑی میں بٹھادوں اور تم واپس چلی جاؤ۔''

''نہیں صفدر' یہ اب ناممکن ہے۔ واپس جا کر اب میں مزید ذلت نہیں برداشت کرنا چاہتی اور تم نہیں جانتے مجھے اکبر سے بہت نفرت ہے۔'' نفرت اور غصے کے آثار اس کے چہرے پر صاف تھے۔

''تو پھر میرا خیال ہے کہ میں فی الحال تم کو کوئی دوسری رائے بھی نہیں دے سکتا۔''

صفدر کو اس لڑکی کی عاقبت نااندیشی اور ضد پر جھنجلاہٹ سی محسوس ہوئی اور وہ صفدر سے بدظن ہوگئی۔ ''میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ فضول میں اتنی دور چل کر اس سے مشورہ لینے آگئی۔ بھلا ایک جوتوں کی مشین پر کام کرنے والے چینی کو مجھ سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے۔''

ایک ناقابل بیان کوفت اور شرمندگی اس کے سارے وجود پر چھا گئی۔ وہ ایک دم مڑی اور تیز قدموں سے مختصر سی پتلی گلی کو پار کرتی چلی گئی۔ گلی کے کناروں پر پھیلی ہوئی کیچڑ میں چونچیں مارتی ہوئی سیاہ اور سفید بطخیں منتشر ہو کر غل مچانے لگیں اور پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر ادھر ادھر لپکیں۔ ایک گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی چھوٹی اور موٹی سی چینی بچی نے دہشت زدہ ہو کر بلک بلک کر رونا شروع کردیا۔

گیتی نے گلی کے آخری نکڑ سے جاتے جاتے گھوم کر دیکھا۔ صفدر یاسین نے بڑے سکون سے آگے بڑھ کر روتی ہوئی بچی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھالیا۔ اس کے سیدھے اور سیاہ بالوں کو آہستہ سے پیشانی پر سے ہٹایا اور اس کو چپ کرانے لگا۔

''ہاں ٹھیک ہے' یہ تمہاری ہم وطن ہے نا۔'' بے آسرا اور حاسد دل نے سوچا۔ ضبط کی شدت کی وجہ سے اس کے گلے کی رگوں میں درد ہو رہا تھا اور آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔ دیر تک وہ یوں چلتی رہی جیسے اس کی بینائی زائل ہو گئی ہو۔

اور گلی کے ایک سرے پر وہ شخص اس بچی کو اٹھائے' اس کو جاتا دیکھتا رہا جو اس وقت جب وہ ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہسپتال میں تھی' محض اس کو ہنستا ہوا اور خوش دیکھنے کی خاطر پہروں اس کے کمرے میں آ کر بیٹھتا اور طرح طرح کی آوازوں اور نقلوں سے اس کو ہنساتا تھا۔

پھر اس کے جانے کے بعد وہ مشین پر کام کرنے نہیں گیا اور روتی ہوئی بچی کو اس کی ماں کے حوالے کر دینے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک چکرایا کھڑا رہا اور پھر واپس دکان کے شوروم کی طرف چلا گیا۔ اس روز اس کے گاہکوں میں سے کئی ایک نے یہ بات محسوس کی تھی کہ ہمیشہ مسکرانے اور ہنس ہنس کر بھاؤ تاؤ کرنے والے لیو چو کا مزاج بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ وہ بے وجہ الجھ الجھ کر جواب دے رہا ہے اور اس دن کتنے ہی لوگ اس کے لب و لہجہ کا برا مان کر نکل گئے اور وہ خلاف عادت ناوقت شاگردوں لڑکوں پر دکان چھوڑ کر اپنے کمرے پر چلا گیا تھا۔

کمرے میں باہر کی بہ نسبت گرمی تھی۔ مگر وہ پسینے اور گرمی سے بولایا ہوا تھا۔ چپ چاپ اس نے تولیہ اٹھایا اور چھوٹے سے تنگ و تاریک غسل خانے میں چلا گیا۔ دیر تک نہاتے رہنے کے بعد اس پر یہ انکشاف ہوا کہ بعض وقت سرد پانی بھی جسمانی اور ذہنی کوفت کو دھونے سے قاصر رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے تولیہ سے اپنا زردی مائل مٹیالا جسم خشک کیا' کپڑے پہنے اور باہر نکل آیا۔ اس کے سیدھے اور سیاہ بال بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

''یہ آج مجھے کیا ہو رہا ہے اور میں کیوں ایسا ہو رہا ہوں؟'' وہ کچھ جھنجھلا سا گیا۔

''کھٹ کھٹ'' دروازے پر یہ دستک لی فان کی گیارہ سالہ بچی کی تھی۔ جس کے گھر صفدر نے اپنے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔

اپنی جگہ سے ہلے بغیر صفدر نے پوچھا۔ ''کیوں ـــــــــ کیا ہے؟''

بچی نے دروازے کے اندر منہ ڈال کر اپنی ماں کا پیغام دیا۔

''آج تم کھانا کھانے کیوں نہیں آئے؟''

اور پھر پوچھنے لگی۔ ''کیا کھانا یہاں لے آؤں؟ میں دکان پر بھی تمہیں بلانے گئی تھی۔''

''اوہ! ہاں' میں نے کھانا بھی تو نہیں کھایا۔'' ایک دم اسے یاد آ گیا۔

اس نے بچی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''نہیں' کھانا یہاں لانے کی ضرورت نہیں' میں خود ہی آ رہا ہوں۔''

کود کود کر زینہ اترتی بچی کے پیچھے پیچھے ہی وہ اترا اور دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر میں داخل ہو گیا۔ پتلے طویل اور گیلری نما کمرے میں ناریل کی چٹائی کا فرش ہو رہا تھا۔ کمرے کے مشرقی سرے پر ایک بے حد نیچی اور نازک سی چوکی پر بڑے سلیقے سے کھانا چنا ہوا تھا۔ گرم گرم کھانے کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ مغربی سرے پر بانس کے پیڑھے نما کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے لی فاں کی چوڑے چکلے چہرے والی خاموش طبع بیوی بیٹھی اپنے شوہر کے کوٹ میں رفو کر رہی تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھا کر یوں دیکھا جیسے پوچھتی ہو' آج کہاں رہ گئے تھے تم؟''

صفدر نے سر کے اشارے سے اس کو سلام کیا اور بغیر کسی معذرت کے کھانے کی چوکی کی طرف چلا گیا۔ اور کھانے کے آگے کشن پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ کمرے کے وسط میں' لکڑی کے پالنے میں لی فاں کا نیا بچہ سویا ہوا تھا۔ ہر طرف گرمی کے باعث خاموشی اور افسردگی طاری تھی۔

صفدر نے بانس کی تیلیاں اٹھائیں اور اجلے اجلے چاولوں سے بھری ہوئی رکابی بڑے شوق سے اپنے آگے کھسکا لی۔ پیالے میں خشک جھینگوں کا شوربہ تھا اور چھوٹی سی طشتری میں کتری ہوئی ہری مرچیں سرکے میں بھیگی ہوئی تھیں۔

مچھلی کے قتلوں میں سے اٹھتی ہوئی گرم گرم بھاپوں کے ساتھ بنولے کے تیل اور لہسن ادرک کی ملی جلی سوندھی خوشبو بڑی اشتہا انگیز تھی۔

جس دن جھینگوں کا شوربہ پکتا تھا اس دن صفدر بڑے اشتیاق سے اور ڈٹ کر کھاتا تھا۔ مگر آج اس نے جلد ہی ہاتھ روک لیا۔ ایک ایک لقمہ اس کے حلق میں پھنس رہا تھا۔ بمشکل اس نے پانی کے چند گھونٹ حلق کے نیچے اتارے اور کھڑا ہو گیا۔

لی فاں کی بیوی نے اتنی جلدی کھانا ختم کر دینے پر ٹوکا' کیوں! آج کیا بات ہے۔ کھانا یوں ہی چھوڑ دیا؟ جھینگوں کا شوربہ تو تم کو بہت پسند ہے۔''

''آج نہ معلوم کیا بات ہے؟ جیسے کھانا میرے حلق میں پھنس رہا ہے۔''

''ضرور کوئی بھوکا ہے۔''

''اونہہ! تم چینی عورتیں ہمیشہ سے توہم پرست ہوتی ہو۔''

''نہیں تو' یہ بات تو مجھے ایک ہندوستانی عورت نے بتائی تھی۔''

''وہ ہندوستانی تھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم عورتیں' خواہ وہ ہندوستانی ہوں' چینی ہوں' روسی ہوں یا ترک' ہمیشہ کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہتی ہو۔''

''اور میں کہتی ہوں کہ تم مردوں کو قوم' چاہے وہ کہیں کے بھی ہوں' عورتوں کو پاگل اور احمق ضرور سمجھے گی۔ میں سمجھتی تھی کہ چین کے مرد ہی عورت کو احمق سمجھتے ہیں' لیکن میری ایک ہندوستانی دوست کہتی تھی کہ ہندوستانی مرد بھی عورتوں کو احمق اور بے مغز سمجھتے ہیں۔''

اس وقت اس کم گو عورت سے الجھ کر صفدر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن پر چھائی ہوئی وہ نامعلوم سی کوفت کم ہو گئی ہو۔

''ہاں' تو پھر وہ ہندوستانی عورت کیا کہتی تھی؟''

''تم تو پیچھے ہی پڑ گئے۔ جب تم کو ہم عورتوں کی باتوں کا یقین ہی نہیں تو پھر پوچھنے سے فائدہ؟''

''نہیں' یقین کیسے نہیں ۔۔۔۔۔۔ یہی تو ایک عجیب بات ہے' حماقت کے باوجود تم لوگوں کی اکثر باتیں سچ نکلتی ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں' میری ماں نے جو باتیں وہاں بتائی اور کہی تھیں' وہ یہاں بھی سچ نکلتی ہیں۔''

''وہ کہتی تھی' جب کھانے میں نوالے حلق میں پھنسیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی بہت عزیز شخص بھوکا ہے۔''

''ہوں ۔۔۔۔۔۔!'' صفدر سوچ میں پڑ گیا اور کھڑا سوچتا رہا۔

''کوئی بہت عزیز شخص بھوکا ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ تو ہی!''

لی فاں کی بیگم نے ٹانکا پکا کر کے دھاگا توڑتے ہوئے فتح مندانہ اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں ۔۔۔۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو؟''

''اوں ۔۔۔۔۔۔ ہاں!'' وہ چونکا۔ میرا خیال ہے' تمہاری وہ ہندوستانی دوست ٹھیک ہی کہتی تھی۔ ضرور کیا' واقعی کوئی بھوکا ہے۔''

اپنی بات پوری کئے بغیر ایک جست میں وہ اس طویل گیلری نما کمرے سے نکل گیا۔

گلی میں چلنے والی لو کے زناٹے اس کو ذرا بھی گرم اور تکلیف دہ معلوم نہ ہو رہے تھے۔ سست قدموں سے وہ یوں چل رہا تھا گویا وقت کاٹنا چاہ رہا ہو۔ اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹنے کے بعد بھی اس کے ذہن میں ایک ہی ان کہا جملہ گونجے جا رہا تھا۔

''اس احمق لڑکی کے سوا اس وقت اور کون بھوکا ہو سکتا ہے۔''

''اور کون بھوکا ہو سکتا ہے۔''

اور اس خیال کی بازگشت سے بچنے کے خیال سے اس نے بار بار کروٹیں بدلیں اور پھر تکیے پر منہ اوندھا لیا۔

''کیا اپنے گھر سے روٹھی ہوئی یہ احمق لڑکی جو مدتوں نظر بھی نہیں آتی اور جس کا کبھی کوئی خیال بھی ذہن میں باقی نہیں رہتا' میرے لیے اس عزیز کا درجہ رکھتی ہے جس کی بھوک سے حلق میں نوالے پھنسنے لگیں؟''

یہ سوال اس کو واقعی حیران کرر ہا تھا۔

اس روز اس کی آنکھ شام ڈھلے کھلی تھی۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کا ذہن اب تک سہما ہوا تھا۔ ڈری ڈری نگاہوں سے اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک ناقابل بیان افسردگی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

''دراصل اس لڑکی کا اس درجہ مایوس ہو کر گلی سے نکل جانا میرے دل و دماغ پر نقش ہو گیا ہے۔ وہ کتنی بے یار و مددگار اور بد نصیب نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے مشورہ طلب کرنے آئی تھی' جواب سے چند سال پہلے اپنے باغ کی دیوار کا گھوڑا بنائے' اس کا منہ چڑایا کرتی تھی۔ جس کی ہر ہر ادا سے آسودگی اور بے فکری ٹپکتی تھی اور جو یوں پھرا کرتی' جیسے اس دنیا میں کسی کی پرواہی نہ ہو۔ پر یہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ آخر اس میں اتنی سرکشی اور ضد کس طرح پیدا ہو گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ لڑکی واقعی۔۔۔۔۔۔''

اور اس کے آگے وہ کچھ سوچنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کوکو وہ اتنے دن سے جانتا تھا اور شروع ہی سے اس کی ذات میں دلچسپی لیتا تھا۔ وہ اس کی ذات کے ساتھ کسی قسم کی برائی کا تصور وابستہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''وہ تو بڑی سیدھی' شریف اور سچی لڑکی ہے جو ہر کسی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتی ہے اور جس کی سمجھ میں یہ بات قطعی نہیں آتی کہ لوگ اپنے محسوسات اور واردات کو سربستہ راز بنا کر کیوں رکھنا پسند کرتے ہیں۔''

فضا میں کلیساؤں اور مندروں کی گھنٹیوں کی آوازیں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ دور کہیں موذن پکارا۔

''حی علی الفلاح۔۔۔۔۔۔۔حی علی الفلاح''

(اے لوگو! بھلائی کی طرف آؤ۔۔۔۔۔۔۔بھلائی کی طرف آؤ)

صفدران مانوس بولوں کے مطلب سے خوب واقف تھا۔

''کچھ لوگ بھلائی کو تلاش کرتے ہیں اور کچھ لوگ برائی اور تباہی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اس لڑکی کی طرح جس کو میں کوکو کہتا ہوں اور جس کا اصل نام مجھے یاد نہیں۔''

وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میز پر رکھا ہوا لیمپ روشن کیا' اسٹوو جلا کر چائے کا پانی رکھا اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔

نہا کر واپس آیا تو سن کر کے کیتلی نے شور مچا رکھا تھا۔ اس نے چائے بنائی اور پنکھا کھول دیا۔
شلف پر چینی زبان کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ چین کے سیاسی بحران کے متعلق کچھ پمفلٹ' قرآن کا چینی میں ترجمہ' کنفیوشس اور لاؤ تزے کی جادۂ حیات۔۔۔۔۔۔اور یہی کتاب اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھائی اور یوں کھولی جیسے فال کھول رہا ہو۔ وہ جھکا اور پڑھنے لگا۔ کھلے ہوئے صفحے پر جلی حروف میں جو پہلا لفظ اس کو نظر آیا تھا' وہ تھا۔۔۔۔۔۔

(تاؤ)

یعنی جادۂ حق

''اوہ۔۔۔۔۔۔!''

جز بز ہو کر اس نے کئی ورق پلٹ دیئے اور ایک نظم کی آخری سطروں پر اس کی نظر خود بخود ٹھہر گئی۔

''چنانچہ ایک مقولہ یہ بھی ہے کہ ایک وقت وہ بھی ہوتا ہے' جب ایک عام سطح کے انسان کو ہر بات الٹی نظر آتی ہے۔ اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب روشن اور شفاف راہوں پر بھی تاریکیاں چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ جب سیدھی راہیں ناہموار نظر آنے لگتی ہیں۔ بلند ترین نیکیاں گناہ کا بہروپ بھر کر منظر عام پر آتی ہیں اور مقدس ترین معصومیت اور پوترتا کا پیرہن تار تار نظر آتا ہے۔ بلند کرداری' لفنگا پن اور آوارگی معلوم ہوتی ہے۔ ٹھوس لیاقتیں مضطرب موجوں کی طرح ناپائیدار معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن حقیقت میں کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

سچی وسعتیں بے کنار ہوتی ہیں۔

زبردست قوتیں دیر سے بروئے کار آتی ہیں۔

عظیم ترین راگ کے سر دھیمے ہوتے ہیں اور بلند ترین وجود کی شکل کا احاطہ ناممکن ہوتا ہے۔''

کتاب اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔ اس کے لب ایک دوسرے سے پیوست تھے اور اس کی آنکھوں کی سیاہی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔

بے خیالی میں اس نے دھیرے دھیرے دہرایا۔

''جب سیدھی راہیں ناہموار نظر آنے لگتی ہیں۔ بلند ترین نیکیاں گناہ کا بہروپ بھر کر منظر عام پر آتی ہیں اور مقدس ترین معصومیت اور پوترتا کا پیرہن تار تار نظر آتا ہے۔ بلند کرداری' لفنگا پن اور آوارگی معلوم ہوتی ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چپٹا اور معصوم چہرہ پھر بھی نظروں سے اوجھل نہ ہوا۔ طمانیت سے بھرپور مسکراتا ہوا جیسے کوئی سنیاسی برسوں کی ریاضت اور گیان کے بعد دنیادار انسانوں کی حماقتوں کو دیکھ کر ہمدردی سے مسکرائے۔

اور یہ چہرہ تو سدا سے ایسا ہی تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی جب بھی تو اس چہرے کا بالکل یہی انداز تھا اور جب ہی تو وہ اتنی پراسرار اور دلچسپ نظر آتی تھی۔

گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کتابوں کی چھوٹی سی شلف پر آلتی پالتی مارے گیان میں مصروف گوتم کا ننھا سا مجسمہ کسی گہری سوچ میں تھا اور صفدر بھی سوچ رہا تھا۔

''فوق البشر اپنے ماحول کی بے حسی اور بداعمالی سے اکتا جاتا ہے تو وہ اس سے نکل بھاگتا ہے۔ وہ کبھی یہودا کے شہر بیت اللحم کی گلیوں میں بھٹکتا ہے' کبھی حرا میں بیٹھ کر گیان کرتا ہے' کبھی اپنی بے چین آتما کے لیے نروان کی تلاش میں سرگرداں ہو کر رات کے اندھیرے میں پاٹلی پتر کے مکلف ایوانوں کو خیر باد کہہ دیتا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک احمق اور جلد باز چھوکری کے روپ میں اپنے گھر کی سلامتی اور سکون سے منہ موڑ کر اجنبی شہر کی گلیوں میں دل شکستہ اور بے سہارا پھرتا ہے۔''

اس نے بلا جھجک اس معمولی سی لڑکی کو فوق البشر کا درجہ دیا اور مطمئن ہو گیا۔

آج اس عجیب و غریب لڑکی کی ساری کجروی اور حماقتوں کا بھید اسے مل گیا تھا۔ اس نے واقعی ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''کوکو! آخر تجھے کس نے رائے دی تھی کہ تو ''تاؤ'' کا راستہ اختیار کر لے۔ جادۂ حق ناہموار اور کج ہوتا ہے۔ ہاں' میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔ اتاؤ!

باب ۵۵

''اگر تمہاری جگہ کوئی اور اپنا صحیح پتہ بتائے بغیر اس طرح چل دیتا تو میرے لیے اس کا پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا' بلکہ شاید ناممکن بھی۔ لیکن یہ تم ہو کوکو۔۔۔۔۔۔۔!''

''اور میرے لیے یہ اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہیں کہ تم کہاں ملو گی۔ یہ میں ہوں اور میں ہمیشہ وقت پر پہنچ جاتا ہوں۔ نہ جانے کس طرح! یہ تو صرف خدا ہی کو معلوم ہے۔''

''لیکن جب تم جامن کے پیڑ سے گری تھیں جب' اور اس وقت بھی جب اکتا کر تم کمپنی باغ میں جا بیٹھی تھیں اور پھر آخری مرتبہ

جب تم نے ادنیٰ درجے کا سینما کا ٹکٹ خرید لیا تھا' اس وقت بھی میں ہی تمہاری مدد کو پہنچا تھا۔''

''اور اسی دن میں نے اس بات پر غور کیا تھا کہ قدرت یا اتفاق مجھے ہمیشہ وقت پر تمہارے پاس بھیج دیتا ہے۔''

اتوار کی صبح کو جب اس کے عیسائی ہم وطن کنبے گرجا جا چکے تھے اور دوسرے اپنے گھروں میں بنیان اور نیکر میں مرغی خانوں کی درستی یا پھرکتوں اور بچوں سے کھیلنے میں مصروف تھے۔ اس کی سائیکل دھیرے دھیرے سیاہ لمبی سڑک پر اس کے وجدان کے اشارے پر چلتی رہی۔

اونچے اونچے چھتنار درختوں سے گھرے ہوئے راستے کے داہنی طرف اس کو اوپن ایئر کے ٹکٹ گھر کی کھڑکی نظر آئی اور ایک نامعلوم موہوم سی امید سے چمکتی چھوٹی چھوٹی تکونی آنکھوں نے ادھر ادھر دور دور تک دیکھا۔ مختلف گوشوں' جھاڑیوں اور درختوں کے سائے میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں اتوار منا رہی تھیں۔

ان میں رنگ برنگی پگڑیوں' سجی ہوئی داڑھیوں اور غلافی آنکھوں والے سکھ بھی تھے اور مختلف ملے جلے لباسوں والے ہندو مسلمان بھی۔ خوشحال اینگلو انڈین کنبے بھی تھے اور کالے عیسائی بھی۔ آیاؤں کے ساتھ آئے ہوئے انگریز بچے غدر مچا رہے تھے۔ ہر طرف خوشی تھی اور بے فکری۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ تو یہاں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

''اور جو میرے خیال کے مطابق آج تم مل گئیں تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ میرا اور تمہارا کوئی انجانا تعلق ضرور ہے اور قدرت نے مجھے تمہاری دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے مامور کیا ہے۔ میں یہ سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ہم ایشیائی' اوہام پرست اور عقیدوں کے پابند ہوتے ہیں۔''

وہ یہاں کہیں بھی تو نہ تھی۔ فرنوں' چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور ناگ پھنی کے پودوں سے گھری ہوئی پہاڑیوں پر پڑی ہوئی بنچوں پر اس نے بار بار نظر دوڑائی۔

ابھی تو باغ کے اور بھی بہت سے گوشے باقی ہیں۔ اس نے اس پہاڑی پر چڑھتے ہوئے سوچا' جس کی پہلی ڈھلان پر ان دنوں جو گیٹ کھڑا تھا' اس پر سفید اور چھوٹے چھوٹے سرخ گلابوں کی ملی جلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سبز جنگلے سے ٹیک لگا کر ایک بار پھر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور اوپر کی طرف چڑھ گیا۔ اس پہاڑی پر پڑی ہوئی بنچ پر صرف ایک مدراسی آیا ایک کھیلتی ہوئی چھوٹی سی بچی انگریز بچی کی نگرانی کر رہی تھی۔

آیا کی چائیں مائیں اور بچی کے شور سے مکدر ہو کر وہ پہاڑی کی اگلی ڈھلان کی طرف مڑ گیا' جس طرف پتھروں کے نیچے چھپے ہوئے نلکے سے پانی ابل ابل کر پتھروں میں سے گزرتا اور پھسلتا' شور مچاتا نیچے کی طرف چلا جا رہا تھا اور وہاں ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں اسی پتھر سے ٹیک لگائے وہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس کے منہ میں کوئی چیز تھی' جس کو وہ دھیرے دھیرے گھلا گھلا کر چوس رہی تھی۔

قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ کتاب ہی کی طرف متوجہ ہے۔ حالانکہ اس کی نظریں صفحے کی سیدھ میں نہ تھیں۔

وہ اس کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ عجیب بات تھی' اتنی مایوسی کے بعد غیر متوقع طور پر اس کو پا کر اس پر کوئی چونکا دینے یا حیران ہونے والی کیفیت طاری نہ ہوئی۔

''ہاں' یہ تو ہونا ہی تھا۔'' اس نے سوچا اور بس یہی اس کا ردعمل تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اس کو مخاطب کیا۔

''کوکو! یہ میں کھڑا ہوں۔''

''ہاں' میں نے دیکھ لیا ہے صفدر''

اس کی آواز میں رکھائی اور خفگی تھی اور سب سے بڑھ کر اس نے اس کو ''چو'' یا ''لیو چو'' کہنے کی بجائے بڑی معقولیت سے صفدر کہا تھا۔

''مگر میں تمہاری ہی تلاش میں آیا تھا کوکو''

''میری تلاش میں؟۔۔۔۔۔۔۔تم کو کس نے بتایا کہ میں یہاں بیٹھی ہوں؟''

''کسی نے تو بتا ہی دیا نا' جب ہی تو میں سیدھا یہاں پہنچ گیا۔''

''بڑے تعجب کی بات ہے' میں تو گھر پر بھی کسی کو بتا کر نہیں آئی تھی۔ آخر وہ کون ہے' جس نے تم کو میرا اتنا صحیح پتہ بتا دیا؟''

''اب کہ میرا کام بن گیا' تو پھر مجھے بتانے اور تمہیں یہ سب پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کل سے' جب تم اچانک ہی چلی آئی تھیں' مجھے برابر تمہاری فکر تھی۔'' اس کی آواز میں بڑی صداقت تھی۔

''اچھا! مگر اس وقت تو تم جھنجلا گئے تھے۔ مجھے بھی افسوس ہوا کہ فضول میں تم کو بور کیا۔''

''جب ہم اپنی کسی مشکل کو آسانی سے حل نہیں کر پاتے اور جب ہمیں معقول عذر نہیں سوجھتے تو جھلا ہی تو جاتے ہیں۔'' اس کی آواز میں ندامت اور رنج تھا۔ ''لیکن اب میں اسی ارادے سے آیا ہوں کہ دونوں مل کر کوئی معقول بات سوچیں گے۔ دراصل اس وقت اچانک یہ سب سن کر میرا دماغ بے کار ہو گیا تھا۔''

اس نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور اپنی عادت کے مطابق پیشانی پر گرتے ہوئے بالوں کو سر کے جھٹکے سے پیچھے کو لوٹا دیا۔ پھر بغور صفدر کو دیکھا۔ جو کچھ سوچ رہا تھا۔

آج اس چہرے پر وہی سکون اور گیانیوں کی سی طمانیت ہے اور آنکھوں میں کچھ ایسی بے نیازی اور آسودگی ہے' جیسے وہ اس دنیا کو کہیں بہت نیچے کی سطح پر دیکھ رہی ہوں۔

اور گیتی نے سوچا۔ ''یہ لیو چو واقعی بڑا گڈ اور مخلص ہے۔ میں تو اس سے یوں ہی بدگمان ہو گئی تھی۔ اب بھلا اس کو کیا پڑی تھی' جو اپنی اتوار کی چھٹی ناس کر کے مجھے ڈھونڈتا پھرے۔ نہ جانے کس طرح میرا پتہ لگایا ہو اور کن کن لوگوں سے پوچھتا پھرا ہو۔''

اس کا آئینہ دل ہمیشہ کی طرح کدورت سے پاک ہو گیا اور وہ دوستی کے موڈ میں آ گئی۔

''آؤ' ادھر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے دوسرے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔

اور وہ اس پتھر پر بڑی سعادت مندی سے بیٹھ گیا۔ یہ لڑکی اس کو آج اپنے آپ سے بھی بہت بڑی نظر آ رہی تھی۔

''مجھے اب عذر معذرت کی ضرورت نہیں رہی۔'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''کیوں؟ کیا ہدیٰ نے تمہاری مخالفت ترک کر دی؟'' نہ معلوم اس خیال سے صفدر کو بے چینی سی ہوئی۔

''وہ مخالفت ترک کرے یا نہ کرے' اس سلسلے میں مشورے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

''مگر کیوں؟'' وہ بے صبر ہو رہا تھا۔

''اس لیے کہ۔۔۔۔۔۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کہ میں نے ہدیٰ کو سچ بات بتا دی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہارا اس کا ملاپ ہو گیا۔''

صفدر یہ محسوس کر کے کہ اب کوکو اس کی ضرورت باقی نہیں' افسردہ سا ہو گیا۔

''سنو تو' نامعقول چینی! بیچ میں اتنا نہ بولو کہ میں بات ہی نہ کر سکوں۔''

وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہوا یہ کہ جیسے ہی میں واپس آئی' ہدیٰ گھر پہنچ گیا۔ چاچی جی ڈاکٹر کے پاس انجکشن لگوانے گئی ہوئی تھیں اور چاچا جی دفتر میں تھے۔اس نے مجھے اکیلے میں پا کر گھیر لیا اور لگا سوال یہ سوال کرنے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ ''مسٹر نورالہدیٰ جو میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں ہزاروں شبے رکھنے کے باوجود تم کو اکیلا پا کر یوں سوالوں پر نہ رکھ لیتی ۔۔۔۔۔۔اور اب جو تم سوال کر ہی رہے ہو تو سن لو۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر بغیر کہے سنے یہاں آ گئی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی۔''یقین ماننا یہ سن کر وہ اچھل پڑا اور پھر میں نے آہستہ آہستہ وہ وجہ بھی بتا دی۔ یہاں تک کہ وہ واقعی ہانپ سا گیا اور پھر اس نے بدقت کہا کہ میں اب بھی تمہاری بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں۔ ایسے گھروں کی لڑکیاں کبھی ایسی حرکت کرتی ہی نہیں اور جو سچ پوچھو تو تم جیسی لڑکی سے تو یہ حرکت بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔''

میں نے جواب دیا۔''بعید معلوم ہوا کرے' مگر اب تو یہ حرکت کی ہے میں نے' تم یقین کرو یا نہ کرو۔''

''اگر تم نے واقعی ایسا کیا ہے تو پھر تم کو چاہیے کہ جو ہوا سو ہوا۔ اب تم واپس جاؤ۔ میں آج ابا جی سے کہوں گا کہ وہ تم کو خود واپس پہنچا کر آئیں۔'' وہ مجھے نصیحت کرنے بیٹھ گیا۔

میں نے اس سے کہا۔''دیکھو' مسٹر نورالہدیٰ! یہ میرا اپنا معاملہ ہے تم کو میرے بیچ میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنا برا بھلا بھی خوب معلوم ہے اور میں ابھی تمہارے اس گھر میں کئی دن اور رہوں گی' خواہ تم مجھ سے بور ہو یا لڑو۔''

''کیا بولا وہ؟''

''پہلے تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بڑے زور سے ہنسا۔ کہنے لگا' بھئی! تم غضب کی مسخری اور ڈھیٹ لڑکی ہو۔ کس صفائی سے مجھے بیوقوف بنانے چلی تھیں' مگر میں بھی علی گڑھ میں پڑھتا ہوں' گیتی آرا۔۔۔۔۔۔۔سنا تم نے؟ اور وہ دوسرے کمرے میں جا کر سامان سمیٹنے لگا۔ یہ لڑکے پاکستان کے لیے ووٹنگ کی کنویسنگ کے لیے آئے ہوئے ہیں نا' اس کو اسی سہ پہر کی گاڑی سے کہیں جانا تھا۔ بھئی! وہ اپنے کام میں بری طرح مصروف ہے۔ ورنہ کچھ تو میری بات پر غور کرتا۔''

''اچھا' تو یہ لوگ رائے شماری کا کام کرنے آئے ہوئے ہیں؟''

''ارے ہاں! سچ! صفدر! بہت کام کر رہے ہیں۔ چاچا جی بتا رہے تھے کہ ان لڑکوں نے تو بس اپنی کتابیں ہاتھ میں اٹھا لیں اور کمروں میں جو کچھ سامان تھا' سب کا سب چندے میں دے دیا۔''

''مبارک ہیں' وہ لڑکے جو اپنی قوم اور وطن کے لیے ایثار کر رہے ہیں۔'' صفدر نے افسردگی سے سوچا۔'' اور ایک میں ہوں کہ

یہاں اپنے وطن سے دور ایک مشین اور بدبودار چمڑے سے دن رات سر مار رہا ہوں۔"

پھر وہ آہستگی سے بولا۔"مبارک ہو کوکو! تم کو یکسوئی تو ہو گئی۔"

"یکسوئی سی یکسوئی! سچ جانو صفدر! مجھے اب سے پہلے سچائی کی اہمیت کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ ہم سچی بات کہہ کر خواہ وہ کتنی بھیانک اور ذلیل کیوں نہ ہو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں۔"

"مگر تم ہمیشہ ہی سچ بات کہتی ہو کوکو! جب ہی تو اتنی مگن اور چڑیوں کی طرح بے فکر رہتی ہو۔" صفدر نے خاموشی سے سوچا۔۔۔۔۔۔"کون کہتا ہے جادۂ حق ناہموار اور پر خار ہے۔۔۔۔۔۔کون کہتا ہے راستی ایک اتھاہ اور بیکراں سمندر ہے ۔۔۔۔۔۔کوئی اس کوکو سے پوچھے اس اتھاہ، پرشور اور بیکراں سمندر کی تہ میں سچے موتی، مونگے اور نہ جانے کیا کیا کچھ پڑا دمک رہا ہے۔"

اور اسی آن گیتی نے مٹھی میں دبی پڑیا میں سے نکال کر کوئی چیز منہ میں رکھی۔

"سو! ہا! چٹ۔۔۔۔۔۔کھاؤ گے لیو چو؟"

"لاؤ" بے دھیانی میں اس کے ہاتھ سے وہ چیز لے کر اپنے منہ میں رکھ لی۔ نمک مرچ اور املی کھٹاس اس کے منہ میں گھل گئی۔ تمباکو نوشی کے عادی دانت سنسنا کر رہ گئے۔

"نامعقول لڑکی!" اس نے سوچا اور ہمیشہ کی طرح جھڑک کر کہا۔"املیاں کھا رہی ہو؟ بے وقوف! اتنا بھی خیال نہیں کی بیمار ہو گئیں تو ہدی اور بور ہو گا۔ پھینکو ابھی انہیں میرے سامنے۔"

مٹھی میں دبی ہوئی املیوں کی پڑیا اس نے بہتے ہوئے پانی میں پھینک دی۔

باب ۵۶

اور اب وہ اس کے عقیدے کے مطابق اس کی حفاظت اور ذمے داری میں آچکی تھی۔

قضا و قدر ہم سے مشورہ لیے بغیر بعض وقت ہمیں ایسی ذمہ داریاں سونپ دیتی ہے، جن کی ہم نے کبھی تمنا نہیں کی ہوتی اور وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔

صفدر نے میز پر پھیلے ہوئے سرخ چمڑے سے دس گیارہ سال کی بچی کے جوتے کا اپر کاٹتے ہوئے سوچا۔

''اور غلط بخشی کے طور پر ملی ہوئی ان ذمے داریوں کا نبھانا اور بھی مشکل ہوتا ہے اور مجھے تو شروع ہی سے مشیت نے ذمے داریوں کے نبھانے کے لیے تاک رکھا تھا' ورنہ۔۔۔۔۔۔۔ورنہ''

اس نے حسرت سے پیکنگ کالج کے ان درودیوار کو یاد کیا' جس میں مشکل سے وہ اپنی زندگی کا ڈیڑھ سال گزار پایا تھا۔

''کالج کے کمروں' برآمدوں اور میدان میں اب بھی اپنی مخصوص یونیفارم میں بے شمار بے فکر اور ہنستے ہوئے لڑکے کتابیں اور نوٹ بکیں بغلوں میں دبائے گھوم رہے ہوں گے' تجربہ گاہ کی میزوں پر جھکے ہوئے سائنس کے تجربے کر رہے ہوں گے' کھیل کے میدان میں جمناسٹک کے کرتب اور مختلف کھیلوں کے گر سیکھ رہے ہوں گے اور ہر سال تقسیم اسناد کے وقت سیاہ گون پہن کر بے شمار طالب علم ڈگریاں ہاتھوں میں لیے بکھر جائیں گے۔''

''اور کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے گا کہ ایک دن کالج کی اس چار دیواری سے صفدر یاسین لیو چونام کا کوئی لڑکا بحسرت و یاس فارغ التحصیل ہوئے بغیر نکل گیا تھا تاکہ وہ اپنے ماں باپ' بھائی بہنوں اور کئی رشتے داروں کی ذمہ داری کو سنبھال سکے۔''

''میں نے نہ جب اس قسم کی ذمہ داری کی تمنا کی تھی اور نہ اب اس ذمہ داری کی جو حال ہی میں مجھے سونپی گئی ہے یا خود میں نے اپنے اوپر مسلط کر لی ہے۔''

اور اب وہ اس کی طرف سے خاصا مطمئن ہو چلا تھا۔ اس نے اس کے لیے چند بڑے اچھے ٹیوشنوں کا انتظام کر دیا تھا اور ان دنوں وہ ایک چینی عیسائی لڑکی کی شرکت میں وائی ڈبلیو سی اے میں رہ رہی تھی۔ وہاں وہ سیکرٹری کا کورس بھی کر رہی تھی۔

''دھیرے دھیرے' رفتہ رفتہ میں اس کو اس پر بھی راضی کر لوں گا کہ وہ واپس گھر چلی جائے۔ ذرا غصے اور خوف کے اس جذبے میں کچھ اور کمی آ جائے۔''

اپنے حساب کتاب میں مشغول وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے اس کی سائیکل چمکی۔ برف کی طرح سفید اور سادے کپڑوں میں اس کی زرد رنگت بڑی ٹھنڈی اور پرسکون نظر آ رہی تھی۔ تھکی تھکی آنکھوں سے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔

''ارے! تم ابھی تک اپنے کام میں مشغول ہو۔''

''ہاں' کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔''

''اور وہ تمہارا ساتھی کب تک آ رہا ہے؟''

''میرا بیچارا سانگ اب کیا آئے گا' وہ بہت بیمار ہے اور اچھے ہونے کی کوئی امید نہیں۔''

''تو پھر' کیا تم کو یہ دکان مل جائے گی؟''

''توبہ کرو' میرا کیا حق ہے اس پر۔۔۔۔۔۔۔ میں تو اس کا ملازم ہوں۔ البتہ یہ خبر ہے کہ اس سال کے آخر تک اس کے بڑے بھائی کا لڑکا آ کر کاروبار سنبھال لے گا۔''

''اور پھر تمہارا کیا بنے گا لیو چو۔۔۔۔۔۔۔؟''

''میرا۔۔۔۔۔۔۔ میرا وہی بنے گا جو ہمیشہ سے بنا ہوا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''یہ تو کہو' آج ادھر کیسے نکل آئیں؟''

''بس ایسے ہی دل گھبرایا تو ادھر آ گئی۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''کیوں؟ دل کیوں گھبرایا؟ کیا گھر یاد آ رہا ہے؟'' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل کا چور پکڑنے کی کوشش کی۔

اس نے آنکھیں جھپکائیں اور بات ٹال گئی۔

''میں کل چاچا جی کے ہاں گئی تھی۔''

''اچھا!'' اس کا بات ٹال جانا اس کو اچھا نہ لگا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ گھر کا ذکر کر کے اب وہ اس کو راہ پر لانے کی کوشش کرے گا۔

''ہدیٰ واپس چلا گیا۔''

''کہاں؟''

''علی گڑھ۔۔۔۔۔۔۔ چاچی جی اداس ہو رہی تھیں۔''

''ہاں' یہ تو ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہر ماں اپنے بچے کی جدائی پر اداس ہوتی ہے۔'' صفدر نے رقمیں جوڑتے جوڑتے پنسل رکھ دی اور معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری ماں بھی تو اداس ہوتی ہوگی' جب تم یہاں آتے ہو گے؟''

''کیوں نہیں' پچھلی مرتبہ جب میں واپس آ رہا تھا تو تین دن پہلے سے اس نے میرے قریب اٹھنا بیٹھنا ختم کر دیا تھا اور ضرورتاً بلکہ میرے کسی سوال کے جواب میں ہی بات کرتی تھی اور جب میرے باپ کی بوڑھی خالہ نے اس رویے پر ٹوکا کہ ایک تو وہ جا رہا ہے' دیکھو' کب واپس آتا ہے اب' اور تم نے اس سے بات چیت تک ترک کر رکھی ہے تو اس نے جواب دیا تھا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ

جب وہ یہاں سے جائے تو اس کو میری محبت' میری باتیں اور میرا خیال یاد نہ آئے۔ بس اللہ کا مال ہے' جہاں رہے خوش رہے ۔۔۔۔۔۔اور پھر جذبات سے عاری چہرہ لیے صحن میں بیٹھ کر چاول صاف کرنے لگی تھی۔''

گیتی نے سر جھکا لیا' اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

اچانک ہی صفدر نے سوال کیا۔ ''کوکو! تمہارا بڑا بھائی بھی تو فرنٹ پر گیا ہوا ہے۔''

''ہاں صفدر'' وہ آہستہ سے بولی۔ وہ اچانک ہی افسردہ سی ہو گئی تھی۔

''کچھ خیر خبر بھی معلوم ہوئی اس کی؟''

''جب میں آئی تھی' اس وقت تک تو نہیں ہو سکی تھی۔'' اتنے دن میں میرے سامنے صرف ایک خط آیا تھا۔ وہ بھی بہت دن کا چلا ہوا۔''

''تمہارے اس بھائی کو میں نے صرف ایک دفعہ دیکھا ہے۔ لیکن مجھے وہ بڑا اچھا لگا۔ سچ مچ بڑا آدمی لگتا ہے اور بڑا خوبصورت ہے۔''

''صفدر! تم نے میرے دوسرے بھائی کو نہیں دیکھا' وہ بھی بڑے اچھے ہیں اور اب تو اتنے ذمہ دار ہو گئے ہیں کہ۔۔۔۔۔۔''

''تمہارے اس بھائی کی شکل کس سے ملتی ہے۔۔۔۔۔۔ کہیں تم سے تو نہیں؟''

''مجھ سے تو کوئی بھی نہیں ملتا۔ میرے گھر بھر میں بختیار بھیا اور میں تو بالکل اپنی شکل ہیں۔ ان کا رنگ ہم سب میں کم ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ بڑے بھیا سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔''

''اچھی تو تمہاری وہ بہن بھی ہیں' کیا نام ہے تمہاری جڑواں کا؟''

''ارجمند''

''بھئی! تم سب کے نام بہت مشکل ہیں اور وہ کیا نام ہے' تمہاری بڑی بہن کا؟''

''صولت'' اس نے ذرا رک کر کہا۔

''اب کتنے بچے ہیں ان کے؟''

''دو''

''لڑکے ہی ہیں؟''

''بڑی لڑکی ہے اور دوسرا لڑکا۔''

''بہت پیارے بچے ہوں گے۔''

''ہاں! اور اعظم جس کو ہم گڈو کہتے ہیں' وہ تو بہت پیارا ہے۔''

وہ بڑے مزے میں اس کی باتوں اور شرارتوں کا ذکر کرنے لگی جیسے اس کا اور ان بچوں کی ماں کا کوئی بگاڑ ہی نہ ہو۔

صفدر نے پنسل رکھ دی تھی اور رجسٹر بند کر دیا تھا۔ وہ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اور جب دکان کی صفائی کرنے والا چھوٹا لڑکا اندر داخل ہوا تو صفدر نے اس سے چائے لانے کو کہا۔

''اچھا! اب میں چلوں؟'' وہ اپنی بات ختم کر کے بولی۔

''اگر۔۔۔۔۔۔اگر تم کچھ خیال نہ کرو۔۔۔۔۔۔۔'' وہ جھجکا۔ ''تو چائے آ رہی ہے' چائے پی کر چلی جاؤ۔'' پھر وہ کچھ رک کر بولا۔

''تم کچھ خیال تو نہیں کرو گی؟ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔''

''ہاں' میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں۔'' گیتی نے سوچا۔ ''ایک بڑے گھرانے کی لڑکی کو ایک معمولی سے دکان والے کا چائے پلانا تو سخت معیوب بات ہوئی اور تم چائے پینے کی صلاح کر کے خود ہی نادم بھی ہو رہے ہو۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تم نے اس لڑکی کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ تم ہمیشہ ہی میرے آڑے آئے ہو لیو چو! اب بھی اور جب مجھے تمہاری کوئی خاص ضرورت نہیں تھی جب بھی' مجھے تمہارا جلتی دوپہر میں سانگ سے چھپ کر ہسپتال آنا کبھی نہ بھولے گا جب تم محض میری دلداری کی خاطر ہر روز آتے تھے اور محض میری خاطر چچی جان کے لیے پان' چھالیہ اور برف جیسے سودے جلتی دوپہر میں لا کر دیا کرتے تھے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس ہماری دنیا کے خود ساختہ اصولوں میں اتنے بہت سے خلوص' نیکی اور محبت کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر ہے تو حفظ مراتب کی اور طبقوں کی۔''

اس کی سوچ اور خیال کی رفتار تیز تھی اور زبان کاہل۔ ان تمام باتوں میں سے ایک لفظ بھی وہ اپنی زبان سے نہ نکال سکی۔ جو سچ پوچھو تو ایسی باتیں انسان کہا بھی کب کرتا ہے۔

صفدر کے ان جانے میں اس نے اتنا سب کچھ سوچا اور بولی۔ ''نہیں' کوئی بات نہیں۔ اچھا' میں چائے پی کر ہی چلی جاتی ہوں۔''

وہ دوبارہ اچک کر کاؤنٹر کے بائیں طرف رکھے ہوئے اونچے سٹول پر بیٹھ گئی۔

''یہ تم کس کا جوتا کاٹ رہے تھے؟'' اس نے سرخ چمڑے پر رکھی ہوئی قینچی دیکھ کر کہا۔

''ایک بچی کا ہے۔''

''سوچتی ہوں کہ اب میں بھی جوتے بنانا سیکھ لوں۔'' اس نے مذاق میں کہا۔

''کیوں؟ کیا جوتے بنانا اس قدر دلچسپ کام ہے؟''

''سارے کام دلچسپ ہوتے ہیں' میں جب چھوٹی تھی تو بڑھئی' جو ہمارے گھر میں کام کر رہا تھا' اس سے ہر وقت لڑا کرتی تھی کہ لاؤ' آری مجھے دے دو۔ میں لکڑی کاٹ دوں۔ مشکل کیا ہے' مجھے رندا کرنا سکھاؤ۔''

''پھر تو جوتے بنانے کے بجائے تم مجھ سے پینٹنگ ہی سیکھ لو۔''

''ارے ہاں' بھئی! تم بڑے نکلے ہو۔ نہ تو مجھے اپنی زبان سکھائی اور نہ پینٹنگ۔''

وہ اس مزے سے بیٹھی نیم مزاحیہ انداز میں باتیں کر رہی تھی کہ صفدر وہ ساری ندامت بھول گیا جو اس کو چائے چائے پینے کی دعوت دے کر اس پر طاری ہوئی تھی۔

لڑکا چائے لے کر آیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑے اہتمام سے چائے بنائی اور بڑے احترام سے سر جھکا کر پیالی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی' جیسے وہ اس کا خادم ہو۔

اور جب وہ جا چکی تو صفدر یاسین نے سوچا۔ ''تمہارے وجود اور شخصیت میں کیا بات ہے' تم جہاں کہیں ہوتی ہو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہاں سکون' طمانیت اور معصومیت کے سوا کچھ نہیں۔''

اور آج یہ انکشاف بھی بہت امید افزا تھا کہ وہ اپنے گھر اور گھر والوں کا ذکر اتنے جوش اور محبت سے کرتی رہی تھی۔

''ارے! اس کا دل تو سونا ہے سونا!'' اس نے سوچا اور اپنے گاہکوں سے جھک جھک کر مشغول ہو گیا۔

باب ۵۷

اگست کی یہ شام نسبتاً خنک اور خوشگوار تھی۔ وائی ڈبلیو سی اے کی اقامت گاہ بھی قدرے خاموش اور سونی سونی ہو رہی تھی۔ زیادہ تر لڑکیوں کی اپنے دوستوں سے اپوائنٹمنٹ ہوتی تھی اور وہ چار بجے ہی سے نہا دھو کر سج دھج کر ان کے انتظار میں گیٹ کے قریب ٹہلتیں یا لان پر پڑی اکا دکا بنچوں پر بیٹھ کر وقت گزاری کے لیے ناولوں کے سستے ایڈیشنوں میں غرق ہو جانے کی کوشش کرتیں۔

کچھ لڑکیاں اور خواتین باہر سے بیڈمنٹن کھیلنے آتیں اور اس وقت تک کھیلتی رہتی تھیں' جب لکڑی کے اونچے اونچے کھمبوں میں لگے ہوئے بلب جلا دیئے جاتے۔

گیتی کی چینی روم میٹ' مارگریٹ کی ڈیوٹی جن دنوں شام کی ہوتی تھی تو وہ اکیلی رہ جاتی تھی اور ایسی شاموں کو وہ یا تو چاچا جی کے

یہاں پہنچ لیتی یا پھر اپنے ہی کمرے میں لیٹی کتاب پڑھتی رہتی۔ اب وہ پہلے کی طرح لاابالی نہ رہی تھی کہ کمرہ بھی ٹھیک کر کے نہ رکھتی۔ پڑھتے پڑھتے اچانک ہی اس کو خیال آتا تو وہ کتاب پھینک کر اٹھ کھڑی ہوتی اور اپنی مارگریٹ کی پھیلائی اور بکھیری ہوئی چیزوں کو سمیٹ کر ترتیب سے رکھتی۔ کھڑکیوں کے پردے سرکاتی اور جمعدار کو آواز دے کر غسل خانے میں خشک ٹائلی لگواتی اور پھر بوڑھی مسز بنجامن کے کمرے میں جا بیٹھتی۔ مسز بنجامن کے فیل پا تھا۔ وہ اپنے کسے ہوئے موٹے موٹے پیروں کا ہر روز اک نیا دکھڑا رونے کو تیار بیٹھی ہوتی۔ گیتی بڑے انہماک اور دلچسپی سے اس کی ہر بات سنتی اور پھر سوچتی۔ ''یہ دوسروں کے دکھ بھی تو ایک نعمت ہوتے ہیں۔ انسان ان میں کھو کر اپنے دکھ بھول جاتا ہے اور وہ لوگ کتنے ظالم ہوتے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو کوئی دکھ نہیں۔ ان کا کوئی مسئلہ نہیں اور وہ بہت مگن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں ایک دکھیا انسان اکیلا ہی کڑھتا رہے اور اس معاملے میں یہ مسز بنجامن کتنی سخی ہے۔ آپ کے سامنے اپنے سارے دکھ بکھیر دیتی ہے' جن کے ہجوم میں اپنے سارے دکھ کھوئے جاتے ہیں۔

کامن روم سے پیانو پر بجتی ہوئی نرم نرم غمناک گت کی آواز چلی آ رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں تحلیل ہونے کی بجائے نغمے ٹھہر گئے ہوں۔

''کاش! وقت کے لمحات اور فضا میں بکھری ہوئی ہر آواز ہمیشہ کے لیے ٹھہر جایا کرتی۔''

گیتی نے کتاب میز پر ڈال دی۔

''مگر کیوں؟ میں نے یہ خواہش کیوں کی؟ آخر مجھے کن لمحات کی تلاش ہے؟''

اس نے خود سے سوال کیا اور دھیرے دھیرے کھڑکی کے پردے کو سرکایا۔ جالی کے پیچھے چنبیلی اور مالتی کی بیلوں کی الجھی ہوئی شاخوں نے ایک سبز گنبد سا بنا رکھا تھا اور اس کے عقب میں شہتوت' جامن اور پیپل کے درخت بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ شام کے جھٹ پٹے میں ہر چیز کتنی افسردہ اور تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔

مارگریٹ اس وقت اسٹرینجرز ہوم کے نرسری وارڈ میں ان بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگی جو جنگ کی کھیتی ہیں۔ جن کا کبھی کوئی گھر ہوگا اور نہ کنبہ۔ جن کے لیے اپنی ماؤں کے گداز اور توجہ بھرے لمس کا لطف ممنوع ہے۔ جن کی مائیں ان کے وجود کو بھول جانے کی کوشش میں ویکائیوں کی وردیوں میں ملبوس پوری تندہی اور نظم وضبط کے ساتھ لڑنے والوں کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہوں گی۔

اور یہ مارگریٹ اس کام کے لیے کتنی موزوں ہے۔ وہ خاموش بردبار ذمے دار اور زرد رو ہے۔ اس کی آنکھیں اور بال گہرے

سیاہ ہیں۔اس کے اندر ماؤں کی سی توجہ اور قوت برداشت ہے۔

مارگریٹ چینی تھی اور اسٹر ینجرز ہوم کی انچارج کی سیکرٹری تھی۔ گیتی کے ساتھ اس کا رویہ اور سلوک وہی تھا جو اپنی حفاظت میں دیئے ہوئے چھوٹے سے بچے کے ساتھ ہو سکتا ہے۔صفدر لیو چو کی اس کو یہی خاص ہدایت تھی اور پھر وہ اپنی طبیعت کی نرمی اور فطری ہمدردی سے بھی مجبور تھی۔وہ خاموش تھی' لیکن کبھی کبھی سکوت اور خاموشی سے نکل کر باتونی بھی ہو جاتی تھی۔

آج وہ نہیں تھی تو گیتی کو اس کا انتظار تھا۔وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس سے اتنی باتیں کرے اتنی باتیں کرے کہ وہ اپنا اگلا پچھلا سب کچھ بھول جائے۔آج وہ اپنے دل سے خوفزدہ تھی اور اس کے ساتھ تنہا نہ رہنا چاہتی تھی۔اس لیے کہ آج کی وحشت' اکتاہٹ اور اس سے متعلق ذہن میں بار بار اٹھنے والے سوالوں کا جواب اس کے دل نے نہایت گستاخی اور بے باکی سے یکمشت دے دیا تھا۔

گویا دل نے یوں کہا تھا۔

''گیتی آرا بیگم! تم مجھے خواہ کتنا ہی مجبور کرو اور اخفائے راز کی کتنی ہی تاکید کیوں نہ کرو'اب میں مزید برداشت کرنے سے معذور ہوں۔اور آج میں اس بات کا انکشاف کئے بغیر نہ رہوں گا کہ تم کو گھر یاد آرہا ہے اور اس کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔''

گیتی میں اب مدافعت اور کسی کو جھٹلانے کی قوت بھی باقی نہ تھی۔اس نے بے بسی سے اپنا سر میز پر لٹکا دیا اور آنسوؤں کو بلا تکلف بہنے دیا۔گھر کے ہر فرد کے متعلق اس کا دل طرح طرح کے واہموں اور وسوسوں سے معمور تھا۔

اور بوڑھی مسز بنجامن اپنے فیل پا سے بیزار چندیا کے عین وسط میں ٹوکرے کے نیچے رکھنے والی اینڈوی کی شکل کا جوڑا بنائے اور اپنی الو کی سی گول گول آنکھوں پر عینک جمائے سوچ رہی تھی۔

''جانے آج دو دن سے وہ لڑکی ادھر کیوں نہیں آئی؟ وہ آتی ہے تو اس سے بات کر کے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔''

اپنے دکھوں' غلطیوں اور لغزشوں کو کسی ایسے شخص کو سنا کر' جو ہمیں الزام دینے اور عقل سکھانے نہ بیٹھ جائے' کتنا سکون ملتا ہے۔

باب ۵۸

''تو سنا تم نے۔۔۔۔۔۔۔جنگ ختم ہو گئی۔'' گیتی نے صبح صبح اخبار نیچا کر کے مارگریٹ سے کہا۔

''ہاں' یہ خبر رات مجھے اپنی ڈیوٹی پر ہی معلوم ہو گئی تھی۔'' اس نے بال درست کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''عجب مٹی طبیعت کی عورت ہے یہ بھی۔صبح سے منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھی ہے' جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔بارش بھی برستے برستے تھم جاتی ہے توانسان ایک دوسرے کو بتاتے ضرور ہیں۔'' گیتی کو مارگریٹ کی کم سخنی پر سخت کوفت ہوئی۔

''پر مجھے تو اب معلوم ہوا کہ لڑائی بند ہوگئی۔''

''کل تم سویرے سے سو جو گئی تھیں' ورنہ تم کو بھی اسی وقت معلوم ہو جاتا۔'' مارگریٹ کی آواز اب بھی ویسی ہی سپاٹ اور دھیمی تھی۔

''تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں جلدی سو گئی تھی؟''

''مجھے معلوم ہے۔۔۔۔۔۔۔اور یہ بھی معلوم ہے کہ کل شام تم روتی رہی ہو۔''

''تم سے کس نے کہا؟''

''مجھ سے۔۔۔۔۔۔؟'' مارگریٹ نے برش ہاتھ سے رکھ کر کھڑکی کے باہر نظر آتے ہوئے مسز بنجامن کے کمرے کی طرف ایک نظر دیکھا اور بولی۔''بس کسی سے معلوم ہو گیا۔''

''اچھا' خیر۔۔۔۔۔۔'' اس نے بات ٹالی۔''تو تم کو خوشی نہیں ہو رہی کہ لڑائی بند ہو گئی؟'' اس کی آواز میں بچوں کی سی خوشی تھی۔

''لڑائی بند ہوگئی تو مجھے کیا' میرے وطن کا بحران اور کشمکش ختم ہو تو بات بھی ہے۔اور یوں لڑائی کا بند ہو جانا ہی کون سی خوبی کی بات ہے۔تم دیکھ لینا' بے شمار محکمے جو وقتی طور پر قائم ہو گئے تھے' بند ہو جائیں گے اور بے روزگاری بے تحاشا بڑھ جائے گی اور نہ جانے کیا کیا ہو۔''

''نہ جانے کیا کیا ہو'' یہ لفظ مارگریٹ نے خالص مشرقی عورتوں کے سے وہمی اور پر اسرار لہجے میں کہے تھے۔

گیتی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔''یہ مارگریٹ کم بخت ایسی ہی ہے۔کہانیاں سنائے گی تو ایسی چڑیلوں' بدروحوں اور بھوت پریتوں کی کہ دل دہل جائے۔بالکل ایسی ہی وحشت ناک اور ڈراؤنی کہانیاں جیسی دادی اماں کے یہاں جو گاؤں والی نانی رہتی تھیں' وہی کامنی کی نانی' وہ سناتی تھیں۔

''کامنی۔۔۔۔۔۔!'' گیتی کا خیال پھر بھٹکنے لگا۔''کامنی جو مسعود کی منگیتر تھی۔'' اور اس نے فوراً اس خیال کو لگام دی۔''مگر مارگریٹ تم تو عیسائی ہو' تم کو تو لڑائی ختم ہونے پر خوش ہونا چاہیے۔الٹا تم اپنے وطن کی کشمکش کا دکھڑا لے کر بیٹھ گئیں۔''

''گیتی! میں عیسائی ہوں تو کیا ہوا' یہ لڑائی عیسائیت کی لڑائی تو نہ تھی اور میں اپنے وطن کے مسائل کو کیسے بھول جاؤں؟ جیسے اور

لوگ بھول گئے ہیں' جیسے صفدر یاسین بھول گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔تم صفدر یاسین کو نہیں سمجھ پاؤ گی کبھی۔'' وہ ہنسی۔

''میں۔۔۔۔۔۔؟'' گیتی کو اس کی یہ بات بری لگی۔'' پتہ ہے' میں اس کو کب سے جانتی ہوں؟ جب میں بالکل چھوٹی سی تھی۔ اور تم نے تو اب جانا ہے' کچھ دن سے اس کو۔''

''کبھی سے جانا کرو۔'' وہ بال سنوار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں شناسائی کی ایک خاص چمک تھی۔

''جیسے وہ کہتی ہو۔۔۔۔۔۔۔تم کیا جانو اس کو' اجنبی دیس کی لڑکی! میں اس کی ہم وطن ہوں' اس کی زبان سمجھتی ہوں' اس کے عقیدوں سے واقف ہوں' اس کے اور میرے مسائل ایک ہیں اور یہ کتنی بڑی بات ہے۔''

اور پھر وہ ایک خاص انداز میں اس کے سامنے ذرا سا جھک کر بولی۔''مگر ہاں' میں ایک وجہ سے خوش ہوں کہ لڑائی ختم ہو گئی۔ اس لیے کہ میری چھوٹی کوکو کا بھائی اب واپس آجائے گا۔ جس کا ذکر کر کے بعض وقت وہ بہت غمگین ہو جاتی ہے۔''

''یہ صفدر کی نقل میں مجھے کوکو کیوں کہتی ہے؟'' وہ جھلائی اور بولی۔''ہاں' اور بھی بہت سے سپاہی اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔''

''بشرطیکہ وہ زندہ ہوں۔'' بے خیالی میں مارگریٹ کے منہ سے نکل گیا۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ کوکو کا خوشی سے تمتمایا ہوا چہرہ اچانک ہی اتر گیا۔ اس نے مضبوطی سے دونوں ہونٹ بھینچ لیے۔

''اچھا! تو یہ صبح صبح جنگ ختم ہونے کی خبر سے یوں خوش تھی۔'' مارگریٹ کو اچانک ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔''میں نے ناحق ہی اتنی تشویشناک بات کہہ دی۔'' اس نے سوچا اور پھر بات بنائی۔''تو پھر تم کو پارٹی کھلاؤ گی نا؟ مجھ کو' صفدر اور مسز بنجامن کو۔۔۔۔۔۔ بس اب وہ جلد واپس آئیں گے۔''

''بشرطیکہ وہ زندہ ہوں۔۔۔۔۔۔۔بشرطیکہ وہ زندہ ہوں۔''

گیتی کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ اس نے مارگریٹ کی بات کا جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا اور اپنے گداز ہاتھوں کی نرم نرم ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر چپ چاپ آنسو بہانے لگی۔

باب ۵۹

اس نے مشین کا پرزہ پرزہ کستے کستے چھوڑ دیا اور تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ کل شام بھی روتی رہی اور پھر آج صبح بھی اس قدر روئی اور پھر تم اس کو تنہا چھوڑ کر نکل بھی آئیں۔''

صفدر کی آواز میں ملامت تھی۔

''مگر صفدر! یہ میری چھٹی کا دن تھا۔ میں کتنے دن سے اس طرف نہیں آئی تھی' مجھے کتنے ہی دن سے لی فان کی گھر والی بلا رہی تھی۔''

''لیکن وہ پریشان تھی اور تنہا'' اس کی آواز میں مزید ملامت تھی۔

''پھر میں کیا کروں؟ وہ بچہ تو نہیں۔''

''بچہ ہی تو ہے۔''

وہ چڑ گئی۔ ''اچھا' صفدر! خدا حافظ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اب کبھی بھی بات کے موڈ میں نہیں ہوتے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔'' وہ دوبارہ پرزے کو کسنے لگا۔

وہ کارخانے سے نکل کر گلی میں اتری اور لی فاں کے گھر کی طرف مڑتے ہوئے اس نے سوچا۔ ''پتہ نہیں' کیا بات ہے! صفدر کو ہوا کیا ہے؟ یا اس نے سوچا کیا ہے؟''

اور جب صفدر کھانا کھانے وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مارگریٹ مزے سے بانس کی نیچی سی کرسی پر لی فان کے سب سے چھوٹے لڑکے کو لیے بیٹھی ہے۔ چھوٹی سی تین سال کی بچی' جس کے کانوں کے بالکل ساتھ چھوٹی چھوٹی چوٹیاں گندھی تھیں' مارگریٹ سے بالکل چپکی بیٹھی تھی اور وہ اس کو بڑے شدومد سے کہانی سنا رہی تھی۔ صفدر کو دیکھ کر اس نے منہ پھلا لیا اور کہانی میں انہماک اور بھی بڑھ گیا۔

''اسٹرینجرز ہوم کے بچوں سے دل نہیں بھرتا جو یہاں بھی آ کر بچوں کے سوا کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں ہوتیں؟''

صفدر نے اس کو چھیڑا۔ مگر وہ بدستور زوئی کے ساتھ مشغول رہی۔

لی فاں کی بیگم قریب سے گزری تو مارگریٹ نے کہا۔

''میں اگلی دفعہ زوئی کے لیے ایک چھوٹا پوڈل لا رہی ہوں۔''

زوئی کی ماں ٹھٹھک گئی۔ ''مارگریٹ! یہ بچے شریر ہیں' اس کو جان سے مار ڈالیں گے۔''

''نہیں' میں سمجھاؤں گی۔۔۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں کریں گے۔''

''مگر۔۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔۔'' زوئی کی ماں ہکلائی۔

''صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ کتا لانے کی ضرورت نہیں۔ مسلمان کتے نہیں پالتے۔'' صفدر نے ہنس کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''کیوں'' مارگریٹ نے جیسے زوئی سے سوال کیا۔

''اس لیے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے' وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔''

''چلو ہٹو! بڑے تم پکے مسلمان ہونا۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے' کتامت لانا اس گھر میں۔۔۔۔۔۔۔زوئی! تم ہرگز نہ لینا' مارگریٹ کا کیا ہے' یہ تو عیسائی ہے۔''

غصے کے باوجود مارگریٹ کو ہنسی آ گئی۔

کھانے کے وقت صفدر نے بڑے مزے دار لطیفے سنائے اور سب کو ہنساتا رہا اور مارگریٹ کو محسوس ہوا کہ اس کی چھٹی کا یہ دن اچھا گزر گیا۔

اور اس ہفتے جب وہ اس کی دکان پر آئی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے زیادہ مغموم اور پریشان نظر آ رہی تھی۔

''اب تمہارا کورس کیسا چل رہا ہے؟'' صفدر نے اس سے پوچھا۔

''ٹھیک چل رہا ہے۔ انسٹرکٹر کا خیال ہے کہ میں عام لڑکیوں سے زیادہ تیزی سے ترقی کر رہی ہوں۔''

''ہوں!'' صفدر نے اس کی اداس آنکھوں کی طرف دیکھا۔ ''یہ چھوٹی چھوٹی کالی کالی آنکھیں اداس ہو کر کتنی دلچسپ نظر آتی ہیں۔''

اس نے سوچا اور پھر پوچھا۔ ''آج تم اداس کیوں ہو؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کا سوال ہے صفدر!'' وہ ہنسی۔ ''میرے ہی جیسے لوگ تو اداس ہوا کرتے ہیں۔''

''مگر تم اس دن روئی کیوں تھی؟''

''مارگریٹ نے تم کو بتایا ہوگا۔'' وہ بے پروائی سے باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ ''مارگریٹ میں یہ تو بری عادت ہے' بات ادھر سے ادھر پھیلاتی پھرتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے' مگر وجہ کیا تھی؟''

''پھر وہی' وجہ کیا تھی؟ اداس کیوں ہوں؟'' وہ جھنجھلائی۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بے شمار وجوہات ہوتی ہیں ان باتوں کی۔''

بہت دن کے بعد وہ ایسے لہجے میں بولی تھی جو ایک بڑے گھر کی لڑکی کے شایان شان ہوتا ہے اور یہ بات صفدر کو بڑی اچھی لگی تھی۔

''اچھا بھئی! اب نہیں پوچھوں گا۔'' وہ واپس اس میز کے پاس جا کھڑا ہوا' جس پر وہ چمڑا پھیلائے اپر کاٹ رہا تھا۔

''ارے بھئی! خود مارگریٹ نے ہی تو میرے رونے کا سامان کیا تھا۔'' اس نے صلح جویانہ لہجے میں کہا۔

''صفدر! لڑائی ختم ہوگئی ہے نا' میں اس لیے خوش ہو رہی تھی کہ اب تو بڑے بھیا واپس آجائیں گے اور ان ہی جیسے بہت سے لوگ ۔۔۔۔۔۔تو بڑے بھیا کا نام سن کر تو وہ خاموش رہی' لیکن دوسرے لوگوں کے نام پر پھوٹ سے بولی۔''بشرطیکہ وہ زندہ ہوں۔'' میرے دل میں یہی وہم سما گیا ہے کہ بشرطیکہ بڑے بھیا بھی زندہ ہوں اور صفدر! اگر ایسا ہوا تو میری ماں مرجائے گی۔ اس کی پریشانیوں اور دکھوں کی حد ہو چکی ہے۔کون سا غم ہے جو خدا نے اس کو نہ دیا ہو۔'' اس کی آواز سپاٹ ہونے کے باوجود بڑی دکھی تھی۔

''ہاں' کچھ خدا کے دیئے غم ہوتے ہیں اور کچھ متعلقین کے' بیچ کو کوا! ایسا انسان بڑا مظلوم اور قابل رحم ہوتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' اس کا سر آج پھر جھک گیا تھا۔

اور پھر وہ دکان سے نکل آئی۔''اب میری دونوں شاگرد کمرے میں پہنچ گئی ہوں گی۔'' اس نے تیزی سے سائیکل وائی ڈبلیو سی اے کی طرف موڑلی۔

نرم نرم گہرے بھورے بالوں میں ربن باندھے اور گول مٹول چہرے کاپیوں پر جھکائے دونوں بچیوں اپنا کام کرنے میں مشغول تھیں۔

اور وہ سوچ رہی تھی۔

''لو بھلا میں صفدر کو یہ کاہے کو بتاتی کہ مجھے علاوہ اور باتوں کے یہ بھی غم ہے کہ اگلے ہفتے کالج کھل رہا ہے اور میں داخلہ نہیں لے سکتی۔''

باب ۶۰

ایک تو صولت کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ کئی دن تک یہ حالت رہی کہ وہ اٹھ کر بیٹھتی تو چکر آجاتا۔ اور کچھ ڈر اور گھبراہٹ کے مارے وہ اماں بیگم کو خط لکھنے سے کترا رہی تھی۔

ایک ہفتے تک گھر سے کسی قسم کی اطلاع کا نہ ملنا' یوں بھی پریشان کن تھا اور پریشانی میں انسان یوں بھی الٹ پلٹ خواب دیکھنے لگتا ہے۔ ان کا دل بمبئی سے اچاٹ ہونا شروع ہوگیا۔

''بھئی! میں تو اب چلی ہو جاؤں۔'' وہ گھبرا گھبرا کر بھائی اور بھاوج سے صلاح کرتیں۔

بھائی کا خیال تھا' یہ اب کی گئیں نہ معلوم کب واپس آئیں۔لڑکے کی طرف سے علیحدہ پریشان رہتی ہیں۔ لڑکے اور داماد دونوں کی

پریشانی اور ہول نے ان کو اچھا خاصا خبطی اور وہمی بنا دیا ہے۔ایسی تو یہ کبھی نہ تھیں۔

لیکن ان کی وحشت ہر گھڑی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اب کسی طرح بھی ٹھہرنے کو تیار نہ تھیں۔''میں پھر آ جاؤں گی' خدا نے خیر رکھی تو۔'' انہوں نے بھائی کو اطمینان دلایا۔

''اے کاش! دلہن' ممانی اور ماموں میاں نے کچھ دن تو ان کو اور روک لیا ہوتا۔'' اس نے نہ معلوم کس امید پر یہ سوچا تھا اور اب سامنے کھلا ہوا تار پڑا دیکھ کر اس پر خوف و اضطراب کی وہی کیفیت طاری تھی جو بچپن میں ان کی غیر موجودگی میں کوئی چھوٹی موٹی غلطی کر بیٹھنے کے بعد اس پر طاری ہوتی تھی۔

اس ذرا سی دیر میں اس نے اپنے دونوں بچوں کو بے بات کئی دفعہ جھڑکا اور مارا تھا' آیا پر خوب چلائی اور آج پہلی دفعہ اس نے دل کی گہرائیوں سے آرزو کی تھی۔''کاش! آصف جاہ اچانک واپس آ جاتا۔۔۔۔۔۔۔۔کاش! عافیت اور بے فکری کی وہ زندگی جو اس نے اسے سونپ رکھی تھی' لوٹ آتی۔اس نے بار بار اس گھڑی کو کوسا تھا' جب وہ اپنا ڈلہوزی والا گھر ولر کی میم کو کرائے پر دے کر یہاں آ گئی تھی۔ان سب کی اور خود اپنی دوسراہٹ کے خیال سے۔ایسی بھی تنہائیاں کیا تھیں اور اب یہ اچھی دوسراہٹ ہوئی۔

دھیرے دھیرے وہ گھڑی بھی آ گئی' جب اماں بیگم اسٹیشن سے گھر پہنچیں۔

یہ اپنے گھر کا سفید پتھریلا پھاٹک تھا اور خوبصورت دبیز پتوں والی ترلسی کی سیاہی مائل سبز باڑھ' باغ اور لان حسب معمول ہرا بھرا اور شاداب تھا۔کنویں کی مشین چل رہی تھی اور بھینس اپنے تھان پر ڈکرا رہی تھی۔یہ گھر مالک کے ختم ہو جانے سے چپ چاپ ضرور تھا لیکن یہاں مکمل سکون اور اپنائیت تھی۔گھر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ان کو محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے نس نس میں چبھی ہوئی سوئیاں نکال دی ہوں۔

بڑے اطمینان اور بشاشت سے وہ گھر میں داخل ہوئی تھیں اور لڑکیوں اور ملازموں کے جلو میں گھری ہوئی سیدھی اپنے کمرے میں بے داغ اور اجلی چاندنیوں والے تخت پر جا کر یوں بیٹھ گئی تھیں' جیسے کہیں گئی ہی نہ ہوں۔

پان دان میں کتھا' چونا سب تازہ بھرا ہوا تھا اور تانبے کے قلعی دار تسلے میں بھیگی ہوئی سرخ صافی میں پان لپٹے رکھے تھے اور جب شریف چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے بڑی طمانیت اور شکر گزاری سے سوچا تھا۔

''یہ بیٹیاں بھی خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔اب یہ دیکھو کہ معلوم ہوتا ہے کہ گھر سے کہیں گئی ہی نہ تھی۔''

ارجمند نے اماں کا سامان کھلوانے' ان کی لائی ہوئی چیزوں کے متعلق بے تحاشا سوال کرنے اور شریف سے بستر بند خالی ک

روانے میں منہمک ہو کے کچھ دیر کو ان کے کسی بھی سوال کی زد میں آنے سے اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔

اور صولت نے ان کے قریب بیٹھے بیٹھے اچانک ہی سیما کی ٹانگ لینا شروع کر دی تھی۔ ''اب تم پھر نکل آئیں؟ پڑھائی کے بعد نکلی ہوتیں۔ تم نے اور تمہارے بھائی نے تو مجھے دیوانہ کر رکھا ہے۔ چلو پھر تم میرے ساتھ چلو۔ تم مجھے بیٹھنے تو نہیں دو گی۔ یہ تو مجھے خوب معلوم ہے۔''

اور وہ اعظم کو گود میں اٹھائے سیما کو باقاعدہ ہنکاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی تو اسی وقت مالی نے ڈاک لا کر دی تھی۔ اماں بیگم نے پر سکون اور آسودہ چہرہ اٹھا کر مالی کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''اچھے تو ہو؟ ٹماٹر کی پود تو بٹھا دی ہو گی تم نے؟'' اور پھر انہوں نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ خط بڑی بٹیا کے کمرے میں دے آؤ۔''

انہوں نے سوچا۔ ''شکر ہے کہ آصف جاہ کا خط تو آیا۔ شہر یار کا بھی آ جائے اللہ پاک! تو میں اکٹھے نفل پڑھوں گی۔''

صولت کے کمرے سے دھیمی دھیمی ہچکیوں کی آواز بتدریج بلند چیخوں میں تبدیل ہوتی گئی۔

ان کا ہاتھ لرزا اور پیالی چھوٹ کر ان کی گود میں الٹ گئی۔ جلتی جلتی چائے نے جو چرکے لگائے تھے ان کا انہیں احساس بھی نہ ہوا۔ بدقت تمام وہ اس کے کمرے میں پہنچ پائی تھیں۔ وہ اپنی مسہری پر بے حال پڑی تھی۔ بوکھلائی، گھبرائی ارجمند اس کو سنبھالنے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھی۔

''ارے بتاؤ تو کیا ہوا۔'' متواتر غم اور پریشانی نے ان کی آنکھوں کے سوتے خشک کر دیئے تھے۔ ''کیا خبر آ گئی؟'' ان کی آواز میں لرزش البتہ تھی۔

دھیرے دھیرے ارجمند نے بات بنائی۔ ''اب تو آصف بھائی کا جب خط آتا ہے تو ان کا دل بگڑ جاتا ہے۔ آپ کے پیچھے دو مرتبہ ایسا ہی ہوا ہے۔''

اس کا دل بگڑتا چلا گیا اور اس طرح کچھ اور وقت ٹل گیا، مہلت بڑھتی گئی لیکن تابکے۔

پہلی فرصت میں شریف نے سوال کیا۔ ''چھوٹی بٹیا نہیں آئیں؟''

''اے ہاں! وہ ہے کدھر؟ اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا۔ میرے آنے پر نہ سہی، صولت کی چیخوں پر تو نکلی ہوتیں۔ خدا اس لڑکی کو عقل دے، دیکھو کیا انجام ہوتا ہے اس مزاج کا۔'' انہوں نے ارجمند سے کہا۔

''دیکھو! کیا انجام ہوتا ہے اس مزاج کا۔'' ارجمند نے دل میں دہرایا۔ ''اس مزاج کا وہی انجام ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔''

اور پھر نہ معلوم کس طرح ارجمند میں وہ ہمت اور سلیقہ پیدا ہو گیا' جس کے سہارے اس نے دھیرے دھیرے ان کو ہر بات بتا دی اور جواب میں ایک لفظ بولے بغیر انہوں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی اور سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگیں۔ ان کا چہرہ سفید تھا اور ہونٹ خشک۔ اس پر بھی وہ اپنے آپ کو سنبھالے رہیں۔ ایک بڑے گھرانے کی بیگم کے پورے رکھ رکھاؤ اور وقار کے ساتھ۔

ان کے گھٹنے تلے بختیار کا بغیر کھلا خط رکھا تھا' جس کے اندر اس نے مونوگرام والے سفید دبیز کاغذ پر بڑا پیار محبت بھرا خط لکھا تھا۔ بالکل اس انداز میں جیسے کوئی کسی غمزدہ بچی کو بہلانے کے لیے لکھے۔ اس نے لکھا تھا۔

''اماں جی! تم گھبرانا نہیں۔ ذرا بھی ضرورت محسوس کرنا تو مجھے فوراً لکھنا۔ آپ کا بیٹا اسی وقت حاضر ہو جائے گا' الف لیلہ کے جن کی طرح آپ کی پریشانی اور مشکل دور کرنے کے لیے۔ اماں جی! تم یقین کرو' میں اب وہ پہلا سا بختیار نہیں ہوں۔ اب تو میں اپنی اماں بیگم کا بیٹا اور بہنوں کا ذمہ دار بھائی ہوں۔ میرا دل ہر وقت تمہارے ہی پاس ہے اماں جانی!'' اس کا یہ آپ اور تم کا ملا جلا لاڈ بھرا طرز تخاطب ان کو اب کچھ دن سے کتنا پیارا لگنے لگا تھا۔

باب ۶۱

بہت خوب صورت' دھیمے اور ٹھہرے ہوئے زرد رنگ کی سلک پر گل داؤدی کے پھولوں والا لباس مارگریٹ فرصت کے اوقات میں ضرور پہنتی تھی۔ یہ اس کی اپنی ماں کے ہاتھوں کا تیار کیا ہوا تھا۔ اونچے گلے اور ڈھیلی ڈھالی آستینوں والے لباس کو پہن کر وہ حقائق سے یکسر دور ہو جاتی تھی اور یہ بھی کوئی خوبی کی بات ہے کہ انسان حقائق سے بے نیاز ہو جائے۔

مگر اس کا کیا کیا جائے کہ وہ کبھی کبھی دیدہ و دانستہ یہ بھول جانا چاہتی تھی کہ وہ وطن سے کوسوں دور ایک اجنبی دیس میں ویکائی کی خدمات انجام دے رہی ہے۔

اور ان دنوں وہ چھاؤنی کے پیراشوٹ ڈیپارٹمنٹ میں پیراشوٹ کے چیک کرنے' ان کو وصول کرنے اور پیک کرنے ہی کے غیر دلچسپ کام پر لگی رہی تھی۔ پھر بڑی مشکلوں سے اس ڈیپارٹمنٹ سے تبادلے کی نوبت آئی تو سپلائی میں پہنچ دی گئی۔ عام حالتوں میں دوسری ویکائیاں اس محکمے میں پہنچنا خوش قسمتی سمجھتی تھیں۔ مگر اس کا کون سا گھر ورتھا جو وہ اپنا گھر انڈوں' مکھن' دودھ کے ڈبوں اور خشک گوشت سے بھر لیتی۔ جب کہ وہاں اس کے وطن میں ماں اور دونوں چھوٹی بہنیں اس تمام عیاشی کے خواب بھی نہ دیکھ پاتی ہوں گی۔ لنڈا اور جولی جانے اب اسکول بھی جاتی ہوں گی کہ نہیں۔ سڑکوں پر بستے گلے میں ڈالے تندرست بچیوں کو اسکولوں سے آتے

جاتے دیکھ کر مارگریٹ بلاارادہ ہی سوچنے لگتی تھی اور اب خدا خدا کر کے ٹائی فائڈ جیسی لمبی بیماری جھیل کر اٹھنے کے بعد اس کی اسٹرینجرز ہوم میں تبدیلی ہوئی تھی جو اس کو گزشتہ تمام محکموں سے زیادہ دلچسپ نظر آیا تھا۔ غمزدہ اور دنیا سے دستبردار انسانوں کے قریب اٹھ بیٹھ کر اپنے غم نسبتاً ہلکے اور سہل معلوم ہوتے ہیں۔

پھر اسی دوران میں لی فاں کے کنبے کے ذریعے اس کی واقفیت لیو چو یعنی صفدر یاسین سے ہوئی تو اس نے بڑا سکون محسوس کیا۔ رفاقت اور یگانگت کے احساس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا سکون۔

اس اجنبی میں وہ بھی اس کی طرح تنہا اور بے گھر تھا۔ اور وہ تھا بھی بڑا حلیم' ہنس مکھ اور خاموش۔ اس سے ملنے کے بعد مارگریٹ کو اس بے کراں اور اتھاہ تنہائی کا احساس نہ رہا تھا۔

''صفدر یاسین' مستعد' فرض شناس اور بڑا شریف لڑکا ہے۔'' وہ جب اپنے اور صفدر کے ملنے والوں کے منہ سے یہ لفظ سنتی تو بلا وجہ ہی فخر سے اس کا سر بلند ہو جاتا۔

اور وہ تو اس کے شہر پیکنگ سے بہت دور جنوب کی رہنے والی تھی۔ نہر کے کنارے پر اس کا قصبہ تھا' جہاں بارشیں بکثرت ہوتی تھیں۔ مگر یہ سب فاصلے' زبان اور تمدن کے چھوٹے موٹے اختلاف تو وطن میں رہ کر مانے جاتے ہیں اور جب لوگ وطن سے دور ہوتے ہیں تو مذہب جیسا عظیم اور مسلمہ فرق بھی باطل ہو جاتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو' صفدر مسلمان تھا اور وہ عیسائی اور پھر بھی کتنا یگانہ اور اپنا سا معلوم ہوتا ہے۔

اور صفدر نے تو اس کو کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا کیا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس کو بعض وقت اپنا سا کیا' بالکل ہی اپنا محسوس ہوتا تھا۔ خصوصاً جب وہ فرصت کے اوقات میں چھٹی والے دن بڑے گھریلو انداز میں گل داؤدی والا زرد سلک کا لبادہ پہن کر خاص گھر گرہستنوں والے انداز میں اپنے کمرے کی درستی اور ایسے ہی چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف ہوتی تو وہ اس کو اپنے آپ سے اور بھی زیادہ قریب محسوس ہونے لگتا۔ اور جب سے اس نے بڑے یقین اور اعتماد سے اس عجیب وغریب بڑے گھر کی لڑکی کو اس کی تحویل میں دیا تھا۔ اس وقت سے تو وہ اس پر اپنا قطعی دعویٰ سمجھنے لگی تھی۔ انسان ہر کسی کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا کرتا۔

اس کے نرم نرم' چھوٹے چھوٹے اور گداز ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں گلدان میں لگے ہوئے پھولوں کی درستی میں سستی سے مصروف تھیں اور دماغ تیزی سے سوچنے میں محو۔

''چاہے کوئی بات بھی ہو' مگر صفدر اس کا اتنا خیال کرے ہی کیوں؟ یہی بات تو بس ناقابل برداشت ہے۔ جو صفدر کا بچہ نہ بھی ہوتا

تو بھی میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگتی۔ سیدھی سادی بے مطلب لڑکی! اتنے دن میں کبھی بھی تو کسی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ لیکن یہی کیا کم تھا کہ اس دن چھٹی گزارنے میں وہاں پہنچی تو اس کے ذکر نے صفدر کا سارا موڈ خراب کر دیا۔ اتنا بھی کیا کسی غیر لڑکی کے لیے غلطاں ہونا۔ دراصل صفدر کے دل میں ابھی میرا خیال ہی پیدا نہیں ہوا ٹھیک ہے۔''

وہ رنجیدہ ہو گئی اور کوکو کی طرف سے دل میں کدورت آ گئی۔ ''میں تو اب یہ کرتی ہوں کہ اس سے کہتی ہوں کہ بھئی! تم تو مسز بنجامن کے کمرے میں چلی جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔۔۔ مگر پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ صفدر قطعی ناراض ہو جائے گا مجھ سے۔ وہ اس کی مہمان ہے۔''

اور مارگریٹ اسی الجھن میں غلطاں ہو گئی۔

دھیرے سے دروازہ کھلا اور وہ اپنی شارٹ ہینڈ اور بک کیپنگ کی کتابیں اور کاپیاں ہاتھ میں لیے اندر آ گئی۔ وہ تھکی ہوئی اور زردرو نظر آ رہی تھی۔ چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد بے خوابی کے سیاہ حلقے تھے۔

اچانک ہی مارگریٹ کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ کمرہ چھوڑ دینے کے نوٹس اور مسز بنجامن کے کمرے میں جا کر رہنے کا مشورہ تو ایک طرف اُس کا دل چاہا کہ اس کے دکھیا وجود کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لے۔ اس کے منتشر بالوں کو اپنے ہاتھوں سے برابر کرنے زرد پیشانی اور افسردہ آنکھوں کو چوم کر اس کو دلاسا دے لیکن اتنے کھلم کھلا اور اتنی بہت سی نیکی کرتے بھی تو انسان کو غیرت آتی ہے۔ وہ نہ جانے کیوں اپنے پگھلتے ہوئے دل کا تماشا خود اس کو بھی دکھاتے گھبراتا ہے۔ جس سے ہمدردی کی آنچ اس کے دل کو پگھلاتی ہے۔

وہ اپنی جگہ سے ہلے بغیر تاسف کی نظر سے اس کو دیکھ کر بولی۔

''تم تو بہت ہی تھکی ہوئی اور زرد نظر آ رہی ہو۔ اتنی محنت تو نہ کیا کرو۔''

اور اب گیتی کا دل بھی اس حد تک رقیق ہو گیا تھا کہ خیال اور محبت کا ایک جملہ بھی اس کی سیاہ پلکوں کو بھگو دیا کرتا تھا۔

''اب نہیں کیا کروں گی۔'' اس نے سپردگی اور مجبوری کے عالم میں کہا اور اپنی قدیم عادت کے مطابق لاابالی انداز میں کتابیں میز پر ڈال دیں اور پھر فوراً ہی سنبھل کر ان کو اٹھایا اور قرینے سے اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

''مس صاحب جی! آپ کا ٹیلیفون!'' دفتر کے چپراسی نے مارگریٹ کو اطلاع دی۔

''اونہہ! آ گیا معلوم ہوتا ہے ایمرجنسی بلاوا۔'' وہ جز بز ہوتی ہوئی اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم بے دلی سے اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل

گئی۔

اس کو یقین بھی نہ آ رہا تھا کہ ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر سے سنائی دینے والی آواز صفدر کی تھی۔

''مارگریٹ! یہ میں صفدر بول رہا ہوں۔''

''ارے ہیلو ہیلو چو!'' مارگریٹ نے مارے یگانگت کے فوراً چینی بولنا شروع کر دی۔ ''کہو کیا ہے؟''

''اس دن تمہاری چھٹی تھی' پھر نہ معلوم ہم میں سے کس کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ تمہارے ساتھ جو سینما کا پروگرام بنا تھا' رہ گیا۔ اس دن کے بدلے میں تمہیں آج دکھا سکتا ہوں۔ بولو' تیار ہو؟''

صفدر کی آواز دوسرے سرے پر چہچہا رہی تھی اور وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ وہ اس کے اچھے موڈ کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو اس کو سدا خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

''کیوں۔۔۔۔۔۔کیا سوچ رہی ہو؟'' صفدر کی آواز کا جوش کم ہو چکا تھا۔

''نہیں تو' کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ مجھے لینے آؤ گے یا پھر میں تمہیں کہاں آ کر ملوں؟''

''میں تمہیں وہیں آ کر لے جاؤں گا' پلازہ ہی تک تو چلنا ہے۔''

خوشی اور دل کی دھڑکنوں سے بولا کہ اس نے رسیور بھی پوری واپس نہ لگایا اور تیار ہونے کے لیے کمرے کی طرف چل دی۔ جی تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ بس اسی زرد سلک کے لباس میں اس کے ساتھ سینما جائے۔ مگر خیر' کپڑے تو بدلنا ہی پڑیں گے۔

بڑی پھرتی سے اس کو تیاری میں مصروف دیکھ کر گیتی نے پوچھا۔

''کدھر کی تیاریاں ہیں؟''

''سینما کی' صفدر مجھے لینے آ رہا ہے۔'' وہ اپنے چھوٹے چھوٹے چمکدار سیاہ بالوں میں برش کرتے ہوئے بولی۔

''چلو' اچھا ہے' تم سینما دیکھ آؤ۔ کئی دن سے تو تم یوں نظر آ رہی ہو' جیسے بہت بور ہو رہی ہو۔''

''ہاں' میں۔۔۔۔۔۔'' وہ رکی اور اس کو یوں محسوس ہوا جیسے گیتی نے اس کے دل کی ان پچھلی باتوں کو تاڑ لیا ہو اور پھر بولی۔ ''تم بھی چلو نا ساتھ ہمارے۔''

''کون۔۔۔۔۔۔میں؟'' گیتی ہنسی۔ اس دن اپنی حفاظت کے خیال سے سینما میں اس کے ساتھ بیٹھ جانے پر اس کو جس الجھن کا سامنا کرنا پڑا تھا' وہ اس کو یاد آ گئی۔ ''میں تو ذرا دیر آرام کروں گی' پھر میری شاگرد لڑکیاں آ جائیں گی۔''

وہ برآمدے میں کھڑی ان دونوں کو سائیکلوں پر دوش بدوش جاتا دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ یہ صفدر بھی بڑا اچھا آدمی ہے۔ سب کا خیال کرتا ہے۔

''تم اگر کوکو سے کہتے تو شاید وہ بھی چلی چلتی۔ مارگریٹ نے اپنی اس دن کی کم فطری کی تلافی کے خیال سے کہا۔

''ارے' نہیں! تم اس سے کبھی ایسی بات کرنا بھی نہیں۔ تم کو نہیں معلوم' وہ بہت بڑے گھر کی لڑکی ہے اور یہ اس کی شان کے خلاف بات ہے۔''

اور یہ بات سن کر مارگریٹ کو طمانیت اور خوشی کا احساس ہوا تھا۔

باب ۶۲

وہ خط جو اس نے اماں بیگم کے نام لکھا تھا' کئی دن تو اس کی میز ہی پر پڑا رہا اور پھر کئی دن تک یوں ہوا کہ وہ جب بھی کسی کام سے باہر نکلتی تو لفافہ اٹھا کر اپنی سائیکل کے ہتھے میں اٹکی ہوئی ٹوکری میں ڈال لیتی اور پھر پوسٹ آفس یا راستے میں کھڑے ہوئے لیٹر بکس سے بہت آگے جا کر اس کو خیال آتا کہ ارے' میں خط تو ڈالنا بھول ہی گئی۔ ''جیسے شاید میں یہ خط ڈالتے ہوئے ڈرتی ہوں۔'' وہ سوچنے لگی۔

چنانچہ وہ خط جسے اس نے بڑی ہمت اور بڑے ارادے سے اور کچھ صفدر یاسین کے تقاضے پر لکھا تھا' اس وقت تک ڈالا نہ جا سکا تھا۔

خط میں کوئی لمبا چوڑا مضمون تو نہ تھا' اس نے تو فقط اتنا ہی لکھا تھا کہ

''میں یہاں خیریت سے ہوں۔ امید ہے آپ سب بھی خیریت سے ہوں گے۔ میرا سیکرٹری کورس اب قریب الختم ہے اور اب میرے پاس چار بڑی اچھی ٹیوشنیں ہیں۔ گھر میں میری طرف سے سب کو واجبات کہیے۔

مالی اور شریف کو سلام!''

یہ لکھنے کی تو کوئی خاص ضرورت نہ تھی کہ وہ کہاں مقیم ہے' اس لیے کہ خط کا آغاز ہی پتے سے ہوا تھا۔ وہ گھر سے کیوں چلی آئی اور وجہ کیا تھی' اس کے متعلق لکھنا فضول تھا۔'' وہ میری بات سننے کو تیار ہی کب ہوں گے اور جو ہوں بھی تو ان کو یقین کون کرنے دے گا۔'' اس سلسلے میں تو وہ بالکل ہی صبر کر چکی تھی۔

''اس سے تو میں نے یہ خط چپراسی ہی کو دے دیا ہوتا تو ڈاک میں نکل تو جاتا۔ یا پھر مارگریٹ تو ضرور ہی ڈال دیتی۔''

اور جس دن اس سے مسز بنجامن نے کہا تھا کہ میں جی پی او تک جا رہی ہوں' گیتی آرا۔۔۔۔۔۔۔تم کو کوئی کام ہو تو بتا دو ۔۔۔۔۔۔تو یہ بوڑھی' کمزور اور اپنے سوچے ہوئے قدموں سے بدقت چلنے والی عورت اس کو کس درجہ ذمہ دار اور ہمدرد نظر آ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں فخر تھا اور کسی دوسرے کے کام آنے کے تصور سے آسائش کی چمک تھی۔

گیتی کا دل نہ چاہا کہ اس کو مایوس کردے۔

''ہاں' مسز بنجامن! میرا ایک ضروری خط ہے' وہ تم ڈال دینا' بڑی مہربانی ہوگی۔'' اس نے دراز کھول کر وہ خط مسز بنجامن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ مسز بنجامن نے بازو سے لٹکتے ہوئے نیلے بیگ کو اتار کر میز پر رکھا۔ بڑی مستعدی سے اس کا زپ کھینچا اور لفافے کو اس میں محفوظ کرلیا۔

سفید بندکیوں والی گہری نیلی فراک اور چھوٹے سے بیہئے نما جوڑے والی اس عورت کو پھاٹک سے نکلتے دیکھ کر گیتی نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ خط جس کو شاید میں کبھی بھی ڈالنے میں کامیاب نہ ہوتی' اب ڈاک میں پڑ جائے گا۔

وہ آرام سے اپنے پلنگ پر لیٹ کر ناوقت سوگئی۔

احساس ذمہ داری کی شدت سے تمتمایا ہوا چہرہ اور غرور و فخر سے تنی ہوئی آنکھیں لیے مسز بنجامن نے جی پی او کے لیٹر بکس کے قریب کھڑے ہو کر اپنا تھیلا کھولا اور بے شمار کاغذوں' رسیدوں اور پرانے خطوں کے ہجوم میں سے ٹٹول کر لفافہ نکالا اور لرزتے ہاتھوں سے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

اس شام وہ دیر تک اپنے کمرے میں لیمپ جلا کر اپنی میز کی درازوں' کپڑوں کی الماری اور جوتوں والی الماری میں اس سادے لفافے کو ڈھونڈتی رہی تھی' جس میں مسٹر ولیمس نے جی پی او کے پوسٹ ماسٹر کے نام خط دیا تھا۔ چونکہ تھیلے میں لفافہ موجود نہ تھا' اس لیے اس کا اپنا کام تو ہو بھی نہ پایا تھا۔ پھر وہ بار بار تھیلے میں ٹھنسی ہوئی چیزوں کو دونوں ہاتھ ڈال ڈال کر اور کاغذ اور رسیدیں کھینچ کھینچ کر دیکھتی رہی تھی۔

اور پھر جل کر اس نے وہ سارے کاغذ جن میں کئی مڑے تڑے پرانے لفافے بھی شامل تھے' اپنی میز کی دراز میں ڈال دیے اور سوچا کہ اب پوسٹ ماسٹر کے نام دوسرا خط لینا ہوگا۔

''پر وہ لفافہ ہوا کیا۔۔۔۔۔۔؟'' وہ اپنی گول گول آنکھوں کو دیر تک گھما گھما کر سوچا کی۔

◆◆◆

فصل ہفتم

باب ۲۳

''اچھا' تم بتاؤ' پھر میں کیا کر سکتی تھی؟ حلیہ جاری کر دیتی یا رپورٹ لکھواتی؟ کتنی بدنامی کی بات تھی۔ اس گھر کی یہ پوزیشن تو نہیں کہ تلاش گمشدہ والا اشتہار جاری کر دیا جاتا۔'' انہوں نے بڑی مجبور آواز میں کہا۔

''ہونہہ! اس گھر کی پوزیشن!'' بختیار نے پیر پٹخے۔ ''وہ رہ کب گئی؟ آپ کے گھر کی پوزیشن کدھر ہے؟ مجھے دکھایئے۔ وہ آپ نے کہاں سنبھال کر رکھی ہے؟''

وہ کھڑا ہوا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''اشتہار تو آپ نہیں دے سکتی تھیں' مگر مجھے تو اطلاع دی جا سکتی تھی۔''

''نہیں' یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں تو خود ہی پورے دس دن بعد گھر پہنچی تھی۔ تم کو بلا کر کیا کر لیتی۔ جو بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی' اس نے مجھے اتنا بدحواس اور معطل کر دیا کہ یہی تعجب ہے کہ پاگل کیوں نہ ہو گئی۔ یوں ہی سمجھ لو کہ اب اتنے اوسان آئے ہیں تو تم کو بلایا ہے اور صولت تو یہی سمجھتی رہیں کہ دو چار دن میں خود ہی واپس آ جائے گی۔''

''یوں ہی سمجھ لو۔'' وہ پھر بد مزاجی سے بڑبڑایا۔ ''ہم سب کچھ سمجھ لیں۔ کبھی آپ نے بھی ہم کو سمجھنے کی کوشش کی؟''

''نہیں' بیٹا! میں اس قابل ہی نہ تھی۔'' انہوں نے نرم نرم اور سفید براق تکیے پر سے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' جو اچانک ہی بہت سفید ہو گیا تھا۔

''اور یہ عورت جو میری ماں ہے' اچانک کتنی بدل گئی ہے۔'' اس نے ان کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں اور پیشانی پر پڑی ہوئی شکنوں کو دیکھ کر سوچا۔ ''اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اس کا وقت گزر گیا ہے۔ وہ وقت جو اس کا تھا' اب اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا ہے اور جب لمحوں اور ساعتوں پر سے انسان کی گرفت اٹھ جاتی ہے تو وہ ان کے اختیار میں ہوتا ہے اور ایسے ہی ایک بے بس کر دینے والے لمحے کی زبردستی کا جواب میں اس سے طلب کر رہا ہوں۔''

اس کا سر خود بخود جھک گیا اور لہجہ نرم ہو گیا۔

''میرا مقصد آپ کو الزام دینا نہیں ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر بروقت مجھے بلالیتیں تو ہم سر جوڑ کر کچھ تو سوچ سکتے۔''

وہ خاموش آنکھیں بند کئے لیٹی رہیں۔

وہ برابر کہتا رہا۔

''وہ اتنی بے حقیقت اور قابل نفرت تو نہ تھی کہ اس کا یوں چلا جانا کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ کتنی ہی بری سہی مگر تھی تو اسی گھر کی عزت' جس کی پوزیشن کا آپ کو اتنا خیال ہے۔''

طیش میں آئے ہوئے لڑکے کے لہجے میں نرمی اور ندامت کا احساس ہوتے ہی ان کے آنسو بہہ نکلے۔ اس کے لہجے کی کاٹ اور درشتی پر نہیں بلکہ احساس ندامت کے تحت۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخیں مار مار کر روئیں اور اس سے کہیں کہ

''تم اس طرح میرا لحاظ کر کے خاموش نہ ہو۔ میں بجا طور پر تمہاری ملامتوں کا مستحق ہوں۔ میں نے تم میں سے کسی ایک کو بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ میں نے صولت سے لے کر ہر ایک سے ناانصافی کی ہے اور مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدرت نے یا خود صولت نے مجھ سے اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا انتقام لیا ہے۔''

مگر نہ جانے کون سی چیز ہوتی ہے جو انسان کو اس قسم کے اعترافات اور جذباتی اظہار سے باز رکھتی ہے۔ وہ خاموش اور بظاہر باوقار نظر آتا ہے اور دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی اڑ پر بدستور قائم ہے اور اس کا جذبہ احساس دستور سویا ہوا ہے۔

''اور تم آج میرے سامنے یوں بے بسی سے آنسو بہا رہی ہو۔ تم جس کی گود میں سر رکھ کر اس بائیس تئیس سال میں میں نے نہ جانے کتنی بار آنسو بہائے ہوں گے۔'' وہ بڑا جذباتی اور نرم خولڑکا تھا۔

''اماں جانی! وہ ان پر جھکا اور ان کے آنسو اپنے ہاتھوں میں جذب کر لیے۔ پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی اسپرٹ ایمونیا کے چند قطرے پانی کے گلاس میں ڈال کر ان کی طرف بڑھا دیئے اور بات بدل دی۔

''صولت آپا کس دن گئیں؟''

''گئی ہوں گی کسی دن' مجھے نہیں معلوم۔'' انہوں نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا اور پھر رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ''جس دن تمہارا خط ملا تھا کہ تم پہنچ رہے ہو اسی سہ پہر کی گاڑی سے روانہ ہو گئیں۔ ویسے جانا تو انہیں تھا ہی۔ جن لوگوں نے ان کا کاٹیج کرائے پر لیا تھا' وہ چھوڑ رہے ہیں اور آصف جاہ بھی اس مہینے کے آخر تک پہنچ جائیں گے۔ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ بچوں کو چھوڑ جاؤ۔ کاٹیج خالی ہو جائے اور اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کر لو تو لے جانا' مگر وہ مانی ہی نہیں۔ کہا کہ ہمیں تکلیف نہیں ہو گی۔

ہمارے ملنے والے وہاں موجود ہیں۔اور اب میں وہاں نہ رہی تو پھر مشکل ہوگی ایک دم گھر ٹھیک کرنے میں۔"

"ٹھیک ہے' اچھا ہے۔ جو آصف بھائی کے آنے سے پہلے اپنا گھر درست کرلیں۔ اچھا' اب سو جائیے۔" وہ پھر ان کی طرف جھکا۔" آرام سے سوئیے۔ مجھے تو اس بات کی کوفت ہے کہ یہاں اکیلی بیٹھی آپ دکھ اٹھاتی رہیں اور مجھے خبر نہ کی۔ جب میں موجود ہوں تو یوں غم کھاتے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو زندہ ہوں۔"

"ہاں' تم سلامت ہو۔" انہوں نے اس کی گردن پر پیار کرلیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔تم میرے پاس بیٹھے رہو۔" وہ اس کا ہاتھ اس طرح پکڑے رہیں' جیسے چھوٹا سا بچہ تنہا رہ جانے کے خوف سے اپنی ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس کو پاس بیٹھے رہنے پر مجبور کردیتا ہے۔

"بختیار!" انہوں نے اس کو ایسے آواز دی جیسے کسی کنوئیں سے بول رہی ہوں۔

"جی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"جیسا تم کہہ رہے تھے کہ وہ بری سہی' میں سچ کہتی ہوں میرے دل میں ایک لحظہ کے لیے بھی خیال نہیں آیا۔ وہ ضدی ضرور ہے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ جب میں نے اس کو قریب لانے کی کوشش کی تو پے در پے ایسی باتیں اور حادثات ہوئے کہ مجھے یہ موقع نہ ملا کہ اس کو یہ احساس دلاسکوں۔"

"ویسے آپ کا کیا خیال ہے؟ آخر وہ کہاں ہوگی؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ اپنے کالج چلی گئی ہوگی۔"

بختیار کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اور پھر بھی آپ نے وہاں دریافت نہ کروایا؟"

ان کی آنکھیں جھک گئیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولیں۔"جب بھی ارادہ کیا' اس خوف سے پورا نہ کرسکی کہ اگر وہاں سے جواب آگیا کہ وہ یہاں نہیں ہے تو پھر کیا ہوگا؟"

"مگر صولت آپا کی سمجھ کو کیا ہوا تھا؟"

"ان کا نام نہ لو وہ تو جس دن سے میں آئی' اس وقت سے اب تک مجھے یہی یقین دلانے کی کوشش میں مصروف رہیں کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر وہ کسی اور بات کا بہانہ پکڑ لیتی اور ضرور جاتی۔"

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ کس وجہ سے؟ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس معاملے میں مجرمانہ حد تک بے پروائی برتی گئی ہے۔''

بختیار کو پھر غصہ آ گیا تھا' لیکن اس بار وہ حجت کئے بغیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

باب ۶۴

جب اس کو بتایا گیا کہ کامن روم میں تمہارا بھائی تمہارا منتظر ہے تو اس کو قطعی یقین نہ آیا۔

پھر بھی وہ اس طرف گئی اور جب اس نے کمرے میں بختیار کو دیکھا تو دروازے ہی میں اس کے قدم رک گئے۔ خوف اور ملامتوں کے خیال سے زیادہ خفگی اور رنجیدگی کا وہ خیال تھا جو اسے خط کا جواب نہ ملنے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کو اپنی آنکھوں پر اعتبار بھی نہیں آ رہا تھا۔

پھر اسے کھڑے دیکھ کر بختیار خود اس کے قریب گیا۔ اس کو گلے لگایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا۔

''کیا سوچ رہی ہو گیتی؟'' وہ اس کو خاموش دیکھ کر بولا۔ ''کیا تمہارے خیال میں مجھے آنا نہیں چاہیے تھا تم سے ملنے؟''

''نہیں' میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ یہاں کس طرح پہنچے' اس لیے کہ میں نے جو خط گھر بھیجا تھا' اس کا تو جواب بھی کسی نے نہیں دیا اور میں تو اب دوسرا خط لکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔''

''تمہارا کوئی خط کسی کو نہیں ملا۔ کیا وہ خط تم نے خود ڈالا تھا؟''

''نہیں' کسی کو دیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ پھر آپ کو میرا پتہ کس طرح معلوم ہوا؟''

''مجھے تو پتہ نہ تھا کہ تم یہاں ہو یا کہاں' اب میں گھر آیا تو مجھے پتہ چلا اور میں اندازے سے یہاں آیا۔ کالج میں تم تھیں نہیں' جس سے مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ آج سہ پہر کو میں پلازہ کے پاس کھڑا تھا تو میں نے تم کو سائیکل پر ادھر آتے دیکھا۔ تم بہت تیزی سے نکل گئیں' اس لیے میں تم کو آواز نہ دے سکا۔ لیکن میں ادھر ہی کو مڑ گیا تھا۔ پھر جب تم یہاں پھاٹک میں داخل ہوئیں تو مجھے اطمینان ہو گیا۔''

اس کا لہجہ اور آواز سن کر گیتی کو احساس ہوا کہ کم از کم اس کے دل میں اس کے خلاف حقارت اور نفرت نہیں۔ بڑی ہمت کر کے اس نے بظاہر پرسکون لہجے میں سب کی خیریت پوچھی۔

اپنے ہر سوال کا جواب سن لینے کے بعد ہر خاموشی کا وقفہ اس پر بھاری گزرتا تھا۔ اس لیے کہ وہ سوچتی تھی کہ اب بختیار بھائی مجھ سے سوالات شروع کریں گے اور اس طرح یہاں چلے آنے کا سبب پوچھیں گے۔ مگر بختیار نے اس قسم کا ایک بھی سوال نہ کیا' اس لیے کہ وہ تمام تفصیل ارجمند سے سنا چکی تھی۔ ارجمند' جو بڑی سچی اور غیر جانبدار لڑکی تھی۔

''تم کالج سے کتنے بجے واپس آتی ہو؟''

''میں کالج میں نہیں ہوں۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''ٹھیک تو ہے۔'' بختیار نے سوچا۔ ''آخر کالج جاتی بھی کس طرح ہوگی؟''

اس نے پھر کوئی سوال نہ کیا' تو وہ خود ہی کہنے لگی۔ ''میں نے تین ٹیوشنیں کر لی ہیں اور سیکرٹری کا کورس کر رہی ہوں۔ میں نے خط میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔''

''خیر۔۔۔۔۔۔اب اس کی ضرورت نہیں۔ دیر تو ہوگئی ہے' لیکن چاہے کسی طرح بھی ہو' میں تمہارا داخلہ کرا کے جاؤں گا۔''

وہ اتنی خاموش' رنجیدہ اور چپ چپ نظر آ رہی تھی کہ بختیار کا دل کڑھ کر رہ گیا۔ خیر' وہ جیسی بھی ہو' ضدی' بے سری اور بے کہی ۔۔۔۔۔۔ہے تو وہ گیتی' جواب سے پہلے اس کی صورت دیکھتے ہی فرمائش کرتی تھی۔

''اور میرے لیے کیا لائے؟'' اور جیبوں سے ٹٹول ٹٹول کر چاکلیٹ کا پیکٹ نکال لیتی تھی۔

''تم نے آخری فلم کون سی دیکھی تھی؟'' بختیار نے پوچھا۔

اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کس نے۔۔۔۔۔۔۔میں نے؟ بختیار بھائی! اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''چلو اب تو پیدا ہو گیا۔ اب تم جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔ ہم اس وقت سینما دیکھنے چل رہے ہیں۔'' وہ چاہ رہا تھا کہ اس کے دل سے یہ احساس مٹ جائے کہ وہ اس سے ناراض ہے اور اس نے کوئی غیر معمولی حرکت کی ہے۔

چلتے وقت وہ اس سے ہوسٹل ملنے گیا تو اس نے اس کو بڑی محبت سے تسلی دی۔ ''تم امتحان وغیرہ کی فکر نہ کرنا' بس میں تو یہی چاہتا تھا کہ تم اس وقت کالج میں داخل ہو جاؤ۔ امتحان دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ تم ہوسٹل میں ہو اور کوئی غیر ذمے دار حرکت نہ کرنا۔ تم کو معلوم ہے کہ اس وقت تمہارا داخلہ ناممکن تھا۔ اگر اتنی بڑی سفارش نہ پہنچ جاتی تو میں یہ کام نہ کر سکتا۔''

پھر اس نے کہا۔ ''حالات پہلے جیسے نہیں رہے' اب ہم ارجمند کی شادی کر دیں گے۔''

''ارے ارجمند! اولڈ گرل! تمہاری شادی ہو رہی ہے؟ مگر کس سے؟'' اس نے سوچا اور یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ کس سے ہو رہی ہے۔

اس کی خاموشی ہی اس کا سوال تھی۔

بختیار نے خود ہی کہا۔

''ارجمند کو اکبر سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے اور پھر اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ وہ ہمارے گھر کی اتنی بہت سی باتوں سے واقف ہو چکا ہے کہ سب کا خیال ہے کہ اس کا خاندان میں شامل ہو جانا بہتر ہے۔''

گیتی نے سر جھکا لیا۔

''وہ ہمارے گھر کی بہت سی باتوں سے واقف ہو چکا ہے اور ارجمند سب کے خیال سے متفق ہے۔''

''واقعی ارجمند! جو خوبیاں تم میں ہیں' مجھے ان کی قدر ہے۔ لیکن میں ان سے محروم ہوں اور نہ جانے کیوں انہیں اپنانے کی مجھے تمنا بھی نہیں۔''

اور پھر بختیار نے بدقت کہنا شروع کیا۔

''حالات بہت بدل گئے ہیں اور میں تم سے کیا کہوں' اب ہم اور تم عمر کی اس منزل میں ہیں جب ہمیں ہر حقیقت کے مقابلے اور برداشت کی تاب ہونا چاہیے۔ اب بڑے بھیا کبھی واپس نہ آئیں گے۔ گم شدوں کی فہرست میں نہیں' بلکہ مرنے والوں کی فہرست میں ان کا نام ہے۔ ہم نے اماں سے یہ خبر چھپا لی ہے اور یہ بھی ہماری غلطی ہے' لیکن پھر بھی جنگ کے سلسلے میں ایسی خبریں عرصے تک چھپ رہ سکتی ہیں۔''

گیتی کو چکر سا آ گیا۔ مگر بظاہر وہ سوکھی آنکھوں کھڑی رہی۔

اس کے بھائی نے اس کے سفید ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''تم تو بڑی بہادر لڑکی ہو تم خدا سے میرے لیے دعا کیا کرو۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سب کے حصے کی ذمے داریاں مجھ ہی کو نبھانا پڑ جائیں گی۔ اور دیکھو اب تم کسی وقت بھی ہراساں نہ ہونا۔ تم کو جو الجھن ہو مجھ سے کہو۔ گیتی! تم کو تو ابا میاں سے بڑی محبت تھی۔ تمہیں یاد نہیں' وہ مخالفت اور اپنے مزاج کے خلاف باتوں کا کس سکون اور استقلال سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔''

پھر وہ رکا۔ اس نے گیتی کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

''یہ بھی ایک بڑی اچھی بات ہے کہ لوگوں میں ہمدردی اور دوسروں کو سہارا دینے کا جذبہ موجود ہے۔لیکن میں یہ کچھ اچھا نہیں سمجھتا کہ انسان میں دوسروں سے ہمدردی وصول کرنے اوران کا سہارا لینے کا جذبہ موجود ہو۔''

پھراس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔''خدا حافظ''

اور پھرایک لحظہ رک کر بولا۔

''چاچا جی سے میری بات ہوگئی ہے۔وہ بہت نیک اوراچھے لوگ ہیں۔میں نے ان کا نام لکھوادیا ہے۔لیکن تم بہت جلد جلد اب وہاں بھی نہ جانا۔جب ان کو بلانا ہوا کرے گا' وہ تم کو خود بلوالیا کریں گے۔۔۔۔۔۔ٹھیک ہے نا؟''

اس نے آہستہ سے سرہلا دیا اور پھراس کا بھائی روانہ ہوگیا۔

موٹے موٹے آنسواس کی آنکھوں سے گرتے رہے۔

''میں کتنی کم بخت ہوں' میرا بھائی اس دنیا سے اٹھ گیا' میری ماں پر صدمے پر صدمے گزر گئے اور ایک صدمہ عظیم اسے محض میری جلد بازی اور ضد کی وجہ سے اٹھانا پڑا۔اے رب العزت! تو نے مجھے ارجمند کے ساتھ پیدا کرکے بھی اس جیسا نہ بنایا۔'' اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے اس نے سوچا۔

باب ۶۵

وہ کتنی ہی دیر سے کھڑکی کے پاس والے کونے میں کھڑا چکنے سفید بانس کی سرکی والی لمبی اور پتلی چٹائی پر اپنا برش چلائے جا رہا تھا۔

اور وہ بھی کتنی دیر سے چپ چاپ بید کی مضبوط کرسی سے پشت لگائے اسی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔

سفید' کتھئی' بھورے' تیز سرخ' سبزی اور سیاہی مارتے ہوئے گہرے چمکیلے' نیلے' سنہری اور تیز فیروزی رنگوں کی ایک مسلسل پھواری تھی جو اس کے برش سے نکلتی چلی آ رہی تھی' جس میں فقط تین یا چار بال تھے اور یوں یہ ایک دوسرے سے تقریباً پیوست' بانس کی سرکیوں پر' پھیلتے ہوئے رنگ اس کے ذہن میں کیسی گڑبڑ اور ادھم مچا رہے تھے۔

بیزاری اور بوریت کی ایک انتہا یہ بھی تو ہوتی ہے کہ ذہن میں ادھم بڑھتا جائے اور انسان اس ادھم' اس بیزاری اور جھنجھلاہٹ کو

بڑے سکون اور خاموشی سے برداشت کرتا جائے۔ اتنا کہ دیکھنے والا سمجھے کہ وہ قطعی پرسکون ہے اور اسے کسی بات کی جلدی نہیں۔

حالانکہ اس وقت اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ جھلائی ہوئی اٹھے' اس کے ہاتھ سے برش چھین کر پھینک دے اور اس تقریباً مکمل ہوتی ہوئی چٹائی کے گیلے رنگوں پر ہاتھ پھیر کر ان کو گڈمڈ کر ڈالے۔

اور پھر اس کی مضبوط انگلیوں میں لتھڑے ہوئے رنگوں کو تارپین والے پیالے میں ڈال کر اپنے ہاتھوں سے صاف کرے۔ اس کی پیشانی پر آئے ہوئے سیدھے سفید بالوں کو ہٹا دے اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھے۔

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ میں بیٹھی ہوں اور تم ایک ایسی چیز میں الجھے ہوئے ہو جس کا وجود نہیں؟''

لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بجائے اس نے یہ سوال کیا تھا۔''تم سلک یا ساٹن پر کیوں نہیں پینٹ کرتے؟''

جواب میں صفدر نے اس کو مڑ کر دیکھا۔

''اس لیے کہ سلک کی نرمی سے مجھے کوفت ہوتی ہے اور ساٹن کی چمکیلا پن مجھے بیزار کر دیتا ہے۔ پتہ نہیں' کیوں مجھے ساٹن کی نقرئی چمک سے وحشت ہوتی ہے۔ کھردری اور سخت چیزوں پر نقش ابھرتے دیکھ کر مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے۔''

افسردگی اور حیرت کے باوجود وہ بڑے سکون سے اس شخص کو جو صرف ایک نیکر اور بنیان میں آدھا مڑا ہوا اس کے سامنے بیٹھا تھا' دیکھتی رہی اور پھر دھیرے دھیرے اس کے لبوں پر آ ہی گیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم ضرور تھوڑے سے پاگل ہو۔''

''پاگل!'' وہ ہنسا اور جھک کر پیالی میں سے رنگ لینے لگا۔''اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟''

''پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟ ساٹن کے چمکیلے پن سے تمہیں نفرت ہوتی ہے اور سلک کی نرمی تمہیں بیزار کر دیتی ہے۔''

صفدر نے مارگریٹ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اب مرغ کی کلغی میں جیتے جیتے خون کا سا سرخ رنگ لگا رہا تھا' جس کے بعض اطراف میں کلونج بھی جھلک رہی تھی اور ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا۔

''یہی تو وہ رموز ہیں' جن سے تم واقف نہیں ہو مارگریٹ! اور جنہیں تم جھٹ پاگل پن سے منسوب کر دیتی ہو اور جو تم چیڑ کے درخت کی چھال پر کی ہوئی پینٹنگ کو دیکھ لو تو تم مجھے کیا کہو؟ لیکن وہ میں تم کو دکھانے ہی کیوں لگا۔ اس کی تو قدر وہی کر سکتی ہے' جس کے لیے وہ میں نے بنائی ہے۔ اتنے دن تک میں اس کا موضوع سوچتا رہا اور جب وہ تیار ہوئی تو اب اس کو دکھانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ کالج میں داخلہ لینے سے پہلے گھڑی بھر کو بڑی عجلت میں آئی تھی۔''

اور وہ اس کی زبانی تمام واقعات سن کر کتنا خوش ہوا تھا۔ شکر ہے کہ دوسرا خط تو اس کے گھر پہنچ ہی گیا تھا۔

اور اس دن اس کی طرف سے اس نے کتنی بے فکری محسوس کی تھی' جیسے بس اس کے سر سے ایک بڑا بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ ''افوہ! کسی دوسرے کی لڑکی کی کتنی بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔

اور پھر اس دن کے بعد سے وہ اس کو نظر نہیں آئی۔ بجز اس کے کہ ایک دن اس نے اس کو سبز رنگ کی گاڑی میں اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا اور وہ سبز رنگ کی گاڑی جو چلا رہا تھا وہ یقیناً اس کے بھائی کا دوست ہی تھا۔ پھر وہ تینوں گاڑی سے اتر کر کنفکشنر کی دکان میں چلے گئے تھے۔

سرمئی رنگ کی قمیص اور سفید دوپٹے میں وہ مطمئن اور خاموش نظر آ رہی تھی۔ وہ وہاں کھڑے رہ کر اس سے بات بھی کر سکتا تھا' لیکن ایک نامعلوم جذبے کے تحت وہ فوراً ہٹ کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔

''لو! اب پھر یہ گم ہو گیا۔ اتنی مشکل سے تو اس کو متوجہ کرنے کے لیے ایک موضوع ہاتھ آیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں شام تک اسی طرح بیٹھی اپنی اتوار کا ستیاناس کرتی رہوں اور یہ تلے ہوئے جھینگے' مچھلی کے قتلے اور گاجر کا لچھا جو میں اتنی محنت تیار کر کے لائی ہوں' سب پڑے پڑے ٹھنڈے اور بساندے ہوتے رہیں گے۔''

وہ تھوڑی دیر تک کڑھتی اور کھولتی رہی اور پھر بڑے سکون سے کھڑے ہو کر بولی۔ ''اچھا تو' میرا خیال ہے کہ اب میں چلوں۔''

اور پھر وہ اسٹو والی میز کے قریب جا کر بولی۔ ''ناشتے دان کے ڈبوں میں کھانا نکال کر گرم کر لینا۔ اور ناشتہ دان لی فاں کے گھر رکھ دینا۔ میں کسی دن آ کر لے جاؤں گی۔''

صفدر نے رنگ میں ڈوبا ہوا برش پیالی ہی میں چھوڑ دیا اور بھورے تولیے سے ہاتھ پونچھتا ہوا بولا۔

''ارے! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کو اس طرح بیٹھ کر دیکھنے میں لطف آ رہا تھا۔ اتنا کہ تم بولنا بھی نہیں چاہ رہی ہو۔ ورنہ میں اسی وقت چھوڑ دیتا۔ اور پھر ابھی وقت کیا ہوا ہے؟''

''وقت تو خیر اب تقریباً ایک بجے کا ہے۔'' مارگریٹ نے اپنی کلائی پر نظر ڈالی اور پھر اس کو تولیے سے انگلیاں رگڑتے دیکھ کر بولی۔

''تو گویا تم نے ہاتھ صاف کر لیے۔''

''تم چاول تو ابالنا شروع کرو' ہاتھ بھی صاف ہوئے جاتے ہیں۔'' اس نے کارنس پر رکھی ہوئی تارپین کی پیالی ہاتھ بڑھا کر

اتاری اور اس میں انگلیاں ڈبولیں۔

جب وہ نہا کر نکلا تو کھانا میز پر رکھا ہوا تھا۔

''تم نے اس میز پر کی کتابیں کہاں رکھ دیں؟'' اس نے تولیے سے سر رگڑتے ہوئے پوچھا۔

''وہ رہیں تمہاری کتابیں۔'' اس نے شلف کی طرف اشارہ کیا۔

اور جب وہ بڑے شوق سے کھانے میں مصروف تھا تو اچانک مارگریٹ نے کہا۔

''کوکو! اتنی بے مروت لڑکی ہے کہ اتنے دنوں میں ایک مرتبہ بھی اس نے خبر نہ لی۔

''کس کی؟'' صفدر نے بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے سوال کیا۔

''میری تو خیر کیا خبر لینا تھی' تمہاری بھی نہ لی۔ بس اس ملک کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور بھئی! میں تو صاف بات کہوں' مجھے تو وہ بڑی بگڑی لڑکی معلوم ہوتی ہے' ضدی اور خودسر۔''

اب جبکہ اس لڑکی کو کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہ رہی تھی تو اس کے خلاف اس قسم کی باتیں کہہ دینے میں مارگریٹ کو کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا تھا اور اس سے وہ بعض بعض وقت واقعی حسد کرنے لگتی تھی۔

''اگر عورتیں دوسروں کے متعلق باتیں کرنا چھوڑ دیں تو کوئی حرج تو نہ ہو۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اگر عورتیں دوسروں کے متعلق باتیں کرنا چھوڑ دیں تو ان کا کام بھی نہ چلے۔''

''یہ کیوں؟''

''یہ اس لیے کہ میں تم سے صحیح کہتی ہوں' صفدر! کہ جو عورتیں دوسروں کے متعلق باتیں کرنا چھوڑ دیں تو ان کا اپنا مستقبل اور کنبے کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے۔''

صفدر زور سے ہنس پڑا۔

''تمہارا کیا ہے' تم ہنسے جاؤ۔ اچھا' تم بتاؤ۔۔۔۔۔۔ جب انسان اتنا خودغرض اور بے مروت ہو تو پھر بھی اس کے متعلق بات نہ کی جائے؟''

''ضرور کی جائے' مگر وہ ایسی ہے نہیں' جیسا تم سوچ رہی ہو۔''

اس نے مارگریٹ کے رنگ بدلتے ہوئے چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولا۔

''دراصل! اگر تم کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ ہمارے اور تمہارے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی نہیں ہے تو اس پر اس قسم کے اعتراض ہرگز نہ کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔''

اور اس مختصر سی بات کو سن کر مارگریٹ کو بڑا سکون محسوس ہوا۔ اب اس کو اس بے مروت لڑکی سے کوئی شکایت نہ تھی۔

اس نے چاولوں سے الجھی ہوئی تیلیاں پیالے میں چھوڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''کیوں اتنی محنت کرتے ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ میں یہاں آرام کرنے آیا ہوا ہوں؟'' وہ مسکرایا۔

''نہیں، مگر چھٹی کے دن بھی تو آرام نہیں کرتے۔ آج بھی صبح سے اس پینٹنگ میں الجھے رہے۔''

''اپنے شوق کی تکمیل سے تو آدمی کی تسکین ہوتی ہے مارگریٹ!'' اس نے پیار سے اپنی پینٹنگ کو دیکھا جو تقریباً مکمل تھی۔ ''اور پھر میں نے تو بہت مدت کے بعد اب برش اٹھایا ہے۔ تم کو پسند نہیں آئی؟'' پھر وہ رکا۔ ''ہاں، تم کو تو شوق ہی نہیں ان باتوں کا۔''

''لو! اور سنو۔۔۔۔۔۔۔ ہے کیوں نہیں؟'' اس نے اظہار شوق کے لیے تصویر کو غور سے دیکھا۔ پر نچے ہوئے مرغے کا جلجلا جسم اور نچے ہوئے پروں کی سیاہ اور سفید کھونٹیاں کراہت کا احساس دلا رہی تھیں۔

''اس تصویر کا عنوان ''پر نچا مرغ'' ٹھیک رہے گا۔'' اس نے مزید دلچسپی کا اظہار کیا۔

''اس کا نام میں نے پہلے ہی سوچ لیا ہے۔''

''کم بخت گھنونا ہے یہ مرغا۔'' بے خیالی میں مارگریٹ اظہار حقیقت سے باز نہ رہ سکی اور پھر خود ہی ٹپٹا گئی۔ ''مگر میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔'' صفدر کے چہرے پر اطمینان کی جھلک تھی۔ ''آ رہی ہے نا گھن؟ میں یہی چاہتا تھا۔''

''اس کا عنوان کیا ہے؟'' مارگریٹ پورے طور پر دلچسپی لینے کی کوشش میں مصروف تھی۔

اس کا عنوان ہے۔۔۔۔۔۔۔ ''جنگ کے بعد''

وہ بڑے معنی خیز انداز میں ہنسی تھی۔ لیکن صفدر کو خوب احساس تھا کہ وہ کچھ نہ سمجھی تھی۔

اس شام جب وہ سینما دیکھنے کے بعد اس کو چھوڑنے گیا تھا تو وائی ڈبلیو سی اے کی عمارت کے قریب کھڑے ہو کر اس نے مارگریٹ کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف اس کا چہرہ جھکتے جھکتے اچانک ہی رک گیا

تھا۔اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ جلدی سے گھوم کر خدا حافظ کہتا ہوا سائیکل پر سوار ہو کر چل دیا تھا۔
سبز اسکرٹ اور سفید بلاؤز میں ملبوس اس چینی لڑکی نے پھاٹک میں داخل ہوتے ہوتے دل میں کہا تھا۔ ''لوگ سچ ہی تو کہتے ہیں کہ ہم چینی پراسرار اور ناقابل فہم ہوتے ہیں۔''

باب ٦٦

گیمس سے فارغ ہو کر وہ سب ادھر ادھر لان پر مختلف درختوں کے نیچے گھاس اور بنچوں پر بیٹھی تھیں۔
شفق پھول چکی تھی اور اس کی سرخی دھیرے دھیرے شام کی سیاہی میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ گرجا کے گھنٹے بج رہے تھے۔ پھر فضا میں بہت موہوم اور بہت مدھم سی اذان کی آواز گونجی اور گیتی کا دل افسردہ ہوتا چلا گیا۔ جب بھی وا یسے وقت بے کار ہو کر بیٹھتی' اس کو شہریار کا خیال آنے لگتا۔
''بڑے بھیا! میں نے تم کو کتنے ہی سالوں سے نہیں دیکھا ہے۔ یوں کبھی اتنا یاد بھی نہ آئے تھے۔ اور اب تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آج ہی تم ہم سے جدا ہوئے ہو۔''
وہ نماز پڑھنے کے خیال سے اپنے کمرے میں چلی اور جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ اپنے بھائی کی بخشش کے لیے دعا نہ کر سکی۔
''پھر تو ایسا معلوم ہو گا کہ تم سچ مچ ہی اس دنیا میں نہیں ہو۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
پھر اس نے ہاتھ نیچے کر لیے اور جا نماز پر بیٹھی سوچتی رہی۔ ''یوں لگتا ہے جیسے یہ اتنی بڑی جنگ فقط ایک میرے بھائی کی جان لینے کو ہوئی تھی۔ اس بھرے ہوسٹل میں میں اپنا یہ غم کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ میں یہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان کے اس غم پر جو اس کا کلیجہ پاش پاش کر رہا ہو دوسرے اوپری دل سے اظہار ہمدردی کریں' بالکل مجبوراً اور بے دلی سے۔ یہ تو اپنے غم کی توہین ہوئی نا۔''
اس کا تو دل چاہتا تھا کہ اس غم کو ہلکا کرنے کے لیے وہ اپنی ماں کے سینے پر سر لگا کر خوب آنسو بہائے اور اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی خوب رلائے۔

''یا پھر.......یا پھر.......اس کا ذہن جھجکا۔ سیدھی سائیکل پر بیٹھے اور صفدر یاسین کی چمڑے اور پالشوں کی بو میں بسی ہوئی دکان میں داخل ہو کر شوکیسوں میں سجے ہوئے جوتوں کے درمیان سیلز مین والے اسٹول پر بیٹھ کر اس سے کہے۔

''دیکھا ناتم نے لیوچو! میرا دل کم بخت سچ ہی سوچ رہا تھا۔'' اور وہ شخص جو اس کا ہم وطن نہ تھا' جو اس کے اپنے طبقے کا نہ تھا۔ دوسروں کے غم کا احترام کرنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔

مگر اب یہ ممکن نہیں۔

''عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔'' اس کے کانوں میں بختیار کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''یہ بڑی اچھی بات ہے کہ لوگوں میں دوسروں سے ہمدردی کرنے اور انہیں سہارا دینے کا جذبہ موجود ہے لیکن میں یہ کچھ اچھا نہیں سمجھتا کہ انسان کے اندر دوسروں کی ہمدردی وصول کرنے اور سہارا لینے کا جذبہ موجود ہو۔''

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر واضح اشارہ جوتوں کی وہ دو جوڑیاں تھیں جو بلاضرورت ہی تھیں اور جن کو دیتے وقت بختیار نے کہا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ میں نے تم کو اتنی بہت سی چیزیں دے دی ہیں کہ تم کو کافی دن تک اپنی ضرورت کے لیے بازاروں اور دکانوں میں پھرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''نہیں' اب اگر ضرورت بھی ہوئی تو میں کم سے کم نکلنے کی کوشش کروں گی۔ میں اپنے اس بھائی کی الجھنوں میں ہرگز اضافہ نہیں کروں گی جو اپنی ہر ذمہ داری کو انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دینا چاہ رہا تھا۔ میرا بھائی کتنا فراخ دل اور درگزر کرنے والا ہے۔ بختیار بھیا! تمہاری فراخدلی اور مروت نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دی ہیں۔''

کوئی بات نہیں صفدر! اگر تم مجھے ناشکری اور بے مروت سمجھ لو اور اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ہمیں اپنے وقار اور مرتبے کو جاننے اور محفوظ رکھنے کے لیے یہی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ چاچا جی کا ہر طرح شکریہ ادا کر سکتے تھے اور ان کو میرا گارجین بنا سکتے تھے لیکن میرے سب کچھ بتا دینے کے بعد بھی وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ میرے سب سے بڑے گارجین تو تم تھے۔ اور پھر تم سے شکریے کے دو حرف بھی ان کو کہنا گوارا نہ تھے۔ اب بتاؤ کہ اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔

کچھ بھی ہو لیکن اب میں ان کو رنج نہ دوں گی۔

اس نے جاء نماز تہ کر کے الماری کے خانے میں رکھی اور اپنے چھوٹے سے پرسکون کمرے کو ایک نظر دیکھا۔ اس مرتبہ وہ پہلے کی طرح ڈارمیٹری میں نہ تھی۔ ایک پورا کمرہ بختیار نے اس کو دلوایا تھا جو اتفاقاً خالی تھا۔

اس نے اس کو بہت سی چیزیں خرید کر دی تھیں۔ اس کی پسندیدہ چاکلیٹ کے پیکٹ' بسکٹوں کے ڈبے اور اچار اور جام کی شیشیاں۔

اس کو رہ رہ کر جنئی سبزہ گھوڑی یاد آ رہی تھی جو پرانے سائیس کی عوضی میں کام کرنے والے نئے سائیس کے برے برتاؤ کی وجہ سے چھوٹ بھاگی تھی۔ اور پھر دو دن بعد ٹہلتی ہوئی آ کر پھاٹک کے ساتھ والی گھاس چرنے لگی تھی۔ ابا میاں نے جا کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تھا۔ اس نے نتھنوں سے اپنے نتھنے ملا کر گہری گہری سانسیں لی تھیں۔ اور اگاڑی پچھاڑی باندھ کر اس کے سامنے صاف ستھرے چنوں کی بالٹی کے علاوہ نرم نرم چارہ بھی رکھ دیا گیا تھا اور وہ نہائی دھوئی اصطبل میں کھڑی یوں نرم نرم گھاس پر منہ مار رہی تھی' جیسے کہیں گئی ہی نہ ہو۔

کھڑکی کے شیشے میں سے درختوں کی کالی کالی شاخیں جھومتی نظر آ رہی تھیں اور اس سے پرے جھٹ پٹے سے ڈھکا ہوا سرمئی آسمان۔

ڈائننگ ہال کی گھنٹی بج رہی تھی اور لڑکیوں کی ٹولیاں اس طرف جا رہی تھیں۔

عافیت اور بے فکری ایک بار پھر اس کو ڈھونڈ کر اور منا کر اپنی پناہ میں لے آئی تھی۔

ڈائننگ ہال کے دبیز پردوں کی کھسکی ہوئی چلنوں میں سے' جھانکتے ہوئے شفاف شیشے کے اس طرف مسکراتا ہوا زرد رو اور مسکین صورت چاند' لمبی لمبی میزوں پر بچھے ہوئے بے داغ میز پوش' چمکتی ہوئی کٹلری اور پلیٹوں کے درمیان پھولوں سے بھرے گلدانوں میں سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی مہک' ہلکے ہلکے بے فکرے قہقہوں اور دھیموں اور دھیمی دھیمی آواز میں ہونے والی باتوں کے درمیان پلیٹوں اور چھری کانٹوں کی جھنکار' یہ سب چیزیں' تحفظ اور بے فکری کی ضامن تھیں۔

اس کے باوجود اس کو وائی ڈبلیو سی اے کی ذمہ داری' مشقت اور فکروں سے بھرپور فضا کئی بار یاد آئی۔ اور محبت کے بوجھل بندھنوں کا وزن بہت گراں محسوس ہوا۔

اور پھر سوتے وقت اس نے دعا مانگی تھی۔

''یا اللہ! مجھے عقل اور شعور دے تاکہ میں سیدھی راہ چل سکوں۔''

باب ٦٧

ارجمند کی شادی کی تاریخ جان کر ایسی رکھی گئی تھی کہ اس کا کالج کھلا ہوا تھا۔ اس لیے کہ ابھی اس کی سمجھداری اور اس کا عہد مشکوک تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی موجودگی کون سے بدمزگی اور الجھن کا باعث بن جائے۔ تاریخ کا خط اس کو مل چکا تھا۔ اب بھی اس کو فقط بختیار خط لکھتا تھا۔

اور اس صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو بہت گرمی تھی اور یہ موسم گرما کی پہلی گرم صبح تھی۔ نہاتے نہاتے اس کو خیال آیا کہ کل اتوار ہے اور کل ارجمند کی شادی ہو جائے گی اور میں اس میں شریک نہیں ہوں گی۔

شادی کی اس تاریخ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید وہ لوگ اس کو کبھی گھر بلانا ہی نہ چاہتے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ بختیار بھیا اپنی خواہش سے اسے تلاش کرنے آئے ہوں اور انہوں نے اسے کالج میں داخل کروایا ہو۔ اور اماں بیگم کا وہ مختصر خط جو کالج میں آنے کے بعد اسے ملا تھا وہ بھی انہی کی زبردستی سے لکھا گیا ہو۔ اسی وجہ سے تو پھر انہوں نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا۔

اس کو اماں بیگم کے خط کا مضمون یاد آرہا تھا جو بہت مختصر تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ تمہارے کالج کے داخلے سے اطمینان ہوا۔ فیس کے علاوہ جو ضرورت ہو لکھ دیا کرنا۔ اور اب تمہارا اتنا وقت خراب ہو چکا ہے اس لیے بختیار کا خیال ہے کہ تمہیں صرف گرمی کی چھٹی میں آنا چاہیے۔

ارجمند کا اس کے پاس کوئی خط نہیں آیا تھا اور وہ یہ سوچتی تھی کہ جب ارجمند لکھے گی تو میں لکھوں گی۔ جب تک مجھے یہ نہیں پتہ چل جائے گا کہ ارجمند کے میرے متعلق کیسے خیالات ہیں' اس وقت تک میں اس کو ہرگز خط نہیں لکھوں گی۔

''اور اب کل اس کی شادی ہے۔ کیا تھا' جو وہ مجھے ایک خط لکھ دیتی۔ خیر' وہ خوش رہے۔''

شادی میں کون کون آئے گا اور کس طرح ہوگی۔ یہ نقشہ اس کے ذہن میں جم نہ پا رہا تھا۔

''خیر' کوئی آئے یا نہ آئے' میں تو نہیں ہوں گی۔'' اس نے بار بار سوچا۔

اتنے عرصے میں آج سے زیادہ اسے گھر کبھی یاد نہ آیا تھا۔

''یہ کبھی کوئی سوچ سکتا تھا کہ میں اپنی جڑواں بہن کی شادی میں موجود نہ ہوں گی۔''

کلاس میں اس کا ذرا بھی دل نہ لگا۔ اس نے کسی کو بھی نہ بتایا تھا کہ کل اتوار کو اس کی اپنی بہن کی شادی ہے۔

اتوار کی صبح وہ غسل خانے میں کھڑی ہو کر خوب روئی۔ شادی میں شرکت نہ کرنے سے زیادہ اس کو ارجمند کے بے اعتنائی کا غم

تھا۔

پھر اس نے خود ہی دل کو تسلی دی۔

''ٹھیک ہے میرے جیسے انسان ایسے ہی سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ بلکہ میں تو اس سے بھی بڑی سزا کی مستحق ہوں۔''

اس اتوار کو بہت دن پیچھے چاچاجی اس کو لینے آئے تھے۔ چاچاجی نے اس کے لیے آلو بھری روٹیاں پکوائی تھیں۔ مکھن کے ساتھ گرم گرم روٹی اور آم کا اچار کھا کر اور لسی کا گلاس پی لینے کے بعد اس نے مگن ہو کر سوچا۔

''چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ یہاں آ کر بھی تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنے گھر میں ہے اور یہاں سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ لوگ سوالات کی بوچھاڑ نہیں کرتے۔ ہدیٰ سوالات کرنے کا شوقین ہے تو وہ رہتا نہیں۔ چاچی کی آنکھوں میں کبھی کبھی سوالات جھانکتے تو ہیں' لیکن چاچاجی کے ڈر سے زبان تک نہیں آتے۔''

وہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو سوت کی پلنگڑی پر لیٹ کر سو گئی اور چاچی جی پاس ہی پیڑھی پر بیٹھی مصنوعی چھینکوں کے لیے کاغذ کی باریک باریک بتیاں بٹتی رہیں۔

باب ۶۸

اتوار کی وہ صبح بھی اور دنوں کی طرح گرم اور خاموش تھی۔ گھر میں کوئی ہنگامہ' کھلابلی اور دوڑ بھاگ نہ تھی۔

صولت جو ایک ہفتے سے آئی ہوئی تھی۔ وہ حسب معمول اپنے بچوں کو نہلانے اور کپڑے بدلنے میں مصروف تھی۔ اس لیے کہ بچوں کی آیا بیمار تھی اور وہ اس کو ڈلہوزی چھوڑ آئی تھی۔ باہر کے برآمدے میں آصف جاہ آرام کرسی سے ٹیک لگائے اخبار دیکھ رہے تھے۔ بختیار ابھی سو کر اٹھا تھا اور اماں بیگم کے کمرے میں ناشتا کر رہا تھا۔

اماں بیگم کے پاس ہی تخت پر چچی جان بیٹھی ہوئی تیز فیروزی رنگ کے چنے ہوئے دوپٹے میں سنہری کرن ٹانک رہی تھی اور یہی اس گھر میں شادی کی واحد علامت نظر آ رہی تھی۔

ارجمند آج بھی ہر روز کی طرح بہت سویرے اٹھی تھی اور ہر روز کی طرح نہا کر نماز پڑھی تھی۔ پھر اس نے اماں بیگم کی چائے ان کے کمرے میں پہنچائی اور ان کو نماز پڑھتا دیکھ کر چپکے سے چلی آئی تھی۔

دراصل اس کو ان سے شرم بھی بہت آ رہی تھی۔ لیکن یہ شادی اتنی خاموشی سے اور اتنے معمولی طریقے پر ہو رہی تھی کہ وہ کونے میں

گھس کر بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ شادی کے مہمانوں میں فقط ایک چچی جان تھیں' جو دراصل شہریار کے لاپتہ ہونے کا سن کر آئی تھیں۔ ان کو بھی یہی خبر تھی کہ گم شدوں کی فہرست میں ان کا نام ہے اور یہ خبر بھی ان کو پندرہ بیس دن ہوئے ملی تھی۔

اپنے طور پر تو وہ اماں بیگم کو تسلی دینے آئی تھیں۔ پھر یہاں ارجمند کی شادی کے لیے روک لی گئیں۔

''شادی کیا ہے' بہن! نکاح ہے۔'' اماں بیگم نے حسرت آمیز صبر سے کہا تھا۔ ان کا تو دل اڑا اڑا سا تھا۔ وہ تو دن بھر میں دو تین دفعہ بیٹھے بیٹھے کہہ اٹھتی تھیں۔

''اچھی جنگ ہوئی' ہمارے تو دل کا چین ہی لٹ گیا۔ خوب موچی موچی لڑے۔''

اس وقت ارجمند روز کی طرح کمروں کی صفائی کرتی پھر رہی تھی۔ اور اب وہ اماں بیگم کے کمرے میں آئی تھی۔ چچی جان کے ہاتھ میں دوپٹا دیکھ کر وہ جھینپ سی گئی۔

''ارے بھئی! ادھر تو آؤ۔'' انہوں نے جھاڑن اس کے ہاتھ سے لے کر گھٹنے کے نیچے دبا لیا۔ ''ہم نے ایسی دلہن نہیں دیکھی جو عین شادی کے دن صفائی کرتی پھر رہی ہے۔''

ارجمند سر جھکائے ان کے اور بختیار کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

''ایسا بھی کیا ہے' لاکھ معمولی طور پر شادی ہو' دلہن کو تو آرام کرنا چاہیے۔''

''ہاں' یہ تم صبح سے کیوں تھکتی پھر رہی ہو؟ جاؤ' ذرا نہا لو۔ دیکھو تو گرمی کس قدر ہے۔ اور بھلا یہ کام تم شریف سے کہہ دیتیں' مگر تم تو اس قدر بے زبان ہو۔'' بختیار نے کہا۔

''واقعی بالکل گائے ہے یہ لڑکی تو آپ کی۔'' چچی جان ظاہر تو یہی کر رہی تھیں کہ ان کو کچھ خبر نہیں۔ مگر وہ گیتی کے حالات سے پوری طرح باخبر تھیں۔

''یہ لڑکی واقعی بہت اچھی ہے۔'' بختیار نے اس کو چمٹا لیا پھر اس کے سر پر پیار کر کے بولا۔ ''اس کے جانے سے میری فکر بڑھ جائے گی۔ اس کی وجہ سے میں گھر کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔''

وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی اور پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور بھیگ کر اور بھی خوبصورت ہو گئی تھیں۔

''تم کو واقعی آرام کرنا چاہیے تھا۔ چلو' میں تم کو کمرے میں پہنچا دوں۔''

وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

''اب تم رو دھو نہیں۔۔۔۔۔۔۔ نہیں تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' اماں بیگم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اور بختیار اس کو اس کے کمرے کی طرف لے گیا۔

''دیکھو پگلی نہ بنو تم تو اتنی سمجھدار لڑکی ہو اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے۔ میری طرف دیکھو۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ آئی ہنسی' وہ آئی۔۔۔۔۔۔''

وہ مسکرا دی۔'' آپ جائیے' ناشتہ کیجیے۔''

''اچھا' وعدہ کرو اب تو نہیں روؤ گی۔''

''وعدہ کرلیا۔۔۔۔۔۔۔ جائیے''

مگر اس کے باہر نکلتے ہی وہ تکیے پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگی۔

''مجھ سے کہتے ہیں' رو نہیں۔ ایسے موقع پر سب کتنا یاد آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے باپ کو یاد نہ کروں' بھائی کا خیال نہ آئے اور نہ اس کم بخت بے مروت گیتی کا۔ روٹھ کر گئی تھی تو میں نے کیا بگاڑا تھا' مجھے خط نہ لکھا۔ پھر اب بختیار بھیا کو خط لکھتی ہے' اماں کو لکھا' دو حرف مجھے بھی لکھ سکتی تھی۔ مگر اسے تو مجھ سے محبت ہی نہیں۔ اور اب بھلا یہ سن کر بھی ایک حرف نہ لکھا اور میں اس سے کتنی بہت سی باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ شاید وہ مجھ سے یوں بھی خفا ہے۔'' اس نے میز پر رکھی ہوئی اکبر کی تصویر کو دیکھا کہ میں اس سے شادی کر رہی ہوں جس وہ ناپسند کرتی ہے۔

''لیکن تم اتنے برے تو نہیں ہو۔'' وہ اس کی تصویر دیکھ کر مسکرا دی۔

''اور میں سوچ رہی ہوں کہ تم سہرا باندھ کر لگو گے کیسے؟'' پھر اس کے آنسو خود بخود رک گئے اور وہ نہانے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی۔

کھانے کے بعد سے البتہ گھر میں کچھ الٹ پلٹ اور ہنگامے کی صورت پیدا ہوئی۔

اب باہر لان پر شامیانے لگ رہے تھے۔ گھر میں خاص گڑبڑ اب بھی نہ تھی' اس لیے کہ صرف چائے تھی اور وہ بھی مخلوط پارٹی کی صورت میں۔ باراتیوں سمیت کل تیس چالیس تو لوگ ہوں گے۔

''اے ہے بھابی! آپ نے تو بڑی سونی شادی کی۔ ایسا بھی کیا تھا۔'' چچی جان بار بار کہہ رہی تھیں۔

''بہن! میرا دل جیسا اڑا اڑا ہو رہا تھا۔ تم کو اندازہ نہیں۔ اب میرا دل دماغ اس قابل نہیں کہ مہمانداری کروں۔ اس سب کے لیے اطمینان اور سکون قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''ہاں' یہ تو ہے۔ اللہ آپ کو سکون دے۔'' وہ جتنی گہری سانس لے کر یہ بات کہتی تھیں' اتنا گہرا جذبہ اس میں شامل نہ ہوتا تھا۔

بارات کے آنے کا وقت ہوا تو صولت کا بھی دل بھر آیا۔ وہ اماں بیگم سے چھپ کر دیر تک روتی رہی تھی۔ پھر آصف جاہ نے سمجھایا۔ ''دیکھو' تم جو یوں دل تھوڑا کرو گی تو کیا ہوگا۔ اپنی اماں کا خیال کرو اور اس وقت تو اس غریب لڑکی کے پاس تمہیں ہونا چاہیے۔ واقعی میرا دل بہت کڑھ رہا ہے۔ کیسی حسرت اور خاموشی سے یہ شادی ہو رہی ہے۔''

صولت نے آنسو خشک کر کے اس شخص کی طرف دیکھا جو بڑی نیک نیتی اور سیدھے سادے انداز میں اس کو سمجھا رہا تھا اور جو بہت دن بعد زندہ سلامت واپس آیا تھا۔ لیکن بہت مضمحل ہو کر اور جواب اس کے سامنے اور بھی زیادہ سن رسیدہ نظر آنے لگا تھا۔ مگر صولت میں اب اس کے لیے بڑا صبر وضبط پیدا ہو گیا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

وہ ارجمند کے پاس چلی گئی۔

وہ کمرے میں تنہا تھی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا' زور سے آواز دے۔

''گیتی! تم کہاں ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ میری ڈھارس بندھاؤ۔''

اور اسی وقت صولت آپا کمرے میں داخل ہوئیں۔

''اب تم سنبھل کر بیٹھ جاؤ۔ ہمت سے کام لو۔'' انہوں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور پھر رونا شروع کر دیا۔

ان کے ساتھ ہی وہ بھی ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اور پھر روتے روتے اس نے سوچا۔ ''یہ ہمارے یہاں کے طریقے ہیں۔ اگر یہ اوپر والے لوگ اس قسم کی فضا نہ پیدا کیا کریں تو ہونے والی دلہن اس درجے ٹپٹایا نہ کرتی۔ یہ بات جو میں نے فقط سوچی ہے' گیتی ہوتی تو پھٹ سے کہہ بھی دیتی۔''

''بھئی! آرسی مصحف ضرور ہوگا۔'' چچی جان نے اس کے دلہن بنتے ہی اعلان شروع کر دیا۔ ''اے ہے' کوئی تو رسم ہو۔ وہ دولہا بھی کیا کہے گا۔''

''ہاں' بھئی! ضرور کروالو۔'' اماں بیگم کا دل اس وقت بے حد پریشان اور بیزار تھا۔

سرخ جالدار دوپٹے کے سائے میں رکھے ہوئے آئینے میں اکبر نے اس کی کھلی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر سوچا۔

''یوں دیکھنے میں تو مجھے وہی زیادہ اچھی لگا کرتی تھی' مگر اس وقت اس آئینے میں تمہاری دیکھی بھالی شکل بہت نئی اور پیاری معلوم ہو رہی ہے اور قصہ دراصل یہ ہے کہ خوبصورت بھی تو تم ہی ہو۔ تمہارے ماتھے پر ٹیکا سج رہا ہے اور تمہارے بالوں میں افشاں بھلی لگ رہی ہے جو شاید اس کے سیدھے اور بہت زیادہ کالے بالوں میں بھلی نہ لگتی۔''

باب ۶۹

شام کے جھٹپٹے میں وہ جانے پہچانے اسٹیشن پر ایک ناخواندہ مہمان کا سارا خوف و وسوسہ اپنے دل میں سمیٹے کھڑی تھی۔ اور یہ جون کی آخری تاریخوں میں سے کوئی سی تاریخ تھی۔

چھٹیاں ہونے سے پہلے بختیار نے منی آرڈر کے کوپن پر لکھ کر بھیجا تھا کہ تمہارا کرایہ بھیج رہا ہوں' تم جس دن چھٹی ہو اسی دن روانہ ہو جاؤ اور اپنے پہنچنے کے وقت کی تار سے اطلاع دے دینا۔

''تار تو میں نے دے دیا تھا' مگر کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

اب اس کو کامل یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ سارا تپاک اور ساری مصالحت صرف بختیار بھیا کی ہے ورنہ اور کوئی بھی اس سے تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔

''ارے بی بی! آپ یہ کھڑی ہیں اور میں نے آپ کو سارے پلیٹ فارم پر ڈھونڈ مارا۔''

وہ چونک کر مڑی۔

''سلام علیکم' شریف!''

''جیتی رہو بی بی! مگر یہ آپ کدھر چھپی کھڑی تھیں؟ ہم نے سوچا' شاید بیگم صاحب نے ٹائم غلط پڑھا ہوگا۔''

''گھر کون کون ہے؟''

''گھر کون ہوتا بی بی! آپ سب تو جم ہی جم ہیں۔ ہم ہیں اور ہماری بیگم صاحب۔'' پھر وہ چونکا۔ ''ارے! یہ اٹیچی کیس آپ خود اٹھائے کھڑی ہیں' لائیے مجھے دیجئے۔''

''نہیں شریف' اٹیچی کیس اتنا بھاری تو نہیں ہے۔ پھر ہمیں بھی تو اپنا کام کرنے کی عادت ہونا چاہیے۔''

''ہاں' ہونا تو چاہیے مگر ابھی تو ہم زندہ ہیں بٹیا!'' اس نے اٹیچی کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس کے لہجے میں مٹھاس تھی اور شفقت بھی۔ گیتی کا دل کچھ ٹھہرا۔

شریف تانگے پر سامان رکھوا چکا اور اگلی سیٹ پر بیٹھا تو اس نے پوچھا۔

''شریف! اماں کیسی ہیں؟''

''بس اب آپ ہی دیکھ لینا بی بی! بڑے بھیا کی پریشانی نے بالکل ہی توڑ دیا ہے۔ اللہ پاک ان کی پریشانی دور کرے گا۔ میں نے تو بڑے پیر صاحب کی منت مانی ہے۔ وہ آئے جائیں تو دیگ پکاؤں گا زردے کی اور مجد میں چراغی کروں گا۔''

''تم اب بھی مجد ہی کہتے ہو مسجد کو؟'' اس نے بات ٹالی۔

''تو اور بٹیا! اب کچھ اور کہنے لگیں۔۔۔۔۔۔۔اب ہمارا گھٹتا وخت ہے۔''

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا' شریف کا سارا سر کھچڑی ہو رہا تھا۔

''ارے شریف! تمہارے بال کتنے سفید ہو گئے۔'' وہ اس کو دوسری باتوں میں لگا رہی تھی' اس لیے کہ وہ بڑے بھیا کے متعلق اتنی امید افزا باتیں سننے کی تاب نہ رکھتی تھی۔

''ہم کو کہتی ہو ذرا بیگم صاحب کو دیکھنا اور تو اور صولت بٹیا کے دولہا اب کتنے بڑھیا گئے۔ میں تو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں کہتا ہوں' جو بڑے بھیا۔۔۔۔۔۔''

''ہاں' شریف! کیا آصف بھائی بہت بڈھے لگنے لگے ہیں؟'' اس نے جلدی سے بات کاٹی۔

''تو اور کیا۔۔۔۔۔۔اب تو بٹیا کوئی جوڑ ہی نہیں معلوم دیتا۔ پہلے بھی زیادہ تو۔۔۔۔۔۔۔'' وہ چپ ہو گیا۔

''ارجمند کی شادی میں کون کون آیا تھا؟''

''ارے کون۔۔۔۔۔۔۔ایمان سے کہتا ہوں بٹیا! اس سے زیادہ رونق تو ہمارے صاحب کے مرنے میں ہو گئی تھی۔ ایک چھوٹی دلہن تو آئی تھیں۔''

''اچھا! چچی جان آئی تھیں؟''

''ارے ہاں' وہ آئی کیا تھیں۔۔۔۔۔۔۔خدا رکھے بڑے بھیا کا سنا کہ ان کا پتہ نہیں مل رہا ہے تو بیگم صاحب کی تسلی کی خاطر آ گئی تھیں۔ بھئی! وہ بھی تو بڑے بھیا کو بہت چاہتی ہیں۔ ایمان سے چھپ چھپ کر روتی تھیں کہ بیگم صاحب کے دل میں وہم آئے گا۔

ارے ہم تو کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔“

اس نے پھر بات کاٹ دی۔ ”شریف! تم کو دولہا کیسا لگا؟“

”لگتا کیسا! اپنا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ نظر لگ رہی تھی اور بھئی! سچی بات یہ ہے کہ ہماری بٹیا جیسی دلہن کوئی شاید ہی بنے۔ کیسا نور اترا ہے۔ مجھے تو اتنی پیاری لگ رہی تھی۔ کل کی بات تھی' تم دونوں کو کندھوں پر بٹھائے کام کرتا گھومتا تھا۔“

”کتنے دن بعد دلی گئی تھی؟“

”ارے! ہمارے گھر سے تو دوسرے ہی دن رخصت ہو گئیں۔ سنا تھا' پہاڑ پر جائیں گے پہلے۔ دلی تو بعد میں گئی ہوں گی۔ چلتے وخت بٹیا بہت روئی تھی اور مجھ کو ایک طرف لے جا کر کہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ دیکھو شریف! اماں کو تکلیف نہ ہونے دینا۔“

وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ اسٹیشن سے گھر نزدیک تو تھا ہی' باقی راستہ خاموشی سے طے ہو گیا۔

یہ گھر اور یہاں کی ہر چیز اتنی بدلی بدلی نظر آ رہی ہے کہ یقین نہیں آتا۔ اوپر سے نیچے تک سنسان کمروں اور برآمدوں کی خاموشی اس کو بہت کھل رہی تھی۔ باوجود اس کے کہ گھر اسی طرح صاف ستھرا اور قرینے سے قاعدے کا تھا' لیکن ہر طرف ایک بے حسی اور خاموشی تھی۔

اور اپنی ماں کو دیکھ کر تو وہ ٹھٹک گئی۔ وقت کے قدموں تلے آ کر بعض انسان کس بری طرح روندے جاتے ہیں۔ ان کا پورا سر سفید تھا اور کھال لٹک آئی تھی اور سب سے بڑھ کر مزاج پر ضعیفی آ گئی تھی۔ ان کے دبدبے میں فرق آ گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس ایک سال میں ان پر سے عمر کے دس سال گزر گئے ہوں۔ انہیں اس حال کو پہنچانے میں نہ جانے کن کن باتوں کا ہاتھ تھا۔ لیکن اس سب کا ذمے دار وہ صرف اپنی ذات کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے ایک پھر دل میں عہد کیا اور دعا مانگی۔

”اے اللہ! تو مجھے ان سب کے حسب منشا سوچنے اور جینے کی توفیق دے۔ اور اس میں حرج ہی کیا ہے کہ انسان دوسروں کے حسب منشا جیئے بلکہ یہی سہل ترین بات ہے۔“

اس کی اور ان کی دونوں ہی کی طرف سے اس بات کی بڑی احتیاط کی جا رہی تھی کہ گزری ہوئی تلخ باتوں کا ذکر بھی نہ آنے پائے۔ اور اس نے آنے کے دوسرے دن سے ہی گھر کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی۔ پہلے تو اس نے سب کمروں میں تھوڑا تھوڑا ردوبدل کیا۔ چیزوں کی تھوڑی سی ادل بدل ماحول کی افسردگی اور بے حسی کو زائل کر دیتی ہے۔ مالی کو تاکید کہ گلدانوں میں ہر روز پھول لگاؤ۔ پھول نہ ہوں تو ہری ڈالیں ہی لگا دیا کرو۔

اور یوں اس طرح ان خلاؤں کے محیط میں کچھ کمی سی ہونے لگتی تھی جو اس گھر میں داخل ہو گئے تھے۔ کسی کسی وقت تو وہ سوچتی کہ یہ گھر کیا ہے' چھلنی ہے۔ پوری خاندانی زندگی خلاؤں اور سوراخوں سے بھری پڑی ہے۔ اور اب جو کنبے کے ہم دو دم ایک جگہ موجود بھی ہیں تو کیا ہمارے درمیان فاصلے اور خلا موجود نہیں ہیں۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے کا حد درجہ لحاظ کر رہے ہیں اور دونوں کی زیادہ سے زیادہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ اختلاف کا موقع نہ پیدا ہو۔ مگر یہ اہتمام اور تپاک ہی تو اصلی خلا ہے۔ اور جب ہم ایک دوسرے سے بد لحاظی اور لاپروائی برتتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد ہے اور ہمارے درمیانی فاصلے پر ہیں۔

وہ پچھلے باغ سے فالسے توڑ کر لائی اور ان کے پاس رکھ دیئے۔

"دیکھیے آپ نے یہ فالسے۔۔۔۔۔۔۔ اس مرتبہ ہر دفعہ سے بڑا فالسہ آیا ہے۔"

"ہاں" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "لگوانے والے کو تو ان کا شربت پینا بھی نصیب نہ ہوا۔ اور یہ اتنے بہت سے فالسے یہاں کیا ہوں گے؟"

اس کی ساری خوشی ختم ہو گئی۔ بجھے دل سے اس نے فالسوں کی طرف دیکھا۔

"تم ایسا کرو کہ تھوڑے شریف کے یہاں بھیج دو اور تھوڑے ارجمند کی ساس کے یہاں بھجوا دو۔ خدا رکھے اکبر کو تو بہت ہی پسند ہیں۔۔۔۔۔۔۔ مگر وہ بھی نہیں ہیں۔"

فالسوں کی ٹوکری اٹھا کر وہ پینٹری میں چلی گئی۔ اب یہ فالسے اس کو کتنے بے کار نظر آ رہے تھے۔

اس کے جانے کے بعد اماں بیگم نے پنج سورہ کھول خاموشی سے پڑھنا شروع کیا۔ وہ اپنی سلائے لے کر ان ہی کے کمرے میں تخت پر آ بیٹھی۔ اتنے بڑے گھر میں دو دم الگ الگ بیٹھیں تو اور بھی وحشت ہوتی ہے۔

"اس سے تو اچھا ہے' اماں بیگم کہ اس گھر کو کرائے پر دے دیجئے' چھوٹا سا بنگلہ اب تو کافی ہو گا۔"

"اے ہے! ایسی فال تو منہ سے نہ نکالو خدا نہ کرے جو مجھے چھوٹا بنگلہ کافی ہو"

خانساماں کی جگہ بھی اب شریف ہی تھا اور سب کام اسی کے ذمے تھے۔ اس لیے اس نے باری باری کمروں کی صفائی کروائی تھی اور آج اماں بیگم کے کمرے کی باری تھی۔

"اگر آپ آج برآمدے میں نماز پڑھ لیں تو جتنی دیر میں آپ وظیفہ ختم کریں گے' میں کمرے میں صفائی کروا لوں گی۔"

"کمرہ تو بالکل صاف ہے۔ بچارا شریف بغیر میرے کہے' کونے کونے کی صفائی کرواتا ہے۔"

''میرا مطلب ہے' تھوڑی رد و بدل کرلیں۔ یہ پلنگ اگر اس طرف آجائے اور میز اس کونے میں چلی جائے تو گنجائش بھی نکل آئے گی اور ذرا نیا پن بھی آجائے گا۔''

''رہنے دو نئے پن کو' وحشت ہوتی ہے' مجھے تو۔ تم میرے کمرے کو تو اسی حال میں رہنے دو۔ یہ کمرہ اب یوں ہی رہے گا۔ میں یہاں بیٹھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ گھر ویسا ہی بھرا پڑا ہے۔ وہ ابھی نکل کر آئیں گے اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ اور جب ادھر میں اپنے تخت پر ناشتا کرتے بیٹھوں گی تو لڑکے آکر میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور کھائیں گے۔''

''اب اماں بیگم بڑے بھیا کا نام لیتے جیسے کتراتی ہیں۔ ذکر آتا ہے تو ہمیشہ لڑکے کہہ کر دونوں کا ذکر کرتی ہیں۔''

وہ رنجیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔

اور ان کو خیال ہوا کہ شاید وہ اس مخالفت سے برا مان گئی ہے۔ چنانچہ صفائی کے طور پر پھر بولیں۔

''بات یہ ہے بٹیا! بڑھاپے میں انسان کو ایک خاص طریقے کی کل پڑ جاتی ہے اور اس میں تبدیلی آجائے تو اس کی روح بے کل ہوجاتی ہے۔''

''اور میں کتنی احمق ہوں کہ میں ان کو گھر چھوڑ کر دوسرے گھر میں رہنے کا مشورہ دے رہی ہوں۔ جس میں ان کی روح بے کل ہو جائے۔''

وہ اتنی بوڑھی اور دقیانوسی تو نہ تھیں کہ تار تو تار ہر ڈاک کی آمد پر ہول جائیں' لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ اب جب بھی ڈاک کا وقت آتا تھا' وہ بے کل ہوجاتی تھیں۔

لرزتے ہاتھوں سے انہوں نے ارجمند کا خط پڑھ کر دے دیا جس کے شروع ہی میں لکھا تھا کہ یہ سوچ کر مجھے پہلی سی فکر نہیں رہی کہ گیتی آگئی ہوگی۔ میرا کتنا دل چاہ رہا ہے کہ میں وہاں ہوتی۔ وہ واپس چلی جائے گی اور جانے کب ملنا ہو۔''

''اچھا! یہ بات ہے۔'' اس کو افسوس ہونے لگا کہ میں نے ہی کیوں نہ خط لکھ دیا۔ اور لکھنا بھی تو مجھی کو چاہیے تھا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ واقعی ہم انسانوں میں کتنا چھوٹا پن اور تھڑدلی ہوتی ہے۔ کیوں ہم ایک دوسرے کو اپنے آگے جھکانا چاہتے ہیں۔

باب ۷۰

بدلی خوب گھر کر آئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا' جھوم جھوم کر چلتی ہوئی ہوا کا جل بکھیرتی آ رہی ہے۔ اس لیے کہ ہر لحظہ اندھیرا بڑھ رہا تھا اور احاطے اور اس سے بھی پرے سڑک کے کنارے کنارے لگے ہوئے درختوں کی سبزی سیاہی میں بدل رہی تھی۔ وہ اگلے برآمدے میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور دن کے گیارہ بجے تھے۔ اب اندر کمرے میں جا کر بتی جلانا پڑے گی۔ اس نے آسمان پر امڈتے ہوئے اندھیرے بادلوں کو دیکھ کر سوچا۔

''اب دیکھو' شریف کس وقت آتا ہے اسٹیشن سے۔ میں دو دفعہ تو جا کر ہنڈیا دیکھ آئی ہوں' کہیں جل ہی نہ جائے۔ پھر مجھے چھیڑے گا کہ بس تم ہی بے ڈھنگی ہو اور مجھے تو پتہ بھی نہیں کہ شوربا کب کرتے ہیں۔''

مارے فکر اور وحشت کے اس کی سمجھ میں ایک حرف بھی نہ آ رہا تھا۔ اس نے ورقوں کے درمیان اپنے سر سے پن نکال کر لگائی۔ کتاب میز پر ڈال دی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

مسالا چھن چھن کر رہا تھا اور بھنتے ہوئے مسالے کی خوشبو سارے باورچی خانے میں پھیل رہی تھی۔ اس نے روٹی کا ڈبا ٹٹولا۔ باسی روٹی نکال کر ایک بوٹی اور مسالہ نکال لیا اور پتیلی اتار کر میز پر رکھ دی۔

''اس بھنتے ہوئے مسالے سے بھی مزے کی کوئی چیز ہے۔'' کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے وہ مزے لے لے کر آہستہ آہستہ کھاتی رہی۔

چھنن' چھنن۔۔۔۔۔۔۔ اکے کی آواز آئی۔

شریف کا اکہ پچھلے پھاٹک سے داخل ہوا۔

''اونچے اونچے ٹوکروں کے درمیان خود بھی ٹوکرا بنا بیٹھا ہے۔'' اس کو ہنسی آ گئی۔ اکہ بھینس والے چھپر کی طرف رک گیا اور شریف کود کر اترا۔ یکے بعد دیگرے ٹاٹ سے سلے ہوئے ٹوکرے اتارے اور پھر پیسے دے کر اکے والے کو رخصت کیا۔

''یہ میرے پیچھے باورچی خانے میں چوریاں ہو رہی ہیں؟''

وہ چونک پڑی۔ ''چوریاں ہو رہی ہیں یا تمہاری ہانڈی ٹھیک کر رہی ہوں۔ وہاں جا کر اسٹیشن پر چپک گئے۔ میں تو سمجھی' ٹکٹ چیکر نے تم کو ٹکٹ چیک کرنے پر لگا دیا۔''

''ارے بھئی! بلٹی چھڑانا ہنسی کھیل تو نہیں۔ یہ سری لڑائی ختم ہو گئی اور اپنے عذاب چھوڑ گئی۔ ہر جگہ جھنجھٹ' ہر جگہ الجھن۔ آخر پہلے بھی تو جب جائیداد بٹی نہیں تھی' ہم نے پچاس پچاس ٹوکرے آموں کی بلٹیاں چھڑائی ہیں۔ اور پھر یوں منٹوں میں تمہارے چچا ابا

اور پھوپھی بیگم کو مدراس اور کلکتہ بھیجی ہیں۔" شریف ہمیشہ پہلے کی بات بڑے زور شور سے کرتا تھا۔

مالی ٹوکرے اندر پہنچا چکا تھا۔ وہ پینٹری سے گزر کر برآمدے میں آ گئی۔ اماں بیگم کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور برآمدے کے فرش پر بھوسا سا بکھرا ہوا تھا۔

مختلف آموں کی ملی جلی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔

"ذرا دیکھی تم نے منشی جی کی عقل! یہ آم وہیں سے بختیار اور صولت کو بھجوا دیتے۔ اب یہ دو ہزار خرچ ہوگا اور وقت الگ ہوگی۔"

جب اپنے ملنے والوں کے یہاں بھیجنے کے لیے وہ کشتیاں لگوا رہی تھیں تو شریف نے پال میں رکھے جانے والے لنگڑے الگ کر کے رکھ لیے۔

"یہ میں الگ سے پال میں رکھوں گا۔ یہ بڑے بھیا کی خاص پسند کی چیز ہے۔ کیا پتہ دس پانچ دن میں آ ہی جائیں۔"

ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ گیتی نے شریف کے ہاتھ سے وہ آم لے کر باقی آموں میں ملا دیئے۔

"اچھا' لو تم یہ کشتی اٹھاؤ اور مالی سے کہو کہ ارجمند کی سسرال پہنچا دے۔"

پھر اس نے الگ لے جا کر کہا۔ "شریف! تم کیوں ہر وقت بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہو؟ اگر آ گئے تو دیکھا جائے گا۔ اماں کو فضول پریشانی ہوتی ہے۔"

وہ اس کی صورت دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد انہوں نے دسہری آم اپنی پلیٹ میں رکھ لیے۔

"آپ لنگڑا لیجئے نا۔ آپ کو تو لنگڑے پسند ہیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں' تم کھاؤ۔ مجھے تو اب ہلکی چیز زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

اور اس وقت اس کو احساس ہوا کہ لنگڑا آم انہوں نے کیوں نہ لیا۔

باہر بوندا باندی ہو رہی تھی اور ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔

اماں بیگم آرام کرنے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ وہ کتاب لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ "ایسی ہی ایک دوپہر تھی' جب پچھلے برآمدے میں بیٹھ کر سجاد بھائی نے سب کے ہاتھ دیکھے تھے۔" موسم سہانا ہو تو بکھری ہوئی یادیں ذہن کے گوشوں میں سمٹنے لگتی ہیں اور نکھر نکھر کر سنورتی ہیں۔ مختلف باتوں اور واقعات کی کڑی سے کڑی جڑنے لگتی ہے۔

اور اسی دن کے بعد سے نہ جانے کیوں صولت آپا مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے تو پوری طرح میرا ہاتھ بھی نہ دیکھا تھا۔

اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ تمام تلخ باتیں یاد آنا شروع ہو گئیں تو پھر اس نے سونے کا ارادہ کر لیا۔ یہ دن اور اس سے پہلے کے تمام دن کتنی خاموشی لیکن سکون سے گزر رہے تھے۔

وہ سو کر اٹھی تو گھٹا ایک بار پھر جھک آئی تھی اور ابھی سے جھٹپٹا سا لگ رہا تھا۔ اماں بیگم ظہر کی نماز کے لیے برآمدے میں نکل آئی تھیں اور اب جاء نماز پر بیٹھی ہوئی دعا مانگ رہی تھیں۔

ان کے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ لرز رہے تھے اور وہ قریب ہی آرام کرسی پر دراز نیم وا آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تو کیا میری ماں تمام عمر اس برآمدے میں اسی تخت پر بچھی ہوئی جاء نماز پر بیٹھی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے مرے ہوئے بیٹے کی عافیت اور واپسی کی دعائیں مانگتی رہے گی؟ اس معمول میں تبدیلی کب اور کیسے آئے گی؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

اس کی آنکھوں میں اتنے آنسو امڈے اور اس نے ان کو اس صفائی سے واپس پلٹایا کہ اس کا گلا بھر آیا۔

اور جب وہ دعا سے فارغ ہوئیں تو اس نے پوچھا۔ ''چائے منگواؤں؟''

''ہاں منگوا لو۔ یہ تمہاری آواز کیسی بھر بھرائی ہوئی ہو رہی ہے؟ آنکھیں بھی سرخ سرخ ہو رہی ہیں۔''

''کچھ زکام سا ہو رہا ہے۔'' وہ جلدی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

''کیسی بدلی ہے یہ! سچ ہے وقت آنے پر انسان بدل ہی جاتا ہے۔ دیکھو جو یہ مزاج باقی رہے۔''

''بیگم صاحب! مبارک ہو پاکستان بن گوا۔'' مالی کے دانت نکلے ہوئے تھے اور آواز میں خوشی تھی۔

''ہیں؟'' گیتی نے چائے دان رکھ دیا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' اماں بیگم کے ہاتھ میں پیالی لرز گئی۔

''مالی! تم بھنگ تو نہیں پی گئے؟'' گیتی ہنسی۔

''اے لو! ہم بھنگ پی گئے اور مارسڑکن پر خبر اڑی اڑی پھر رہی ہے۔ سید صاحب کا بیرا خود اپنے کانوں سن کر آوا ہے۔''

''اے ہے ہوگا پھر ٹھیک ہی۔ ہاں کتنے دن سے تھی تو خبر۔ ہمارے گھر تو جیسے نہ اخبار کا رواج رہا اور نہ ریڈیو کا۔ تم بھی تو اخبار

کھول کر نہیں دیکھتیں۔"

"مالی! اچھا' اگر پاکستان بن گیا تو تم کس واسطے خوش ہو رہے ہو؟" اس نے مالی سے پوچھا۔

"کیوں خوش نہ ہوں' ہمرے صاحب اور بھیا لوگ کتنا چاہ رہے تھے اور صاحب تو آنے جانے والوں سے بس پاکستان کی بات کیا کرتے تھے۔"

"صاحب کی اور بات تھی۔ پاکستان تو مسلمانوں کے لیے بنا ہے مالی!"

اور مالی سٹپٹا گیا۔ اس کی اور مالک لوگوں کی خوشیاں الگ الگ کب تھیں' جو آج وہ خوش نہ ہوتا۔ اس باغ کے پودے پودے کو اس نے اور اس کے مالک نے آنکھوں آنکھوں میں رکھا تھا۔ کونپل کونپل کی خیر منائی تھی اور کلی کلی کے پھول بننے کا انتظار مل کر کیا تھا تو پھر آج ایسی کیا بات ہو گئی تھی جو وہ منہ تھتھا کر بیٹھ جاتا۔

کوئی گیتی کے دل میں چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ "انقلاب آ گیا اور بہت بڑا انقلاب آ گیا۔" وہ اٹھ کر باغ کی طرف چلی گئی۔

مولسری اور چمپا کی بھینی بھینی خوشبو سے باغ بسا ہوا تھا۔ کامنی کی چھتنار جھاڑیوں پر ستارے سے دمک رہے تھے۔ مولسری کے گھنے سائے تلے ننھی ننھی کٹوریوں جیسے نازک پھولوں کا بچھونا ہو رہا تھا اور بانس کے جھنڈ میں بے شمار پستئی پستئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔

دور کہیں پپیہا بول رہا تھا۔

باغ میں پپیہا بولا۔ "میں جانوں' کوئی آیا ری۔"

مالی کی سب سے چھوٹی لڑکی سکھدئی کی باریک آواز فضا میں لہرائی۔

اور گیتی نے چندن کے درخت کے تھالے میں اگتی ہوئی آم کی گٹھلی پر گلابی ڈنٹھل کے سرے پر لگی ہوئی سرخی مائل کتھئی رنگ کی تین ننھی کونپلوں کو دیکھا۔

غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ بڑھے اور اس نے مٹی کے اوپر ہی رکھی ہوئی گٹھلی کو کھینچ لیا۔

تینوں ننھی کونپلیں اور گلابی ڈنٹھل چٹ سے ٹوٹ کر گھاس پر گر پڑے۔ اس نے مٹی میں لتھڑا ہوا بکل اتار کر بجلی نکال لی۔

"بڑے بھیا کیسے مزے سے بجلی کو انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دبا کر پوچھتے۔ بجلی ری بجلی! گیتی کی سسرال کدھر؟ پھٹ سے اچک کر بجلی نہ جانے کہاں جا گھستی اور سارے کے سارے سسرال کی سمت معلوم کرنے کی غرض سے بجلی کو کھوجتے وہ تو ساری ہی لڑکیوں کی سسرالیں معلوم کیا کرتے تھے۔ پھر عصمت آپا کی سسرال پوچھتے تو بجلی جانے کہاں کھو جاتی تھی اور بچارے دونوں اس کو

کھوجتے رہ جاتے تھے۔

''اونہہ! یہ یادیں آدمی کو ستانے کے لیے کیوں اس کی جان کے ساتھ لگی پھرتی ہیں۔ کبھی چھوٹے گا بھی پیچھا ان یادوں سے؟''

وہ جھنجھلائی اور بجلی چندن کے کھردرے تنے سے رگڑ ڈالی۔ اس کا ایک سرا گھس کر پپیا تیار ہو گیا۔ اکھوا پھوئی آدم کی بجلی کی مخصوص پراسرار خوشبو اس کے حواس پر مسلط ہو گئی۔ یہ کتنی مسحور کن خوشبو ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے یا اس میں خود سما جاؤ یا پھر اس میں دانت گڑو کر اس کو چبا چبا کر اپنے وجود میں جذب کر لو۔

بکھٹے سے مزے کا خیال کر کے اس کے مسوڑھوں میں چل سی ہونے لگی۔ پھر بے خیالی میں اس نے آم کی بجلی کا وہ پپیا اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

''پیں۔۔۔۔۔۔۔۔پیں۔۔۔۔۔۔۔پیں!''

اور وہ بھول گئی کہ کوئی انقلاب آ گیا ہے، جسے اس نے ''بڑے انقلاب'' کے نام سے یاد کیا تھا۔

باغ میں پپیا بولا۔

''میں جانوں۔۔۔۔۔۔''

جھولے کی پینگ پر سکھدئی کی آواز لہرائی۔

اور وہ بجلی کے کوندے سے ڈر کر اندر آ گئی۔

باب ۱۷

شریف کے کرتے کے مونڈھوں میں لیس لگی تھی۔ تیل سے چکنائے ہوئے بالوں پر دو پلی ٹوپی جمی ہوئی تھی۔ کندھے پر چار خانے کا رومال تھا۔ کھلے کھلے پائنچوں کے نیچے سے اس کے پرانے پالش کئے ہوئے جوتے جھانک رہے تھے اور دہانہ ایک کان سے لے کر دوسرے تک پھیلا ہوا تھا۔

''بیگم صاب! ہم جما پڑھنے جا رہے ہیں۔'' اس نے حسب عادت اعلان کیا۔

''ارے شریف! اتنی جلدی؟ آج تو حد کر رہے ہو۔'' گیتی نے ٹوکا۔ ''اور ذرا بناؤ سنگھار تو دیکھو جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہے

ہو۔"

"تو اور کیا! یہ عید کی نماز سے بھی زیادہ ہے۔" شریف کی آواز معمول کے خلاف اونچی تھی اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"پاکستان بننے کے بعد پہلے پہل تو جما پڑا ہے۔ مار مجد میں مولوی صاحب نے شامیانے لگوائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں' کام تو اب شروع ہوا ہے۔"

"تو کیا تمہارے مولوی صاحب پاکستان جا رہے ہیں؟"

"پاکستان کون جائے رہا ہے بٹیا! ہم تو خوشی کر رہے ہیں۔ نہ ہم جائے رہے ہیں نہ مولوی صاحب۔"

"تو پھر تم سے مطلب؟"

"چہ۔۔۔۔۔۔ بچہ ہوا بھی' تم کیا جانو۔۔۔۔۔۔۔ بیگم صاب سمجھیں گی ہماری بات۔ کیوں' بیگم! کبھی عرب کا' ایران یا ترکی کا روپیہ یا ٹکٹ نظر آ جاتا تھا تو ہم کیا' اچھے اچھے آنکھوں سے لگا لیا کرتے تھے۔ صاحب تک چوم لیا کرتے تھے روپے کو۔ کاہے سے کہ اپنی اسلامی حکومت کا ہوتا تھا۔"

شریف کی آواز میں خطابت آ چلی تھی۔ پھر بیگم! آپ بتائیے' کبھی خواب میں بھی سوچا ہوگا کہ اپنے ملک میں پاس کے پاس اسلامی حکومت بن جائے گی۔ ارے' ہم تو اس کی خیر منائیں گے۔ ہمارے نصیب کب تھے ایسے۔"

اس کی آواز کا تسلسل بکھر گیا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہچکیوں میں بدل گئی۔

"سچ ہے شریف!" اماں بیگم نے اپنے دوپٹے کے آنچل میں آنسو جذب کئے۔ لیکن وہ نئے سرے سے ابل پڑیں۔ اب روئے زمین پر آ گئی ہے تو اس کو ہر طرح باقی رکھیں گے۔ شریف! ہم جیسے تو دعائیں کریں گے اس کی سلامتی کی۔"

اس روز شریف بغیر کھانا کھائے ہی جمعہ پڑھنے چلا گیا اور چار بجے شام تک پتیلیوں میں کھانا اور باورچی خانے میں جھوٹے برتن بھنکتے رہے۔

عصر کی نماز کے لیے جاتے جاتے اماں بیگم نے کہا۔ "بس یہی تو شریف کی حرکتیں ہیں۔ اب شہر بھر کے صدقے ہوتے اور تقریریں کرتے پھر رہے ہوں گے جوش میں۔"

اور جب وہ سلام پھیر رہی تھیں تو وہ اچکا سا نوجوان لڑکا بڑے مودب طریقے سے ادھر ادھر دیکھتا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور بغیر کسی تمہید کے اس نے کہنا شروع کیا۔

''نیم والی مسجد میں خطبے کے وقت فساد ہو گیا۔ کئی نمازی شہید کر دیے گئے ہیں۔ آپ کا ملازم شریف بھی کام آ گیا ہے۔ آپ اس کی گھر والی کو بتا دیں۔ اب میں چلا۔''

وہ ساکت بیٹھی رہ گئیں اور پھر آواز دی۔

''گیتی! آ کر پوچھو تو یہ کہہ کیا رہا ہے؟''

گیتی کے سوال پر اس نے پھر بے لوچ اور غیر جذباتی انداز میں وہی بات دہرا دی۔

''اور تم کیسے بچے؟'' گیتی کو اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

''میں نماز تھوڑی پڑھنے گیا تھا۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''پھر تم کہاں تھے؟''

''میں' میں کھیل رہا تھا ساتھ والی گلی میں۔''

''تم کون ہو شریف کے؟''

''میں اس کی بھاوج کا رشتے دار ہوں۔''

''تم اس کے کوارٹر کیوں نہیں گئے؟''

''نہیں گیا بس۔۔۔۔۔۔۔ آپ یہ خبر پہنچا دیں۔''

وہ اچھا خاصا گستاخ معلوم ہو رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

''میت کی فکر نہ کریں۔ یہاں جنگل میں لانے سے فائدہ؟'' اس کی آواز بھاری تھی۔ پھر اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ''چاہے کچھ بھی ہو میتیں اچھی طرح دفنائی جائیں گی۔'' اور وہ سٹ سے نکل گیا' جیسے کوئی بدروح آئے اور نکل جائے۔

گیتی کے وہ حواس جو لڑکے کی موجودگی میں برقرار تھے' اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے اور اب زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے تھے اور اس کو اب معلوم ہوا کہ بختیار نے کیوں اماں بیگم سے اتنی بڑی خبر چھپائی تھی۔ ایسی خبریں دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پھر بھی وہ شریف کے کوارٹر کی طرف چلی۔

کمرخ کے درخت کے نیچے کھٹولا ڈالے شریف کی بیوی لیٹی بچے کو دودھ پلا رہی تھی' گیتی کو دیکھ کر بولی۔

''انہی کو پوچھنے آئی ہو گی' وہ میاں کہاں رکھے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اپنے گھوم رہے ہوں گے پالٹی والوں میں۔ جس دن سے

پاکستان بنا ہے گھومائی چڑھی ہے۔ کب کے گئے ہیں جما پڑھنے کو۔۔۔۔۔۔۔"

وہ وہیں بیٹھ گئی۔

"بہو! بات تو سنو۔۔۔۔۔۔۔نیم والی مسجد میں تو بڑا فساد ہو گیا۔"

"ہائیں بٹیا!" اس نے بچے کے منہ پر ہاتھ مار کر دودھ چھڑا لیا اور یونہی الٹے ہوئے کرتے کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ہاں بہو! ابھی خبر آئی ہے۔ چلو تم کو اماں بیگم بلا رہی ہیں۔ بڑا لڑکا کدھر ہے؟"

"وہ ننھیال گوا ہے۔" وہ ایسے بولی جیسے کہیں کوسوں دور سے بات کر رہی ہو۔ وہ دروازے کی طرف گھور رہی تھی۔

اس کا بچہ بھوک سے رو رہا تھا اور دودھ کے بہنے سے اس کا کرتا تر ہو چکا تھا۔

"بہو!" گیتی نے کندھا پکڑ کر ہلایا۔

"ہوں بٹیا!" وہ چونکی۔

"تم کو اماں بیگم بلا رہی ہیں۔"

"تو بٹیا! اب تمرے شریف جما پڑھ کے کبھی نہ لوٹیں گے۔"

اس نے اپنے زانو پیٹ کر کہا اور بچے کو کندھے سے لگا کر کھڑی ہو گئی۔ گیتی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بہو! دوپٹا تو اوڑھ لو۔"

"بٹیا! تو میت کا بیگم صاب کے دھورے ہے؟" اس کی آنکھ میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے دوپٹا اوڑھ کر اسی طرح گھونگھٹ نکال لیا جس طرح وہ اندر جاتے وقت نکالتی تھی۔

گیتی نے دونوں لڑکیوں کے ہاتھ پکڑ لیے۔

اماں بیگم کے پیروں سے لپٹ کر اس نے زمین آسمان ایک کر ڈالا۔ "بیگم صاب! میت تو منگواؤ۔ اپنے شریف کو کا اپنی چوکھٹ سے رخصت نہ کرو گی؟"

اور وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔ "ارے بہو! کس سے منگواؤں؟ خدا لڑکوں کے دم کو رکھے اب تو اس گھر کا مرد وہی تھا۔ ہائے بہو! میں بے دست و پا ہو گئی۔"

جھکے ہوئے سر اور دبے قدموں سے مالی اندر آیا تو گیتی سہم کر اماں بیگم کی پیٹھ پیچھے چھپ گئی۔ بہو کی چیخیں رک گئیں اور اماں بیگم کا

چہرہ فق ہو گیا۔

"یا اللہ! تو عزت آبرو کی خیر رکھیو۔" انہوں نے دھیرے سے کہا۔

مالی کے کلیجے پر گھونسا سا پڑا۔

"بٹیا! مجھ سے ڈر گئی؟ اور جب شریف نہ ہوتا تو بیگم صاب بیٹیوں کے ساتھ مجھے گاڑی میں بٹھا کر سکول بھیجا کرتی تھیں۔"

اس کا دل چاہا' گیتی سے کہے "بٹیا! مجھ سے کیوں ڈر گئی؟ میں تو باغ کا مالی ہوں۔ میں نے تو پودوں کو سینچنا اور پروان چڑھانا سیکھا ہے۔ اور اب میں کس منہ سے کہوں کہ مالی کے دم میں دم ہے تو آپ کو کوئی ڈر نہیں۔" پھر بھی س نے ہمت کر کے کہا۔ "بیگم صاب! بہو سے کہہ دیجئے' میں جندہ ہوں تو شریف اسی چوکھٹ سے رخصت ہوگا۔ آپ لوگ پھکر نہ کریں' میں تو نہیں مر گیا۔"

"ہاں مالی! اب تم ہی ہو۔" انہوں نے مصلحت سے کہا۔ "اب تم باہر جاؤ۔ شریف جن کے ساتھ گیا ہے ان کے ساتھ ہی دفن ہو گا۔"

"ارے مالی! ایک چکو تو ہمارے بھی گھونپ دو' ہم کو کاہے چھوڑو۔" شریف کی بیوی نے بین کیے۔

اور مالی چپکے سے باہر نکل آیا۔

"میں چکو گھونپ دوں' اری بکواسن! میرے آگے بیاہ کر آئی' میں اس کو دولہا بنا کر تیری چوکھٹ پر لے گیا' میں تیرے چکو گھونپ دوں۔"

اس کو پاکستان بننے کے بعد والی بات یاد آ رہی تھی۔ جب اس دن بیگم نے ہنسی میں شریف سے پوچھا تھا۔ "تو شریف! تم پاکستان جا رہے ہو؟" تو وہ کیسے ہمک کر بولا تھا۔ "بیگم صاب! ہم پاکستان جائیں گے؟ ارے! باپ دادا کی ہڈیاں تو یہاں گڑی ہیں اور میں بھلا مرلی کو چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ جو مرلی چلے گا تو میں بھی جاؤں گا۔"

موٹے موٹے آنسوؤں نے راستہ دھندلا دیا اور وہ وہیں چندن کے درخت سے پیٹھ لگا کر نہ جانے کب تک کھڑا رہا۔

اسپرٹ ایمونیا اور ساری دوائیں یوں ہی پڑی رہیں اور آج ان کو ذرا بھی قلب کی گرانی محسوس نہ ہوئی۔ تقریباً نو بجے رات کو گیتی نے چائے بنا کر زبردستی انہیں اور بہو کو پلائی۔ پینٹری میں لنگڑے آم کی پال والا بکس رکھا تھا۔

"ہائے شریف! یہ آم تو تم نے بڑے بھیا کے لیے الگ کیے تھے اور تم ان کے پاس خالی ہاتھوں چلے گئے۔"

وہ جھوٹے برتنوں کے سامنے بیٹھی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔

دروازے تو سرِ شام ہی سے بند تھے' مگر اس کی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ چاروں طرف گھوم پھر کر اطمینان کرے۔

''تم یہاں میرے پاس سونا۔'' اماں بیگم نے اس کو تاکید کی کہ وہ اپنا تکیہ اور چادر لے آئی۔

نہ جانے کس وقت آنسو بہاتے بہاتے بہو کو اونگھ آ گئی اور وہ وہیں زمین پر پڑ گئی۔

گیتی نے چھوٹی سی سوتی پلنگڑی وہیں بچھا کر بچیوں کو لٹا دیا اور کچھ دیر تخت پر لیٹنے کے بعد جھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اماں بیگم! میں آپ کے پاس آ جاؤں؟''

''ہاں! میں خود کہنے والی تھی۔'' ان کے پاس وہ مدتوں بعد لیٹی تھی اور اسے ان کے سینے سے چمٹ کر کیسا عجیب سا لگ رہا تھا۔

''سو جاؤ۔'' انہوں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ لیا۔

تمام رات اماں بیگم کی پلک تک نہ جھپکی۔ ساری رات انہوں نے کبھی اپنے کمرے سے متصل اور کبھی دوسرے کمروں کے قریب ایک ڈنڈے کی کھٹ کھٹ کے ساتھ ساتھ ''ہاہا! جاگتے رہو'' کی صدا سنی تھی۔

باب ۴۷

''بادام کے درخت

ٹھنڈے میٹھے چشمے سارے کنارے جھوم رہے تھے۔

نسیم صبح گاہی کے اثر سے

سر سبز بید مجنوں ہلکورے لے رہا ہے۔

نچلی جھیل سے سنگھاڑے توڑنے کے لیے جاتی ہوئی لڑکیاں خوشی میں مگن عہد قدیم کے گیت گائے چلی جا رہی ہیں۔

اور کشتیاں کھیتا ہوا مسرور و شادماں ہجوم قہقہے لگا رہا ہے۔''

براؤن سوئیڈ کے نرم روئیں دار چمڑے پر اس کا ہاتھ مشاقی سے چل رہا تھا اور بہار کے اس سہے مینگ یون چنگ کا نغمہ خود بخود ذہن سے پھسل پھسل کر اس کے لبوں پر آ گیا تھا۔

جوتے کا جوڑا میز پر پھیلے ہوئے چمڑے سے کٹ کر جدا ہو چکا تھا۔

''اور اب اس چمڑے سے اس جوڑے کا کوئی تعلق' کوئی رشتہ باقی نہیں۔'' اس نے کٹے ہوئے خلا کے درمیان سے جوتے کا کاٹا ہوا خاکہ نکالتے ہوئے سوچا۔

اور پھر گنگنایا۔

''ٹھنڈے میٹھے چشمے سار کے کنارے۔۔۔۔۔۔

لیکن میرا دھیان اپنے دیس کی طرف ہے

کاش! میں وہاں جا سکتا۔''

وہ اسٹول پر بیٹھ گیا اور الماری میں سجے ہوئے آرڈر پر بنے جوتوں کو گھورنے لگا۔

''پتہ نہیں' میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔ نہیں معلوم' آج کسے میری ضرورت ہے۔ اور نہ معلوم کیوں آج نوالے میرے حلق میں پھنستے تھے۔''

دکان کی تنگی اور اس کا چرمی ماحول بڑا پریشان کن معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ چھلانگیں مار کر دکان سے نکل جائے اور بے مقصد سڑکوں پر گھومتا پھرے۔ لیکن سڑکیں بھی تو اس قابل نہ رہی تھیں۔

اس شہر میں جو ایک مدت سے چلا آ رہا تھا' اب ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ یہ اس کا اپنا شہر نہ تھا' پھر بھی وہ واردات جو شہروں پر سے گزرتی ہے' وہ ان میں رہنے والے ہر شخص پر سے گزرتی ہے۔ اس کا دل پریشان اور رنجیدہ تھا اور جب ہی تو اس کو اپنے وطن کا نغمہ بہار یاد آ گیا تھا۔

جوتوں کی کھس کھس پر اس کو گاہک کا شبہ ہوا۔ ادھر دو چار دن سے کچھ ایسی گڑبڑ تھی کہ گاہک کا آنا تعجب خیز بات معلوم ہو رہی تھی۔

اور وہ اتنا بیزار ہو رہا تھا کہ اس نے سوچا۔ ''آتا ہے تو آنے دو' جب آواز دے گا دیکھا جائے گا۔'' وہ اسٹول پر چڑھا بیٹھا رہا۔

مگر یہ کوئی گاہک نہ تھا۔۔۔۔۔۔ جانا پہچانا' مسکراتا ہوا چہرہ اور پرامید آنکھیں بڑی بے تکلفی سے ادھر ادھر اس کو تلاش کر رہی تھیں۔

''اچھا! تو یہ تم ہو۔'' وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بولا۔ ''کسی نے سچ کہا ہے کہ شیطان کو یاد کرو تو۔۔۔۔۔۔''

''وہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ لیکن تم نے یہ بات جھوٹ کہی ہے۔ تم مجھے تو یاد نہیں کر رہے تھے۔''

''اچھا! تو پھر کس کو یاد کر رہا تھا؟''

''مجھے کیا خبر' کسے یاد کر رہے تھے۔ صفدر! اگر اس وقت مجھے یقین ہوتا کہ تم واقعی مجھی کو یاد کر رہے تھے تو میں بخوشی شیطان بننا پسند کر لیتی۔''

''اور جو میں یاد نہیں کر رہا تھا تو تم آ کیسے گئیں؟ جب ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔''

''تم شیطان ہو۔'' مارگریٹ نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ''اور اب تم مزید جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرو' بلکہ اپنے اس اسٹول سے اٹھ کر سامنے آ جاؤ۔''

''خیر' مارگریٹ کچھ ہی ہو۔ تم نے یہ اچھا کیا کہ اس وقت آ گئیں۔ میں آج بہت اداس ہو رہا تھا۔''

''اب تو خوش ہو؟'' وہ بے دلی سے مسکرائی۔ اب اس شخص کے ہونے نہ ہونے سے اس کو واسطہ نہ رہا تھا۔ اس کی طرف سے اس نے غلط فہمی میں مبتلا ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اس کے دل کے کسی کونے میں بھی اس کا وہ مقام نہ تھا جس کی وہ خواہاں تھی۔

وہ خوب سمجھتی تھی کہ وہ اس کو ایک دلچسپ اور وقتی دوست سے زیادہ کبھی نہ سمجھے گا۔ لیکن پھر بھی وہ موقع ڈھونڈتی رہتی تھی کہ وہ اس کے پاس آئے' بیٹھے اور اس کے ساتھ ہنسے بولے۔ اس خیال سے نہیں کہ اس کا دل بدل جائے گا' اس لیے کہ اس سے ہنس بول کر اسے خوشی ہوتی تھی اور انسان کے لیے یہ تھوڑی سی ہنگامی اور عارضی خوشی بھی کچھ کم تو نہیں ہوتی۔

اور اس وقت بھی اس کو اداس پا کر اس کو خوشی ہوئی تھی۔ بلا سے اسی بہانے اسے میرا آنا غنیمت تو لگا۔

''تم کس لیے اداس ہو۔۔۔۔۔۔ خیر تو ہے؟''

''میں کیوں اداس ہوں' میں خود نہیں جانتا۔ لیکن مارگریٹ یہ بتاؤ۔۔۔۔۔۔ کیا تمہیں فضا میں افسردگی اور سناٹا محسوس نہیں ہو رہا؟''

''ہاں' فضا خاموش تو ہے۔ ذرا یہ بھی تو سوچو کہ حادثہ بھی کتنا بڑا ہو گیا۔ حکومت بدل گئی۔'' اس کو سیاست سے کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی اور نہ وہ اس کے متعلق بات کرنا چاہ رہی تھی۔ ''آج دن کتنا اچھا ہے۔''

وہ خاموشی سے باہر دیکھتا رہا' جیسے دن کی اچھائی کا اندازہ کر رہا ہو۔

پھر وہ بولا۔ ''مارگریٹ! تم ان دنوں زیادہ ادھر ادھر مت پھرا کرو۔ شہر کی فضا سخت خراب ہے۔''

''مگر میں نہ یہاں کی رہنے والی ہوں اور نہ ان میں سے کسی کی ہم مذہب۔'' پھر وہ ہنسی۔ ''صفدر یاسین! تم کو خبردار رہنا چاہیے۔

تم ان میں سے ایک فرقے کے ہم مذہب ہو۔“

”کیا واقعی!“ وہ ہنسا اور سوچنے لگا۔”لیکن اس فرقے نے کبھی مجھے اپنا سمجھا؟ کبھی میرا نوٹس لیا؟ وہ تو بس مجھے ایک چینی سمجھتے ہیں۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ ان کے عام لوگوں کے اور ہمارے طرز زندگی میں کتنی بہت سی باتیں مشترک ہیں۔“

”صفدر! یہاں بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اب تو بہتر ہے کہ آدمی یہاں سے چل دے۔“

”ہاں! میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ تم واپس کیوں نہیں چلی جاتیں؟ اب حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔“

”میرے جانے کا حکم آچکا ہے اور اب میں جانے ہی والی ہوں۔ مگر تم کو بھی تو گھر جانا چاہیے۔ تم نے کب سے چھٹی نہیں لی۔“

”میں ابھی نہیں جانا چاہتا اور نہ میں چھٹی لوں گا۔“

وہ دکان کے باہر دیکھنے لگی۔ سڑک پر سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کو یہاں کی فضا اور یہاں کے انسانوں سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو جن کی جنگ لڑنے آئی تھی، ان سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور جب وہ اپنی جنگ جیت گئے تھے، تو کبھی کبھی اس کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ اتنی بڑی جنگ اسی کے بل بوتے پر جیتے ہوں اور فخر سے اس کا سر تن جاتا تھا۔ مگر پھر بھی ایک تشویش ناک افسردگی سارے ماحول پر حاوی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

”یہ کیسی آزادی ہے۔“ اس نے سوچا۔

”صفدر! تم کہتے ہو، تمہاری ماں بوڑھی ہو اور بیوہ۔ اور پھر بھی اس کی زندگی کا اتنا اعتبار ہے کہ تم جب بھی جاؤ گے، وہ تمہارے دیکھنے کو زندہ بیٹھی ہوگی۔ اور پھر تم کہتے ہو کہ تم کو اس سے بڑی محبت ہے۔“

اس کے آخری الفاظ میں زور تھا اور غصہ بھی۔ اور صفدر کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس کو اس شدت سے واپس جانے پر کیوں آمادہ کر رہی ہے۔

وہ کتنی صحیح بات کہہ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی کئی وجوہ کی بنا پر اس کے جلد جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ منجملہ دوسری وجھوں کے ایک ناقابل فہم وجہ یہ بھی تھی کہ نہ معلوم کیوں اس کا دل اس سرزمین سے جانے کو نہ چاہتا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔”مارگریٹ! تمہیں معلوم ہے، تمہارے آنے سے ذرا دیر پہلے میں کیا گنگنا رہا تھا؟“

”تم ہی بتاؤ۔“ مارگریٹ نے اس کی طرف دیکھا۔

''بادام کے درخت

ٹھنڈے میٹھے چشمے سار کے کنارے جھوم رہے ہیں''

مارگریٹ نے دوسرا بند پڑھا اور پہلا بند ادھورا ہی رہ گیا۔

''نچلی جھیل سے سنگھاڑے توڑنے کے لیے جاتی ہوئی لڑکیاں خوشی میں مگن عہد قدیم کے گیت گائے چلی جارہی ہیں

اور کشتیاں کھیتا ہوا مسرور و شادماں ہجوم

قہقہے لگا رہا ہے''

وہ خاموش ہوگئی' لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

''یہ سب باتیں وطن سے تعلق رکھتی ہیں۔''

پھر صفدر نے سگرٹ کا ایک لمبا کش لے کر کہا۔

''مگر تم نے آخری شعر چھوڑ ہی دیا۔ وہ میں مکمل کئے دیتا ہوں۔

''لیکن میرا دھیان اپنے دیس کی طرف ہے

اے کاش! میں وہاں جاسکتا''

اب شام ہورہی تھی۔ دونوں سیلز مین دکان میں آچکے تھے اور اب تک صرف دو گاہک آئے تھے' جن میں سے ایک فقط جوتوں کی قیمتیں پوچھ کر چلا گیا تھا۔

صفدر مارگریٹ کے ساتھ باہر چلا گیا۔

باب ۴۳

وہ حیران اور سراسیمہ کھڑا تھا اور جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ رہا تھا' اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ اس کی موجودگی میں ہوا تھا۔

بھینس کا خالی چھپر ناند میں ادھ کھائی سانی' خالی کھونٹا اور چھپر کی ویرانی' ہر چیز ناقابل یقین تھی۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ رات کی تاریکی میں نہیں دن کی روشنی میں ہوا تھا۔

مختصر سا گروہ باغ کے پچھلے دروازے سے اندر آیا تھا اور بڑے اطمینان سے سانی کھاتی ہوئی بھینس کو کھول کر لے گیا تھا۔ پھر کچھ لوگوں نے کنوئیں میں اتر کر مشین توڑ دی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ اب باغ میں پانی بھی نہ لگ سکے گا۔

اور اس دن تو میں نے بڑی لمبی زبان سے کہا تھا۔ ''بیگم صاب! جب تک میرے دم میں دم ہے' آپ بے فکر رہیے۔''

''اب بھلا میں ان کو منہ دکھانے کے قابل رہا ہوں؟''

وہ چپ چاپ جا کر کوٹھڑی میں لیٹ گیا۔ شریف کے بعد سے بازار اور اندر کا بہت سا کام وہی کر رہا تھا۔

اس دن جب عصر کا وقت بھی تنگ ہو گیا تو اماں بیگم نے جمعدار کے لڑکے سے کہا۔ ''جا! ذرا دیکھ تو' مالی آج اندر آیا ہی نہیں۔''

لڑکا بڑی دیر بعد اندر آیا۔

''جی! مالن کہتی ہے' مالی گیا ہوا ہے۔''

''ارے! تو یہ نہ پوچھا کہ کدھر گیا ہے اور کب آئے گا۔''

وہ لڑکا کچھ عجیب طرح مسکرایا۔

''جی! مالی تو اندر سویا پڑا ہے' پر مالن کہتی ہے کہ وہ گیا ہوا ہے۔''

عجیب اطلاع تھی' نہ معلوم کیوں ان کو زمین اپنے پیروں تلے سے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''گیتی۔۔۔۔۔۔۔!'' انہوں نے آواز دی۔

''جی!'' وہ ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی۔

''ذرا بیٹا! جا کر تو دیکھو' مالی کیسا ہے۔ اس دیوانے کو بھیجا تھا تو کبھی کہتا ہے' وہ گیا ہے' کبھی کہتا ہے' اندر سویا پڑا ہے۔''

ان کا دل نہ چاہتا تھا کہ ایسی ان ہونی بات کا یقین کریں کہ مالی ہوتے ہواتے کہلا دے کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔

''بکواس ہے' یہ تو ہمیشہ کا بوڑم ہے۔'' گیتی نے گیلا تولیہ پھیلاتے ہوئے کہا اور کھڑاویں پہنے پہنے مالی کی کوٹھڑی کی طرف چلی گئی۔

اماں بیگم نے پھر لڑکے سے جرح کی۔

''ارے بندو! تو نے اپنی آنکھوں سے لیٹے دیکھا تھا اس کو؟''

''ہاں جی' پلنگ پر' اندر لیٹا تھا۔ مالن چوکھٹ پر بیٹھی تھی۔ میں جا کر بولا تو وہ کروٹ لے کر پڑ گیا۔''

انہیں کچھ عجیب سے شبے ستانے لگے۔ ''میں نے ناحق ہی لڑکی کو اٹھا کر ادھر بھیجا۔ خیر اب اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔''

''سچ ہی تو کہہ رہا تھا بندو'' اس نے کروٹ لیے ہوئے مالی کو دیکھ کر سوچا۔

مالن اسے دیکھ کر اٹھ کر پاس آ کھڑی ہوئی۔

''کیوں ۔۔۔۔۔۔۔ مالی کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کیسے لیٹے ہیں؟'' اس نے مصلحتاً بڑی نرمی سے پوچھا۔

اور مالن دل میں پچھتائی۔ ''ناحق ہی باہر جانے کا بہانہ کر دیا۔ اچھا خاصا کہہ دیتی' ماندے ہیں۔''

''اچھے ہیں بٹیا! نشہ زیادہ کر گئے ہیں' اس کر کے اندر نہیں آئے' بہانہ کر دیا۔''

اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر ایک اور جھوٹ تحریر تھا اور اب کسی قسم کا سوال بے کار تھا۔

سست اور سوچتے ہوئے قدموں سے وہ واپس چلی گئی۔

''میں اماں بیگم سے جا کر کیا کہوں؟''

آج چھپر سے بھینس کے ڈکرانے کی آواز آ رہی تھی اور نہ کنوئیں سے دھک دھک کی۔

ہر چیز پر کتنا المناک سکون اور قرار طاری تھا۔ چھپر کے قریب آ کر اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ بھینس ناوقت چھپر سے غائب تھی اور کتا بھی موجود نہ تھا۔ اس کے قدم اور بھی سست پڑ گئے۔ شریف کے کوارٹر میں تالا پڑا تھا۔ اس کی بیوی کو اس کا بھائی آ کر لے گیا تھا۔

کئی دن بعد آسمان صاف ہوا تھا اور قوس قزح کے نیلے پیلے رنگ اس سرے سے اس سرے تک نظر آ رہے تھے۔

جب وہ چھوٹی تھی تو شریف اسے دکھایا کرتا تھا۔

''دیکھو بی بی! اللہ میاں کی تیر کمان۔''

وہ آ کر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیوں ۔۔۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟'' انہوں نے سلام پھیرتے ہی پوچھا۔

''مالن کہہ رہی تھیں' نشہ زیادہ کر لیا ہے' اس واسطے بہانہ کر دیا تھا۔''

انہوں نے تسبیح اٹھا لی۔

بھینس کے خالی چھپر کی اطلاع اس کے دل میں اودھم مچائے ہوئے تھی۔ اتنی اہم خبر کو دل میں اکیلے ہی لیے پھرنا بڑے دل گردے کی بات تھی۔ نہیں معلوم' اس خبر کے چھپا لینے کا کیا نتیجہ ہو' اور پھر جب کہ یہ اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ اندرون شہر کے

علاقوں میں وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں' اسے حقیقت حال کا سامنا حقیقت پسندانہ انداز میں کرنا ہی مناسب نظر آیا۔

''اماں بیگم!''

''ہوں!'' انہوں نے تسبیح پر انگلیاں پھیرتے پھیرتے اس کی طرف دیکھا۔

''میں جب اس طرف سے آ رہی تھی تو بھینس کا چھپر خالی پڑا تھا۔'' ان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے' مگر بدستور تسبیح پڑھتی رہیں۔

''نہ بھینس تھی نہ کٹا اور کنوئیں کی مشین بھی نہیں چل رہی تھی۔''

ان کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔

''تو تم نے مالن سے دریافت کیا ہوتا' اب مجھ سے کہنے بیٹھیں۔'' وہ جھلائیں۔

''میں مالن سے کیا پوچھتی اماں! مجھے تو مالی نشے میں نہیں معلوم ہوا۔ البتہ میں نے یہ ضرور اندازہ کیا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ کر کروٹ بدلی تھی۔ اور مالن میرے آگے بڑھنے سے پہلے ہی راستے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مالی کی شرارت ہے۔''

انہوں نے جاءنماز لپیٹی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''دیکھو' تم ایسا کرو کہ اکبر کے والد کو فون کرو۔ میں ذرا دروازے بند کر دوں۔''

''اماں! جمعدارنی کو اندر بلا لوں؟'' اس نے ان کے چہرے پر خطرے کے آثار دیکھ کر سہم کر پوچھا۔

''یہ غلطی بھی نہ کرنا' یہ نیچ لوگ! اگر ان پر ذرا بھی ظاہر ہو گیا کہ ہم گھبرائے ہوئے ہیں تو ان کی ہمت اور بڑھ جائے گی۔''

جس دن سے شریف کا واقعہ ہوا تھا' گیتی ان میں ایک عجیب تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ مفلوج سی کیفیت بتدریج دور ہو رہی تھی' جیسی مظلوم اور مجبوری خاموشی سے وہ دن رات عبادت اور معمولات میں لگی رہتی تھیں' اب وہ بات نہ تھی۔

اب وہ بڑی مستعدی سے اندر سے باہر تک ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں اور اس کی کوشش کے باوجود دونوں وقت کا کھانا خود پکا رہی تھیں۔

اور جب شریف کے واقعے کی اطلاع پا کر ارجمند کے ساس اور سسر آئے تھے اور انہوں نے اصرار کیا تھا کہ وہ دونوں ان کے

یہاں چلی چلیں تو انہوں نے ان کو اطمینان دلایا تھا کہ یہ تو اتفاق تھا کہ جھڑپ ہو گئی۔

اور اس مرنے والے کی قسمت میں شہادت لکھی تھی۔

''اور جو میں چلی جاؤں تو اس کے بیوی بچے کس کے ہو کر رہیں گے۔ میں نے منشی جی کو لکھا کہ اکرام کو بھیج دیں۔''

انہوں نے شریف کی موت کی اطلاع بختیار' صولت اور ارجمند کو خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر بھیجی تھی۔ جس میں سے فقط ارجمند کا جواب آیا تھا۔

بختیار کا جواب نہ آنے پر وہ بالکل نہیں گھبرائیں' اسکیم پر گیا ہو گا وہ۔ اور صولت کے متعلق انہوں نے یہ سوچ لیا کہ ڈلہوزی میں نہیں ہو گی۔ آصف جاہ اپنی والدہ کے پاس جانے کو کہہ رہے تھے' چلے گئے ہوں گے۔

اور جب وہ ہر طرف کے دروازے بند کر کے آئیں تو گیتی نے انہیں بتایا کہ چچا کا ٹیلیفون شاید خراب ہے' اتنی کوشش کی' ہوتا ہی نہیں۔

''اچھا! پھر تم نے شکایت کی ہوتی۔''

''وہاں تو کوئی اٹھا ہی نہیں رہا۔''

''تھوڑی دیر بعد کر لینا۔'' اور وہ باورچی خانے کی طرف چلیں۔

''اب آپ کدھر جا رہی ہیں؟'' وہ خوفزدہ آواز میں بولی۔

''کہیں نہیں بیٹا! تھوڑی کھچڑی چڑھا دوں۔ تم گھبراؤ نہیں' خدا مالک ہے۔'' انہوں نے بڑی ہمت سے کہا۔

ذرا دیر میں وحشت کھا کر وہ وہیں ان کے پاس چلی گئی۔ باورچی خانہ صاف ستھرا تھا۔ کھونٹی پر ابھی تک ملیشیا کا وہ ایپرن ٹنگا تھا' جسے پہن کر شریف کھانا پکایا کرتا تھا۔

ایک اسٹول پر بیٹھی وہ بڑے غور سے دیکھ دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ ''ایسے وقت میں بھی اماں بیگم کو کھچڑی کے ساتھ چٹنیوں کا خیال ہے۔''

اور وہ بڑے اہتمام سے پسی ہوئی کھٹائی میں ملانے کے لیے ہری مرچوں اور پیاز کا قیمہ کتر رہی تھیں۔

''تم چل کر میز لگاؤ' بس کھچڑی میں دم آتا ہی ہے۔''

''اماں بیگم! یہیں کھائے لیتے ہیں۔'' اس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔

''اچھی بات ہے۔'' انہوں نے پتھر کی میز کو صاف کر کے اس پر پلیٹیں رکھ لیں۔ بولیں۔ ''ہمت سے کام لو' اس طرح دل چھوڑنے

سے کچھ حاصل نہیں۔ خدا مالک ہے۔ زندگی باقی ہے تو موت خود حفاظت کرتی ہے۔''

کھچڑی گرم تھی اور مزے دار۔ دو تین نوالے کھانے کے بعد اس نے ان کی طرف دیکھا۔ آنسو پھسل پھسل کر ان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

دروازے اور چٹخنیاں اچھی طرح بند تھیں تو کیا ہوا' کھڑکیوں کے شیشے اتنے لمبے تھے کہ اگر ایک بھی ٹوٹ جاتا تو۔۔۔۔۔۔۔

وہ دونوں اپنے اپنے پلنگوں پر خاموش بیٹھی تھیں۔ اماں بیگم کی زبان پر آیت کریمہ کا ورد تھا۔ ان کی کھڑکی کے بالکل قریب روشنی چمکی اور پھر پردے کی جھری سے گیتی کے منہ پر پڑی۔

یہ شفاف اور لمبے شیشوں والی کھڑکیاں اس وقت کتنی بے ثبات اور غیر محفوظ معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ کھسک کر ان کے اور قریب ہوگئی اور سرگوشی میں بولی۔

''کوئی روشنی ڈال رہا ہے۔''

روشنی ذرا فاصلے پر ہوگئی تو انہوں نے پردے کو سرکا کر دیکھا' کئی آدمی گھوم رہے تھے۔

''لا الہ الا انت سبحانک'' ان کی آواز میں لرزش تھی۔

پھر رفتہ رفتہ ان کا شک اس یقین سے بدلتا گیا کہ کچھ لوگ لالٹینیں اور لاٹھیاں لیے پہرہ دے رہے ہیں۔

اور جب ایک بار ان کی کھڑکی کے قریب کسی نے کھنکار کر زور سے للکارا۔

''جاگتے رہو۔۔۔۔۔۔''

تو اچانک گیتی کے منہ سے نکلا۔

''ارے۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو مالی ہے۔''

باب ۴۷

بشنو از نے چوں حکایت می کند
و ز جدائی ہا شکایت می کند

دبیز اور پیلے کاغذ کے صفحے پر چمکتا ہوا شعر' سنسان اور ویران کمرے میں بکھرے ہوئے ورقوں کے درمیان پھڑ پھڑایا اور ہوا سے اڑ کر اس کے قدموں سے ٹکرا گیا۔

سرخ سرخ آنکھوں سے اس نے پھاڑے ہوئے کاغذ' دواؤں کی شیشیوں اور ایسی ہی مختلف فالتو چیزوں کو بکھرا ہوا دیکھا۔ اس کے تصور میں اب تک لٹتے ہوئے اس گھر کا نظارہ تھا۔ کمروں' غسل خانوں اور گوداموں میں چیزوں اور فرنیچر کی کھینچا کھانچی کا شور۔ قرینے سے الگ الگ کمروں میں لگے ہوئے سامان کا گڈمڈ ہونا اور چیزوں کے بٹوارے پر ان لوگوں کا ایک دوسرے سے الجھنا' ایک ایک چیز پر پوٹا جھکے دینا' ایک ایک کر کے ہر بات اس کی نظروں میں چپک کر رہ گئی تھی۔

لان اور برآمدے میں پڑے ہوئے الٹ پلٹ سامان کو دیکھ کر ایک منٹ کو اس نے سوچا تھا۔

''دیکھو' تو ناس جائے ان کا' سارا سامان گڑبڑ کر کے ڈال دیا اور اکیلے میں اس کو بھلا کس طرح تو جماؤں گا اور کیسے الگ الگ کروں گا۔''

سامان لٹنا تو بیگم صاحب کے سامنے ہی شروع ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جیپ والے سپاہی ان کو اور بٹیا کو نکال کر لے گئے تھے۔

اور یہ جیپ یہاں تک لانے میں اس کو کتنے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ کپور صاحب کے پیروں پڑا تھا اور وہ ان کے سامنے چھاتی کوٹ کوٹ کر رویا تھا' تب جا کر کپور صاحب پورے چھ گھنٹے پیچھے جیپ کا انتظام کر پائے تھے اور اس کے پہنچتے پہنچتے گھر لٹنا شروع ہو گیا تھا۔

وہ دونوں مالن کی چارپائی پر خاموش بیٹھی تھیں اور مالن زمین پر پلنگ کی پٹی کے پاس گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ بیگم صاحب کے سامنے کھلے منہ تو نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

سپاہیوں کے درمیان گھونگھٹ نکالے' اس کی کوٹھری سے نکل کر وہ جیپ تک پہنچی تھی۔ فوجی سپاہیوں کی حفاظت میں جیپ کے اندر انہیں بیٹھا دیکھ کر اس کو محسوس ہوا تھا کہ بڑا بھاری بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہے۔ اور اتنی خوشی ہوئی تھی کہ وہ یہ تک بھول گیا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہ آنے کے لیے جا رہی ہیں۔

اور جب جیپ پھاٹک سے نکل کر دور پہنچی تو اس کو خیال آیا تھا۔ ''میں نے تو آخری بار سلام بھی نہ کیا اپنی بیگم صاحب کو۔'' وہ خالی اور لمبے راستے کو دیر تک دیکھا کیا۔ کوٹھی کے اندر بڑا شور و غل تھا اور راستے خاموش تھے۔ اس شہر میں باقاعدہ فساد شروع ہوئے آج

دوسرا دن تھا۔

پھر جب وہ سرخ مورم والے راستے پر چلتا ہوا واپس آیا' تو مورم اس کے قدموں تلے چر چرائی تھی۔ گھر لٹ چکا تھا اور اب اس کو پریشان کرنے کو کوئی سامان لان یا برآمدے میں بکھرا نظر نہیں آ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ خاموش اور رلتے ہوئے مکان کی طرف بڑھا۔ صاحب کے ویران کمرے میں پھٹی ہوئی کتابوں کے ورق خزاں کے پیلے پتوں کی طرح ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ ان ورقوں میں کیا لکھا تھا' وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ یہ اس کے صاحب کی کتابوں کے ورق تھے' جنہیں وہ سجا کر اس الماری میں رکھا کرتے تھے' جس کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کرچیاں بکھری پڑی تھیں۔

کمرے میں بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ پنکھا کھلا ہی چھوڑ کر چل دیئے تھے۔ پنکھا بند کر کے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

باب ۷۵

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر لی فاں کی بچی سے کھیلنے لگا۔ اس کو واپس جانے کی جلدی نہ تھی۔ اور جب بچی کی ماں اپنی سلائی کا سامان لے کر اس طرف آئی تو وہ بچی کو چھوڑ کر اس سے مخاطب ہو گیا۔

''سنا ہے' تمہارے جانے کی بات پکی ہو گئی ہے۔''

''ہاں' کچھ دن میں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کب جا رہے ہیں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رفتہ رفتہ میں یہاں پر اکیلا رہ جاؤں گا۔''

''نہیں' اکیلے تو نہیں رہ جاؤ گے۔ کچھ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے اور کچھ نئے لوگ آ جائیں گے۔''

''میرا مطلب واقف کاروں سے ہے۔''

''مارگریٹ بھی تو چلی گئی۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

''ہاں' یہی دیکھ لو کہ چلی گئی وہ بھی۔''

''مگر وہ تم سے کتنا کہتی رہی کہ تم بھی چلو' مگر تمہارا تو کوئی ارادہ ہی نہیں ہوا۔''

''اور اب میں پچھتا رہا ہوں۔'' وہ ہنسا۔ ''یہ شہر اتنا سہما ہوا اور پریشان نظر آنے لگا ہے کہ میرا اب یہاں دل نہیں لگ رہا ہے۔''

''ہاں' بہت بڑا انقلاب آ گیا ہے۔ کاروباری اور شہری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ مگر کچھ دن بعد سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ٹھاک نہ ہوگا تو اور ہوگا بھی کیا۔ اس دو چار ہفتے میں کیا کچھ نہ ہو گیا اور کیا کچھ نہ دیکھ لیا۔ گھر بھی لٹے' آگ بھی لگتے دیکھی۔ قافلوں کو آتے بھی دیکھا اور جاتے بھی دیکھ لیا۔ اب ہونے کو اور کیا رہ گیا۔''

اس نے بچی کا ہاتھ اپنے منہ کے پاس سے ہٹایا جو بار بار اس کی ناک پکڑ رہی تھی۔ ''سچ کہتا ہوں' میں ان دنوں بہت پریشان ہو رہا ہوں۔''

''ہوں'' وہ گہری آواز میں بولی۔ ''اب وہ سیاہ بول کے قریب بادامی اور نارنجی ریشم رکھ رکھ کر مناسب رنگوں کی تلاش میں تھی۔ پھر سوئی میں تاگا پروتے ہوئے بولی۔

''شکر ہے کہ ہمارا اس سب جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی میں تو بچوں کو بالکل نکلنے نہیں دیتی۔ ہاں مجھے خوب یاد آیا' صفدر! تم وقت پر خود ہی آ جایا کرو۔ پہلے تو تم کو دیر ہوتی تھی تو میں کسی بچے کو بھیج دیتی تھی۔''

''ٹھیک ہے' میں خیال رکھوں گا۔'' اس کی آواز نہ جانے کیوں کھوئی گئی تھی۔

''لی فاں کی بیگم! تم صحیح کہتی ہو۔ شکر ہے کہ ہمارا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''لیکن نہیں معلوم' کیوں مجھے لگتا ہے کہ میرا اس ہنگامے سے ضرور کوئی تعلق ہے۔ نہیں معلوم' مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ شہر' وطن اور علاقے جیسے الفاظ کبھی کبھی میرے نزدیک اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں اور پتہ نہیں' میرے دماغ کو کیا ہو جاتا ہے کہ سارے بڑے بڑے فاصلے اور فرق کو معدوم سے نظر آتے ہیں۔''

اس نے بچی کو گود سے اتار دیا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''دکان پر جا رہے ہو؟''

''خیال تو ایسا ہی ہے۔'' اتنی بہت سی بند اور مقفل دکانوں کے درمیان پابندی سے کھلتی ہوئی دکان بھی عجیب لگتی ہے۔ کچھ خبر ہے تمہیں' کیوں کھولتا ہوں میں دکان؟''

''کیوں؟'' اس نے اپنا خاموش اور غیر جذباتی چہرہ اس کی طرف اٹھا کر پوچھا۔

''میں شاید اس احساس سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں کہ میں محفوظ ہوں اور اس ہنگامے سے بے تعلق۔''

اور وہ گلی میں نکل آیا۔

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا اس ہنگامے سے تعلق ہے اور میں محفوظ ہوتے ہوئے بھی خود کو غیر محفوظ تصور کر رہا ہوں۔'' اس کے دل نے کہا۔

تمام سہ پہر وہ اپنے کمرے میں رہا۔ اس نے بار بار چائے بنا کر پی۔ آج پھر وہ ضرورت سے زیادہ مغموم تھا۔ پھر اس نے اپنی کتابوں کی مختصر سی تعداد کو ٹٹولا اور ایک کتاب اٹھالی۔ یہ وہی کتاب تھی' جسے پڑھ کر وہ ہمیشہ خوش اور مطمئن ہو جاتا تھا۔

بے صبری سے اس نے ورق پلٹنا اور پڑھنا شروع کئے۔

''چنانچہ درویش اپنی ذات کو ہمیشہ صف آخر میں رکھتا ہے اور پھر اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا مقام صف اول میں ہے۔ وہ اپنے پیکر کو حادث تصور کرتا ہے۔''

جلد جلد ورق پلٹتے رہے اور نظریں سطروں اور مضامین کو چاٹتی رہیں۔ پھر بھی اس کو سکون نہیں مل رہا تھا۔ اس نے کئی ورق ایک ساتھ پلٹ دیئے اور پڑھا۔

''درویش دنیا میں امن اور شانتی سے رہتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کے تمام لوگ ایک ہی نگر کے باسی ہیں' یعنی شہر دل کے رہنے والے۔''

''اس کے نزدیک دنیا کے تمام لوگ ایک ہی نگر کے باسی ہیں' یعنی شہر دل کے رہنے والے۔'' اس نے زیر لب اس فقرے کو بار بار دہرایا اور اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ کیوں بعض وقت علاقے' وطن اور نگر جیسے الفاظ اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔

وہ پڑھتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ لیکن جب دن کے اجالے ختم ہوئے اور شام کی سیاہی نے طول پکڑا تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کی وحشت بھی طول پکڑ رہی ہے۔ پھر اس نے کپڑے پہنے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ کہاں جانے کے لیے؟ یہ اس کو خود معلوم نہ تھا۔

باب ۷۶

اتنی بے سروسامانی کہ یقین بھی نہ آئے۔ جیسے فرضی قصے کہانیوں میں اچانک اور ناگہانی انقلاب آ جائے۔ گیتی کو اس تمام گرد و پیش کو اپنے نہیں' اماں بیگم کے چاروں طرف دیکھ کر وہم ہونے لگتا تھا کہ یہ کوئی پریشان خواب تو نہیں ہے۔

اور عجیب بات تھی کہ وہ خاموش اور مطمئن تھیں اور وہ ہمت جو شریف کے مرنے کے بعد سے ان کے اندر عود کر آئی تھی' بدستور موجود تھی بلکہ شاید کچھ بڑھ گئی تھی۔

ابھی تک بختیار کا پتہ چلا تھا' نہ ارجمند اور صولت سے کوئی رابطہ پیدا ہو سکا تھا۔ اس کے باوجود اب نہ وہ بے کلی تھی اور نہ ہول اور وحشت جو اکیلے شہریار کی خبر نہ ملنے سے ان پر طاری رہتی تھی۔

اب وہ گھڑی گھڑی اپنی اولاد کو وظیفوں کے حصار اور آیت الکرسی کے ورد میں نہ دے رہی تھیں۔ پیال پر بیٹھ کر سیدھی سادی نمازیں پڑھتیں اور مغفرت مانگ کر ہاتھ نیچے کر لیتیں۔

اور جب کیمپ کے بعض لوگوں نے سنا کہ ان کا بیٹا ڈیڑھ دو دن کے فوجی اسکول میں زیر تعلیم تھا اور داماد لیفٹیننٹ کرنل تو انہوں نے ان پر پچھتاوا طاری کرنے کی بہت کوشش کی کہ بھئی' تم تو ان کے حوالے سے فوجی انتظام اور حفاظت میں آسکتی تھیں۔ مگر انہیں اپنی جلد بازی اور بد انتظامی پر ذرا بھی افسوس نہ ہوتا اور پھر وہ اپنا پاندان کھول کر رہی سہی چھالیہ خشک کلھیوں میں پانی ڈال کر پھلائے ہوئے کتھے چونے کی مدد سے پھانکتے ہوئے کہتیں۔

''سب مقدر کی بات ہے۔ تقدیر الہٰی کا بھی کسی نے انتظام کیا ہے۔''

اور پھر وہ پاندان بند کر لیتیں' جس کو وہ ہزار دقت میں بھی ساتھ لائی تھیں۔ اوروں کو دیکھتے ہوئے ان کو یہ بھی غنیمت لگتا کہ پاندان کے علاوہ کپڑوں کے دو بکس' ایک لوٹا' بینک کی کتاب اور اس زیور کی صندوقچی جو ہنگامی تقریبات کے خیال سے بینک میں نہیں رکھوایا تھا' ساتھ آگئی تھی۔

چوتھے روز جب بختیار اور صولت کے پیغامات ریڈیو پر مل گئے تو گیتی کو یاد آیا کہ اسی شہر میں چاچاجی رہتے ہیں۔

وہ باہر نکلی تو یہ شہر اس کو کتنا اجنبی لگ رہا تھا۔ جیسے اس شہر اور اس کی سڑکوں پر اس کے قدم کبھی نہ پڑے ہوں گے۔ اب یہاں رنگ برنگے صافے اور ڈاڑھیاں تھیں اور نہ بے فکر بشاش ہندوؤں کے چہرے۔ شہر خاموش تھا۔ وہ جب میسن روڈ پہنچی تو چاچاجی کے مکان میں تالا پڑا تھا۔ سہمی سہمی سی صورتوں والے عیسائیوں نے اسے بتایا کہ وہ تو ایک ہندو دوست کے گھرانے کو بچانے میں ہلاک ہو گئے۔ ان کا لڑکا مسلم لیگی تھا' اس لیے وہ ہندوستان میں قید ہو گیا اور بوڑھی جب بہت بیمار ہوئی تو اس کا بھائی آکر اسے ملتان لے گیا۔

وہ دیوار سے پیٹھ لگائے اور تالا ہاتھ میں پکڑے دیر تک کھڑی سوچتی رہی۔ ''تو چاچاجی! آپ کو بھی لوگوں نے مار دیا۔ آپ جو نہ کسی سے سوالات کرنا پسند کرتے تھے اور نہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینا۔ پھر بھلا آپ نے دوسروں کے اتنے بڑے معاملے

میں کا ہے کو دخل دیا۔"

پھر اسے چاچی کا خیال آیا کہ وہ عورت جو نہ کسی کے اچھے میں تھی اور نہ برے میں۔ جو صبح کی نماز اور وظیفوں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے گھر کو چندن کر کے ڈال دیتی اور پھر برآمدے کے در میں پیڑھی پر بیٹھ کر کاغذ کی باریک باریک بتیاں بنا کر مصنوعی چھینکیں لیا کرتی تھی۔ آخر اس کو جدائی اور تنہائی کا یہ عذاب کس خطا میں ملا ہے۔ کچھ نہیں خطا وطا' اس دنیا میں بہت گھپلا ہے اور بہت گڑبڑ۔ مقدرات اتنے بے اصول کیوں ہیں؟" وہ چکرائی۔

اور اب اس شہر میں فقط ایک اور واقف کار تھا۔۔۔۔۔۔ اور وہ تھا ایک مختلف رنگ' نسل اور طبقے کا شخص!

"مگر نہیں' میں اس سے اب کسی قسم کی مدد نہیں لوں گی۔ وہ معاملہ میرا اپنا تھا اور یہ اماں بیگم کا معاملہ ہے۔ میں ان کی مرضی کے خلاف ان کو کسی ایسے شخص کا شرمندۂ احسان نہیں کروں گی' جس کو وہ اپنے شایان شان نہیں سمجھتیں۔ ویسے احسان تو ان پر مالی کا بھی ہے۔" مالی کا خیال کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مگر مالی کی بات اور تھی' وہ ان کا نمک خوار اور تنخواہ دار ملازم تھا۔"

پھر یوں تو اس کے کالج کی کئی لڑکیاں اور ان کے گھر والے بھی تھے اور ان لڑکیوں سے ان کی اچھی راہ و رسم بھی تھی۔ مگر یوں اس طرح اور اس حال میں کسی کے دروازے پر جانا کتنی غلط بات تھی۔

"مگر پھر اس جانے پہچانے شہر میں جو اب اس وقت اتنا اجنبی نظر آ رہا ہے' کس طرح اپنے لیے گنجائش پیدا کروں؟"

اس کی کرائے کی سائیکل وائی ڈبلیو سی اے کے پھاٹک کے سامنے رک گئی۔

"نہ جانے' مارگریٹ اس وقت کیا کر رہی ہوگی! مگر نہیں' مارگریٹ عیسائی ہے اور چینی۔ اس کا تعلق نہ ہمارے اس نئے ملک سے ہے اور نہ اس پرانے وطن سے۔ میں آخر اس سے کس طرح کہہ سکتی ہوں کہ انہوں نے ہمیں مار کر نکال دیا ہے اور ہمارا آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

اس وقت اور اس گھڑی اس کو عجیب احساس ہوا۔ جب سارا وقار' تمکنت اور کروفر ختم ہو گیا تو اس کے اندر عزت نفس پیدا ہو رہی ہے۔ یہ وہی تو میں تھی جو ہر بات ہر کسی کے سامنے بے بے تکلف کہہ دینے میں ہرج نہیں سمجھتی تھی اور بڑی بے تکلفی سے صفدر کی دکان میں بیٹھ کر خاندانی الجھنوں کا ذکر کیا کرتی تھی۔ اور اب میں ہوں کہ مارگریٹ کے سامنے اپنے ہم وطنوں کی زیادتی کا ذکر کرنے کے خیال سے شرما رہی ہوں۔"

گرجا کے گھنٹے بڑی بے فکری سے بج رہے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی' چھ بج رہے تھے۔ "آج کا دن بھی یوں ہی ضائع ہو گیا۔"

اس نے سوچا۔ ''اور اب نہ جانے کس وقت جا کر پہنچوں کیمپ تک۔ ''

باب ۷۷

''اماں بیگم! کیا کہیں گی۔۔۔۔۔۔۔ یہ کوٹھی ہے؟''

دو چھوٹے چھوٹے بیڈ روم کا مکان اس کو ان کے لیے بہت چھوٹا لگا۔ وہ پھاڑی ہوئی کتابوں' خالی ڈبوں اور بوتلوں کے درمیان کھڑی سوچتی رہی۔ پھر ٹہلتی ہوئی کھانے کے کمرے میں گئی۔ اس کے بیچ میں ٹھنڈے پانی کا ایک کورا گھڑا رکھا تھا۔ اتنی دور تک سائیکل چلاتے رہنے کی وجہ سے اس کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہ وہیں جھک کر اوک سے پانی پینے بیٹھ گئی۔ سرد پانی خشک حلق سے گزر کر کلیجے تک پہنچ گیا۔ کچھ دیر وہ گھڑا پکڑے کھڑی رہی اور پھر سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید یہ گھڑا وہ مہاجر چھوڑ گئے ہیں' جن کو کسٹوڈین کے آدمیوں نے یہاں سے نکالا تھا۔

''اور اب وہ کہاں گئے ہوں گے؟''

وہ کمرے سے نکل آئی۔ چھوٹے سے گول برآمدے کے ستون سے لگی ہوئی سائیکل لے کر چلی۔ پھر اس کو کچھ خیال آیا۔ کمرے بند کیے۔ کسٹوڈین کا دیا ہوا تالا لگایا اور اماں بیگم کو لینے چلی گئی۔

بے تحاشا بڑھی ہوئی باڑھ سے تقریباً آدھے چھپے ہوئے لکڑی کے سرخ پھاٹک میں تانگہ داخل ہوا تو اس نے دیکھا سرخ اینٹوں کے پاکھے پر سفید پتھر کی تختی پر کالے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ آنند بھون۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ حرف اردو میں لکھے تھے۔

برآمدے میں پہنچ کر اماں بیگم کے قدم لرزنے لگے۔ جیسے ان کو یقین نہ آ رہا ہو کہ ان کے سر پر ایک ایسی چھت ہے' جسے وہ اپنا گھر کہہ سکیں گے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ دیکھو' کب ان کو اس گھر سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ یہ گھر نہ صرف مختصر ہے بلکہ اس کی بناوٹ میں خوش مذاقی کا بھی گزر کم ہی ہے۔

مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ گھر ان کو پسند آ گیا ہے۔ لان کے چاروں طرف قسم قسم کے زرد' سفید' دیسی اور ولایتی گلابوں کے پودے بے توجہی کے باوجود برقرار تھے۔ اور مغربی دیوار پر چھوٹے گلاب کی بیل کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ بے شمار ننھے ننھے گلابوں کو دیکھ کر پہلی بار ان کو لوہے کے گول پھاٹک پر چڑھی اپنی بیل یاد آ گئی۔

شام ہو رہی تھی اور درختوں اور جھاڑیوں میں بسیرا لینے والی خاکستری چڑیاں پھدک پھدک کر شور مچا رہی تھیں۔

گیتی نے راستے میں خریدی ہوئی کوری جھاڑو سے ایک کمرہ صاف کیا اور ایک نرم چٹائی بچھا کر اس پر ان کا پاندان سجا دیا' جس میں اب پانوں کے علاوہ کتھا چونا اور چھالیہ تمبا کو بھی موجود تھی۔

''جتنے یہ نماز پڑھیں' میں چھالیہ ہی کتر دوں۔'' اس نے سوچا اور چھوٹے سے لفافے کا منہ کھول کر تمبا کو ڈبیا میں بھر دی۔ اس پاندان میں احمد حسین کا خوشبودار زردہ قوام اور ورقی الائچیاں رہا کرتی تھیں۔

بلب سارے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ''پتہ نہیں' میٹر بھی کام کر رہا ہے یا نہیں؟'' اس نے پنکھا کھول کر دیکھا۔ شکر ہے کہ وہ چل رہا تھا۔ اس نے سامان کی ٹوکری کو ٹٹول کو موٹی سی موم بتی نکالی اور روشن کر کے کھڑکی میں رکھ دی۔

''یہ اتنی دور اندیش ہے' مجھے تو کبھی خیال ہی نہ تھا۔ ضرورت کی ہر چیز مہیا کر لی۔'' اماں بیگم نے چٹائی' موم بتی اور بھرے ہوئے پاندان کو دیکھا۔ ''اس وقت تو میرے لیے بیٹا ہو گئی یہ۔''

وہ یوں ہی کھلے دروازے کے بیچ میں زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کی شلوار میلی ہو رہی تھی اور بھوری قمیص جگہ جگہ سے سلی ہوئی تھی۔

◆◆◆

فصل ہشتم

باب ۷۸

وہ تھا تو چھوٹا اور فقط دو کمروں کا کاٹیج مگر بڑا اجلا' روشن اور آرام دہ تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ڈھلان پر تھا اور اس کو اور اس کے بچوں کو چڑھنے اترنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوتی تھی۔ وہ دو مہینے سے یہاں مقیم تھی اور پہلی بار پہاڑ پر آئی تھی۔

''یا اللہ! یہ پہاڑ اتنے خوبصورت ہوتے ہیں اور پھر میدانوں کے ہزاروں لاکھوں لوگ انہیں بن دیکھے ہی مر جاتے ہیں۔'' اس نے کئی بار سوچا تھا۔ اور ان دنوں وہ بڑی باقاعدگی سے طلعت اور امی جان کو خط لکھا کرتی' جن میں موسمی کیفیات اور ماحول کے حسن کا ذکر ہوتا اور وہ اپنے ننھے سے کاٹج کے چڑھائی والے پتھریلے زینوں سے لے کر باورچی خانے کے پیچھے بہنے والی پانی کی اس نالے نما دھار تک کا ذکر بڑی تفصیل سے لکھتی' جس کے ساتھ سیاہ' سفید اور کائی زدہ سبز پتھر تھے۔

پھر سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل ذکر بات تو یہ تھی کہ اتفاق نے اسے اور صولت آپا کو یکجا کر دیا تھا۔ اگرچہ ان کا کاٹج بہت بلندی پر تھا اور وہاں تک پہنچنا خاصا دشوار کام تھا۔ وہ اسے بازار میں اپنی بچی کے ساتھ کھلونوں کی دکان میں ملی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران بھی ہوئی تھیں اور پھر سگی چچازاد بہنوں کی طرح گلے بھی ملی تھیں۔

''تم یہاں کیسے ہو عصمت؟'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''صولت آپا! زبیر کی پوسٹنگ ہو گئی ہے یہاں پر' زبیر تو اب پبلک ریلیشنز میں ہیں نا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک گئی تھیں۔

اس کے علاوہ وہ یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ اب آپ زبیر سے ملیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔ وہ تو دن بدن اتنے خوبصورت اور اسمارٹ ہوتے جاتے ہیں۔

اور صولت نے اس کی روشن پیشانی' چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سوچا تھا۔ ''یہ عصمت تو بڑی حسین ہوتی جا رہی ہے۔''

پھر جب اس نے جھک کر اپنے لڑکے کو گود میں اٹھایا اور کہا۔ ''خالہ بیگم کو آداب کرلو۔'' تو صولت نے چونک کر پوچھا تھا۔ ''تو زبیر پبلک ریلیشنز میں آ گئے؟ کب سے ہو یہاں پر؟'' اور پھر ذرا دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ ''ہاں' اس لڑائی نے تو ہر شخص کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔''

مگر عصمت کو صولت آپا سے یوں غیر متوقع طور پر ملنے کی اتنی خوشی تھی کہ ان کے فقرے پر غور ہی نہ کیا۔ ارادہ تو اس کا یہی تھا کہ وہ بچے کو اس وقت کوئی معمولی سی چیز دے کر بہلا دے' لیکن اب صولت آپا اور ان کی بچی کی موجودگی میں منک منک کر چلنے والی بطخ دلوانا پڑی تھی۔

''پتہ تو آپ کا میرے پاس تھا' مگر زبیر کو فرصت ہی نہیں تھی جو ہم آپ کا گھر ڈھونڈتے اور میری طبیعت کچھ ادھر ایسی ہی رہتی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''ہاں' یہ تو ہے'' صولت بھی جبراً مسکرائی۔ ''بس اب تو یہ ہے کہ اتفاقیہ ہی ملنا رہ گیا ہے۔''

''پھر آپ اس وقت چلئے نا میرے ساتھ۔''

''اس وقت تو تم مجھے معاف کردو تو اچھا ہے۔ دیر سے نکلی ہوئی ہوں اور یہ سیما بھی تھک گئی ہے۔ اور اب تمہارے بھائی بھی تو گھر ہی پر ہوتے ہیں۔'' اس کی آواز تھکی ہوئی سی تھی۔

''اچھا' ٹھیک ہے۔'' عصمت کی گردن جھک گئی تھی اور اب اس کو اپنی بے تحاشا خوشی پر غصہ آ رہا تھا۔ ''ناحق ہی میں ان کو دیکھ اتنا گھگیا گئی تھی۔''

وہ کاؤنٹر کی طرف بل چکانے چلی گئی۔

اور تب جانے کس خیال کے تحت صولت نے پھر اس سے کہا۔ ''عصمت بی بی! پھر چلو' اس وقت تمہارا گھر دیکھے لیتے ہیں اور پھر کسی دن ہم دونوں تمہاری طرف آ کر کچھ وقت گزاریں گے۔''

عصمت پھر خوش ہو گئی۔ اصل میں وہ صولت آپا کو اپنا ننھا سا کاٹج بھی دکھانا چاہتی تھی' جسے اس نے انتہائی خوش مذاقی اور ماحول اور موسم کی مناسبت سے سجایا تھا۔

''اصل میں صولت آپا! میں گھر کی ڈیکوریشن کے سلسلے میں آپ سے کچھ مشورہ بھی لینا چاہتی تھی۔ خیر' پردے وردے تو میں نے ڈال لیے ہیں' لیکن ابھی کچھ چیزیں بس ہم نے لی نہیں ہیں۔''

یوں یہ کہہ دینے سے اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ اس کے گھر میں بے حد کم سامان دیکھ کر یہی خیال کریں گی کہ ابھی چیزیں خریدنا باقی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے چارخانے کی زرد سلک کی ساڑھی اور بہت ہلکے بادامی رنگ کے بے حد سمارٹ بلاؤز میں وہ اپنے گھر میں کھڑی واقعی بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔

''آخر تو یہ میری سگی چچا زاد بہن ہے۔'' صولت نے سیاہ برمی چپلوں میں پھنسے ہوئے اس کے خوبصورت اور اجلے پیروں کی طرف دیکھا۔

لڑکے کو آیا کے حوالے کر کے وہ نشست گاہ میں واپس آئی اور وہیں اس کے برابر بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ عین جس وقت آیا نے اس کے سامنے کافی کا سامان لا کر رکھا اور اسی وقت زبیر داخل ہوا۔ اس کی چونکا دینے والی تندرستی اور چہرے کے نکھار کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ اسے پہچان نہ سکی۔

''خوب! تو تمہاری بہن بغیر ڈھونڈے ہی مل گئیں۔'' وہ خوشدلی سے ہنسا۔

''دیکھ لیجئے جناب! آخر کو میں نے خود ہی ڈھونڈا اور آپ آج کل پر ٹالے چلے جا رہے تھے۔''

''چلو اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ تم نے اپنی بہن کا پتہ خود ہی لگا لیا اور ہم تو ایسے ہیں کہ ڈھونڈتے رہتے اور کھوج ہی نہ ملتا۔''

وہ نہیں چاہتی تھی کہ زبیر اس کی گھر آئی بہن کی دل آزاری کرے جلدی سے بولی۔

''زبیر! تمہارے دو تار آئے ہیں۔''

''اچھا کوئی بات نہیں۔ تم کافی تو پلاؤ، تار تو آتے ہی رہتے ہیں۔''

''آصف بھائی کہاں ہیں؟'' زبیر نے صولت سے سوال کیا۔

''یہیں ہیں۔''

''تعجب ہے۔۔۔۔۔۔۔نظر نہیں آئے تم لوگ کبھی ورنہ پہلے۔۔۔۔۔۔۔''

''زبیر! تم کتنے بدل گئے ہو۔'' آخر صولت سے ضبط نہ ہو سکا۔

''ہاں، مگر تم ذرا نہیں بدلیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر کافی کی پیالی رکھ کر بولا۔ ''کچھ شہریار بھائی کا معلوم ہوا؟ ہمیں

تو آخری خبر یہی ملی تھی کہ لاپتہ ہیں۔ دیکھو' قسمت کی بات ہے۔ خیر سلامت رہیں تو انے کی امید ہمیشہ باقی رہے گی۔''

عصمت نے سر جھکا لیا اور سوچا۔

''بھائی تو وہ میرا تھا' اس کے متعلق پوچھنا تو مجھے چاہیے تھا۔ لیکن پتہ نہیں' کیوں ان کے سامنے ان کا نام لینے کو جی نہیں چاہتا۔''

اس کو بے وجہ ہی ایک احساس جرم ستاتا رہتا تھا کہ وہ گھر سے بے گھر اس کی وجہ سے ہوا ہے۔

''میں چاہوں تو ابھی ابھی تم کو ان کا پتہ بتا سکتی ہوں کہ وہ اب کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن میں ہرگز تمہاری بیوی کے سامنے نہیں بتاؤں گی کہ میرا وہ بھائی اس دنیا میں نہیں ہے' جو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور جسے یہ پسند کرتی تھی۔ اور اب دیکھو' کس طرح تمہارے گھر خوش خوش بیٹھی ہے۔ بات یہ ہے کہ زبیر خاں' کہ یہ تھی بھی تمہارے لائق۔ یہ مختصر سا خوش وضع سا کاٹج ہی اس کو زیب دیتا تھا۔'' صولت سوچتی چلی گئی اور پھر اچانک ہی غصے سے اس کا خون کھول گیا۔ لیکن اس نے بڑی آہستگی سے پیالی میز پر رکھی اور پھر افسردگی سے بولی۔ ''عصمت! ذرا بچوں کے پاس سے سیما کو بلوادو' اب چلنا چاہیے' بارش ہونے والی ہے۔''

پھر وہ اس کو ڈھلان تک چھوڑنے آئے تھے اور واپس آتے وقت دونوں بالکل خاموش تھے۔ بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔ صولت کو نارنجی رنگ کی جاپانی چھتری سنبھالے رکشا میں بیٹھتے دیکھ کر اچانک ہی زبیر نے کہا۔

''واقعی! اس کا حسن لازوال ہے۔ تم نے غور کیا' یہ کتنی افسردہ تھی۔''

''اتنا کم وقت ٹھہریں کہ ارجمند کی شادی کے متعلق بھی کچھ نہ پوچھا۔ بختیار اور گیتی کو بھی نہ پوچھ پائی' نہ بڑی اماں ہی کی خیریت معلوم ہوسکی۔''

''بات یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں انسان مبہوت ہو جاتا ہے۔'' زبیر نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''زبیر! مجھے ایک بات بتاؤ گے؟'' عصمت نے غیر مطمئن اور بے چین نظروں سے اس کی نگاہ کی گہرائیوں کو ٹٹولا۔

''ارے' بس تمہارا اتنا چھوٹا سا دل ہے۔'' زبیر نے اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

باب ۷۹

صولت نے ان کو اپنے گھر مدعو نہ کیا' لیکن عصمت اس سے دوبارہ ملنے کی خواہشمند تھی۔ اب ایک ہی جگہ رہ کر سگی چچازاد بہنیں ہفتے میں ایک مرتبہ بھی نہ ملیں تو اندھیر ہے نا۔

صبح سے بارش ہورہی تھی اور جیسے ہی ترشح رکا' وہ روانہ ہو گئے۔

''تم پھر مجھے زبردستی لے جا رہی ہو' پھر تم شک کرو گی عصمت آرا۔۔۔۔۔۔۔۔اور یہ بہت غلط بات ہے۔''

وہ یوں مسکراتا ہوا کتنا پیارا لگ رہا تھا۔

''میں تم کو لے بھی جاؤں گی اور شک بھی کروں گی۔'' وہ خود بخود اس کے بازوؤں میں آ گئی۔ ''تم کو معلوم ہے' تم کتنے قیمتی ہو۔''

''عصمت! ایک بات بتا دو۔''

''پوچھو۔'' اس نے بڑے لگاؤ سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم کو شہریار کبھی یاد نہیں آتا؟''

''کون۔۔۔۔۔۔۔بڑے بھیا؟ میں ان کو یاد کیوں نہیں کرتی' اللہ انہیں واپس لائے۔''

''عورت بڑی چالاک ہوتی ہے۔'' وہ ہنسا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل آیا۔

صولت ولا کے سرخ پتھروں سے بنے راستے کو طے کرتے کرتے جیسے کسی نے عصمت کے قدم پکڑ لیے۔ ناحق ہی میں ان کو اپنے اس چپے بھر کے کاٹج میں لے کر گئی تھی۔ اب اتنے عالیشان گھر میں رہنے والی کو تو یقیناً وہاں پر خفقان ہی ہوا ہو گا۔

کال بیل کے جواب میں اتنی بڑی بڑی اور گھومی ہوئی مونچھوں والا بیرا نکلا تھا کہ عصمت کو خفقان سا ہونے لگا اور پھر وہ ادب سے سر جھکا کر ان کو اندر لے گیا۔

وہ ابھی تک رات کے لباس میں تھی۔ آسمانی پھولدار گاؤن اور فر لگے ہوئے جوتوں میں بے آواز قدموں سے چلتی وہ ایک موہوم خواب لگ رہی تھی۔

زبیر بڑی خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا اور عصمت نے آج بیٹھتے ہی سب کی خیریت پوچھنا شروع کر دی۔ اسی دوران میں عنابی رنگ کے سنہری کیریوں والے ڈریسنگ گاؤن میں آصف جاہ کمرے میں داخل ہوئے۔

ان کی شادی کے بعد عصمت نے آج دوسری مرتبہ انہیں دیکھا تھا۔

''آداب! آصف بھائی!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جیتی رہو' بی بی! شکل سے تو تم صولت کی کزن ہی معلوم ہو رہی ہو' لیکن۔۔۔۔۔۔۔''

''چچی جان کی بڑی بیٹی اور ان کے دولہا زبیر ہیں۔'' صولت نے ان کی طولانی تمہید کو مختصر کر دیا۔ اس کو آصف جاہ کا بالوں سے

محروم چکنا سر، موٹی موٹی جھریوں سے ڈھکی ڈھکی آنکھیں اور ڈریسنگ گاؤن میں سے ابلتے ہوئے پیٹ کی گولائی تکلیف دہ حد تک شرمندہ کر رہی تھی۔ اور وہ تھے کہ پائپ ہاتھ میں لیے آرام سے صوفے پر دراز زبیر سے باتوں میں غرق تھے۔ بات آزادی اور اس سلسلے میں ہونے والے فسادات سے چل کر جنگ پر آ گئی تھی۔

زبیر کے سوالات کے جواب میں وہ اپنے جنگی تجربات کے متعلق بڑی دلچسپ معلومات فراہم کر رہے تھے۔

اور صولت' عصمت سے باتیں کرتے کرتے سوچ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ ''تم کو شرم بھی نہیں آ رہی ہے آصف جاہ! جو تم زبیر کے کندھے سے کندھا ملائے یوں باتوں میں مشغول ہو' تمہارے مقابل آئینہ ہوتا تو تم کو معلوم ہوتا کہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تم کتنے مکروہ اور بوڑھے نظر آ رہے ہو۔ ٹھیک ہے' تمہیں احساس کیوں ہو گا۔ تم نے کارنامے کیے ہیں اور اسی لیے تمہیں اپنے ظاہر اور دکھاوے کی کوئی پرواہ نہیں' لیکن میرے باطن میں کوئی کارنامہ نہیں ہے' بجز اس کے کہ میں نے اپنی ماں کے مشورے پر سر جھکا کر تم کو قبول کر لیا تھا۔ اس لیے مجھے اپنا اور اپنے گرد و پیش کا دکھاوا بہت عزیز ہے۔''

اس نے یہ سب کچھ سوچا اور اپنی بہت خوبصورت آنکھوں کو بڑی نرمی سے اٹھا کر آصف جاہ کی بات کاٹی۔ ''آپ نے اپنی گولیاں تو کھالی ہیں نا؟''

''ارے بھئی' کھالیں گے گولی بھی۔'' وہ ہنسے تو ان کا سارا ڈھیلا ڈھالا وجود ہلنے لگا۔ ''یہ بھئی! حد سے زیادہ خیال کرنے والی بیوی بھی زحمت ہی ہوتی ہے۔ کیوں بھئی' زبیر میاں! تمہارا کیا تجربہ ہے؟''

''بالکل یہی خیال ہے اور اس خاندان کی لڑکیاں تو بس بڑھیوں کی طرح خیال کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بیوی سے زیادہ میری اماں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔''

''دیکھ رہی ہیں آپ صولت آپا! یہ مرد کہتے ہیں کہ مبالغہ عورتیں کرتی ہیں اور خود کیسی بڑھا کر بات کرتے ہیں۔'' عصمت ہنسی۔ ساتھ ہی زبیر اور آصف جاہ بھی ہنس پڑے۔

پھر زبیر نے صولت کی نرمی سے اٹھی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر سوچا۔ ''تم واقعی اب تک ایک نغمہ ہو اور سحر' ایک نہ ٹوٹنے والا طلسم۔''

اسی وقت کھانا لگنے کی اطلاع آ گئی اور کھانے کے دوران ہی میں صولت نے آصف جاہ کو یاد دلا دیا کہ آپ کو فوراً آرام کرنا ہے اور یہ کہ تین بجے چائے پر پہنچنا ہے۔

ہاتھ دھوتے وقت زبیر نے عصمت کو دھیان دلایا۔ ''میرے خیال میں کافی دیر بیٹھ لیے ہیں اور یہ لوگ آرام کریں گے' پھر ان کو

کہیں جانا بھی ہے۔''

''ہاں' میں نے صولت آپا کی بات سن کر یہی سوچا تھا کہ اب چلنا چاہیے۔''عصمت زبیر کے سامنے ایسی بات پر کچھ خجل سی نظر آ رہی تھی۔

ان کے پھاٹک سے نکلتے نکلتے زبیر نے کہا۔

''یہ آصف بھائی بڑے معقول اور نیک مزاج معلوم ہوتے ہیں' تمکنت تو ان میں ذرا بھی نہیں۔''

''ہاں!''اس نے کہا اور خاموش رہی۔ وہ شاید تھک گئی تھی' اسی لیے پریشان سی نظر آ رہی تھی۔

ان کے نکلتے ہی صولت نے سوچا تھا۔

''آخر ان رشتے داروں سے بھی انسان چھٹکارا پا سکتا ہے کبھی کہ نہیں۔''

وہ تو شاید عرصے تک اب ادھر نہ جاتی' کیونکہ اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ صولت کو اس سے مل کر کوئی خاص مسرت نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دن صبح صبح وہ اس کو آتا دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

صولت نے آتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

''چچی جان کا کوئی خط تو نہیں آیا؟''

''اے ہے۔۔۔۔۔۔کیا بات ہے؟ کیا وہاں بھی فساد ہو گیا؟''وہ ہول گئی۔ ایک ہفتے سے یوں ہی پریشان کن خبریں آ رہی تھیں۔

''نہیں' ابھی تک تو خبر نہیں۔۔۔۔۔۔یوں ہی پوچھا تھا۔''

''کہاں آیا؟ میں تو پریشان رہتی ہوں۔ آپ کے پاس بڑی اماں کا خط آیا؟''

''دیکھا! میں نہ کہہ رہی تھی اور زبیر نے مجھے بے وقوف بنا لیا کہ نہیں' بھلا ایسا بھی کیا ہے۔ نواحی بستیوں میں دو چار وارداتیں ہو گئی ہوں گی۔ اخبار یوں ہی بڑھاتے ہیں بات کو۔''

''ہاں! زبیر نے تمہاری حالت کے پیش نظر بات بنا دی ہو گی۔''وہ سخت پریشان نظر آ رہی تھی۔

''تو پھر صولت آپا! تار دیا ہوتا۔ زبیر نے کتنا برا کیا کہ مجھ سے چھپا لیا۔''

''تم کیا کر لیتیں؟''صولت کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو چمکنے لگے۔''تم کو پتہ ہے' کسی خط' کسی تار اور کسی ٹرنک کال کا

جواب نہیں مل رہا تھا۔ آج آصف نے سگنل کے ذریعے پیغام بھجوایا ہے۔ کہا تھا' اطلاع ملتے ہی تم کو فون کروں گا اور جب میں نے کیا تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے مجھے بہلا رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟'' صولت کے آنسو دیکھ کر اس کے بھی آنسو نکل آئے۔

''کہنے لگے' جب لائن خالی ہوگی تو سب سے پہلے تمہارا پیغام پہنچے گا۔'' اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''مجھے یوں لگتا ہے' میری ماں ختم ہوگئی۔''

''یوں نہ کہئے' صولت آپا! اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔'' وہ اس کو گلے سے لگا کر دلاسا دینے لگی۔

''کیا حفاظت کرے گا۔ اس نے آگے کس کی حفاظت کرلی۔ بھائی میرا ختم ہوگیا' جنگ کی نذر ہوگیا۔''

''ہیں!'' وہ حیرت سے بولی۔ ''یوں تو نہ کہئے' خدا ان کو واپس لائے۔''

''لا چکا واپس۔۔۔۔۔۔!'' صولت نے رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔ ''عصمت! یہ خبر ہم نے اپنی اماں کی وجہ سے چھپا رکھی تھی۔''

عصمت اس کے پاس سے اٹھ کر دوسری طرف بیٹھ گئی۔ اس کو خوف تھا کہ کہیں وہ صولت کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر چلانا شروع نہ کر دے۔ یہ تم ہو صولت آرا بیگم! جس نے اس کو ختم کر دیا اور الزام جنگ کو دیتی ہو۔'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔

اور اس کو سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر صولت نے سوچا۔

''تم کھا گئیں اس کو ڈائن کہیں کی! اور اب کیسی خوش ہو' مطمئن ہو' کیسے میرے سامنے زبیر سے ہنس ہنس کر لگاوٹ کی باتیں کرتی ہو' جیسے تمہارا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ ٹھیک ہے' تم خوش رہو' زبیر تو سلامت ہے۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا! میں چلتی ہوں۔''

''ابھی سے۔۔۔۔۔۔ بیٹھئے تو۔'' دھنسی ہوئی اور زبردستی نکالی ہوئی آواز میں اس نے اوپری دل سے کہا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

''نہیں' جا کر دیکھتی ہوں' شاید کوئی جواب آیا ہو۔''

''اگر آپ کے پاس کوئی جواب آئے تو زبیر کے دفتر فون کر دیجئے گا۔ یہ نمبر ہے۔'' اس نے زبیر کا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا

اور دروازے کا سہارا لے لیا۔ اس کو چکر آ رہا تھا۔

اور پلنگ پر لیٹے لیٹے اس کو یاد آیا۔ میرے کہنے پر کیسی پھرتی سے پیپل کے پیڑ پر چڑھ کر بلبل کے بچے اتار لائے تھے۔ پھر بلبل کو بلکتے اور شور مچاتے دیکھ کر میں نے ان کو مجبور کیا تھا کہ واپس رکھ آیئے۔ یہ بلبل آپ کو کوسے گی' تو کیسے میرے چپت لگا کر بولے تھے۔ ''تو مجھے اتنا کیوں ستاتی ہے؟ پہلے بچے اتروائے اور اب رکھوا رہی ہے؟''

''بڑے بھیا! یہ تم کو کوسے گی۔''

''پھر کیا ہوا' مر جاؤں گا۔''

''واہ' اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔۔۔کیوں مریں!''

پھر جب وہ بچے رکھنے چڑھے تھے تو صولت آپا اسی وقت بڑی اماں سے شکایت لگا آئی تھیں اور اس دن ان کی کتنی پٹائی ہوئی تھی۔ میں اس دن بھی روئے تھی ان کے ساتھ ساتھ۔

اس نے تکیے پر منہ اوندھا لیا اور سسکیوں سے اس کا سارا وجود ہلنے لگا۔

باب ۸۰

بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے مایوس ہو کر اس نے تانگہ لینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔

''گیتی!''

چونک کر وہ پیچھے مڑی اور پکارنے والے کو بغور دیکھا۔

بڑھے ہوئے شیو والا یہ شخص صرف قمیص پاجامے میں تھا اور باوجود اترتے ہوئے چہرے کے تندرست اور جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔

اس کو خاموشی اور حیرت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ اور بھی ملول ہو گیا۔

''تم نے مجھے پہچانا نہیں' لیکن اپنی بہن کو تو شاید نہ بھولی ہو گی؟''

اس کی آواز نے گیتی کو چونکا دیا۔

''کون۔۔۔۔۔۔زبیر بھائی۔۔۔۔۔۔اللہ! آپ کتنا بدل گئے۔''

''میں بدل گیا۔۔۔۔۔۔۔۔واقعی؟''

''بہت'' وہ بے صبری سے بولی۔ ''اور عصمت آپا کہاں ہیں؟ آپ کب آئے؟ سب خیریت تو ہے؟ کس طرح آئے؟''

''جس طرح سب آ رہے ہیں۔ عصمت میرے ایک دوست کے یہاں ہے۔ تم یہاں کب پہنچیں اور کون کون ساتھ ہے؟ بختیار کہاں ہیں؟''

وہ اس کی سستی چپل' لباس اور بس اسٹینڈ پر کھڑے ہونے ہی سے ان کے حالات کا اندازہ لگا چکا تھا۔

''یہاں صرف میں اور اماں پہنچے ہیں اور بختیار بھائی کا صرف ریڈیو پر ہم لوگوں کے متعلق اعلان سننے میں آیا تھا۔ اب مجھے یہاں آئے تقریباً ایک مہینہ ہو رہا ہے۔''

''پھر گیتی! کہیں ٹھکانہ مل گیا؟ کہاں ہو؟ چچی اماں تو اچھی ہیں؟''

''ٹھیک ہیں' آپ کو کوئی خاص کام نہ ہو تو ٹھکانہ چل کر دیکھ لیجیے۔ ورنہ پھر ہم آپ کیسے ملیں گے؟''

''ہاں' یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نظر آ گیا تو پھر اس کو تلاش کرتے پھرو۔''

''چلئے' پھر تانگہ کئے لیتے ہیں۔''

''تم آ کدھر سے رہی ہو؟''

''آفس سے۔''

''کہیں کام کر رہی ہو؟''

''جی''

''کہاں؟''

''کسٹوڈین کے آفس میں۔''

اس نے سر سے پیر تک اس لڑکی کو دیکھا' جس کو چند سال پہلے اس نے خاصا چھوٹا دیکھا تھا۔

''کیا کام کرتی ہو؟''

''اسٹینو کا۔''

تانگہ مڑتے مڑتے اس نے کہا۔ ''رہ رہ کر یہ بات ذہن میں آتی ہے زبیر بھائی! کہ آپ کہاں تھے اور چچی جان اور طلعت کہاں

ہیں؟''

''وہ لوگ وہیں ہیں۔طلعت نے ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔وہاں فساد نہیں ہوا۔ہم البتہ رفیوجی ہوکر آئے ہیں' ڈلہوزی سے۔''

''ڈلہوزی' زبیر بھائی! آپ ڈلہوزی میں تھے؟ تو آپ کی ملاقات آصف بھائی وغیرہ سے ہوتی ہوگی۔'' اس نے صولت کی بجائے آصف جاہ کا نام لیا۔

''ہاں' گیتی! تمہاری صولت آپا سے ہماری ملاقات ہوتی رہی تھی۔عصمت ایک دن کو پکڑ لائی تھی۔پھر ہم بھی گئے تھے' ان کے گھر ایک دن۔پھر ایک مرتبہ وہ تم لوگوں کے سلسلے میں پریشان ہوکر آئی تھیں' مگر میں آفس میں تھا۔''

''پھر فساد ہوا وہاں بھی؟'' گیتی پریشان ہوگئی۔''تو وہ لوگ کہاں ہیں؟ فساد میں تو آپ سب ایک جگہ ہوں گے؟''

''وہ سب دہلی میں خیریت سے ہیں۔ہم بھلا ایک جگہ کیسے ہوسکتے ہیں' وہ بڑے لوگ ہیں۔خواہ فساد ہو یا کچھ' بڑے لوگ تو بڑے ہی رہتے ہیں۔'' زبیر نے رکھائی سے کہا۔

''یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

''بات ہو یا نہیں' حقیقت کا کیا کیا جائے۔'' زبیر کی آواز میں جھنجھلاہٹ آگئی۔''تم کو معلوم ہے گیتی! کہ بلوے میں ہمارے چاروں طرف سخت مخدوش حالات تھے۔آگیں لگ رہی تھیں اور عورتیں زبردستی بھگائی جارہی تھیں۔اس وقت میں نے عصمت کے کہنے پر ان کے یہاں ٹیلیفون کیا۔پہلے تو ان کے ملازم نے کہہ دیا کہ وہ لوگ آرام کررہے ہیں۔میں نے چاہا تھا کہ کچھ نہیں تو معاملہ رفع ہونے تک وہ عصمت کو اپنے پاس ٹھہرالیں۔چنانچہ میں نے دو گھنٹے بعد پھر ان کو فون کیا تو وہ خود ہی بولیں اور مجھے ان کا وہ لہجہ آج تک کیا' تمام عمر یاد رہے گا۔انہوں نے بڑی اجنبیت سے کہا کہ اس قسم کے ٹیلیفون اور بھی کئی لوگوں نے کئے ہیں مگر تم کو معلوم ہے کہ آصف کی پوزیشن ایسی ہے کہ یہ بہت مشکل ہے۔پھر کچھ سوچ کر بولیں کہ دیکھو' آنے دو ان کو' شاید کچھ ہوسکے۔پھر اس کے بعد ہم نے اپنے آپ کو خدا پر چھوڑ دیا اور اس نے ہم کو یہاں پہنچادیا۔''

''پھر آپ کو گھر نہیں ملا اب تک؟''

''نہیں' دوچار دن میں کراچی جارہا ہوں۔میں نے تو پاکستان لکھ دیا تھا۔''

''آنند بھون'' زبیر نے جھک کر پڑھا۔''بھئی گیتی! نام تو پیارا ہے تمہارے ٹھکانے کا۔شاباش ہے تمہاری ہمت کو کہ اکیلی لڑکی

نے سب کام کرلیا۔ چچی اماں تو سب کی طرف سے پریشان ہوں گی؟"

"بس کچھ نہ پوچھئے' دراصل زبیر بھائی غم کا پیمانہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہو چکا ہے کہ ہر غم اس میں سما جائے اور پتہ نہ چلے۔"

"کیا بات کہہ دی بٹیا تم نے!"

چھوٹے سے گول برآمدے میں سرکی کے دو مونڈھے پڑے تھے اور کمروں کے دروازوں پر کوئی پردہ نہ تھا۔ ایک کمرے میں بان کی چارپائی اور نماز کی چوکی نظر آرہی تھی۔

گیتی نے برآمدے ہی سے آواز دی۔

"اماں! دیکھئے تو کون آیا ہے۔"

وہ ننگے پیر ہی باہر نکل آئیں۔ ان کی ساری ملگجی اور پرانی تھی۔

"زبیر!" ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ نہ جانے کس خیال میں نکلی تھیں۔ اس کو گلے لگایا تو ان کے ہاتھ لرزنے لگے۔ گیتی چائے بنانے باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

"چچی اماں! صولت آپا خیریت سے دہلی میں ہیں۔"

"دہلی میں ۔۔۔۔۔۔۔تم ملے تھے ان سے؟"

"مجھے ہوائی اڈے پر آصف بھائی ملے تھے اور اس سے پہلے ہم لوگ ڈلہوزی میں ملتے رہتے تھے۔"

"ڈلہوزی میں ۔۔۔۔۔۔۔تم لوگ کیا وہاں سے آرہے ہو؟"

"جی ہاں وہاں تو ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو سکی تھی۔ پھر دلی میں ہوائی اڈے پر ملاقات ہوئی تھی۔"

"تم کو ارجمند کی بھی خبر ہے کچھ؟"

"ہاں' وہ بتا رہے تھے کہ وہ اسپتال میں ہے۔"

"خدا خیر کرے' اے بیٹا! کچھ کہہ رہے تھے کہ کیوں ہے؟ کیا زخمی ہو گئی؟" آج اس کی زندگی کی خبر کے ساتھ ہی ان کے منہ سے اس کے لیے دعائے خیر نکلی اور طبیعت کو بے قراری سی محسوس ہوئی۔

"نہیں' خدا نہ کرے۔ زخمی تو نہیں ہوئی' چند مہینوں کا کچھ تھا۔ اور خود اکبر بھی بیمار ہیں۔ ان کے والد تو جیل میں ہیں۔ والدہ وغیرہ کا پتہ نہیں چل سکا تھا' اس وقت تک۔"

''عصمت کہاں ہیں؟''

''یہیں ہیں' میں تو اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھیرا ہوا ہوں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ اپنی دونوں لڑکیوں کی زندگی اور سلامتی کی خبر پا کر وہ کچھ کھوسی گئی تھیں۔ اتنے تھوڑے سے دن میں وہ خوش ہونا اور چونک جانا بھول گئی تھیں۔ ہر بات ایک سے جمود اور یکسانیت سے سن لیتی تھیں۔

''بیٹا! گھر تو موجود ہے۔ عصمت کو یہاں لے آؤ۔ کمرے تو دو ہی ہیں' لیکن مل جل کر کام چل جائے گا۔''

چچی اماں! میں تو دو چار دن میں کراچی روانہ ہو جاؤں گا۔ اب جہاں ٹھیرے ہیں وہاں سے آئیں گے تو ان کو برا لگے گا۔ ویسے میں آج شام کو یا کل صبح آپ کے پاس ضرور لے کر آؤں گا۔ وہ سن کر ایک منٹ نہیں ٹھہرے گی۔''

اور جب زبیر اٹھ کر گیا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔''ماشاء اللہ بڑی اچھی تندرستی ہو رہی ہے اور خوب شکل نکالی ہے زبیر نے تو۔ دیکھو اس بھول کا برا ہوا کہ یہ بھی نہ پوچھا کہ طلعت اور دلہن کہاں ہیں۔''

''طلعت نے ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے اور چچی جان دادی اماں والے مکان میں ہی ہیں۔ وہاں کوئی فساد نہیں ہوا۔'' گیتی نے کہا۔

وہاں کوئی فساد نہیں ہوا' طلعت نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور عصمت کا میاں زبیر اتنا وجیہہ اور تندرست نکل آیا۔ ان کی نظروں میں آصف جاہ کا بالوں سے محروم سر' عمر رسیدہ چہرہ اور ڈھلتا ہوا جسم گھوم گیا۔ ارجمند کا بچہ ضائع ہو گیا اور اکبر بیمار ہے۔ یہ گیتی بی اے بھی نہ کر پائی اور کسٹوڈین کے دفتر میں ٹائپسٹ کا کام کر رہی ہے۔ ساری باتیں کچھ یوں گڈمڈ ہوئی جا رہی تھیں' جیسے خوب پھینٹ کر بانٹے ہوئے تاش بازی بدل دیں۔

زبیر جا چکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے نماز کے لیے نیت باندھ لی۔

باب ۸۱

جب دو سائیکل سوار ٹریفک کا سگنل بدل جانے کے باعث شانہ بشانہ رک جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے برابر والی سائیکل پر جس لڑکی کے شانے اور چہرے پر آئے ہوئے چھوٹے چھوٹے سیاہ بال نظر آ رہے تھے' اسے وہ

ہزاروں کے درمیان بھی پہچان سکتا تھا۔

اس نے اس کو پہچان لیا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر میرا دل کیوں دھڑکا اور مجھے نامعلوم سی خوشی اور گھبراہٹ کا مخلوط احساس کیوں ہو رہا ہے۔

اب اس پر ان حقیقتوں کا انکشاف ہو رہا تھا جو مدت سے آشکار ہونا چاہتی تھیں۔ لیکن اس کی طرف سے اجازت نہ ملتی تھی۔ اور اب وہ بلا اجازت ہی آشکار ہو چلی تھیں۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری اس سرپرستی اور ہمدردی میں تمناؤں اور خواہشات کا خفیہ ہاتھ تھا۔''

گوتم بدھ کے پرستاروں کی سرزمین کا رہنے والا اور تصوف کی روایات کی حامل قوم کے مذہب کا پیروٹیسٹ ایشیائی انداز میں اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا۔

پچھلی سائیکل کے دھکے سے چونک کر گیتی نے اپنے دائیں طرف دیکھا اور دوسری طرف منہ کر کے اس شخص کو نظر انداز کر دیا جو اس کے نزدیک محسن اور مربی کا درجہ رکھتا تھا۔ اور وہ اپنی اس حرکت پر بالکل مطمئن تھی۔

سپاہی نے مڑ کر دیکھا تو سائیکلیں یکے بعد دیگرے آگے سرک گئیں۔

اب ہر عجیب و غریب بات کتنی معمولی معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ تمام باتیں بالکل ہی مضحکہ خیز کہی جا سکتی تھیں، روز روز سامنے آتے آتے بہت سنجیدہ معلوم ہونے لگی تھیں۔

مثلاً یہی کہ بختیار جو پاکستان پہنچ چکا تھا۔ اس کو اپنی ماں کا پتہ نشان صولت کے خط سے معلوم ہوا تھا۔ وہ چار دن کے لیے گھوڑا گلی سے آیا ہوا تھا۔ گیتی کو دفتر جاتا دیکھ کر اس کو رنج بھی ہوا اور اطمینان بھی کہ یہ چھ سات مہینے اور گزر جائیں گے اور پھر میں اپنا کورس ختم کر لوں گا اور کہیں نہ کہیں پوسٹنگ ہو جائے گی۔

سارا دن بیٹھا وہ اماں بیگم سے باتیں کرتا رہا تھا۔

''آصف بھائی کا ارادہ یہاں آنے کا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری صحت اس قابل نہیں کہ میں از سرنو اکھڑ کر وہاں جاؤں اور اگر میں چلا جاؤں گا تو میری والدہ جو بہت ضعیف ہیں ہرگز نہ جائیں گی۔ پھر یہ فساد تو باقی نہیں رہیں گے۔ میں اپنے علاقے کی دیکھ بھال کروں گا۔''

وہ خاموش چھالیہ کاٹتی رہیں۔

''تم ارجمند سے بھی ملے تھے؟''

''ہاں' کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔میں تین دن وہاں رہا تھا یا وہ لوگ آجاتے تھے۔ارجمند خاصی کمزور ہو رہی ہے۔''

''خط تو لکھتی ہی نہیں۔اتنے دن میں کل دو خط لکھے ہیں۔ویسے خوش تو ہے؟''

''ہاں' خوش ہی ہے۔اکبر کی والدہ اور چھوٹے بھائی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔والد ان کے جیل میں ہیں۔کچھ چڑچڑے سے ہو گئے ہیں۔ارجمند یہ کڑھتی رہتی ہے کہ میں یہاں اکیلی رہ گئی۔حالانکہ آپا بہت سمجھاتی ہیں کہ اکیلی کیوں ہو' میں تو موجود ہوں۔''

ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔''مگر خط تو لکھتی۔''

''خط کیا لکھے۔'' بختیار نے مجبوراً صاف بات کہی۔''اکبر کہتے ہیں کہ تم پاکستان خط لکھے جاؤ گی تو میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔میرا باپ پہلے ہی سیاسی قیدی ہے۔''

''تو یہاں آنے کا خیال نہیں ان کا؟''

''بھئی! کیسے آجائیں' باپ وہاں جیل میں پڑے ہیں' خود یہاں آجائیں۔''

''ہاں' ٹھیک ہے۔'' ان کی آواز میں بڑی مجبوری تھی۔

''اصل میں ان کا تو ارادہ ہے کہ والد کے رہا ہونے پر باہر چلے جائیں۔بس یہی اب تو سب سے امن کا راستہ ہے۔''

انہوں نے چونک کر بختیار کی طرف دیکھا۔

گیتی دفتر سے واپس آ گئی تھی۔آج اس کے ساتھ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا بھی تھا۔وہ دور سے ہی فاتحانہ انداز میں بولی۔

''دیکھئے' اماں! میں آپ کے لیے نوکر بھی لے آئی۔''

''ارے! خدا تم کو خوش رکھے۔تم نے تو میرے لیے سب کچھ کر دیا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولیں۔

اس لڑکی کے ان پر کئی احسان تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے کبھی بھولے سے بھی گزری باتوں کا ذکر نہ کیا تھا۔

''چلو اب کچھ دن عیش کر لو۔'' بختیار ہنسا۔''پھر تم کو کالج میں داخل کراؤں گا۔اصل میں تم اتنی بدشوق ہو کہ جب کالج میں داخل کرو تو ایسی گڑبڑ کرتی ہو کہ پڑھائی ناس ہو جاتی ہے۔''

''جب ہی تو میں کہتی ہوں کہ میرا پڑھنا راس نہیں آتا۔اب میں نے پڑھنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا ہے۔''

''کچھ خبر ہے' طلعت نے ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔''

''خبر ہے۔۔۔۔۔۔۔'' وہ مسکرائی۔ ''تو میں کیا کروں۔''

''یہ کرو کہ پڑھو' بس! اب چھ سات مہینے کی بات اور ہے۔ ویسے میں دہلی میں چچا ابا سے بھی ملا تھا۔ وہ وہاں آئے ہوئے تھے کسی سرکاری کام سے۔ وہ لوگ تو سب ٹھیک ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ امن ہو جانے دو' پوری طرح پھر میں تمہاری زمینوں پر جاؤں گا۔ اماں! منشی جی' اکرام یہ سب تو ختم ہو گئے۔''

''مگر یہاں تو سب کہہ رہے ہیں کہ کلیم کئے جائیں گے' فسادزدہ علاقوں کی جائیداد کے۔''

''خیر' وہ بھی دیکھا جائے گا۔ مگر پہلے تو آپ یہ گھر بدلیے۔ مجھ سے کل ہی ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ جو جہاں بیٹھ جائے گا وہی اس کو ملے گا۔ پھر آپ کو تکلیف بھی تو ہو گی یہاں۔''

''بیٹا! شکر ہے اس کا کہ اس نے چھت کے نیچے بٹھا دیا ہے' مجھے کیا تکلیف۔۔۔۔۔۔۔ بس کافی ہے' ہم دونوں کے لیے۔''

''آپ کے لیے یہ کیسے کافی ہو گا' جب سب جمع ہوا کریں گے تو پتہ چلے گا۔''

''جمع ہونے'' پر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کیا جمع ہوں گے بیٹا! سب بکھر گئے۔''

''پھر وہی مایوسی کی باتیں۔ ذرا کچھ دن گزرنے دیجئے' دیکھیے گا یہ لوگ کتنی بار آئیں گے۔ اور اگر ارجمند باہر چلی بھی گئی تو بھی ہر سال نہ آئے تو کہیے گا اور میں کیسا ہوں' آنے والا۔'' وہ ہنسا۔

اور انہوں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ارے! تم سلامت رہو' مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔''

اس وقت گیتی کو خیال ہوا کہ اب سے کچھ سال پہلے اس نے اپنی ماں کو غلط سمجھا تھا۔

باب ۸۲

''ارے لڑکی! تم یہاں؟''

بھاری سی اس آواز کو سن کر اس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر کے حروف پر سے پھسل گئیں۔ اور اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

بعض وقت لوگ ایسے خلاف توقع سامنے آ جاتے ہیں کہ ان کو پہچاننے کے لیے حافظے پر خاصا زور دینا پڑتا ہے۔

وہ لمبا چوڑا شخص دو منٹ تک اس کی طرف دیکھتا رہا اور وہ خالی نظروں سے گھورتی رہی۔

اس کے بشاش چہرے پر افسردگی سی آ گئی۔ ''تم نے مجھے نہیں پہچانا۔۔۔۔۔۔۔میں سجاد ہوں۔''

''سجاد بھائی۔۔۔۔۔۔آپ؟''

''ہاں! اور میں تمہارا نام بھول گیا ہوں اگرچہ تمہاری شکل ہمیشہ ذہن میں رہی۔''

''میرا نام ہے بھی تو عجیب سا۔۔۔۔۔۔۔گیتی!'' وہ مسکرائی۔

''ہاں' لو! خوب۔۔۔۔۔۔۔اب یاد آ گیا۔''

اس نے سجاد کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ سنولا گیا تھا۔ پیشانی کی کشادگی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ بال اڑنا شروع ہو گئے تھے اور چہرے پر عجیب سی بے حسی کا انداز تھا۔

''اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔بیٹھیے۔''

''اور سب تو خیریت سے ہیں؟''

''ہاں' اب تو خیریت ہی ہے۔''

''اور صولت کہاں ہیں؟''

''وہ لوگ یہاں نہیں آ رہے ہیں۔ وہیں دہلی میں پوسٹنگ ہے آصف بھائی کی۔''

''اور وہ تمہاری دوسری بہن' جو سیدھی سی تھی؟''

''ارجمند۔۔۔۔۔۔۔اس کی شادی ہو گئی۔ وہ بھی وہیں ہیں۔ ان کے میاں کا خیال ہے کہ وہ لوگ باہر چلے جائیں گے۔''

''کس سے ہو گئی شادی اس کی؟''

''آپ نے شاید اکبر کو دیکھا تھا۔'' وہ حافظے پر زور دے کر بولی۔

''اچھا' وہ چھچھورا سا لڑکا'' پھر وہ سنبھلا۔ ''بھئی! معاف کرنا گیتی! کچھ اس وقت اس لڑکے کا یہی اثر پڑا تھا میرے ذہن پر۔''

وہ خاموش رہی۔

''تم برا مان گئی ہو۔ یہی تو میری خرابی ہے کہ ذہن میں جو پہلا خیال ہوتا ہے وہی منہ پر آ جاتا ہے۔ ویسے وہ بڑا دلچسپ لڑکا تھا اور بہت بڑھنے والا۔''

وہ ہنسی۔ ''اب آپ باتیں بنا کر اپنی خفت نہ مٹائیے۔''

گیتی کو سجاد کی بات کا خیال آ رہا تھا جو اس نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہی تھی کہ انسان جو کچھ سوچتا یا دیکھتا ہے' اس کو سچ کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔

''تم لوگ رہ کہاں رہے ہو؟ مکان ٹھیک ٹھاک مل گیا؟ پتہ تو بتاؤ کہ کبھی آ سکوں۔''

''ہاں' اب تو مکان خاصا معقول مل گیا ہے۔ پہلے تو بس گزارے لائق تھا۔ یہ لیجئے۔'' اس نے مکان کا پتہ کاغذ پر لکھا اور باقاعدہ سڑکوں اور موڑوں کا نقشہ بنا کر اس کو سمجھانے ہی والی تھی کہ چپراسی فائل لینے آ گیا۔

''اچھا خدا حافظ' تم بہت ہمت والی لڑکی ہو۔ تمہیں یہاں بیٹھا دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے سجاد بھائی' کوئی بات نہیں۔'' اس نے جلد جلد ادھورے خط کو ختم کرنا شروع کیا۔

سجاد نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

''وقت کا عرصہ بعض وقت کتنا طویل بن جاتا ہے اور اس میں کتنے ناقابل یقین انقلاب آ جاتے ہیں۔''

پھر اس کی گاڑی چھاؤنی کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ یہاں سکون تھا' خاموشی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی انقلاب اور کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

باب ۸۳

''سجاد اتنے دنوں میں کس قدر بدل گیا۔ میں نے تو آج غور کیا کہ کنپٹیوں کے قریب بال سفید ہو گئے ہیں۔'' اماں بیگم نے سجاد کے جانے کے بعد کہا۔

''ہاں! تو پھر ان کی عمر بھی تو خاصی ہے۔'' گیتی نے برش میں رنگ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

بختیار کی پوسٹنگ کے بعد اس نے آفس چھوڑ دیا تھا اور میو اسکول آف آرٹس میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ اپنی تصویر مکمل کرنے کے خیال سے برآمدے میں بیٹھی تھی اور وہیں اماں بیگم کے پاس سجاد نے بیٹھ کر چائے پی تھی۔

''اے لو' یہ پوچھنا تو یاد ہی نہ رہا کہ شادی بھی کی دوسری کہ نہیں؟''

''کر ہی لی ہوگی۔''

''بھئی! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ابھی یوں ہی گھوم رہے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب بھی کوئی معقول عمر رسیدہ لڑکی مل جائے تو کر لے۔''

''کیا پتہ جو کر ہی لی ہو۔''

''ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''دیکھو' ارجمند کب پہنچتی ہے۔ اب تو ان کے جانے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ پہلے تو یہ رہا کہ فارغ ہو لیں۔ اب تو خیر سے لڑکی بھی سوا مہینے کی ہو گئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ یہاں آئے بغیر ہی چلے جائیں گے۔''

''آپ نے اکبر بھائی کے ابا کی رہائی پر مبارکباد کا خط لکھ دیا تھا؟''

''تم ہی سے تو ڈلوایا تھا خط۔''

وہ اٹھیں اور اندر جا کر لیٹ گئیں۔ پچھلے بدھ کو انہوں نے شہریار کی فاتحہ دلوائی تھی۔ وہ اس کی فاتحہ ہر ماہ اس کی پسند کی چیزیں پکوا کر دیتی تھیں۔

ان کی آنکھ لگی ہی تھی کہ گیتی کی آواز آئی۔

''یہ لیجئے ارجمند کا تار آ گیا۔ وہ کل دوپہر کو پہنچ رہی ہے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کا چہرہ اب خوشی میں بھی زرد ہو جاتا تھا۔

بارڈر سے آتے وقت گیتی نے بچی کو اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ اور ارجمند چلتی ہوئی جیپ سے گردن نکال نکال کر اس شہر کی سڑکوں اور عمارتوں کو دیکھ رہی تھی جو اس کی ماں اور بہن کا وطن تھا۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ کیا تم بیمار تھیں؟''

''نہیں تو' ٹھیک ہوں بالکل''

''پھر اتنی کمزور کیسے ہو گئیں؟ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ رہے ہیں۔''

''ڈیڑھ سال میں تیسری دفعہ جا کر یہ بچی ہوئی ہے۔ پہلی دفعہ کے تین ہی مہینے بعد میں پھر بیمار ہو گئی تھی۔ تم لوگوں کو پریشانی کی وجہ سے نہیں لکھا تھا۔''

''مگر ارجمند! تم کو ہوا کیا ہے۔ تم اپنا خیال رکھو' ابھی سے اتنے بچوں کی کیا ضرورت ہے؟''

اس نے سر جھکا لیا اور بچی کی طرف دیکھ کر اس کا پیر گلابی کمبل میں چھپا دیا۔

گیتی نے جھک کر بچی کے سیاہ سیاہ بال ماتھے سے ہٹائے اور بڑی نرمی سے اس کے ماتھے پر پیار کر لیا۔

دودھ اور پوڈر کی ملی جلی خوشبو سیدھی اس کے نتھنوں میں گھسی اور بچی نے کسمسا کر کر مٹھیاں بھینچ لیں۔

''تم کو پسند آیا پاکستان؟''

''ہوں' ابھی تو ایک ہی سڑک سامنے آئی ہے۔'' وہ چونک کر بولی۔

اماں بیگم انتظار میں گیلری کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ آگے آگے ارجمند تھی اور اس کے پیچھے بچی کو لیے گیتی۔ وہ دوڑ کر ان سے چمٹ گئی اور اس قدر روئی کہ وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

شادی کے بعد جو گئی تھی تو اب ملی۔

بدقت تمام وہ اس کو اپنے کمرے تک لائیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اس کو اپنے گلے سے لگا لیتیں اور پھر پیار کرتیں۔

''لو یہ پی لو۔'' انہوں نے گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''اب ذرا ان کو بھی تو دیکھ لیجئے۔'' گیتی نے بچی کو ان کی گود میں دے دیا۔

''کیا نام طے ہوا؟'' اب وہ بھی اس کو بہلانا چاہ رہی تھیں۔

''نوشابہ'' وہ بھی دلچسپی سے اس کو دیکھنے لگی۔

''اوپر کا دودھ پیتی ہے؟''

''نہیں''

''جب ہی تو یہ حال ہو رہا ہے' کچھ کھایا پیا کرو۔''

بڑی دیر تک وہ بیٹھی اپنے خسر کے قید میں رہنے اور چھوٹ کر آنے کا حال بتاتی رہی۔

''کچھ صولت کے آنے کا بھی امکان ہے؟'' اپنی ایک بیٹی کو دیکھ کر ان کے دل میں امیدوں کے چراغ روشن ہو چلے تھے۔

''فی الحال تو کوئی نہیں۔ جب تک آصف بھائی ریٹائرڈ نہیں ہوتے' ان کا آنا مشکل ہے۔ اب تو آپ ہی کو جانا پڑے گا ان کے پاس۔''

''کیا ضد ہے آصف کو بھی؟''

ارجمند نے بات بدل دی اور بختیار کے متعلق پوچھنے لگی۔

''وہ کوہاٹ میں ہے' اردلی آیا ہوا تھا کل شام گیا ہے۔ میں نے کہلوا دیا ہے تمہارے آنے کا۔''

اس رات وہ دونوں بہت مدت کے بعد ایک ہی کمرے میں پاس پاس لیٹیں۔

''جب سے یہاں آئے ہیں' اب جا کر دوسرے تیسرے شخص کی گھر میں شکل نظر آ رہی ہے۔ بس بختیار بھیا آ جاتے ہیں تو ذرا رونق ہو جاتی ہے۔''

''اب تم ان کے لیے لڑکی دیکھو۔''

''طلعت کا کیا خیال ہے؟ کچھ پتہ چلا؟''

''پتہ کیسا! چچی جان نے مجھے خط لکھ لکھ کر بلایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا میکہ پاکستان چلا گیا۔ تم ہمارے پاس آؤ۔ اور میری شامت کیا آئی میں چلی گئی۔ گیتی! کیا کہوں' انہوں نے کب کب کے بدلے لیے۔ میرا تو ہفتہ بھر میں کلیجہ چھلنی کر دیا۔ دن رات کے طعنے۔ بڑے بھیا کی تعزیت کرنے بیٹھیں تو اماں کو ڈائن تک کہہ دیا۔ ہزار بار عصمت آپا کے خوش رہنے کی خبر سنائی اور پھر میرے منہ سے ایک دن نکل گیا کہ اب طلعت ایم اے کر لے تو بس شادی کر دیں گے اس کی بھی' تو بہن! چچی جان تو وہ چیخیں' اتنا بنکاریں کہ میں حیران رہ گئی۔ کیسی چپ خاموش رہتی تھیں' اب تو کینچلی بدل لی ہے۔''

''کہنے لگیں' بس خبردار! جو طلعت کا نام کسی نے لیا۔ جب سب کچھ تھا تو ہم میں اور ہماری اولاد میں کیڑے تھے' اب خاک پر بسم اللہ ہو گئی تو طلعت یاد آ رہی ہیں۔ شہریار تو قربان ہو گئے طنطنے پر سے' طلعت کیسے یاد آ گئی۔ ہماری لڑکی تو راج کر رہی ہے۔ پھر کیسا شاندار اور چاہنے والا میاں ہے۔ اللہ' توبہ! کھال لٹکتا' تو ندہلاتا نہیں ہے۔''

''بھئی' بڑا غرور ہو گیا چچی جان کو تو.........یہ صاف آصف بھائی پر چوٹ ہے۔''

''ہاں بھئی! وہ تو طلعت کے لیے کچھ اور سوچ رہی ہیں' اس مرتبہ چھٹی میں طلعت مدراس گئی تھیں۔''

''طلعت کا کیا خیال ہے؟''

''بس' چپ رہتی ہے۔ ہاں' اس مرتبہ چچا ابا اور چچی اماں کا بڑا ذکر تھا۔ ہمیں تو چچا ابا نے کبھی خط نہ لکھا۔ شادی پر یوں ٹال گئے تھے کہ دل کا دورہ پڑ گیا ہے اور اب طلعت کو گڈا کا گڈا ساریاں دلوائی تھیں۔ بڑا خوبصورت مدراس کا لاکٹ پہنے تھی۔''

''تو پھر ایاز بھائی سے خیال ہو گا۔''

''وہ تو ہی اب کچھ دن میں اس بات کا اعلان ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے بھئی' کبھی کے دن بڑے' کبھی کی راتیں۔''

''چچی جان میں تو حیرت انگیز انقلاب آیا ہے۔''

''ارے ارجمند' یہ دنیا ہے۔''

''اس انقلاب نے تو گیتی! وہ کچھ دکھایا کہ نفرت ہوگئی دنیا سے۔''

''ہاں' ارجمند! یہ دنیا بہت بری بھی ہے اور بہت پیاری بھی۔ اسی دنیا میں بڑے بے زبان' مروت دار اور ہمدرد بھی ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔اور صولت آپا کا کیا حال ہے؟''

''ان کا مت پوچھو ارے! میرا تو ہر طرف سے دل چھلنی ہے۔ اے بہن! اتنا پچھتی ہے' اس قدر بے راہ ہوئی ہیں کہ حد نہیں۔ وہ تو سنا ہے کہ طلاق کی سوچ رہی تھیں۔ پھر سجاد بھائی نے بڑا مفصل لکھا اور فون بھی کیا تھا کہ میں سمجھوں گا کہ تم سے زیادہ ظالم اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا جو تم نے میرے بھائی کو اس حالت میں چھوڑا۔''

''کیوں۔۔۔۔۔۔کیا حال ہے ان کا؟''

''ارے' بہت برا۔۔۔۔۔۔انہوں نے بہت جلایا ہے ان کو' اب تو بڑا رحم آتا ہے۔''

''اور تم لکھنو گئی تھیں۔۔۔۔۔۔کیا حال تھا سب کا؟''

''ہاشمی پھپھو بالکل ٹھیک ہیں۔ مسعود انجینئر ہو گئے۔ سنا تھا' پاکستان آ رہے ہیں۔ کسی کمپنی میں ملازم ہو گئے ہیں۔ کامنی کی نند بہت بیمار تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ میرے سامنے نکاح ہو جائے تو اچھا ہے۔ میرا خیال ہے اب تو ہو گیا ہوگا۔''

''کامنی کا کیا حال ہے؟''

''بھئی! ہم سے تو اتنا کٹ کے ملیں کہ کیا بتاؤں۔ یہ تو طلعت بھی کہہ رہی تھیں کہ جب سے مسعود کی ملازمت کا ہوا ہے' کافی بدل گئی ہے۔ جانے کتنی چیزوں کے تو متعلق کہہ دیتی ہیں کہ ہمیں عادت نہیں ہے۔ ایک دن جانے کیا چیز پکانے کی ترکیب پوچھی تو اتنی ڈھٹائی سے کہنے لگی' باجی! ہمیں تو پکانا آتا ہی نہیں' ہم کو تو کھچڑی ابالنے کا بھی ڈھب نہیں۔''

''اے تو' وہ تمہیں باجی کہنے لگیں؟''

''تو اور کیا۔۔۔۔۔۔صرف ایک دن تمہارا نام لیا تھا تو گیتی آپا کر کے۔''

''مسعود سے ملاقات ہوئی تھی؟''

''نہیں' مجھ سے نہیں ہوئی۔ سنا ہے'یوں بھی بہت کم آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی ساس کے دس بار بلائے سے اور ادھر ہی زیادہ وقت بیٹھتے ہیں۔ چچی جان تو کہتی ہیں کہ غرور ہو گیا ہے۔ اب اللہ ہی جانے' مگر میری موجودگی میں تو ایک دن قدم نہیں رکھا۔ میں خود ہی ہاشمی پھپھو سے ملنے گئی تھی تو سارا دن گھر آئے ہی نہیں۔''

''اے دیکھو' یہ اٹھ گئی۔ اب تم اس کو دودھ تو پلا دو۔''

اندھیرے میں چسر چسر کی آواز کے سوا خاموشی تھی۔

''کیا سو گئیں گیتی!''

''نہیں تو'' اس کی آواز بھاری تھی۔

باب ۸۴

ارجمند اپنے ساتھ ہی گھر کی رونق بھی سمیٹ لے گئی' جو عارضی طور پر اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ اس کی موجودگی میں دو دفعہ بختیار آیا۔ اکبرا سے لینے آ گیا تھا۔ ایک ہفتہ وہ بھی رہا۔

اماں بیگم بہت دن بعد پہلے کی طرح مصروف رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ جانے کے لیے چھالیا کتری' دھنئے کی گری اور کھوپرے کا گوتا تیار کیا۔ کرتے اور دلائیاں سی کر ساتھ کیں۔

گیتی کو نوشابہ کا جانا سب سے زیادہ کھلا تھا۔ وہ چپ چاپ صبح اٹھ کر تیار ہوتی اور کالج روانہ ہو جاتی۔ پھر واپس آتی تو اپنی تصویریں اور مجسمے وغیرہ مکمل کرنے میں لگی رہتی۔ اب تو ملازم بھی قاعدے کا تھا۔ اس لیے گھر میں بھی کچھ خاص کام نہ کرنا ہوتا تھا۔ فالتو وقت میں وہ پڑھتی رہتی تھی۔

اماں بیگم فرصت کے وقت باغ کی دیکھ بھال میں رہتی تھیں۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ جو مالی آتا ہے اس نگوڑے کو پودوں تک کی پہچان نہیں ہوتی۔ پھر وہ مرلی کو یاد کرنے لگتی تھیں۔

دو تین دن سے اسے بہت تیز زکام تھا۔ صبح سو کر اٹھی تو ہلکی سی حرارت محسوس ہوئی اور وہ کالج نہیں گئی۔ دس گیارہ بجے کچھ طبیعت ہلکی ہوئی تو باغ میں لیچی کے درخت کے نیچے کرسی ڈال کر پڑھنے لگی۔

''خوب! تو چھٹی منائی جارہی ہے۔''

اس نے چونک کر دیکھا۔

''آداب' سجاد بھائی!''

''وعلیکم السلام''

''اب اتنے کنجوس ہوگئے کہ دعا تک دینا چھوڑ دی۔'' اس نے کتاب گھٹنے پر اوندھالی۔

''دعا بھی دے دیں گے' پہلے بیٹھنے کا ٹھکانہ تو کرو ہمارا۔''

وہ اٹھ کر برآمدے سے کرسی لینے گئی تو وہ اس کی جگہ ڈٹ کر بیٹھ گیا اور کتاب بند کردی۔

''واہ بھئی! یہ کیا۔۔۔۔۔۔ میری کتاب کیوں بند کردی؟ یہ لیجئے کرسی۔۔۔۔۔۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محترمہ کتاب پڑھیں گی اور میں احمقوں کی طرح منہ تکوں گا۔''

''منہ کیوں تکیے! آپ اس وقت جو آئے ہیں تو ظاہر ہے کہ مجھ سے بات کرنے کی خیال سے تو نہیں آئے ہوں گے' آپ کے حساب سے تو مجھے کالج میں ہونا تھا۔''

''بہر حال اب تو نہیں ہو۔ ہاں بھئی! وہ دعا تو قرض ہے۔ کہو' تو اب دے دوں؟''

''قرض تو آپ پر ایک اور چیز کا بھی ہے۔''

''وہ کیا؟ اب قرضے پر قرضے نکالے جاؤ۔''

''آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ایک دن میرا اور ارجمند کا ہاتھ دیکھا تھا اور میرا ادھورا رہ گیا تھا تو مجھ سے کہا تھا' پھر کبھی دیکھیں گے اور پھر جو غائب ہوئے' جناب والا تو۔۔۔۔۔۔ ہاں! مگر یہ آپ یکا یک کیسے غائب ہوگئے تھے؟''

اس نے دیکھا کہ سجاد کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''ہوں'' وہ چونکا۔ ''لاؤ' اب دیکھوں تمہارا ہاتھ۔ مگر کیا دکھاؤ گی اس وقت؟ جو ان کہی بات رہ گئی تھی' وہ تو سامنے آ ہی گئی ہوگی۔''

''ہاں' اور جو نہیں آئی ہے وہ آجائے گی سامنے۔'' وہ ہنسی۔

''ارے ہاں' سنا ہے وہ لڑکی ارجمند آئی ہوئی تھی' بمع ایک عدد بیٹی کے۔ بھئی وہ تو ابھی خود ہی بچی سی ہے۔''

''وہ آئی تو آپ ایک دن بھی نہیں آئے۔ آپ کو بہت پوچھتی تھی۔''

''ہاں' بھئی! ہم باہر چلے گئے تھے۔'' سجاد نے دھیرے سے کہا اور پھر ذرا رعب دار آواز میں بولا۔ ''گیتی آرا بیگم! میں دیکھتا ہوں' تم بہت چل نکلی ہو۔''

''کیوں سجاد بھائی؟''

''یہ تم کیا پڑھ رہی ہو؟ کچھ معلوم ہے یہ کس کی تصنیف ہے؟''

''ڈی ایچ لارنس کی۔''

کچھ یوں معلوم ہو رہا تھا' جیسے سجاد کو بات کا موضوع نہ سوجھ رہا ہو۔ وہ جلد جلد موضوع بدلتا چلا جا رہا تھا۔

''یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟ کیا روئی تھیں؟''

''مجھے زکام ہے اور حرارت بھی ہے۔''

''میں تمہارے زکام اور حرارت کا یوں علاج کر سکتا ہوں۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''کس طرح؟''

''اس طرح کہ کافی کی ایک گرم گرم پیالی پلواؤ۔''

''وہ تو ابھی یہیں بنوائے لیتی ہوں۔''

''پھر وہی باتیں' ارے لڑکی! کافی ہاؤس کی پیالی کی شرط ہے۔ دیکھو' یہ تمہارا زکام اور حرارت سب یوں ہے کہ اس وقت بہت تنہا ہو اور تمہارا دل گھبرا رہا ہے۔ بوریت کی ایک انتہا یہ بھی ہوتی ہے کہ آدمی کو زکام ہو جاتا ہے۔''

وہ خاموشی سے اس کو دیکھتی رہی۔ ''میں چلی تو چلوں' مگر اماں بیگم سے اجازت لینا ہے۔''

''کون۔۔۔۔۔۔۔ گیتی آرا بیگم! یہ اجازت کی بات تم کر رہی ہو۔'' وہ ہنسا۔

''جی! یہ اجازت کی بات میں ہی کر رہی ہوں۔''

''وہ اجازت ابھی آئی جاتی ہے۔'' وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی اندر آ گئی۔

اماں بیگم کہہ رہی تھی۔

''ہاں! جس دن سے ارجمند گئی ہے' بہت چپ چپ ہو گئی ہے۔ ویسے یہ ہو ہی گئی ہے کچھ کمزور۔''

''صاحب! اس کے ذہن اور جسم پر بہت بار پڑا ہے۔ اب کی چھٹی میں آپ اس کو بختیار کے پاس لے جائیے۔ کچھ دن وہاں

آرام کرلے گی' اس کو تفریح کی سخت ضرورت ہے۔ کتنی زرد ہو رہی ہے۔''

''ہاں! تو پھر لے جاؤ تم اس کو' مگر کچھ حرارت سی بتا رہی تھی۔ تھک نہ جائے زیادہ۔''

''نہیں' آپ اطمینان رکھئے۔''

اور اس وقت آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے بالوں میں برش کرتے میں اس نے سوچا۔

''ارجمند کو تو کہہ رہی تھی' لیکن میں بلا وجہ ہی اس قدر زرد نظر آ رہی ہوں۔'' اس نے اپنی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دیکھا اور ہونٹوں کی سفیدی چھپانے کے لیے ہلکی سی لپ اسٹک لگالی۔

''مجھے بعض وقت تعجب ہوتا ہے گیتی! کہ کیا تم واقعی صولت کی سگی بہن ہو' جس کو کپڑوں کے جوڑ تک ملانا نہیں آتے۔''

''کیوں' کیا بات ہے؟''

''اتنی پیاری سی گلابی قمیص اور یہ سفید کھڑ کھڑاتا ململ کا دوپٹہ۔۔۔۔۔۔۔ ارے تم بیوہ تو نہیں ہو۔ جاؤ' جا کر گلابی دوپٹا اوڑھو۔''

اس کا تحکمانہ لہجہ اس قدر دلچسپ تھا کہ وہ گلابی دوپٹا اوڑھ کر واپس آ گئی۔ اور ہنستی ہوئی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

باب ۸۵

ساری دوپہر وہ غفلت کے عالم میں سوتا رہا تھا اور سہ پہر کے بھی بہت بعد لی فاں کی لڑکی نے اس کو کئی آوازیں دے کر ہوشیار کیا۔

''کیا ہے؟'' وہ چونکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اماں نے پوچھا ہے کہ کھانا کھانے کیوں نہیں آئے۔۔۔۔۔۔۔ کیا بات ہو گئی ہے؟''

''اماں سے کہو کہ انکل کو بخار ہے۔'' اور وہ پھر لیٹ گیا اور اسی وقت سو گیا۔

آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی اور کمرے میں اندھیرا سا ہو چلا تھا۔ کسی کا نرم نرم ہاتھ اس کے ماتھے پر تھا۔

وہ چونکا۔ ''اچھا! تم آ گئیں؟''

وہ ہاتھ جو ٹھنڈا اور نرم تھا' آہستہ سے ہٹ گیا۔

''صفدر! کیا حال ہے تمہارا؟'' اب بھاری اور نسبتاً گرم ہاتھ اس کے ماتھے پر تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا'

جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔

''کیا بات ہے صفدر! دیکھو، ہم تمہارے لیے چائے لائے ہیں' پیو گے؟''

یہ آواز اور زبان مانوس تھی۔ یہ لفظ اسی کی زبان میں بولے گئے تھے۔ مگر بہت اجنبی اور غیر معلوم ہو رہے تھے اور ان کو سمجھنے میں اسے دقت محسوس ہو رہی تھی۔

''میں پانی پیوں گا۔'' اس نے انگریزی میں کہا' جیسے اس کے پاس کھڑے ہوئے یہ دونوں شخص اس کی اپنی زبان نہ سمجھتے ہوں۔

لی فاں نے بڑھ کر ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے قریب کیا۔ ''تم ذرا سا سر اٹھاؤ تو پانی پی سکو گے۔''

سر اٹھانے کے بجائے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک سانس میں آدھا گلاس پی گیا۔

لی فاں کی بیوی نے جلدی سے گیلا تولیہ اپنے شوہر کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس نے صفدر کا چہرہ اور پھر بال ٹھنڈے تولیے سے رگڑ کر صاف کر دیئے۔ اس کی آنکھیں کھل سی گئیں اور وہ لیٹ گیا۔

پھر وہ بڑی کمزور آواز میں بولا۔ ''تم لوگ یہاں کب سے ہو؟''

''تقریباً ایک گھنٹے سے۔ کل شام تم نہیں آئے تو ہمیں خیال ہوا کہ رات کا کھانا تم اکثر باہر کھا لیتے ہو۔ پھر دوپہر کو بھی نہیں آئے تو مجھے فکر ہوئی اور زوئی دیکھنے آئی تو اس نے بتایا کہ تم کو بہت بخار ہے۔''

''اچھا! اب زیادہ باتیں نہ کرو۔'' لی فاں نے بیوی کو ٹوکا۔

''کرنے دو' کوئی حرج نہیں۔''

''چائے دوں بنا کر؟'' وہ مستعدی سے بولی۔

''لاؤ' میرے منہ کا مزا خراب ہو رہا ہے۔''

''میں نمک ڈالے دیتی ہوں۔''

وہ اٹھا تو بولا۔ ''مجھے یوں لگ رہا ہے' جیسے ہر چیز مجھ سے کوسوں دور ہو گئی ہے اور تم دونوں بھی کہیں دور نظر آ رہے ہو۔ ایسا لگتا ہے' جیسے برسوں سے بیمار ہوں۔''

''تم مجھ سے ٹیک لگا لو۔'' لی فان اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے' ماتھے پر گیلا کپڑا رکھو۔'' اس کی بیوی نے رائے دی۔

''نہیں' مجھے اتنا تیز بخار نہیں ہے۔ میں بہک نہیں رہا ہوں۔''

چائے پی کر اس نے پیالی رکھ دی اور تکیے کے نیچے سگرٹ ٹٹولا۔

''لو یہ رہا سگرٹ! لی فاں نے سگرٹ سلگا کر اسے دے دیا۔

''تم دونوں کتنے مہربان ہو۔'' اس کی آنکھوں بھر آئیں اور پھر اس کو پسینہ آنے لگا۔

پسینہ آنے اور بخار اترنے کی گھبراہٹ اور بے چینی میں وہ پھر بہکنے لگا۔

''میں تو جیسے خلا میں پہنچ گیا ہوں۔ اب تمام عمر اسی خلا میں رہنا ہے اور دیکھو اب تم لوگ کتنے موہوم اور بے حقیقت نظر آ رہے ہو۔ لی فان کی بیگم! اب تم مجھے مشورہ دو کہ میں وطن واپس چلا جاؤں۔ تمہیں معلوم ہے' لاؤ تزے کیا کہتا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔ وہ کہتا ہے:

''درویش دنیا میں امن اور شانتی سے رہتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کے تمام لوگ ایک ہی نگر کے باسی ہیں' یعنی شہر دل کے رہنے والے۔''

اور میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ سب بکواس ہے۔ لاؤ تزے احمق ہے یا پھر ہم کو احمق بتاتا ہے۔ سن لو میری بات۔۔۔۔۔۔

انسان فقط دو ہی کام کر سکتا ہے۔ یا خود احمق بنتا ہے یا دوسروں کو احمق بناتا ہے۔ اور تم کو شاید نہیں معلوم کہ میں احمق بنا ہوں اور میں اپنی حماقتوں کی نگہبانی بھی کروں گا۔ اس لیے کہ مجھے لاؤ تزے نے احمق بنایا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ شہر دل تو ویران ہو گیا۔ اب کہو' درویش کدھر جائے' بجز اس کے کہ اپنی حماقتوں کے قلعے میں خود کو محفوظ کر لے۔''

اس کی آواز بتدریج گرتی گئی۔ ساتھ ہی اس کا درجہ حرارت گھٹتا گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ دونوں پریشان و سراسیمہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے رہے۔

تمام رات وہ آرام سے سوتا رہا اور لی فاں اس کے سرہانے بیٹھا بار بار اس کی نبض دیکھتا رہا۔ اس کی حرارت اور نبض آہستہ آہستہ اعتدال پر آ رہی تھی۔

صبح کو اسے مطلق احساس نہ تھا کہ کل کا دن کیسا گزرا تھا۔ اب وہ بڑے سکون سے آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ لی فاں نے اس کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ جن میں علالت کی پژمردگی سے زیادہ کسی چیز کے کھوئے جانے اور پھر اس کو رو پیٹ کر صبر کر لینے والا انداز تھا۔

اس کو ناشتا کرانے کے بعد سگریٹ دیتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''اب میں جاتا ہوں' زوئی آ کر تمہارے کمرے میں کھیلتی رہے گی۔۔۔۔۔۔۔ٹھیک ہے؟'' وہ محبت سے اس کی طرف جھکا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلا دیا۔

''مجھے کیا ہوا تھا اور اتنا تیز بخار کیسے ہو گیا؟'' اس نے اپنے حافظے پر زور دیا۔ ''اور بخار سے پہلے آخری کام میں نے کیا کیا تھا؟

۔۔۔۔۔۔ہاں! ٹھیک ہے' میں نے اپنی ڈائری لکھی تھی۔'' اس نے کروٹ لی اور سرہانے اسٹول پر رکھی ہوئی ڈائری اٹھالی۔

بند ڈائری ہاتھ میں پکڑے پکڑے اس نے سوچا۔ ''میں نے کیا لکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔مجھے کچھ یاد نہیں۔''

پھر اس نے ڈائری کے ورق پلٹنا شروع کیے۔ یہ ڈائری کتنی کم لکھی گئی تھی۔ شاید ہی کبھی وہ فرصت سے بیٹھ کر لکھتا تھا۔ اور یہ اس کے تازہ لکھے ہوئے ورق تھے' جواب اس کے سامنے کھلے تھے۔

اس نے لکھا تھا۔

''جب تم چھوٹی سی تھیں' اس وقت سے لے کر میں نے تم سے نہ جانے کتنی بے شمار باتیں کی ہیں' لیکن فقط ایک جملہ کہنے کے لیے میں ہمیشہ ترستا رہا ہوں۔ تمہارے سامنے کہنا تو ایک طرف میں نے تو اس جملے کو کبھی باضابطہ اور منظم طور پر سوچنے کی بھی ہمت نہ کی اور اس جملے کو تنہائی میں کبھی خود سے بھی نہ دہرایا' لیکن آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آج میں خود سے بھی کہوں گا اور اس صفحے پر لکھوں گا بھی کہ۔۔۔۔۔۔۔کوکو! مجھے تم سے محبت ہے۔

مجھے تم سے محبت بھی ہے اور میں انسان بھی ہوں۔ جب ہی تو اس دن کافی ہاؤس کے دروازے پر تمہیں اس بے حد شاندار اور عمر رسیدہ فوجی کے ساتھ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا' جیسے دنیا کی ہر چیز دھیرے دھیرے دور سرکتی جا رہی ہو۔ جیسے زمین نے اپنا محور چھوڑ دیا ہو اور پیروں تلے سے نکل بھاگی ہو۔ اب یہ دنیا اور اس کی ہر چیز بڑی بے حقیقت اور اپنی ذات سے بے تعلق نظر آنے لگی ہے۔ میں تم سے شکایت کیا کروں۔ اس میں تمہارا تو کوئی پیچ ہی نہیں۔ خود میرے شعور نے ہمیشہ اس حقیقت کا احترام کیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی نسبت اور کوئی واسطہ بھی موجود ہی نہ تھا۔ مگر انسان اپنے اس لاشعور کا کیا کرے جو بہت نا سمجھ اور بہت زیادہ ضدی ہوتا ہے۔ اور میرے شعور نے تو اس وقت بھی مطمئن رہنے کی کوشش کی تھی۔ جب تمہیں کافی ہاؤس کے دروازے پر بڑی خوش دلی سے ہنستے دیکھا تھا۔''

ڈائری اس کے ہاتھ سے پھسل گئی اور زوئی اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ ''یہ دیکھو انکل! میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔''

اس نے تکیے پر ہاتھ رکھا اور مٹھی کھول دی۔ بھورے اور کالے رنگ کی تتلی نے ایک لحظہ توقف کیا اور اڑ گئی۔

''اور ہماری علامات محبت میں یہ کیا معنی رکھتا ہے؟'' اس نے تتلی کو اڑتے دیکھ کر سوچا۔

وہ بہت تمیز دار بچیوں کی طرح اس کے سامنے آ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''انکل! اب آپ کی طبعیت کیسی ہے؟''

''زوئی!'' صفدر نے چھت کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''آج تم نے پڑھا تھا؟''

''ہاں' انکل!''

''کیا پڑھا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔مجھے بتاؤ۔''

''اونہہ بھئی! مجھے یاد نہیں۔ انکل! آپ کو بخار ہے' سر دبا دوں؟'' وہ مستعدی سے اسٹول پر جم کر بیٹھ گئی۔

''نہیں' زوئی! یہ ہاتھ بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔'' اس نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''یہ تھک جائیں گے۔''

''پھر انکل! میں آپ کے لیے کیا کروں؟''

''تم میرے لیے یہ کرو کہ مجھے ایک اچھا سا گیت سنا دو۔''

''مگر میرا دل تو گیت سنانے کو بالکل نہیں چاہ رہا۔''

''اچھا تو پھر جانے دو۔''

''تو پھر آپ یوں کیوں نہیں کرتے کہ آپ مجھے گیت سنا دیجئے۔''

''کون سا؟''

''وہی۔۔۔۔۔۔

چٹان پر

ایک پھول

ایک بید مجنوں

اور ایک ماہی گیر''

''اچھا! وہ۔۔۔۔۔۔۔

دریا پر چمکتی ہوئی

سورج کی کرن

اور اپنے پروں پر اڑتا ہوا پنچھی"

"نہیں، وہ گیت میں تمہیں نہیں سنا سکتا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں بیمار ہوں، زوئی!"

اور پھر اس گیت کے باقی بول اس نے زیر لب دہرائے۔

"نیم راہ کہسار پر

ایک نیم شکستہ سمادھی کی اور بڑھتا ہوا پجاری

جنگل میں

ایک زرد پتہ

سرسراتا ہے اور

شاخ سے جھڑ جاتا ہے"

"کیا کہا آپ نے انکل؟" زوئی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں زوئی" اس نے کروٹ لے لی اور دھیرے دھیرے دہرایا۔

"نیم شکستہ سمادھی کی اور بڑھتا ہوا پجاری

جنگل میں ایک زرد پتہ سرسراتا ہے۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔"

چھوٹی چھوٹی گھنی سیاہ پلکیں آنکھوں پر جھکتی گئیں اور چھوٹی چھوٹی، نرم، تند اسی سانسیں اس کے وجود پر چھا گئیں۔

اور زوئی فرش پر اوندھی لیٹی رسالے میں تصویریں دیکھتے دیکھتے اسی رسالے پر سر رکھ کر سو گئی۔

باب۸۶

انہیں بہت سویرے روانہ ہونا تھا۔اس لیے سجاد رات کو وہیں سویا تھا۔اماں بیگم ایک ایک چیز کو دس بار یاد دلا رہی تھیں۔وہ حتی الامکان ان کو مطمئن کرنے کی کوشش میں تھی۔مگر ہر بار وہ الجھ جاتی تھیں۔''دیکھو کہیں میری دوائیں نہ رہ جائیں۔بھئی!ایک بار اپنے گرم کپڑے پھر دیکھ لو۔''

''توبہ اماں بیگم!پہلے تو آپ سفر کرتے وقت ایسے نہیں گھبرایا کرتی تھیں اور اب اتنے مختصر سفر کی آپ کو اتنی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

انہوں نے اس کو جواب دیئے بغیر نیت باندھ لی۔

اب اسے کیا یاد ہوگا کہ اماں بیگم کیسے سفر کیا کرتی تھیں۔نہ کبھی سامان ساتھ گیا اور نہ جا کر خود کھولا۔دو دن پہلے سب سامان روانہ ہوتا تھا اور پہنچنے پر لگا لگایا ملتا تھا۔

بتیاں جلا کر انہوں نے چائے پی اور منہ اندھیرے روانہ ہو گئے۔اماں بیگم اور وہ یہاں آنے کے بعد پہلا سفر کر رہی تھیں۔سجاد تمام راستوں کے متعلق انہیں بتاتا اور سمجھاتا جا رہا تھا۔

''دیکھو،ہم تمہیں وزیر آباد پر کھانا کھلائیں گے۔''

''کیوں،کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں،تم دیکھنا کھا کر۔''

''اے ہٹو،خاک یہاں والے کھانا پکاتے ہوں گے۔''

''خالہ بی!آپ دیکھیے گا کھا کر۔''

''اب دیکھ لو بیٹا،اس وقت صرف تمہاری خاطر سڑک کا سارا ٹریفک رکوا دیا گیا ہے۔آپ ہی آپ ہیں،یہاں سے وہاں تک۔''

''اجی ہاں،''وہ ہنسی۔''اتنے سویرے اور کون سر پھرا نکلے گا۔''

''اے بیٹا!بختیار کے گھر میں اتنی گنجائش ہوگی؟ہم لوگ رہ لیں گے؟میں نے تو سنا تھا کہ فقط دو کمرے ہیں۔''

''ارے صاحب!گنجائش نہ نکلے تو آپ میرے گھر رہیے گا۔اور بختیار کے گھر میں یہ لڑکی رہ لے گی۔''

''لو اور ہوئی!اب تمہیں پریشان کروں۔''

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ مجھے ضرورت ہو تو میں آپ کے یہاں وہ پھیل پھیل کر رہوں کہ آپ کو یقین نہ آئے۔''

پھر وہ اپنے برابر بیٹھی ہوئی گیتی سے آہستہ سے بولا۔

''یہ بڑھاپے میں لوگوں کو اس قدر خدشات کیوں لاحق ہو جاتے ہیں؟''

''خدشات ۔۔۔۔۔۔۔ہاں! معلوم نہیں کیوں۔ مگر آپ بھی تو بوڑھے ہو چلے ہیں۔ اب یہی خدشے آپ کو لاحق ہو جائیں گے۔''

''چل' ہٹ لڑکی!''

''لو' میں کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں۔'' ذرا آئینے میں دیکھئے' کتنے بال سفید ہو رہے ہیں۔''

''ہوں' ہوں! یہ تو تم نے بری خبر سنائی۔ ایک خدشہ تو یہی لاحق ہو گیا کہ ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔ چلو' خیر۔۔۔۔۔۔۔ اب تم ایک سگرٹ تو سلگا دو نکال کر۔ ذرا غم ہی غلط کریں۔''

''ارے' بھئی! یہ رہا' ادھر اس طرف دیکھو' اس جیب میں ہے۔''

پھر وہ اماں بیگم سے مخاطب ہو گیا۔

''خالہ بی! بختیار میاں نے آپ کو بلایا ہی اس وقت جب ان کو ایک پیارا سا گھر مل گیا۔ لیکن میں ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ یہ جو میں آپ کو یہاں سے وہاں لے جا رہا ہوں تو میری مزدوری بھی ادا کرنی ہوگی۔''

وہ ہنسیں۔ ''کرایہ لوگے کیا؟''

''جی! کرایہ ہی سمجھ لیجئے۔''

''تو بھائی! ابھی سے کھول دو' تاکہ دینے کی ہمت نہ ہو تو اتر کر دوسری سواری کر لیں۔'' وہ ہنسیں۔

''نہیں' اتنا زیادہ نہیں ہے۔ بس یہی کہ کم سے کم پندرہ دن آپ کو میرے ساتھ ٹھہرنا ہوگا۔''

وہ ہنس کر چپ ہو گئیں۔

''اے لیجئے! وہ آپ کا بند کیا ہوا ٹریفک کھل گیا۔ لاری آ رہی ہے اور پیچھے پیچھے ایک گاڑی بھی ہے۔''

''کون سی۔۔۔۔۔۔۔ بیل گاڑی؟''

''بیل گاڑی بھی آ جائے گی۔ ابھی تو موٹر گاڑی معلوم پڑتی ہے۔''

''ارے لڑکی! تو ٹھیک بتاؤ نا۔''

''مجھے خبر ہے۔۔۔۔۔۔۔میک کیا ہے؟''

''اتنا بھی نہیں پتہ؟''

''میں کون سی گاڑیاں خریدرہی ہوں۔ مجھ سے کیاواسطہ گاڑی کا؟'' اس کی آواز میں ایک ہلکا سارنج تھا۔

''البتہ گاڑی زوردار معلوم ہوتی ہے۔رنگ پیارا ہے۔''

''اوروہ دیکھو،وہ'' اس نے جھک کرآہستہ سے کہا۔

''سواری بھی پیاری ہے' چلوہم اپنی جیپ آہستہ کرلیتے ہیں۔ ذرابرابرآلینے دوتوپاس سے دیکھیں گے۔''

''بھئی! ہوگا' چھوڑیئے۔اور جواس گاڑی میں بیٹھا ہوا آدمی بھی ایسی بات کررہا ہو؟''

''مگر معاف کرنا گیتی' ہماری جیپ کی سواری اتنی پیاری نہیں۔''

وہ کھسیا سی گئی۔اوردوسری طرف دیکھنے لگی۔

''اررربھئی! یہ توہمارے انجینئر صاحب نکلے۔''

گیتی نے پیچھے مڑکر گاڑی کی طرف دیکھا۔سلک کی نیلی ساری والی عورت کا سانولا چہرہ بے حد دلکش اور مانوس سا تھا۔

''کون۔۔۔۔۔۔انجینئر صاحب!''

''ہیں ایک انجینئر' ہماری واقفیت ان سے کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ پھر یہ کراچی چلے گئے تھے۔ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے ان کو آئے۔معلوم ہوتا ہے' مری جارہے ہیں۔''

''یہ کیا مہاجر ہیں؟''

''مہاجر تو جب ہوتے جب ہجرت کے زمانے میں آتے۔یہ تو ابھی کچھ عرصہ ہوا آئے ہیں۔پوسٹنگ بھی نئی نئی ہوئی تھی اور شادی بھی نئی نئی کرکے لائے تھے۔''

''تو یہ ہیں کہاں کے؟''

''وہیں تمہارے لکھنو کے ہیں' مسعود احمد''

''مسعود احمد۔۔۔۔۔۔!'' گیتی چونکی اور بالکل پاس سے گزرتی ہوئی گاڑی کو چلانے والے شخص بلاشبہ مسعود ہی تو تھا۔

''اونہہ' ہٹاؤ'' سجاد نے خود سے کہا۔''ہم نے ہاتھ ہلایا تو جناب نے دیکھا ہی نہیں۔گاڑی چلانے اور بیگم سے باتیں کرنے میں اس

قدر غرق ہیں۔"

"تو آپ ان کی بیگم سے بھی ملے ہیں؟"

"خوب اچھی طرح' نام کی بھی کامنی اور صورت کی بھی کامنی ہیں خوب۔"

"کیا مطلب؟"

"بڑے سنبھل سنبھل کر بولتی ہیں۔ گھبرائی گھبرائی سی اور حد سے زیادہ ذہین۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلی بار باہر نکلی ہیں' مگر صاحب منٹوں میں ہر بات لے اڑتی ہیں۔ بہت کم لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ تو گرفتار ہیں۔ اکثر دلچسپ حماقتیں بھی کر جاتی ہیں۔"

"میاں تو شرمندہ ہوتے ہوں گے حماقتوں پر۔"

"قطعی نہیں۔ وہ تو ہوں پر ہاں کرتا ہے۔ بڑے برخوردار قسم کا شوہر ہے۔"

ایک دفعہ ہی گاڑی زن سے آگے نکل گئی اور جیپ پیچھے رہ گئی۔

"کیوں بھئی! پھر داب لیا جائے انجینئر صاحب کو؟ تمہاری ملاقات کرائیں گے۔" سجاد نے ایکسیلیٹر پر پیر رکھا۔

"نہیں' نہیں سجاد بھائی! اماں بیگم کی طبیعت بگڑ جائے گی۔ زیادہ سپیڈ مت دکھایئے۔"

وزیر آباد پر ان کی گاڑی پہلے ہی جا کر رک گئی تھی۔ اس نے دیکھا' مسعود نے اتر کر دروازہ کھولا۔ سفید بلاؤز پر سے بڑی احتیاط سے ساری کا پلو گراتے ہوئے کامنی اتری تھی۔ اپنی خوبصورت جھکی جھکی آنکھیں اٹھا کر اس نے مسعود کو دیکھا تھا۔ اس کے اونچے اور بڑے سے جوڑے میں موتیا کا گجرا لپٹا تھا۔ آگے بڑھ کر مسعود نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور ہوٹل کی طرف بڑھا۔

"لاحول ولا قوۃ! یہ مقام اور یہ رومانس۔۔۔۔۔۔۔!"

سجاد ہنسا۔ "سیدھے ہیں ابھی۔۔۔۔۔۔۔ تو بھئی! کیا خیال ہے' اندر چلا جائے کھانے کے لیے یا یہیں منگوالیں؟"

"سجاد بھائی! اماں بیگم اس طرح نہیں کھا سکیں گی۔ وہ سخت بے آرام ہوں گی۔ کیوں نہ اپنا وہی پروگرام رکھئے' پنڈی میں فلیش مین میں کھائیں گے۔"

بختیار موٹروں کے اڈے پر ان کا منتظر تھا۔

"تو کیا جیپ یہیں چھوڑنا ہے؟" اماں بیگم نے گھبرا کر سوال کیا۔

"نہیں صاحب' جیپ آپ کو گھر پر پہنچائے گی۔ یہ لڑکا تو فقط آپ کی پیشوائی کو آیا ہوا ہے۔"

موڑ پر چڑھتے ہوئے گیتی نے دیکھا۔ مسعود اور کامنی اوپر کی طرف جا رہے تھے اور ان کا سامان لیے ہوئے دو قلی پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کامنی پہلے کی طرح دبلی پتلی نہ رہی تھی۔ اس کا جسم گداز اور خوبصورت ہو گیا تھا۔

''دیکھ لیجئے' جناب! بختیار نے اپنا باغ کتنا عمدہ کر رکھا ہے۔ اور ایک گیتی آرا بیگم کا انتظام ہے۔''

سجاد نے جیپ پھاٹک کے اندر کرتے ہوئے کہا۔

''میرا انتظام کاہے کو ہوتا' وہ تو اماں بیگم خود دیکھ بھال کرتی ہیں۔''

''جب ہی تو میں کہوں کہ اتنا ستھرا کیسے نکلتا چلا آ رہا ہے یہ باغ۔''

سامان رکھوا چکنے کے بعد نہا دھو کر وہ چائے پینے کے لیے آئی تو بختیار نے دیکھتے ہی پوچھا۔

''کیوں' کیا بات ہے؟ کیا بہت تھک گئی ہو؟''

''ہاں! یہ ادھر کچھ کمزوری ہوتی جا رہی ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے اسی خیال سے آنے کی ہمت کی کہ کچھ دن آرام کرلے گی۔''

''کچھ یہ مٹی بھی زیادہ ہے۔'' سجاد نے دوسری پیالی بناتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں اس وقت اسی لیے تھکی تھکی نظر آ رہی ہوں کہ سجاد بھائی نے میرا دماغ چاٹ لیا راستے بھر۔''

''اے لڑکی! خدا کے غضب سے ڈر۔ حد ہو گئی' ہم نے تو بور نہیں ہونے دیا۔ وہ کہتی ہے' دماغ چاٹ لیا۔''

مگر کچھ دیر بعد جب اماں بیگم اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئیں تو سجاد نے اس سے کہا۔

''خیر تو ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ تم ایک دم چپ کیوں ہو گئیں؟ کیا واقعی میں نے تمھیں بہت بور کیا ہے؟ اچھا' خیر۔۔۔۔۔۔۔ اب تو ہم چلتے ہیں۔ اور بور کرنے کی معافی چاہتے ہیں۔''

''ارے نہیں' توبہ! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بھی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سجاد نے ایک ذرا دیر کھڑے ہو کر اس کو دیکھا اور پھر چلا گیا۔

باب ۸۷

''ارے بھئی! کیا اعتکاف کیا ہے جو گھر سے نہیں نکلتی ہو؟''

''اعتکاف کیا سجاد بھائی؟''

''لو بھئی' حد ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔یہ مسلمان کی بیٹی ہے' جسے اعتکاف نہیں معلوم۔''

''کیا گھر سے نکلوں' آپ کی مری ہے کتنی بڑی جو انسان نکلے اور ٹہلے۔ ذرا لمبی چہل قدمی کی تو ایک سرے سے دوسرے تک پہنچ لیے۔ بھئی! ہم نے تو ایسا پہاڑ دیکھا نہیں۔''

''تو اب دیکھ لو۔''

''دیکھ لیا' آپ کہاں رہے چار دن تک؟''

''میں۔۔۔۔۔۔۔میں کہیں نہیں رہا۔''

''یہ بھی کوئی جواب ہوا۔''

''بھئی! مظفر آباد گیا تھا۔''

''ہمیں دکھا دیجئے' ایک بار اپنا مظفر آباد۔''

''مشکل ہے۔ پروانہ راہداری لینا پڑتا ہے۔ چلو اس کے بجائے یہیں نتھیا گلی دکھا دوں۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔''

''رہنے دیجئے' اپنی اچھی جگہیں۔۔۔۔۔۔۔مری بھی تو اچھی جگہ ہے۔''

''اے لو' پھر وہی مری کا طعنہ! ارے بھئی! میں نے تو بنائی نہیں۔ جو کچھ دال دلیا ہے' حاضر ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔

''اور اس کو تو انگریز بہادر نے پہاڑوں کی ملکہ کا خطاب دیا تھا۔''

''یوں ہی دل رکھنے کو دے دیا ہو گا۔''

''دیکھو لڑکی! اب جو حاضر ہے' اسی کو غنیمت جانو اور دل لگاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ جب تمہارا ماضی تمہارا ساتھ نہ دے سکے تو اس پر خاک ڈالو۔''

''تھیوری تو اچھی خاصی ہے۔''

اس نے کشن اپنی گود میں رکھ کر دونوں کہنیاں ٹکا لیں۔ ''اچھا! تو تم اتنے دن کیا کرتی رہیں؟''

''میں نے ایک تصویر مکمل کی ہے اور۔۔۔۔۔۔۔اور یہ پہلی تصویر ہے جس سے میں مطمئن ہوں۔''

''میں کہتا ہوں' چھوڑو اس خرافات کو۔ ارے لڑکی! کیوں اپنی خرابی لگاتی ہے اور کیوں اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتی ہے؟''

''سوال تو معقول ہے۔ اچھا' پھر آپ کا مشورہ کیا ہے؟''

''مشورہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں تم کو ایک مشورہ دینے والا ہوں۔''

''اوہو! آج تو سجاد بھائی نظر آ رہے ہیں۔'' بختیار نے دور ہی دیکھ کر آواز لگائی۔ ''کدھر رہے؟''

''چلا گیا تھا ذرا''

''آپ آئے اور ہم چلے۔''

''کدھر؟''

''ایبٹ آباد''

''تم تو چلے' مگر بھئی! تم نے اس لڑکی کا تو کچھ بھی نہ کیا۔ ویسی کی ویسی نظر آ رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو یہاں بہت چپ چپ نظر آتی ہے۔''

''ہاں' یہ کچھ غلط آئی ہے۔''

''مجھے فرصت نہیں اور یہ خود سے بالکل نکلتی ہی نہیں۔ مال تک نہیں جا کر دیتی؟''

''کون جائے مال پر' اتنی بوریت ہوتی ہے۔ ابھی ایک شخص سے مل کر آگے بڑھے اور ابھی وہی پھر مل جائے گا۔ ہر موڑ پر بار بار ایک ہی نہیں' متعدد جاننے والوں سے مل مل کر اور زبردستی خوشی اور تپاک کا اظہار کر کر کے کوفت ہوتی ہے۔''

''اللہ رے' نازک مزاجی! کیا کہئے۔'' سجاد قہقہہ ضبط نہ کر سکا۔

''نہیں' واقعی معلوم ہوتا ہے کہ کسی پر اسرار کہانی کی فضا میں گھوم رہے ہیں کہ ہر موڑ پر ایک ہی پتلا کھڑا مل رہا ہے۔''

''تنہا بیٹھ بیٹھ کر سوچنے والوں کا آخری انجام یہی ہوتا ہے۔''

''یعنی کیا؟''

''یعنی' یہ کہ جو تمہارا ہوا ہے۔ بختیار! میں کل دن بھر کو نتھیا گلی جا رہا ہوں۔ اگر کہو تو میں اسے لے جاؤں۔''

''ضرور! اماں سے پوچھ لیتے ہیں۔''

چڑھائی خطرناک تھی۔ اس لیے کہ بارش اچانک ہی شروع ہوگئی تھی۔ اور راستے کے پیچ وخم خاصے غیر دلچسپ تھے۔ وہ خاموش سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بلا ارادہ میلوں کے پتھر پر پڑھتی اور اگلے موڑ کے علامتی نشانوں کو گھورتی چلی جا رہی تھی۔

''اس سے تو میں جیپ میں ایک بوری رکھ لاتا۔''

''بوری۔۔۔۔۔۔۔کیوں؟''

''اس لیے کہ بوری پر یہ غصہ تو نہ آتا کہ گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی ہے۔ایک تو اتنا خراب راستہ ہو رہا ہے' اوپر سے تم بور کر رہی ہو۔دل چاہ رہا ہے' اس کھڈ میں گرادوں جیپ کو۔''

''گرادیجئے' مجھے تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔البتہ میری ماں روئے گی۔''

''خیر' مجھے تو یہ بھی فکر نہیں۔مجھے کوئی رونے نہیں بیٹھے گا۔''

''اگر آپ نے شادی کر لی ہوتی تو آپ کی بیوی روتی بیٹھ کر۔''

''تو تم سمجھتی ہو کہ کیا میں سچ مچ کھڈ میں گرا جا رہا ہوں؟ معاف کرنا' میری زندگی اتنی بے حقیقت نہیں ہے۔''

''عجیب باتیں کرتے ہیں۔کون کہتا ہے کھڈ میں گرنے کو؟''

''گیتی آرا۔۔۔۔۔۔!''

''جی' فرمایئے۔''

''تم پہلے سے کچھ بدل نہیں گئی ہو؟''

''ہاں' بدل تو گئے ہوں شاید''

''مگر کیوں؟''

''انسان کوئی پتھر کا جامد ٹکڑا تو نہیں کہ بدلے ہی نہیں۔''

''تم پہلے بہت سرکش ہوا کرتی تھیں۔تم میں بڑی تبدیلی آگئی۔کیا وجہ ہے؟''

''وجہ یہ ہے کہ پہلے میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ میری ماں کو میری ضرورت نہیں اور میں بلا وجہ ہی ارجمند کے ساتھ ایک فالتو چیز کی طرح ان کے گلے بندھ گئی ہوں۔سجاد بھائی! آپ نے کبھی یہ نہ سنا ہوگا کہ دو جڑواں بھائی یا بہن ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوں۔''

''ہاں! یہ بہت عجیب بات ہے۔''

''مجھے تو بعض مرتبہ بچپن میں لوگوں کے اس مذاق کا' کہ یہ تو پال لی ہے کسی سے لے کر' یقین آجاتا تھا۔''

باب ۸۸

پاٹن ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھاتے اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ یہ جگہ اس کو پسند ہے اور کچھ یوں محسوس ہوا جیسے یہ جگہ ساری عمر کی جانی پہچانی ہو۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل کر بے مقصد ادھر ادھر گھومتی رہی اور سجاد وہیں سانپ بوٹیوں سے گھری ہوئی چھوٹی سی چٹان پر بیٹھا اس کو گھومتے دیکھتا رہا۔

ڈیزی کے زرد زیرے والے سفید سفید پھولوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اس نے کہا۔ ''مگر آپ تو کسی کام سے آئے ہیں۔ اپنا کام تو کر لیجیے۔''

''میں کسی کام سے نہیں آیا تھا۔''

''پھر بلاوجہ ہی اتنی خطرناک چڑھائی چڑھے۔ بارش ہوتے ہی لوٹ چلتے۔''

''کیوں لوٹ چلتے' گیتی! میں تم کو یہاں اس لیے لایا ہوں کہ میں تمہیں یہاں لانا چاہ رہا تھا۔''

''مگر کیوں؟'' گیتی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا سنولایا ہوا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اڑے اڑے بالوں کے درمیان چمکتی ہوئی پیشانی اور گہری آنکھیں مل جل کر ایک بڑا دلکش اور شاندار نقش بنا رہی تھیں۔

''میں تمہیں یہاں لانا چاہ رہا تھا۔'' اس نے سوچا' خوف اور وحشت کی ایک لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔ وہ خاموش سر جھکائے ڈیزی کے پھولوں کو یوں دیکھتی رہی' جیسے وہ کوئی بڑی اہم چیز ہوں۔

''اور یہی تو باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ آخر اس غیر انسان کے ساتھ مجھے یوں کیوں بھیج دیا گیا؟ اور یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ اس شخص سے ملنے کو جس نے میرے اوپر احسان کیا تھا' بختیار بھائی نے بڑے واضح طور پر منع کر دیا تھا۔ مگر مجھے کرنل سجاد سے یہ توقع نہ تھی' جو عمر میں مجھ سے اتنا بڑا ہے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''تم پریشان کیوں ہو گئیں؟''

''نہیں' میں پریشان نہیں ہوں۔''

''مگر تمہاری آواز کچھ اور کہہ رہی ہے۔ بس' یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ تم بہت بدل گئی ہو' اب تم جو سوچتی ہو' وہ کہنا پسند نہیں کرتیں۔''

''وہ خاموش بیٹھی رہی۔''

''تم کیا مجھ کو اتنا ذلیل سمجھتی ہو گیتی! میں کوئی نوعمر چھچھورا لڑکا نہیں ہوں۔ میں ایک ذمہ دار افسر ہوں۔''

''مگر ذمہ دار لوگ ہی بعض وقت بہت غیر ذمہ دار ثابت ہوتے ہیں۔'' وہ سوچتی رہی۔

''ادھر دیکھو ڈیزی کے ان پھولوں کو مت گھورے چلی جاؤ۔ یہ تمہاری حفاظت قطعی نہیں کر سکتے۔ نہ تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکتے ہیں۔''

وہ آہستہ سے ہنسی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''جب تم اتنے لمبے چوڑے اور عمر رسیدہ افسر پر بھروسہ نہیں کر سکتیں تو ان پھولوں پر کہاں کا اعتماد آ گیا۔''

وہ اتنی سنجیدگی سے اتنی مسخری باتیں کرتا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''مگر گیتی! یہ میں پھر کہوں گا کہ میں تمہیں یہاں اس لیے لایا ہوں کہ تمہیں لانا چاہ رہا تھا۔''

اس نے پھر سر جھکا لیا۔ اس کی باتوں سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

''پھر وہی پھولوں سے دلچسپی۔ ارے بھئی! زندہ انسان کی طرف دیکھو اور اس سے یہ پوچھو کہ تم مجھے یہاں کیوں لانا چاہ رہے تھے؟''

''کیوں لانا چاہ رہے تھے؟'' اس نے بے حد مری ہوئی آواز میں کہا۔

''اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہے اور اب سے نہیں' اس وقت سے جب میں تمہارا ہاتھ ادھورا چھوڑ کر یکا یک غائب ہو گیا تھا۔ اب مل گیا نہ اس دن کے سوالات کا جواب!''

وہ اس شخص کے یوں بے دھڑک کہہ دینے سے کہ ''مجھے تم سے محبت ہے'' شپٹا سی گئی۔

''مگر میرا تو خیال تھا کہ آپ۔۔۔۔۔۔۔'' وہ رکی۔

''صولت آپا سے محبت کرتے ہیں۔'' سجاد نے جملہ پورا کر دیا۔

''ہاں! یہی میرا بھی خیال تھا اور میں اس کی محبت میں بہت بے تاب اور پریشان بھی تھا' مگر۔۔۔۔۔۔۔ پھر اچانک ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ میری حالت اس شخص کی ہے جو کسی سے ملنے یا بات کرنے کے انتظار میں وقت گزاری کے لیے کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دے۔''

''محبت ہے تو پھر یہاں لانے کا کیا مطلب؟'' اب پھر اس کی آواز میں خوف کی آمیزش تھی۔

''مطلب یہ ہے کہ میں یہاں زیادہ سکون سے تم سے بات کرسکتا تھا۔اوراب تم مجھے سوچ کر جواب دو۔''

''کیا جواب دوں؟''

''یہی کہ مجھ سے شادی کرنے کے متعلق کیا خیال ہے۔''

''کیا خیال ہے؟''اس نے دہرایا۔اچانک اسے برسوں پہلے کی اپنی بات یاد آگئی۔اس نے ایک دن اسی بے تکلفی اور بے باکی سے اپنے باغ کے کنویں کی جگت پر بیٹھ کر مسعود سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھااوراس سے جواب مانگا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہولڑکی؟''وہ اس کی طرف جھکااور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

اپنے قدموں میں بیٹھا ہوا یہ ذمہ دار اعلیٰ افسر اس کو بہت دلچسپ نظر آرہا تھااور وہ اپنے آپ کو اچانک بے حد اہم محسوس کرنے لگی تھی۔دو مرتبہ وہ مال روڈ پر نکلی اور دونوں ہی دفعہ مسعوداور کامنی اس کو کہیں نہ کہیں خریداری میں مصروف یا کسی سے باتوں میں منہمک ملے تھے۔وہ مسعود کے سامنے خود بھی نہ آنا چاہتی تھی۔لیکن ساتھ ہی اس کو یہ وہم ہونے لگتا تھا کہ اس نے اس کو دیکھا اور نظر انداز کر دیا ہے۔

اس وہم نے اس کو اپنی ہی نظر میں بڑا حقیر اور غیر اہم بنا دیا تھا۔حالانکہ یہ وہی تھی'جس سے مسعود نے کہا تھا۔''تجھ سے زیادہ بھی پیاری کوئی چیز ہوسکتی ہے؟''

اس نے سجاد کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا'التجا تھی اور بے صبری۔اور وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آرہا تھا۔

''اچھا'سجاد بھائی!میں سوچ کر جواب دوں گی۔''

''تم مجھے صرف سجاد کیوں نہیں کہتیں؟''

''آپ مجھ سے بہت بڑے ہیں۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟میں آپ کو جلد جواب دوں گی۔''

''مگر کب؟''

''کل پرسوں تک۔''

پھر شام کو گھر آتے آتے اس کا ارادہ بدل گیا۔

''اگر میں کل صبح تک آپ سے بات کرنا چاہوں تو کہاں کروں؟''

''کل صبح مجھے کام ہے' شام کو کرلو گی؟''

سجاد کی آواز بجھ سی گئی۔

''کہاں پر؟''

''سیمسن میں چلی چلنا۔''

''میں ایسی جگہ بات نہیں کروں گی۔''

''پھر؟''

''پھر یوں کریں گے' نکل پڑیں گے۔ مناسب جگہ خود بخود مل جائے گی۔''

رات تو ہر شکل میں خوبصورت ہوتی ہے۔ آسمان پر چاند ستاروں کو ہونا شرط نہیں۔ تاریک رات بھی خوبصورت ہوتی ہے۔ یہی تو وہ وقت ہوتا ہے جب حقیقت ہیولے کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس رات تو آسمان پر اکا دکا تارے بھی تھے۔

سجاد نے بختیار کے گھر ہی کھانا کھایا تھا اور اب وہ دونوں ٹہلتے ہوئے دور نکل گئے تھے۔

چڑھائی کے موڑ پر چیڑ کے جھنڈ خاموش ہیولوں کی شکل میں کھڑے تھے۔

''آہا' یہ دیکھو' یہ میری پسندیدہ جگہ ہے۔''

وہ دونوں ایک درخت کے نیچے پڑی بنچ کی طرف بڑھے۔

راستے بھر باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے وہ اب خاموش تھی۔

نیچے وادی میں بستی اور بازاروں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ چیل کے نوکیلے اور چکنے پتوں پر ان کے قدم پھسل رہے تھے۔

سجاد نے جھک کر نیچے دیکھا اور کہا۔

''دیکھو' کیسے جگنو سے جھمک رہے ہیں!''

اس کی آواز میں خوشی کا ارتعاش تھا۔

''آپ نے اتنی دنیا دیکھ لی۔ جنگ جیسا زندگی کا خوفناک تجربہ کرلیا۔ پھر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے آپ خوش ہوتے ہیں۔''

''ہاں' کہتے تو یہی ہیں کہ جنگ اور ایسے ہی مہیب تجربے انسان کے احساس کو کند کر دیا کرتے ہیں۔ اس کے ذہن پر ایک بے کراں سناٹا طاری ہو جاتا ہے جو دنیا کے کسی ہنگامے سے بھی نہیں ٹوٹتا۔ لیکن مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر تلخ تجربہ میرے احساس کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس دنیا کو جب بھی دیکھو نئی اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے گیتی!''

نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اندھیرے میں سجاد نے اس کی آنکھوں کی نمی اور چہرے پر پھیلتی ہوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ چیڑ کی شاخوں میں سرسراتی ہوا خوشبو بن کر ان پر برس رہی تھی اور پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی بات شروع کر کے ختم کی۔

''بس' تو صرف تم کو یہی کہنا تھا؟''

''ہاں' میں یہی بتانا چاہتی تھی۔ آپ شاید مجھے بہت معقول اور متوازن لڑکی سمجھتے ہیں۔ مگر میں قطعی نارمل نہیں۔'' اس کی آواز میں دکھ تھا۔'' آپ یقین جانیئے' مجھے اس بات کا ہمیشہ دکھ رہتا ہے۔ میں شروع ہی سے اس احساس میں مبتلا رہی ہوں کہ میں اور لڑکیوں سے بہت مختلف ہوں۔''

''کہتے تو لوگ مجھے بھی یہی ہیں کہ میں کچھ ٹھیک آدمی نہیں ہوں۔ مگر گیتی! تمہاری یہ برائیاں تو مجھے پہلے ہی معلوم تھیں۔''

''آپ کا شاید یہ خیال ہے کہ میں اب معقول نظر آ رہی ہوں تو ٹھیک ہو گئی' لیکن شاید میں کبھی نہ ٹھیک ہوں گی۔''

''پھر مجبوری ہے گیتی' بعض وقت برے انسان کو بھی بھگتنا پڑتا ہے' چلو تمہیں بھی بھگت لوں گا۔''

''آپ نے سوچ لیا ہے؟''

چیڑ کے سایوں تلے تاروں کی جھلملی روشنی میں سجاد نے کوئی جواب دینے کے بجائے اس کو اپنے سے بہت قریب کر لیا۔

''تو پھر میں بات کر لوں اماں بیگم اور بختیار سے؟''

''آپ کو ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے متعلق کوئی بات کبھی کسی کی وساطت سے نہیں کی ہے۔ اپنے اس ذاتی معاملے کے متعلق ان سے میں خود ہی بات کروں گی۔'' اس کی آواز میں تیقن اور اعتماد تھا۔

وہ خاموشی سے اس کو پورٹیکو میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

''تمہارے ذہن پر اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کا بوجھ ہے اور تم اس اذیت میں مبتلا ہو۔ تم نے مجھے اپنی خامیوں سے یوں آگاہ کرنا چاہا تھا' جیسے میں تم کو بہت بھلا آدمی سمجھتا ہوں۔ احمق لڑکی! مجھے تیرے ذہن کا یہی بوجھ اور اذیت کا یہ احساس ہی تو پیارا لگتا ہے۔

لیکن ایک بات کی حسرت میرے دل میں تجھے حاصل کر لینے کے بعد بھی رہے گی۔ کاش' تو نے اپنے کنویں کی جگت پر بیٹھ کر یہ لفظ مسعود سے کہنے کے بجائے مجھ سے کہے ہوتے۔ اچھی بات ہے' انجینئر صاحب! میں تمام عمر تم سے رشک کروں گا۔ لیکن گیتی! میں تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گی۔ مجھے تمہارے ذہن کی ان ملامتوں اور بوجھل ضمیر نے موہ لیا ہے۔ محبت میں کچھ باتوں کو ہمیشہ راز ہی بن کر رہنا چاہیے۔"

"ایک اور عمر رسیدہ داماد!" اماں بیگم اس خیال ہی سے مضمحل ہو گئیں۔ وقت اور واقعات اپنے آپ کو دہرانا چھوڑ دیں تو کیا ہی اچھی بات ہو۔ باوجود ناپسندیدگی کے انہیں خوب معلوم تھا کہ وہ اس معاملے میں کچھ کر نہیں کر سکتیں۔ وہ صولت کی اونچ نیچ سمجھا کر ایک عمر رسیدہ شخص سے شادی کرنے پر رضامند کر سکتی تھی' لیکن اس لڑکی کو سمجھا کر عمر رسیدہ شخص سے شادی کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھیں۔

وہ تو بالکل خاموش رہی تھیں' بولا تو بختیار تھا۔

"اچھا' تو پھر یوں کرتے ہیں کہ ہم سجاد بھائی کو منظوری دے دیتے ہیں اور وہ تم کو انگوٹھی پہنا دیں۔" بختیار نے اپنے حسابوں بہت سہولت کی بات کہی۔

"اور ہاں! اب کم سے کم چچا پھوپی کی تو شرکت ہو ہی جائے۔ جب تک وہ لوگ شاید آسکیں۔ اب لکھ دیں گے تو پاسپورٹ بنتے بنتے چار ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔" اماں بیگم نے بھی اپنا خیال ظاہر کر ہی دیا۔

"ارے انہیں' اماں! کون آتا ہے۔ اب تو وہ دوسرا ملک ہے۔" بختیار نے سمجھایا۔

"اے' تو پھر وہ سب مجھ ہی کو کہنے بیٹھیں گے کہ پاکستان جا کر ایسی بے تعلق ہو گئیں کہ بیٹا بیٹی کے کاموں میں بھی شریک نہ کیا۔"

"یہ اب پاکستان آ کر ان کو بڑا خیال آنے لگا۔" بختیار نے سوچا اور پھر بولا۔ "تو آپ کو کون پوچھ رہا ہے' چچا ابا نے ایاز کی منگنی طلعت سے کر لی تو آپ کو کس نے اطلاع دے دی۔ نہ چچا ابا نے پوچھا اور نہ چچی جان نے اطلاع دی۔ عصمت آپا' سنا ہے' گئی تھیں۔ آپ کو منگنی کے لڈو ہی بھیج دیئے ہوتے۔"

وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھی رہیں۔ تقدیر کو ان سے بڑی کد ہو گئی تھی۔ ابھی چند ہی دن تو ہوئے تھے' جب وہ سوچ رہی تھیں۔ "لاؤ' پھر دلہن کو طلعت کے لیے لکھ ہی دوں۔ یہاں تو کوئی معقول لڑکی سمجھ میں نہیں آرہی اور ہماری صولت کو تو یوں ہی ضد ہو جاتی ہے' ہر بات کی۔ عصمت آئی تھی تو کیسی بھاری بھرکم اور اقبال مند لگ رہی تھی۔" اس کے خیال پر ان کا دل بے قرار ہو جاتا تھا۔ دیکھ کر تو یہی دل چاہا تھا کہ اس کو گلے سے لگا کر خوب روئیں۔

''اچھا' تو بھائی صاحب نے ایاز کی منگنی کرلی۔ ہاں' ہماری لڑکیوں میں کیڑے پڑے تھے۔بھئی' ہماری بھابی نے تو کبھی زبان پر آنے ہی نہ دیا۔''

انہوں نے دھیرے سے کہا۔گیتی اگر ہمیشہ کی طرح ایسا اوٹ پٹانگ فیصلہ نہ کرتی تو ان کو اس قسم کا ملال کبھی نہ ہوتا۔

پھر انہوں نے بختیار کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر رنج تھا اور برداشت اور صبر کا بے پناہ احساس۔

''کاش' میرا بڑا لڑکا' جس سے مجھے سب سے زیادہ محبت تھی' اتنا ہی سمجھدار اور حقیقت پسند ہوتا۔'' وہ مزید کچھ طے کئے بغیر چپکے سے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔انہوں نے فقط ایک بات طے کی تھی۔وہ بھی دل میں اور وہ یہ تھی کہ ''میرا ہر فیصلہ غلط اور ہر منصوبہ ناکام رہا ہے۔لہٰذا مجھے مزید اپنے بچوں کی تقدیروں سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔''

ان کے جانے کے بعد وہ بولی۔

''نہیں' بختیار بھیا! یہ سب فضول ہے۔چھوڑیئے' کیوں اپنے آپ کو وقت میں مبتلا کرتے ہیں؟''

''سب فضول ہے تو کیا چپکے سے ان کے ساتھ اٹھ کر چل دینے کا ارادہ ہے؟ دقت کا یہ ہے کہ بہن ہوتی ہے تو اس کو رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''یہ سب خرافات ہے' میرے نزدیک۔بس کل نکاح کردیجئے۔''

''کتنی واہیات اور روکھی طبیعت ہے اس کی بھی۔'' بختیار نے سوچا اور پھر رکھائی سے بولا۔''کل کے بجائے اگر میں پرسوں نرسوں کا دن رکھ لوں تو کیا تم انتظار کرسکوگی؟ مجھے اپنی فرصت بھی تو دیکھنا ہے یا اگر میرے بغیر کام چل جائے تو۔۔۔۔''

''چلئے' آپ کی فرصت تک رک جاتے ہیں۔'' پھر اس نے بختیار کو منانے کے خیال سے کہا۔'' آپ یہ بھی تو سوچئے کہ شادی ایک عمر رسیدہ شخص سے ہورہی ہے' جس کی ایک شادی پہلے بھی ہوچکی ہے۔اس کو کتنا عجیب لگے گا چھوٹی چھوٹی رسموں کا ہونا۔''

''یہ تو سب تمہارے ذہن اور احساس کی اختراعات ہیں۔اس کو عجیب لگ رہا ہے' تو پھر وہ یہ نوعمر لڑکیوں کی سی حرکت کیوں کررہا ہے؟''

''خیر' بھئی! اب ہم نے یہی طے کرلیا ہے۔'' وہ جب فیصلہ کرلیتی تھی تو اس کی آواز میں بڑی قطعیت اور رکھائی آجاتی تھی۔

''عجیب بے مروت اور جلد باز لڑکی ہے۔اور ایسی ہے کہ اپنا کیا کرایا خود ہی مٹا دیتی ہے۔''

اس وقت وہ بختیار کو بے حد بری لگ رہی تھی۔

''مارگریٹ کا عقیدہ ہے۔'' دستک دو اور تم باریاب ہو گے'' اور تاؤ کے پتھریلے راستے پر چلنے والوں کا قول ہے۔'' دستک نہ دو' رسائی تم تک خود پہنچے گی۔''

انجیل مقدس یا مارگریٹ کے اس عقیدے اور تاؤ کے ماننے والوں کے قول میں کیا فرق ہے؟ محض الفاظ کا۔ رسائی اور باریابی کی مشترک آرزو۔ فرق فقط آرزو کو بروئے کار لانے کے طریق کار کا ہے۔

''مارگریٹ انجیل مقدس کی پیروکار تھی اور اس نے بار بار دستک دی' پر وہ باریاب نہ ہوئی۔ اور میں تاؤ کا ماننے والا نہیں ہوں۔ پھر بھی میں نے دستک نہ دی اور رسائی نہ پائی۔ لیکن میرے اور اس کے عمل اور طریق کار میں فرق فقط آرزو کا ہے۔

''مارگریٹ نے دستک دی' اس لیے کہ وہ باریابی کی آرزومند تھی اور رسائی نہ پائی۔ میں نے دستک نہیں دی۔ لیکن اس لیے نہیں کہ میں رسائی چاہتا تھا۔ مجھے اپنا مقسوم معلوم تھا۔ رسائی کے اور میرے درمیان دیوار چین سے بھی زیادہ سنگین اور طویل دیوار حائل تھی۔''

صفدر یاسین عرف لیو چو نے طویل رخصت پر جاتے ہوئے اپنا سامان سمیٹتے سمیٹتے سوچا۔

''میں طویل رخصت پر کبھی واپس نہ آنے کے ارادے سے جا رہا ہوں۔ اس لیے وہ ہاتھ جس کو میں نے دستک دینے سے باز رکھا تھا۔ اس پر میرا اختیار نہیں ہے۔ انسان کو اپنی کسی بات اور چیز پر اختیار نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ دل جیسی پنہاں اور کمزور شے بھی اس سے سرتابی کرتی ہے۔ اور اب درویش کدھر جائے؟ شہر دل تو سکڑ کر بہت مختصر ہوا چاہتا ہے۔''

اپنے بندھے ہوئے سامان اور ویران کمرے کو اس نے دلچسپی سے دیکھا۔ ''اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ان کے دلوں پر کیا بیتی ہو گی جو اپنے آباء واجداد کے بنائے ہوئے پکے مکان اور حویلیاں بھرے بھرے سامان کے ساتھ چھوڑ آئے۔''

پھر وہ لی فاں اور اس کی بیگم کے پاس چلا گیا جو اس کو پہنچانے اسٹیشن تک جا رہے تھے۔ ان کے دیئے ہوئے چھوٹے چھوٹے تحفوں سے اس کے بکس کی اچھی خاصی جگہ گھری ہوئی تھی۔

''اور اب ان کے تمام احسانوں کا بدلہ میں یہی دے سکتا ہوں کہ وہاں بیٹھ کر ان کے تحفے جگہ جگہ پارسل کرتا رہوں۔ میں کراچی کے راستے آیا تھا اور کراچی ہی کے راستے واپس جا رہا ہوں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

پھر اس نے گلے میں پڑے ہوئے چھوٹے سے قرآن شریف کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''میری ماں کتنی خوش ہوگی' جب وہ دیکھے گی کہ اس کا بیٹا صحیح سالم گھر واپس آ گیا ہے۔لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ میں صحیح سالم واپس جا رہا ہوں۔''

اس نے حسرت سے پٹڑی پر چھکا چھک چلتی گاڑی میں سے جھانکا۔وہ شہر پیچھے رہا جا رہا تھا جو اس کو بہت بھلا لگا تھا۔جیسے وہ اپنا نگر ہو۔اس کو اس ہنستے ہوئے قدیم اور باوقار شہر سے محبت تھی۔ایک بھی آنسو اس کی آنکھ سے نہ گرا۔مگر وہ بہت رویا تھا۔اور اس کے دل نے بار بار دہرایا تھا۔

نیم راہ کہسار پر

ایک نیم شکستہ سمادھی کی اور بڑھتا ہوا پجاری

جنگل میں ایک زرد پتا

سرسراتا ہے

اور شاخ سے جھڑ جاتا ہے

''توبہ ہے' تم تو جب نکلتی ہو تو چاہتی ہو کہ تمہارے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور خریدی جائے۔''

''پھر کیا ہوا' بھئی! تم میری بیٹی کو بہت جھڑکتی ہو۔''

''جھڑکوں کیسے نہ سارا ایکسچینج صاحبزادی کی ضدوں پر ختم ہو جائے گا تو پھر ہم کیا کریں گے۔''

''ایکسچینج تم کو مل جائے گا۔تم میری لڑکی کو جوتا خرید دو۔کیا خیال ہے؟''

''خیال کیا ہوتا۔خریدنا ہی پڑے گا۔بڑھاپے کی اولاد ایسے ہی لاڈ میں بگاڑی جاتی ہے۔چلو۔۔۔۔!''

وہ جز بز ہوتی ہوئی جوتے کی دکان کی طرف چل پڑی۔

اس کا جسم بھاری ہو گیا تھا اور سر میں جا بجا سفید بال آ گئے تھے۔اس کے بال اب بھی کٹے ہوئے تھے۔اس نے کبھی چوٹی رکھی ہی نہ تھی۔

''میرے بال بہت سیدھے اور موٹے ہیں۔ان کو بنانے سنوارنے کا ایک اور جھنجھٹ سر لگا لوں۔'' سجاد نے جب بھی اس سے بال بڑھانے کی فرمائش کی' اس کو یہی جواب ملا۔

''اور اب دو بچوں کی ماں ہو کر چوٹی رکھتے شرم بھی تو آتی ہے۔'' جس دن سے اس نے یہ کہا تھا۔'' سجاد نے اس سے بال بڑھانے کی

فرمائش چھوڑ دی تھی۔

ہانگ کانگ کی اس نسبتاً خاموش سڑک پر آ کر اچانک ہی لڑکی بکھر گئی تھی۔

''جوتا پہنوں گی۔'' وہ لڑکی بالکل اپنے باپ کی شکل تھی اور ماں کی طرح ضدی۔ دس جوتے نکلوانے کے بعد بھی وہ مطمئن نہ تھی۔ ہر جوتے میں مین میکھ نکال دیتی تھی۔

''تو پھر اب میں تمہارے لیے آسماں سے بنا ہوا جوتا کہاں سے لا کر دوں؟ لڑکی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کوئی جوتا۔''

وہ ہانپ کر بیٹھ گئی۔ پورے چار سال کے بعد اب یہ تیسرا اتفاق تھا اور اس مرتبہ وہ بہت جلد تھک جایا کرتی تھی۔

''مجھے اور جوتے لا کر دکھاؤ۔'' بچی نے نوعمر سیلز بوائے کو حکم دیا۔

ہمیشہ کے سے نرم نرم اور ستھرے لہجے میں وہ اس کو سمجھانے لگی۔ ''میری بیٹی! اب کتنے جوتے نکلواؤ گی؟ کوئی حد بھی ہوتی ہے؟''

اور جب اس عمر رسیدہ لیکن دلکش شخص نے' جو بچی کا باپ تھا' بڑے اخلاق اور نرمی سے سیلز بوائے کو مزید جوتے لا کر دکھانے پر راضی کر لیا تو اس کی ماں نے شکایتاً کہا۔

''کیوں اس کا دماغ خراب کر رہے ہو؟ یہ جوتا پہننے میں ایسے ہی نخرے کرتی ہے۔''

اور بجھی بجھی سی آنکھوں والا شخص جو بڑے وقار سے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا' مسکرایا۔ اس لیے کہ وہ اجنبی زبان میں بولے ہوئے ان الفاظ کا مطلب سمجھتا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ وہ سامنے جا کر پوچھے۔

''تم وہ دن بھول گئیں' جب تم سانگ کی دکان میں آتیں تو مجھے اسی طرح پھیرے کرنا پڑتے تھے۔''

مگر اس نے فقط اتنا کیا کہ اپنا سفید بالوں والا سر جھکا لیا۔

کاؤنٹر پر سے چشمہ اٹھا کر لگایا اور پڑھے ہوئے اخبار کو پڑھتے ہوئے سوچا۔

''اس وقت میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ آج میں نے پورے بارہ سال کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔''

بچی کی ماں شاید بہت تھک گئی تھی۔ اس لیے ماں کے بجائے وہ اپنے باپ کے ساتھ کاؤنٹر پر بل ادا کرنے آئی تھی۔

اس نے الٹا ہاتھ بڑھا کر بل لیا اور سیدھے ہاتھ سے دبا کر پڑھنے لگا۔

''ہائیں ابو! اس آدمی کا ہاتھ کیا ہوا؟''

بچی نے کلائی کے پاس سے کٹے ہاتھ کو بغور دیکھا۔

''چپ رہو' ایسی باتیں نہیں کرتے۔'' اس کے باپ نے اپنی زبان بولی۔

''تمہارا ہاتھ یہاں سے کیا ہوا؟'' بچی نے بے صبری سے پوچھا۔

''مشین نے کھا لیا۔''

''مشین نے! کیوں؟ کیا تم بہت لا پرواہو؟''

''ہاں' میں کسی وقت بھول جایا کرتا تھا کہ مشین کے پاس کھڑا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے' یہ ہاتھ کیا کہتا ہے؟'' اس نے کٹی ہوئی کلائی اونچی کی۔

''کیا؟'' بچی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

''کہتا ہے' دستک نہ دو۔''

حیرت زدہ بچی یہ اطلاع اپنی ماں کو دینے بھاگ گئی جو دکان کے باہر کھڑی کسی پھیری والے سے مول تول کر رہی تھی۔

◆◆◆